BAHS601DST

جدید ہندوستان

قومی تحریک

Modern India

National Movement

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

بیچلر آف آرٹس (بی۔اے۔)

(چھٹا سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-بھارت

©Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Course: Modern India: National Movement
ISBN: 978-81-972234-0-2
First Edition: April, 2024

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2024
Copies	:	1200
Price	:	400/- (The price of the book is included in the admission fee of distance mode students)
Copy Editing	:	*Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha, Programme Coordinator–History, DDE, MANUU, Hyderabad Dr. Syed Meer Abul Hussain, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad Mr. Mohd Aasim, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, Asst. Professor of Urdu (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Prime Time & Business Enterprises, Hyderabad

Modern India: National Movement

for

B.A. 6th Semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad – 500 032 (TS), Bharat
Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing from the publisher (registrar@manuu.edu.in).

مدیراعلیٰ (Chief Editor)	
Prof. S.M. Azizuddin Husain Former Head, Department of History & Culture Jamia Millia Islamia, New Delhi	**پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین** سابق صدر، شعبہ تاریخ و ثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
مدیر (Editor)	
***Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha** Programme Coordinator – History DDE, MANUU, Hyderabad	**ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا** پروگرام کوآرڈی نیٹر، تاریخ، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
مجلس ادارت (Editorial Board)	
Prof. Mushtaq Ahmad Kaw Former Head, Department of History Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad	**پروفیسر مشتاق احمد کاؤ** سابقہ صدر شعبہ تاریخ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Prof. Perwez Nazir Centre for Advanced Studies, Department of History Aligarh Muslim University, Aligarh	**پروفیسر پرویز نظیر** سینٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز، شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Prof. Alauddin Khan Head, Department of History Shibli National College, Azamgarh	**پروفیسر علاؤالدین خان** صدر، شعبہ تاریخ، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ
Dr. Syed Meer Abul Hussain Assistant Professor of History (C) / Guest Faculty DDE, MANUU, Hyderabad	**ڈاکٹر سید میر ابوالحسین** اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی، نظامت فاصلاتی تعلیم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Mohd Aasim Assistant Professor of History (C) / Guest Faculty DDE, MANUU, Hyderabad	**محمد عاصم** اسسٹنٹ پروفیسر، تاریخ (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی، نظامت فاصلاتی تعلیم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Dr. Khursheed Ahmad Bhatt Assistant Professor of History (C) / Guest Faculty Lucknow Campus, MANUU, Lucknow	**ڈاکٹر خورشید احمد بٹ** اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی، لکھنؤ کیمپس مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ
مدیر زبان (Language Editor)	
Dr. Mohd. Akmal Khan Assistant Professor of Urdu (C) / Guest Faculty DDE, MANUU, Hyderabad	**ڈاکٹر محمد اکمل خان** اسسٹنٹ پروفیسر، اردو (کانٹریکچول)/گیسٹ فیکلٹی، نظامت فاصلاتی تعلیم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

کورس کوآرڈی نیٹر

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

اسسٹنٹ پروفیسر (تاریخ)، نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
• ڈاکٹر داؤد ابراہیم	اکائی 1،3،4،13
• محمد عاصم	اکائی 2،8،9،19،20
• ڈاکٹر خورشید احمد بٹ	اکائی 5،6،15،16،17،18
• ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا	اکائی 7
• ڈاکٹر فردوس حمید پرے	اکائی 10،11،12
• ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	اکائی 14
• ڈاکٹر کھانڈے پرویز احمد	اکائی 21
• ڈاکٹر اے۔ سبھاش	اکائی 22،23،24

مترجمین	اکائی نمبر
• ڈاکٹر تابش امین پرے	اکائی 22
• محمد عاصم	اکائی 23
• ڈاکٹر محمد اسمٰعیل دار	اکائی 24

پروف ریڈرس

اول	:	محمد عاصم
دوم	:	سید میر ابوالحسین
فائنل	:	شیخ محبوب باشا

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	9
بلاک I	**انڈین نیشنل کانگریس: قیام اور منصوبے**	
اکائی 1	انیسویں صدی میں قومی شعور کے ابھرنے کے اسباب	11
اکائی 2	پس منظر اور انڈین نیشنل کانگریس کا قیام	28
اکائی 3	اعتدال پسند	51
اکائی 4	انتہا پسند	65
اکائی 5	دادا بھائی نوروجی اور بدرالدین طیب جی	81
اکائی 6	لال، بال اور پال	101
بلاک II	**بیسویں صدی کے موڑ پر ہندوستان-I**	
اکائی 7	مسلم لیگ	121
اکائی 8	ہندو مہاسبھا	143
اکائی 9	پہلی عالمی جنگ	160
بلاک III	**بیسویں صدی کے موڑ پر ہندوستان-II**	
اکائی 10	ہوم رول تحریک	180
آئینی ترقیاں		
اکائی 11	1909 کا انڈین کونسلس ایکٹ	192
اکائی 12	1919 کا انڈین کونسلس ایکٹ	204

بلاک IV	**گاندھیائی دور-I**	
اکائی 13	جنوبی افریقہ میں گاندھی کا ابتدائی مشغلہ	217
اکائی 14	چمپارن اور کھیڑا	238
اکائی 15	تحریک عدم تعاون	249
اکائی 16	خلافت تحریک	268
بلاک V	**گاندھیائی دور-II**	
اکائی 17	سول نافرمانی اور ہندوستان چھوڑو تحریک	285
اکائی 18	گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ - 1935	306
اکائی 19	قومی تحریک اور بائیں بازو کی جماعتیں	324
اکائی 20	اچھوتوں کا مسئلہ	342
اکائی 21	قومی تحریک اور خواتین	368
بلاک VI	**آزادی اور تقسیم کی طرف**	
اکائی 22	ہندوستان اور دوسری عالمی جنگ	381
اکائی 23	تقسیم ہند	395
اکائی 24	انڈین انڈپنڈنس ایکٹ	411
نمونہ امتحانی پرچہ		424

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔ اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1) اردو زبان کی ترویج و ترقی (2) اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3) روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل واخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر ان شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25 ویں سالگرہ منارہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم از سرِ نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل وابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔ میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی طریقۂ تعلیم کو پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر فاصلاتی طرز تعلیم کو متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم سے ہوا اور 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم (Regular Courses) کا آغاز ہوا اور بعدازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔

ملک میں تعلیمی نظام کو بہتر انداز سے جاری رکھنے میں یو جی سی کا مرکزی کردار رہا ہے۔ فاصلاتی تعلیم (ODL) کے تحت جاری مختلف پروگرام UGC-DEB سے منظور شدہ ہیں۔ UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کر کے فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ (Dual Mode University) ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق Credit Based Credit System (CBCS) نظام متعارف کرایا گیا اور خود اکتسابی مواد (Self Learning Material) از سرِ نو، جس میں یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کیا گیا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ سترہ (17) کورسز چلا رہا ہے۔ ساتھ ہی تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جا رہے ہیں۔ متعلمین کی سہولت کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک موجود ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑہ میں ایک ایکسٹنشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 160 سے زیادہ متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ای میل اور وہاٹس ایپ گروپ کی سہولت فراہم کی گئی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوئوں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ پچھلے دو سال سے ریگولر کاؤنسلنگ کے علاوہ ایڈیشنل ریمیڈیل آن لائن کاؤنسلنگ مہیا کی جا رہی ہے تاکہ طلبا کے تعلیمی معیار کو بلند کیا جاسکے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو عصری تعلیم کے مرکزی دھارے سے جوڑنے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔ آنے والے دنوں میں تعلیمی ضروریات کے پیش نظر نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے تحت مختلف کورسز میں تبدیلیاں کی جائیں گی اور امید ہے کہ یہ فاصلاتی نظام کو زیادہ مؤثر و کارگر بنانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

عزیز طلباء! آداب۔ میں آپ کو 'جدید ہندوستان: قومی تحریک' کورس میں تہہ دل سے خوش آمدید کہتا ہوں۔اس میں آپ ان مختلف عوامل کو سمجھیں گے جنہوں نے انیسویں صدی کے دوران ہندوستان میں قوم پرست شعور کے عروج میں اہم کردار ادا کیا۔ زیر غور عہد میں تمام ہندوستانی قوم پرست 1885 میں قائم ہونے والی ایک ہمہ گیر تنظیم کے تحت یکجا ہوئے جس کا نام انڈین نیشنل کانگریس رکھا گیا۔ کانگریس نے مختلف نظریات کے حامل رہنماؤں اور ان کے پیروکاروں کو جگہ دی اور ہندوستان کی آزادی کے حصول کے لیے مختلف طریقے اپنائے۔ جیسا کہ آپ دیکھیں گے، اس میں اعتدال پسندوں، انتہا پسندوں، انقلابی قوم پرستوں کے ساتھ ساتھ مہاتما گاندھی بھی تھے، جو عدم تشدد پر مکمل یقین رکھتے تھے اور صرف عدم تشدد کے ذریعے ہی آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ کورس آپ کو قوم پرست تحریک کے پورے دورانیے میں ہونے والی مختلف آئینی پیش رفتوں اور جس طرح انہوں نے تھوڑا بہت ہی سہی، ہندوستان کو سیاسی جمہوریت کی راہ پر گامزن کیا، اس کو سمجھنے کے قابل بنائے گا۔ آپ، ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ جیسی فرقہ پرست تنظیموں کے تفرقہ انگیز کردار کو سمجھ کر اس کا تجزیہ کر سکیں گے، جن کی سرگرمیاں دیگر عوامل کے ساتھ مل کر 1947 میں مذہبی بنیادوں پر ہندوستان کی تقسیم اور نتیجتاً کشت وخون کا باعث بنیں اور دیکھیں گے کہ سرحدیں کیسے معصوموں کے خون سے سرخ ہوئیں۔ اس کے علاوہ، آپ ہندوستان کی تحریک آزادی میں آبادی کے نصف حصے یعنی خواتین کی خدمات اور ڈاکٹر باباصاحب بھیم راؤ امبیڈکر کی قیادت میں دلتوں کے ذریعے ادا کیے گئے کردار سے واقف ہو سکیں گے۔ جس زمانے میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک چلائی جا رہی تھی، اس دوران دنیا نے دو خونریز عالمی جنگوں کا مشاہدہ کیا۔ یہ کورس آپ کو، عام طور پر ہندوستانیوں اور خاص طور پر ہندوستان کی تحریک آزادی پر ان دو جنگوں کے اثرات کو سمجھنے کے قابل بنائے گا۔ آخر میں ہی سہی، آپ تحریک آزادی کے غیر معمولی جذبے کی قدر کریں گے اور مجھے امید ہے کہ آپ نہ صرف اسے زندہ رکھیں گے بلکہ تحریک آزادی کے نظریات کو بھی آگے بڑھائیں گے۔

حالیہ دور تک، تاریخ کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے عظیم کارناموں / بداعمالیوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ملکائیں بھی زیادہ تر اپنے عظیم مردوں کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں، تاریخ کو بادشاہوں اور ریاستوں، شہنشاہوں اور سلطنتوں، کے ناموں کی ایک لمبی فہرست سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ان کے ذریعے لڑی جانے والی جنگوں اور ان کی محبوباؤں وغیرہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ مختصراً، تاریخ کا مطلب سیاسی تاریخ تھا اور بدقسمتی سے یہ سوچ عام لوگوں کے ذہنوں پر ابھی بھی حاوی ہے۔ عام لوگ، محنت کش عوام، جو اصل تاریخ ساز تھے، شاید ہی کبھی تاریخ کے ڈرامے میں نظر آئے۔ لیکن، اب تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور اسی لیے تاریخ لکھنے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے۔ عام لوگ بشمول مرد و خواتین، نے تاریخ میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تاریخ کی توجہ حکمرانوں سے رعایا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ تیلگو شاعر سری سری (سری رنگم سری نواس راؤ) نے اپنی نظم میں مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، اب مورخین اس کی کھوج کرنا چاہتے ہیں اور تاریخ کے اندھیرے میں دبی پڑی سب کہانیوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ پوچھنے لگے کہ دریائے نیل کی تہذیب میں عام زندگی کیسی تھی اور تاج محل کی تعمیر میں پتھر ڈھونے والے قلی کون تھے اور سلطنتوں کے باہمی جنگوں میں عام لوگوں کی بہادری کیسی تھی۔ ناوہ ڈولی گنتی کی تھی چڑھ بیٹھا جس پر راجا، اس کے واہک قلی کون تھے؟' یہ بے حد ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ مشہور ادیب جارج اورویل نے تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ: 'جو ماضی کو قابو کرتے ہیں وہی مستقبل کو قابو کرتے ہیں: جو حال کو قابو کرتے ہیں وہی ماضی کو قابو کرتے ہیں۔' ممتاز مورخ پروفیسر کے ایس ایس شیشن نے زور دیا کہ 'تاریخ کا سماج سے وہی رشتہ ہے جو یادداشت کا فرد سے ہے۔' ودیاواچسپتی ایس ایم باشا کے مطابق جو ماضی کو اچھے سے سمجھتے ہیں، وہ حال کو بہترین طریقے سے سمجھ سکتے ہیں؛ اور اسی طرح ماضی کو اچھے ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے حال کا گہرا علم ضروری ہے۔

UGC-DEB کی ہدایات کے مطابق، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سیلف لرننگ مٹیریل لکھنے کے لیے بہترین مصنفین کو راغب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ نہ صرف آپ کی تعلیمی کارکردگی کے لیے کارآمد ثابت ہوگا بلکہ مختلف مسابقتی امتحانات کو اعتماد کے ساتھ دینے کے قابل بھی بنائے گا۔ ہم شعبہ تاریخ، نظامت فاصلاتی تعلیم میں، آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ کورس میں ایک بار پھر خوش آمدید۔ میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

کورس کوآرڈی نیٹر

جدید ہندوستان

قومی تحریک

Modern India

National Movement

اکائی 1۔انیسویں صدی میں قومی شعور کے ابھرنے کے اسباب

(Factors Leading to the Emergence of Nationalist Consciousness in the 19th Century)

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید
1.1 مقاصد
1.2 قوم پرستی
1.3 ہندوستان میں قوم پرستی
1.4 ہندوستانی قوم پرستی کے مختلف نظریات
1.5 ہندوستانی قوم پرستی کے ظہور کے اسباب
1.6 ہندوستان کی معاشی صورتحال
1.7 پریس،اخبارات اور ادب کا کردار
1.8 سماجی مذہبی اصلاحی تحریکات
1.9 انگریزی تعلیم وزبان
1.10 نقل وحمل اور مواصلات کے ذرائع کی ترقی
1.11 نسلی امتیاز کی پالیسی
1.12 سیاسی تنظیموں کا کردار
1.13 اکتسابی نتائج
1.14 کلیدی الفاظ
1.15 نمونہ امتحانی سوالات
1.16 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید (Introduction)

قوم پرستی نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں عصری سیاست کا سب سے متنازعہ موضوع ہے۔اس کی مناسبت کے بارے میں اہل علم کے درمیان بحث موجودہ دور میں بھی جاری ہے۔ پچھلی دو صدیوں کے دوران قوم پرستی ایک زبردست سیاسی نظریہ کے طور پر ابھری ہے جس نے تاریخ سازی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس نے پرجوش وفاداریوں کے ساتھ ساتھ گہری نفرت کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس نے جہاں لوگوں کو متحد کیا ہے وہیں انہیں تقسیم بھی کیا ہے۔ جہاں اس نے لوگوں کو ظالم حکمرانی سے آزادی دلانے میں مدد کی، وہیں یہ تنازعات، تلخیوں اور جنگوں کا سبب بھی رہا ہے۔ سلطنتوں اور قوموں کے زوال کی ایک وجہ بھی رہی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں یورپ میں آسٹریا ہنگری اور روسی سلطنتوں کے ساتھ ساتھ ایشیا اور افریقہ میں برطانوی، فرانسیسی، ڈچ اور پرتگالی سلطنتوں کے ٹوٹنے کی جڑ نیشنلزم تھی۔ ہندوستان اور دیگر سابق کالونیوں میں نوآبادیاتی حکمرانی سے آزادی کی جدوجہد میں ایک قوم پرست جدوجہد بھی تھی۔ قوموں کی سرحدوں کو از سر نو ترتیب دینے کا عمل اب بھی جاری ہے۔ ہم اس سوال پر متفق ہو سکتے ہیں کہ قوم پرستی اب بھی دنیا میں ایک غالب قوت ہے۔ لیکن قوم یا قوم پرستی جیسے الفاظ کی تعریف کے حوالے سے کسی اتفاق رائے تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ آخر قوم کیا ہے؟ یہ کیسے اور کہاں سے ابھرا؟ کیا ہندوستان میں قوم پرستی انگریزوں کا تحفہ ہے یا اس کے عناصر اس سے پہلے بھی ہندوستانی سیاست اور معاشرے میں موجود تھے؟ اس اکائی میں ان تمام سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس کے علاوہ قوم پرستی کے نقطہ نظر کے حوالے سے مختلف مورخین کے درمیان جاری بحث کا مختصر جائزہ لینے کی بھی کوشش کی جائے گی۔ ان کے علاوہ مختلف عوامل پر غور کرنے کی کوشش کی جائے گی جنہوں نے قوم پرستی کے عروج میں اہم کردار ادا کیا۔ جس میں معاشی، ثقافتی، سماجی، انتظامی اور سیاسی نکات پر مبنی پہلوؤں کا تنقیدی مطالعہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس اکائی کی تیاری میں بنیادی طور پر شیکھر بندوپادھیائے، رام لکھن شکلا، بپن چندرا اور ابھے کمار کی تحریروں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- قوم پرستی کی ابتدا اور ارتقاء کو سمجھ سکیں گے۔
- قوم پرستی کے عروج کی مختلف وجوہات کو سمجھ سکیں گے۔
- برطانیہ کے ذریعے ہندوستان کے معاشی استحصال پر قوم پرست رہنماؤں کا ردعمل سمجھ سکیں گے۔
- قومی جذبہ پیدا کرنے میں انگریزی تعلیم، مغربی فلسفہ، بین الاقوامی واقعات اور ان کے اثرات، انگریز حکمرانوں کی جابرانہ اور جارحانہ پالیسی، پریس، سماجی مذہبی اصلاحی تحریکوں وغیرہ کے کردار سے واقف ہو سکیں گے۔

1.2 قوم پرستی (Nationalism)

قوم پرستی بنیادی طور پر ایک جدید یورپی خیال ہے جس کی جڑیں اٹھارویں صدی تک تلاش کی جاسکتی ہیں۔ مورخین کا عام طور پر خیال

ہے کہ قوم پرستی کا آغاز یورپ خصوصاً مغربی یورپ میں ہوا۔ یہاں سے یہ دنیا کے دوسرے حصوں میں پھیل گیا۔ عام طور پر، قوم کا مطلب لوگوں کا ایک گروہ ہے جو 'پیدائش' یا 'جائے پیدائش' سے جڑا ہوا ہے۔ اصل میں اس کا مطلب ایک ہی نوع کے لوگوں سے تعلق رکھتا تھا۔ تاہم، جب اس کی وضاحت کرنے کی بات آتی ہے، تو یہ معروضی اور موضوعی دونوں ہو سکتی ہے۔ اس کی معروضیت کی تعریف ثقافتی طور پر کی گئی ہے—جو ایک ہی زبان بولتے ہیں، ایک ہی مذہب کی پیروی کرتے ہیں، اور مشترکہ تاریخ اور یادوں کے پابند ہیں۔ تاہم، 1983 میں شائع ہوئی اپنی کتاب امیجنڈ کمیونٹیز (*Imagined Communities*) میں بینیڈکٹ اینڈرسن (Benedict Anderson) نے تسلیم کیا ہے کہ اس جیسی خصوصیات والی قوم کو تلاش کرنا ایک مشکل کام ہے۔ لہذا، اینڈرسن نے قوم کو اس کے اراکین کے ذریعے تخلیق کردہ ایک نفسیاتی سیاسی عمل قرار دیا ہے، جسے اس نے تصور کردہ سیاسی برادری (Imagined Political Community) کہا ہے۔ اسے متصور برادری (Imagined Community) اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ ایک چھوٹی ریاست میں بھی لوگ ایک دوسرے کے بارے میں نہیں جانتے لیکن تصور کرتے ہیں کہ وہ ایک قوم کا حصہ ہیں۔ اینڈرسن اس مکمل قوم کی تعمیر میں طباعتی سرمایہ داری (Print Capitalism)، مقامی زبان، مردم شماری، نقشے، عجائب گھر وغیرہ کے کردار کو اہم سمجھتے ہیں۔

قوم پرستی کے ایک اور نظریہ ساز ارنسٹ گیلنر (Ernest Gellner) نے 1983 میں چھپنے والی اپنی کتاب نیشن اینڈ نیشنلزم (*Nations and Nationalism*) میں قوم پرستی کو جدیدیت سے جوڑا ہے۔ وہ پوری قوم پرستی کو ایک جدید نظریے کے طور پر دیکھتے ہیں اور اسے سترہویں اور اٹھارویں صدیوں میں یورپ میں ہونے والی صنعت کاری سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب کہ جاگیردارانہ معاشرے یا 'پری ماڈرن' معاشرے اپنے جاگیردارانہ بندھنوں اور رشتوں کے پابند ہوتے ہیں، جدید صنعتی معاشرے میں کوئی مستقل بندھن نہیں بن سکتا کیونکہ یہ معاشرہ زیادہ متحرک اور مسابقتی ہے۔ اس لیے کچھ اقدار اور نظریات کا ہونا ضروری ہے جو اس معاشرے کی ثقافتی یکسانیت کو برقرار رکھیں، جن کی بنیاد قوم پرستی ہے۔ لہذا، قوم پرستی کی ترقی صنعتی معاشرے کی ضروریات کو پورا کرتی ہے. یہ آنے والے معاشرے میں بھی جاری رہے گا کیونکہ اب پہلے والے معاشرے میں واپس جانا ممکن نہیں رہا۔ گیلنر نے قوم پرستی کو بنیادی طور پر ایک سیاسی نظریہ کے طور پر بیان کیا ہے جو کہتا ہے کہ سیاسی اور قومی اکائیوں کو برابر ہونا چاہیے۔ قوم پرستی کو بطور جذبات، یا ایک تحریک کے طور پر، ان اصولوں کے ذریعے بہترین طریقے سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ قوم پرست جذبات اصولوں کی خلاف ورزی سے پیدا ہونے والے غصے کا احساس یا خوشی کا احساس ہے جو اس کے پورا ہونے پر پیدا ہوتا ہے۔ ایک قوم پرست تحریک ایک ایسی چیز ہے جو اس قسم کے احساس سے متاثر ہوتی ہے۔

انٹونی ڈی اسمتھ (Anthony D. Smith) نے گلینر کے نظریہ سے اختلاف کرتے ہوئے نے 1986 میں شائع شدہ اپنی کتاب دی ایتھنک اوریجنس آف نیشنس (*The Ethnic Origins of Nations*) میں دلیل دی ہے کہ جدید اور ماقبل نسلی برادریوں کے درمیان ایک تسلسل ہے جو بتدریج ترقی کے عمل کا نتیجہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جدید معاشرے میں قوم پرستی کا احساس اچانک پیدا ہوا، بلکہ یہ پرانے معاشرے میں نسلی بندھنوں کی صورت میں پیدا ہوا، جو جدید دور میں سیاسی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لہذا اسمتھ کا خیال ہے

کہ قوم پرستی تاریخی طور پر سرایت کرتی(historically embedded)ہے۔ گلینر کے برعکس ان کا کہنا ہے کہ قوم پرستی جدید معاشرے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ درحقیقت قوم پرستی ایک تاریخی ترقی کا نتیجہ ہے جو کسی معاشرے کے مشترکہ ثقافتی ورثے اور زبان سے نکلی ہے، جو قدیم زمانے میں موجود تھی۔ اسمتھ کا کہنا ہے کہ جب پرانی نسل جدید دور میں سیاسی شکل اختیار کر لیتی ہے تو پھر قوم پرستی جنم لیتی ہے۔

1.3 ہندوستان میں قوم پرستی (Nationalism in India)

ہندوستانی قوم پرستی کے زیادہ تر مورخین کا کہنا ہے کہ ہندوستانی سیاسی قوم جدید معنوں میں برطانوی راج کے قیام سے پہلے موجود نہیں تھی۔ ہندوستان کو بحیثیت قوم کہا جانے والا کوئی شعور تھا یا نہیں یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر قوم پرست رہنما اور تاریخ دان مسلسل بحث کرتے رہے ہیں۔ پرسین جیت دوارا (Prasenjit Duara) نے اس طرح کے خیالات کو روشن خیالی کی تاریخ کا عملی نمونہ (Teleological Model of Enlightenment History)قرار دیتے ہوئے تنقید کی ہے کہ یہ نمونہ ایک متنازع اور متضاد قوم (contested and contingent nation) کو اتحاد کا غلط احساس فراہم کرتا ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے نوآبادیاتی تناظر کی ایک پختہ شکل 19ویں صدی میں اپنے عروج کو پہنچی۔ جیمز مل (James Mill) کی کتاب ہسٹری آف برٹش انڈیا (*History of British India*)سے شروع کرتے ہوئے بہت سے انگریز مورخین میں نوآبادیاتی نظریے کا اثر نظر آتا ہے۔ اور ان میں سے تقریباً سبھی نے ایک قوم کے طور پر ہندوستان کے تصور کو مسترد کر دیا۔ نوآبادیاتی مفکرین نے ہندوستان کے تنوع اور اتحاد کی کمی پر زیادہ زور دیا۔ اس نے اپنی نوآبادیاتی حکمرانی کا جواز پیش کرنے کے لیے ایسا کیا اور ان کی رائے میں نوآبادیاتی حکمرانی نے ہندوستان کو متحد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اسی طرح ونسنٹ اسمتھ(Vincent Smith)نے بھی اپنے خیال اظہار کو پیش کیا اور لکھا کہ ہندوستانیوں میں اتحاد کی بنیادی کمی ہے۔ قدیم ہندوستان میں عظیم سلطنتوں کی حکمرانی کے مختصر ادوار کے علاوہ، ہندوستانی سیاسی ڈھانچہ ہمیشہ 'باہمی مزاحمتی عناصر' پر مشتمل تھا۔ ہندو ریاستوں میں اتحاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ عربوں، ترکوں اور افغانوں کے مضبوط منظم لشکر کا شکار ہو گئے۔ اتحاد مخالف صورت حال کو تبھی ٹھیک کیا جا سکتا ہے جب انگریز جیسی مرکزی حکومت باہر سے مداخلت کرے۔ ہندوستان ایک بار پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اگر آزاد خیال آمریت نے اس ہاتھ کو کھینچ لیا جسے اس نے اپنی آہنی پھندا میں باندھ رکھا ہے۔ جب انیسویں صدی میں قومی تحریک ابھرنا شروع ہوئی اور بیسویں صدی میں پختہ ہوئی تو جان سٹریچی (John Strachey) اور جان سیلی (John Silly) نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کا ایک قوم بننا تقریباً ناممکن ہے کیونکہ اس میں کبھی بھی قوم کی خصوصیات نہیں رہی اور نہ ہی مستقبل میں کبھی ایسا ہو پائے گا۔ ان کے مطابق ہندوستان مختلف اور بعض اوقات متصادم مذاہب، نسلی، لسانی اور علاقائی گروہوں کا مجموعہ ہے جو بحیثیت قوم کبھی متحد نہیں ہو سکتے۔

انیسویں صدی کے آخری سالوں میں ہندوستان میں قوم پرستی کا ظہور ہوا۔ اکثر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ قوم پرستی کے عروج کو صنعت کاری، شہری کاری اور پرنٹ کیپٹلزم نے ہوا دی۔ بینیڈکٹ اینڈرسن کے مطابق، یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایشیا اور افریقہ کی ترقی پذیر دنیا میں قوم پرستی کی ترقی مغرب میں تیار کردہ ماڈل کی طرز پر ہوئی۔ لیکن اس نظریہ پر کئی نظریاتی نقطہ نظر سے تنقید کی گئی ہے۔ پارتھا چٹرجی (Partha Chatterjee) کا استدلال ہے کہ اگر مغرب نے وجہ کا تعین کیا اور ہماری قسمت کا فیصلہ کیا، اور اس نے ہماری طرف سے نوآبادیاتی نظام کے خلاف ہماری مزاحمت کی شکلوں کے بارے میں بھی سوچا، تو پھر ہمارے پاس سوچنے کے لیے کیا فائدہ باقی رہ جائے گا؟ اس لیے ان کا استدلال کہ ہندوستانی سماج نے اقتدار کے لیے سیاسی جدوجہد شروع ہونے سے بہت پہلے اپنی قومیت کو ایک نجی ثقافتی دائرے کے طور پر تصور کرنا شروع کر دیا تھا، حالانکہ اس وقت ریاست نوآبادیات کی تشکیل میں تھی۔ یہیں اس نے اپنی خود مختاری کے بارے میں سوچا اور ایک ایسی ہندوستانی جدیدیت پیدا کی جو جدید تھی لیکن مغربی نہیں۔ دوسری طرف سی اے بیلی (C.A.Bayly) نے بھی اسی سمت اشارہ کرتے ہوئے اپنی مضبوط رائے قائم کی اور ہمیں بتایا کہ ہندوستانی قوم پرستی نے ماقبل نوآبادیاتی دور میں ہی جڑیں پکڑنا شروع کر دی تھیں۔ ان کے مطابق اس کا جنم 'روایتی حب الوطنی' سے ہوا جو 'زمین، زبان، اور فرقے سے وابستگی کی ایک سماجی سطح پر مبنی ایک فعال احساس تھا' اور یہ احساس برصغیر میں مغربیت کا عمل شروع ہونے سے بہت پہلے پروان چڑھا۔ اٹھارویں صدی سے انیسویں صدی کے اوائل تک ہندوستان میں اس طرح کے جذبات علاقائی بنیادوں پر پروان چڑھنے لگے، جب جائے پیدائش کو ملک، وطن یا ناڈو کے طور پر بیان کیا جانے لگا اور آہستہ آہستہ علاقائی زبانوں اور مذہبی وابستگیوں کی ترقی کے ساتھ آہستہ آہستہ شناخت کی تعمیر شروع ہونے لگی تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستانی قوم پرستی برطانوی راج کا تحفہ ہے؟ اگر برطانوی راج نہ ہوتا تو کیا ہندوستان میں قوم پرستی یا قومی تحریکیں نہ اٹھتی؟ بیسویں صدی میں سامراج کے حامیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہندوستان کی قومی تحریک ان کی گود لی ہوئی اولاد ہے، لیکن برطانوی سامراجیوں نے ہندوستان کو اس لیے فتح نہیں کیا کہ وہ ہندوستانیوں میں قوم پرستی کا جذبہ و شعور پیدا کر سکیں اور انہیں اپنے خلاف لڑنا سکھا سکیں۔ برطانوی سامراج کے دیرینہ وکالت کرنے والے ولیم جوائنسن ہکس (Willian Joynson Hicks) نے واضح طور پر کہا تھا کہ 'ہم نے ہندوستان کو ہندوستانیوں کے فائدے کے لیے فتح نہیں کیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ مشنری میٹنگوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم نے ہندوستانیوں کے فائدے کے لیے ہندوستان کو فتح کیا' لیکن یہ ایک کھلا جھوٹ ہے، ہم نے ہندوستان کو تلوار سے فتح کیا ہے اور تلوار کے دم پر ہم اسے اپنے کنٹرول میں رکھیں گے۔ ہم اسے اس لیے کنٹرول میں رکھے ہوئے ہیں کہ وہ برطانوی خام مال نکالنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔

1.4 ہندوستانی قوم پرستی کے مختلف نظریات (Various Approaches of Indian Nationalism)

ہندوستانی قوم پرستی برطانوی راج کے خلاف آزادی کی تحریک کے دوران ترقّی یافتہ ہوئی، جس کے مطالعہ کے لیے بہت سے مکاتب فکر کا اہم کردار رہا ہے۔ ہندوستانی قوم پرستی پر تاریخ نویسی کی بہت سی روایات ہیں جن میں کیمبرج مکتبِ فکر، نیشنلسٹ اسکول، مارکسسٹ اسکول اور سبالٹرن مکتبِ فکر کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ کیمبرج اسکول کے مفکرین کا خیال تھا کہ ہندوستانی قوم پرستی تمام لوگوں کی لڑائی کے بجائے ایک چھوٹی اشرافیہ کی لڑائی ہے۔ اگر قوم پرستی بھی پروان چڑھی ہے تو یہ برطانوی راج کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ برطانوی حکومت تھی جس نے برصغیر

پاک وہند کو اتحاد فراہم کیا۔ ہندوستانی قوم پرست اس پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہندوستان میں قوم پرستی کی ترقی برطانوی راج کے خلاف لوگوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ علاوہ ازیں مارکسی نظریے کے مطابق ہندوستانی تحریک آزادی بورژوا طبقے کی تحریک ہے جو عام لوگوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کام کر رہی تھی۔ مندرجہ بالا تینوں نظریات کے خلاف، سبلٹرن نقطہ نظر ہندوستانی قوم پرستی میں سماج کے پسماندہ لوگوں کے اہم کردار پر زور دیتا ہے۔ یہ چاروں مکاتب فکر ہندوستانی قوم پرستی کے مطالعہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

1.5 ہندوستانی قوم پرستی کے ظہور کے اسباب

(Factors Leading to the Emergence of Nationalism in India)

برطانوی راج اور عالمی اثر انداز ہونے والے رجحانات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی معاشرے میں پیدا ہونے والی اور پروان چڑھنے والی مختلف موضوعی (subjective) اور معروضی (objective) وجوہات کے عمل اور ردِ عمل کی وجہ سے، ہندوستانی قوم پرستی نے برطانوی دور حکومت میں ظہور و پروان پذیر ہوئی۔ لیکن ہم اس بات سے بھی اتفاق نہیں کر سکتے کہ ہندوستان میں ان تمام بنیادی عناصر کی کمی تھی جو قوم پرستی کے فروغ میں معاون ہیں۔ یہ دلیل بھی درست معلوم نہیں ہوتی کہ ہندوستان کی وسعت اور تنوع کی وجہ سے یہاں ایک متحد قوم کے ابھرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ درحقیقت اگر سازگار حالات پیدا ہو جائیں تو ہندوستان ایک قوم بن سکتا تھا اور یہ سازگار حالات ہندوستان میں برطانوی دور حکومت میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں قوم پرستی کی ترقی کا عمل بہت پیچیدہ اور کثیر جہتی ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔ حسب ذیل انہیں اسباب کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

1.6 ہندوستان کی معاشی صورتحال (Economic Conditions of India)

برطانوی حکومت سے قبل ہندوستانی معیشت دیہی تھی اور ملک کی 90 فیصد سے زیادہ آبادی دیہات میں رہتی تھی۔ یہاں زراعت اور دستکاری نمایاں تھی اور دیہات خود کفیل تھے۔ مواصلاتی نظام کی ترقی نہ ہونے کی وجہ سے گاؤں ایک الگ اکائی بن چکے تھے۔ پیشے موروثی تھے۔ یہاں کا اصل پیشہ زراعت تھا لیکن یہ صنعت کے میدان میں بھی ترقی یافتہ تھا۔ ہندوستان کا تیار کردہ سامان پوری دنیا میں مشہور تھا۔ ہندوستانی ریشم اور سوتی کپڑے بہترین معیار کے سمجھے جاتے تھے۔ کپڑوں کے علاوہ سنگ مرمر اور لکڑی کی نقاشی کی ہوئی مصنوعات، سونے اور چاندی کے زیورات، نیل(Indigo)، افیون(Opium) اور مصالحے(Spices) برآمد کیے جاتے تھے۔

سب سے پہلے برطانوی حکمرانوں نے زمین اور زراعت کو نشانہ بنایا۔ برطانوی سرمایہ داری جس نے اپنے ملک میں جاگیردارانہ نظام کو ختم کیا، ہندوستان میں اس کے برعکس راستہ اختیار کیا۔ اس نے ہندوستان پر برطانوی طرز کا جاگیردارانہ نظام مسلط کیا جسے ہم زمینداری، رعیت واری اور محلواری نظام کے نام سے جانتے ہیں۔ اس نئے نظام سے زرعی زمین کو ذاتی ملکیت بنا دیا گیا۔ زمین اب قابل فروخت اثاثہ بن گئی، جسے بازار میں خرید و فروخت کیا جا سکتا تھا۔ دیہات کی آزادی ختم ہو گئی اور دیہی سماج کے تمام کام مرکزی ریاست کے حوالے کر دیے گئے۔ اسی طرح کسانوں پر نقد فصلیں اگانے کے لیے دباؤ ڈالا گیا۔ پہلے دیہات اپنے ارد گرد کی چراگاہوں اور جنگلات کی زمین مفت میں استعمال کرتے

تھے۔ برطانوی حکومت نے جنگلات سے متعلق قانون پاس کر کے دیہی سماج کا یہ حق بھی چھین لیا۔ ایک نئی اہم حقیقت یہ تھی کہ نئے زمینی نظام اور قوانین کی وجہ سے پریشان دیہی شکل کی جگہ ہندوستانی زراعت کی قومی شکل پیدا ہوئی۔ کاشتکاری کے لیے جدید مشینوں کا استعمال، نئی کھاد اور دیگر طریقوں سے کاشتکاری میں تکنیکی جدت اور زراعت سے متعلق تمام تکنیکی اور معاشی مسائل اب پوری قوم کے مسائل تھے۔

صنعتوں اور دستکاریوں کے زوال کی وجہ سے ان میں کام کرنے والے لوگوں نے زراعت کا رخ کیا جس کی وجہ سے زمین پر دباؤ بہت بڑھ گیا۔ لیکن حکومت نے زراعت کے سائنسی طریقہ کار پر کوئی توجہ نہیں دی جس کی وجہ سے کسانوں کی حالت اتنی ابتر ہو گئی کہ 75 فیصد لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں ملتا تھا۔ ناگہانی قحط نے ان کی حالت مزید افسوسناک کر دی۔ ولیم ہنٹر نے لکھا ہے، 'برطانوی حکومت میں کاشتکار سب سے زیادہ پریشان حال ہیں، کیونکہ ان کے آقا (برطانیہ) ان کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔' فشر کے الفاظ میں، 'لاکھوں ہندوستانی آدھے پیٹ پر اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ہندوستانیوں کے استحصال کے بارے میں، ڈی ای واچا (Dinsha E. Wacha) نے لکھا ہے، 'برطانوی دور حکومت میں ہندوستانیوں کی معاشی حالت بدتر ہو گئی تھی۔ چار کروڑ ہندوستانیوں کو دن میں صرف کھانا کھانے پر ہی قناعت کرنی پڑتی تھی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ برطانیہ بھی بھوکے کسانوں سے ٹیکس وصول کرتا تھا اور وہاں اپنا مال بھیج کر منافع کماتا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ انگریزوں کے معاشی استحصال کے خلاف ہندوستانی عوام میں بے اطمینانی تھی۔ وہ اس استحصال سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ چنانچہ ہندوستانیوں نے قومی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ گورمکھ نہال سنگھ کے الفاظ میں 'اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بگڑتی ہوئی معاشی حالت اور حکومت کی ملک دشمن اقتصادی پالیسی کا انگریز مخالف نظریے اور قومی جذبات کو بیدار کرنے میں بڑا کردار تھا۔'

ہندوستانی معیشت پر برطانوی راج کے اثرات انتہائی تباہ کن تھے۔ 1757 عیسوی تک یورپیوں میں ہندوستانی مصنوعات (خاص طور پر سوتی اور ریشم کے کپڑے) کی بہت مانگ تھی، جس کی وجہ سے یورپی تاجر ہندوستان میں چاندی لانے پر مجبور تھے، جب کہ ہندوستان میں مغربی مصنوعات کی مانگ برائے نام تھی۔ لیکن پلاسی کی جنگ نے اس کی شکل میں اہم تبدیلیاں لے آئیں۔ یورپیوں کی آمد سے پہلے بھی ہندوستان پر بہت سی غیر ملکی طاقتوں نے حکومت کی تھی، لیکن انہوں نے صرف سیاسی نوعیت کو ہی تبدیل کیا، انہوں نے ہندوستان کے بنیادی اقتصادی ڈھانچے یا ہندوستان کے دیہی سماجی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی تھی۔ برطانوی حکمرانوں نے بنیادی طور پر شاہی طاقت کا غلط استعمال کیا اور ہندوستان کی قدیم دستکاری اور صنعتوں کو تباہ کیا۔ ہندوستان میں برطانوی پالیسی کا دوہرا مقصد تھا۔ سب سے پہلے، ہندوستان کو برطانوی صنعتی مصنوعات کی کھپت کے لیے ایک قیمتی منڈی بنانا، چاہے اس کے لیئے ہندوستانی صنعتوں کو کچلنے کے لیے مختلف طریقے ہی اختیار کرنا کیوں نہ ہو۔ دوم، ہندوستان کو ایک ایسے زرعی ملک میں تبدیل کرنا جو برطانیہ کی تیزی سے بڑھتی ہوئی صنعتوں کے لیے سستا اور بڑی مقدار میں خام مال پیدا کرتا ہو۔ بی ڈی باسو (B.D. Basu) کے مطابق ہندوستان پر سیاسی اقتدار قائم کرنے کے بعد برطانیہ نے ہندوستانی صنعتوں کی تباہی کے لیے درج ذیل اقدامات کیے تھے۔

- ہندوستان میں آزاد برطانوی تجارت شروع کرنا۔
- برطانیہ میں فروخت کے لیے ہندوستانی مصنوعات پر بھاری ٹیکس عائد کرنا۔

- ہندوستان سے کچا مال برآمد کرنا۔
- چنگی محصول اور نقل و حمل ٹیکس کا نفاذ۔
- ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کو خصوصی سہولیات فراہم کرنا۔
- ہندوستان میں ریلوے کی تعمیر۔
- ہندوستانی کاریگروں کو ان کے روزگار کے راز افشا کرنے پر مجبور کرنا۔
- نمائشوں کا انعقاد وغیرہ۔

اس سب کے نتیجے میں سب سے پہلے ہندوستانی صنعت تباہ ہوئی اور برطانوی سرمایہ داروں کے کارخانوں میں بنے کپڑے ہندوستانی بازار پر حاوی ہوگئے۔ اسی طرح ہندوستان کے ریشمی اور اونی کپڑے، لوہے، شیشہ، چمڑے اور چینی وغیرہ کی صنعتیں تباہ ہوگئیں۔ ہندوستان جو پہلے اپنی صنعتوں سے تیار مال برطانیہ اور دیگر ممالک کو برآمد کرتا تھا، اب برطانوی کارخانوں میں بننے والی مصنوعات کا بازار اور انہیں خام مال فراہم کرنے کا مرکز بن کر رہ گیا۔ برطانوی صنعتی سرمایہ دار نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان میں کارخانے کھلیں۔ وہ ہندوستان میں اپنی فیکٹریوں کے لیے خام مال کی مارکیٹ کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ جب برطانیہ میں صنعتی سرمائے نے مالیاتی سرمائے کی شکل اختیار کی تو مالیاتی سرمایہ داروں نے محض اپنے منافع کے لیے ہندوستان میں کچھ کارخانے کھولے۔ ریلوے کی آمد نے جدید صنعتوں اور جدید مشینری کے داخلے کو مزید تیز کیا۔ انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان میں نیل، چائے اور کافی کی صنعتیں شروع ہوئیں۔ 1850 اور 1885 کے درمیان ہندوستان میں سوتی کپڑے، جوٹ اور کوئلے کی کان کنی کی صنعتیں قائم ہوئیں۔ 1879 عیسوی میں ہندوستان میں 56 سوتی کپڑے کی فیکٹریاں تھیں۔ 1880 تک صنعتی ترقی کافی سست تھی اور بعد ازاں رفتار مزید کم ہوتی گئی۔

ہندوستانی سرمایہ داروں نے اپنا سرمایہ بنیادی طور پر کپڑا ملوں میں لگایا تھا۔ ان ہندوستانی صنعت کاروں کو ہر قدم پر برطانوی سرمایہ داروں اور ان کے برطانوی حکمرانوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ 1860 میں برطانوی حکمرانوں نے ہندوستانی سرمایہ دار طبقے پر آمدنی محصول عائد کیا۔ اس کے بعد مانچسٹر کے کپڑا مل مالکان کے مطالبے پر اب ہندوستان میں ان کے مصنوعات پر عائد درآمدی ڈیوٹی ختم کر دی گئی۔ 1882ء میں شراب اور نمک کے علاوہ ہر چیز پر درآمدی ڈیوٹی ختم کر دی گئی۔ 1894ء میں حکومت ہند کی آمدنی میں اضافہ ضروری ہوگیا، اس لیے درآمدی ڈیوٹی دوبارہ نافذ کی گئی لیکن سوتی کپڑے کو چنگی محصول کے دائرہ سے باہر رکھا گیا۔

اس دوران دولت کی نکاسی (Drain of Wealth) کا نظریہ پیش کر کے برطانوی راج کے اصل کردار کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی۔ لوگ غربت، افلاس اور بے روزگاری سے تنگ آچکے تھے۔ دوسری طرف قحط اور خشک سالی صورتحال کو مزید مشکل بنا رہی تھی۔ ایسی صورت حال نے غیر ملکی ریاست کے تئیں عدم اعتماد اور نفرت کو جنم دیا۔ ایک مقامی ریاست کے لیے لوگوں کی کشش اور امنگیں بڑھ گئیں۔ قوم پرستوں نے مقامی صنعتوں کے زوال اور معاشی استحصال کو ہندوستان کی غربت کی جڑ سمجھا اور لوگوں کی مادی حالت میں مزید بگاڑ کو روکنے کے لیے کئی اقدامات کیے۔ انہوں نے ملک کی معاشی نشاۃ ثانیہ کے لیے ہندوستانی دستکاری کی صنعتوں کے تحفظ، دوبارہ قیام،

دوبارہ روزگار اور جدید کاری کو اپنے پروگرام کا ایک بڑا حصہ بنایا۔ان معاشی تبدیلیوں کی وجہ سے ایسی سماجی قوتوں کا ظہور ہوا جنہوں نے قومی تحریک اور قوم پرستی کے لیے بہت ہی زیادہ متاثر کن ثابت ہوئے۔اس کے نتیجے میں دو نئے سماجی طبقات، بورژوا اور پرولتاریہ، ابھرے۔

1.7 پریس، اخبارات اور ادب کا کردار (Role of the Press, News Papers and, Literature)

پریس نے ہندوستانی قوم پرستی اور قومی تحریک کی سماجی، ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ چھاپہ خانہ کی وجہ سے ہندوستان میں بے شمار اخبارات اور لٹریچر شائع ہوئے اور اس نے لوگوں میں سیاسی بیداری اور قومی جذبہ بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1870ء تک برطانوی ہندوستان میں تقریباً 650 اخبارات شائع ہو چکے تھے۔ سمت سرکار کے مطابق 1885ء میں 299,000 اخبارات شائع ہوئے اور 1905ء تک ان کی تعداد 817,000 تک پہنچ گئی۔ ان میں سے اکثر اخبار مقامی زبان میں شائع ہوتے تھے۔اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان اخبارات ورسائل کی اشاعت مغربی اثرات کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی۔ ان اخباروں میں سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ برطانوی جابرانہ پالیسیوں پر بھی کڑی تنقید کی گئی۔ ہندوستان میں قومی چھاپہ خانہ کی بنیاد راجارام موہن رائے نے رکھی تھی۔اُن کے ذریعے شائع ہونے والا بنگالی اخبار سمباد کومدی (*Sambad Kaumudi*) اور فارسی اخبار مرأۃالاخبار (*Mirat ul Akhbar*) ملک میں سیاسی بیداری کے لیے کام کرنے والے اوّلین اخبار تھے۔ اسی طرح 1859 میں ایشور چندر ودیا ساگر کے ذریعے شائع ہونے والا ہفتہ وار رسالہ سوم پرکاش (*Som Prakash*) بھی قوم پرستانہ نظریہ رکھتا تھا۔ نیل تحریک کے دوران، سوم پرکاش نے کسانوں کے مفادات کی بھرپور حمایت کی، جس کی وجہ سے وہ لٹن کے دور میں منظور شدہ ورناکولر پریس ایکٹ (Vernacular Press Act) کا شکار ہونے والا پہلا اخبار بن گیا۔اس کے بعد دوسرا نمبر ہندو پیٹریاٹ (*Hindoo Patriot*) کو جاتا ہے جس کے ایڈیٹر ہریش چندر مکھرجی (Harish Chandra Mukherjee) تھے جنہیں قومی جذبات کو اجاگر کرنے میں خاص مقام حاصل تھا۔ ایشور چندر ودیا ساگر اور کرسٹو داس پال (Kristo Das Pal) کے نام بھی ہندو پیٹریاٹ کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ کرسٹو داس پال کو ہندوستانی صحافت کا شہزادہ کہا جاتا ہے۔ لندن میں اس اخبار کے نامہ نگار (1874-75 تک) سریندر ناتھ بنرجی تھے۔ ان کے علاوہ دیگر اخبارات نے بھی ہندوستانی قوم پرستی کے ظہور و ترقی میں اہم کردار ادا کیا، خاص طور پر 'انڈین مرر' (دیویندر ناتھ ٹیگور اور منموہن گھوش/1861)، مدراس سے 'دی ہندو' (ویر راگھواچاری/1878)، 'بنگ باسی' (جوگندر ناتھ بوس)، 'بنگالی' (سریندر ناتھ بنرجی/1879) مہاراشٹر میں انگریزی زبان میں 'مراٹھا' (اگرکر/1881)، مراٹھی زبان میں 'کیسری' (تیلک)، 'بامبے کرانیکل' (فیروز شاہ مہتا/1913)، 'مدراس اسٹینڈرڈ' (جسے 1916 میں اینی بیسنٹ نے 'نیو انڈیا' کا نام دیا)، 'کامن ویل' (اینی بیسنٹ/1914)، ہندی کے پہلے اخبار 'اُدنت مارتنڈ' (جگل کشور) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پریس نے علاقائی ادب اور ثقافت کی ترقی میں بھی مدد کی۔ ان کی شکل علاقائی تھی لیکن حقیقت میں وہ قومی تھے۔ صحافیوں کی طرح ادیبوں نے بھی مختلف اصناف کے ذریعے سیاسی شعور پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جدید ہندی کے بانی بھارتیندو ہریش چندر نے اپنے ڈرامے بھارت دردشا (1876) میں برطانوی راج کے تحت ہندوستان کی حالت زار کی تصویر کشی کی۔ حب الوطنی کی جھلک دوسرے

مصنفین جیسے دین بندھو مترا کے ناول 'نیل درپن'، بنکم چندر چٹرجی کے 'آنند مٹھ' اور 'درگیش نندنی' کی تخلیقات میں بھی ملتی ہے۔ دیگر زبانوں کی طرح اردو ادب میں بھی قومی جذبہ 1870 کے بعد آیا۔ اس کا آغاز محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے کیا۔ اسی طرح مراٹھی میں چپلونکر، گجراتی میں نرمد، تمل میں سبرامنیم بھارتی وغیرہ ایسے ادیب تھے جنہوں نے قومی جذبے کے فروغ میں اہم کام کیا۔

1.8 سماجی مذہبی اصلاحی تحریکات (Socio-Religious Reform Movements)

انیسویں صدی کی سماجی- مذہبی اصلاحی تحریکیں، کردار میں مذہبی ہونے کے باوجود، قومی جذبات سے لبریز تھیں۔ ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کے تئیں دوبارہ احترام پیدا کرنے کے ساتھ، اس نے ہندوستانیوں میں ایک نئی ہمت اور اعتماد بھی پیدا کیا، جس کی مدد سے وہ بعد میں غیر ملکیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو سکے۔ ایک طرف ان تحریکوں نے سماج میں رائج برائیوں اور خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف ہندوستان میں قوم پرستی کے جذبے کے لیے زمین تیار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ برہمو سماج، آریہ سماج، پرارتھنا سماج، تھیوسوفیکل سوسائٹی اور رام کرشن مشن وغیرہ نے ان تحریکوں میں بہت ہی نمایاں کردار ادا کیا۔ راجا رام موہن رائے، دیویندر ناتھ ٹیگور، ایشور چندر ودیا ساگر، کیشو چندر سین، راناڈے، دیانند سرسوتی، رام کرشن پرم ہنس، وویکانند وغیرہ نے مختلف درجات میں مذہب کے میدان میں قوم پرستی کے علاوہ جمہوریت کے اصول کو متعارف کرایا۔

ان عظیم شخصیات میں راجا رام موہن رائے کو ہندوستانی قوم پرستی کا علمبردار کہا جا سکتا ہے۔ راجا رام موہن رائے وہ شخصیت تھے جنہوں نے انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانیوں کی ترقی کے لیے تمام اہم تحریکوں کی بنیاد رکھی۔ اسی لیے مختلف دانشوروں نے انہیں 'جدید دور کا موجد'، 'جدید ہندوستان کا بانی'، 'نئے دور کا پیغمبر'، 'قوم پرستی کا باپ' اور 'اصلاحی تحریک کا موجد' کہا ہے۔ اسلام اور مسیحی مذہب کی تعلیمات نے ان پر بڑا اثر ڈالا اور انہوں نے ہندو سماج کے سدھار کا کام شروع کیا۔ 1828ء میں برہمو سماج کی بنیاد ڈالی۔ مورتی پوجا کی مخالفت کی اور خدا کی وحدانیت کی تعلیم دی۔ ستی کی خوفناک و شرمناک رسم ختم کرنے میں بھی بڑا کام کیا۔ اس کے علاوہ عورتوں کے حقوق اور اپنی قوم کی تعلیم و تربیت پر زور دیا۔ شاید راجا رام موہن رائے پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے ہندوستانیوں کے لیے سیاسی حقوق کا مطالبہ کیا۔ اس نے 1823 کے پریس آرڈیننس کے خلاف مہم چلائی اور اسے ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اسی طرح انہوں نے جیوری ایکٹ کی تحریک بھی شروع کی۔ آر سی مجمدار کے مطابق راجا رام موہن رائے پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے اپنے ہم وطنوں کی مشکلات اور شکایات کو برطانوی حکومت کے سامنے پیش کیا اور ہندوستانیوں کو جدید سیاسی تحریک کو منظم کرنے اور چلانے کا راستہ فراہم کیا۔

اسی طرح دیانند سرسوتی نے بھی سماجی-اصلاحی تحریک کے ساتھ ساتھ ہم وطنوں میں قومی شعور بیدار کرنے کا کام کیا۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش (*Satyarth Prakash*) میں دلیری سے لکھا ہے کہ ایک غیر ملکی حکومت چاہے وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، سوراج (حکومت خود اختیاری) سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ ہربلاس شاردا نے لکھا ہے کہ سیاسی آزادی کا حصول سوامی دیانند کا بنیادی مقصد تھا۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے سوراج کا لفظ استعمال کیا اور اپنے ہم وطنوں کو غیر ملکی مال استعمال کرنے کے بجائے سودیشی مصنوعات

استعمال کرنے کی ترغیب دی۔ اینی بیسنٹ کے مطابق سوامی دیانند سرسوتی پہلے شخص تھے جنھوں نے سب سے پہلے یہ نعرہ دیا کہ ہندوستان ہندوستانیوں کا ہے۔ ہندوستان کی پہلی قومی بیداری ابتدا میں مذہبی نوعیت کی تھی اور بعد میں یہ احساس گہرا ہو کر سیکولر نوعیت اختیار کر گیا۔ ان میں سے زیادہ تر مذہبی اصلاحی تحریکوں کا کوئی سیاسی مقصد نہیں تھا، لیکن جو لوگ ان کے زیر اثر آئے ان میں جلد ہی عزت نفس اور حب الوطنی کے جذبات پیدا ہوئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے مصلحین نے ہندوستانی عوام میں قومی بیداری پیدا کی۔ انہوں نے ایسا ماحول پیدا کیا جس کی بدولت ہندوستان آزادی کا ہدف حاصل کر سکا۔ اے آر ڈیسائی نے لکھا ہے کہ یہ تحریکیں بڑی حد تک انفرادی آزادی اور سماجی مساوات کی جدوجہد تھیں اور ان کا آخری ہدف قوم پرستی تھی۔

1.9 انگریزی تعلیم اور زبان (English Education and Literature)

انگریزی تعلیم نے ہندوستانی قوم پرستی کے عروج میں کس حد تک مدد کی ہے؟ اگر ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا وجود نہ ہوتا تو کیا ہندوستانی قوم پرستی کا ظہور ہو سکتا تھا؟ اس موضوع پر کافی بحث رہی ہے۔ برطانیہ حکمرانوں نے اپنے مفادات کے زیر اثر انگریزی تعلیم کا آغاز اور پھیلاؤ کیا تھا لیکن انیسویں صدی میں مغربی نظریات اور انگریزی تعلیم کی ترقی نے ہندوستانیوں کی ذہنی لاشعوری کو ختم کر کے انہیں جدید عقلی، عقلی سیاسی نقطہ نظر کا موقع فراہم کیا۔ ہندوستانی بھی اب آزادی، مساوات اور نمائندگی کی اہمیت کو سمجھنے لگے تھے۔ انگریزی تعلیم کی آمد سے انگریزی ایک مواصلاتی زبان بن گئی جس کے ذریعے وسیع ملک کے لوگ باآسانی ایک دوسرے سے رابطہ قائم کر سکتے تھے۔ اس وقت کسی ایسے عنصر کی ضرورت تھی جس کے ذریعے مختلف صوبوں اور علاقوں کے لوگ، جو مختلف زبانیں بولتے ہوں، جن کے سیاسی مقاصد مشترک نہ ہوں، ایک دوسرے کے قریب آ کر متحد ہو سکیں۔ یہ کام انگریزی زبان سے ممکن ہوئی۔ انگریزی زبان نے ملک بھر کے پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان مختلف موضوعات کے حوالے سے قومی سطح پر خیالات کے تبادلے کے لیے ایک ذریعہ کے طور پر کام کیا۔ ابتدائی قومی کانگرسوں اور کانفرنسوں میں انگریزی زبان نے اظہار خیال کے ذریعے کا کام کیا اور قوم پرستی کے فروغ میں گراں قدر تعاون کیا۔ لیکن انگریزی تعلیم کے حامل افراد ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے جن کی تعداد بہت کم تھی۔ انگریزی کبھی بھی ہندوستان کی عام زبان نہیں بن سکی۔ جس کی وجہ سے پڑھے لکھے طبقے اور عام طبقے کے درمیان زبان کی دیوار کھڑی ہو گئی۔ جب قومی آزادی کی جدوجہد نے زور پکڑا تو قوم پرست رہنماؤں کو احساس ہوا کہ ان سے ان کی زبان میں بات کر کے لوگوں کے دل جیتے جا سکتے ہیں۔ غیر ملکی انگریزی زبان ایسا نہیں کر سکتی۔

ان انگریزی تعلیم یافتہ دانشوروں کے مطابق ہندوستانی سماج کی تمام برائیوں کا ماخذ، بشمول مذہبی توہم پرستی اور سماجی قدامت پرستی، عام لوگوں کی جہالت یا لاعلمی میں موجود ہے۔ اس لیے ان کے پروگرام کا مرکزی نکتہ علم کی ترویج تھا۔ تعلیم سے متعلق ان کے نظریات اہداف اور تفصیلات دونوں لحاظ سے نوآبادیاتی حکمرانوں سے مختلف تھے۔ اس نظام کے نظریاتی مضمرات کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے، جس سے وہ شدید پریشان تھے، ہندوستانی دانشوروں نے مقامی زبانوں کے ذریعے سائنس اور بڑے پیمانے پر تعلیم پر مبنی ایک متبادل وضع کرنے اور نافذ کرنے کی کوشش کی۔ ان کا ایک بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ روایتی اور ادبی تعلیم زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ رام موہن رائے کا یہ اعتراض کہ 'نوجوانوں کے ذہنوں پر گرامر کی باریکیوں اور روحانی خصوصیات کو مسلط کرنا نقصاندہ ہے جو سماج اور فرد کے لیے

بالکل فائدہ مند نہیں' اس وقت کی تعلیمات کی خامیوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ قومی تعلیمی منصوبے کے پہلے ہندوستانی حامی اکشے کمار دت نے روایتی نظام تعلیم کو مکمل طور پر مسترد کر دیا۔ ایشور چند ودیا ساگر جیسے دانشوروں نے ان لوگوں کا مذاق اڑایا جو یہ مانتے تھے کہ تمام سائنسی حقائق ہندوستانی مذہبی صحیفوں میں موجود ہیں۔ سر سید احمد خان کے لیے مسلم تعلیم روایتی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔

لیکن برطانوی حکومت نے انگریزی تعلیم کا دائرہ صرف اپنے فائدے تک ہی محدود کر رکھا تھا۔ برطانوی حکومت کو نہ تو سائنسی علم کے عام پھیلاؤ میں دلچسپی تھی اور نہ ہی ہندوستانیوں کے ذریعے سائنس کے مطالعہ کے اعلیٰ حصول میں۔ اسی لیے بہت سے سماجی مصلحین اور دانشوروں نے حکومت کی کوتاہیوں کو بے نقاب کرا نہیں اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس لیے خود ہندوستانی دانشوروں نے اس کام میں دلچسپی ظاہر کی اور اس کام کی حوصلہ افزائی کے لیے کئی ادارے کھولے گئے۔ مثال کے طور پر کلکتہ میں ترجمہ کرنے والی یورپی سائنسز کی سوسائٹی (1825) اور 1863ء میں غازی پور میں سر سید احمد خان کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی وغیرہ نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ انہیں یہاں تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ تاہم، انگریزی تعلیم اور زبان نے قومی تحریک کے آغاز میں خاص کردار ادا کیا۔ انگریزی زبان نے ہمیں مغربی ثقافت اور تہذیب سے متعارف کرایا۔ بہت سے ہندوستانی آزادی، مساوات، بھائی چارے، جمہوریت اور قوم پرستی کے مغربی نظریات سے متاثر ہوئے۔ جوسیپ مازنی (Giuseppe Mazzini)، اوٹو فون بسمارک (Otto Von Bismarck) اور جوسیپ گاریبالڈی (Giuseppe Garibaldi) وغیرہ کی سوانح عمری ان کے لیے مشعل راہ بنی۔ انگریزی کے مطالعہ نے جدید ہندوستان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا اور مختلف سماجی و سیاسی تحریکوں کی راہ ہموار کی۔ انگریزی میں بہت سے لٹریچر کے مطالعہ اور لاتعداد انگریزی زبان میں ترجمہ نے ہندوستانیوں کے علم میں اضافہ کیا اور انہیں ایک عالمی تناظر فراہم کیا۔ ہندوستانیوں کے پڑھے لکھے طبقے نے دنیا کے جدید سائنسی اور سیاسی حقوق علم کو سمجھا اور کئی ہندوستانی متون کا ترجمہ بھی کیا۔ ایسے کئی انگریز افسران اور مفکرین آئے جنہوں نے ہندوستانی ثقافت اور قدیم ادب کی فضیلت کو اپنے مطالعے کا مرکز بنایا۔ اس کے نتیجے میں، انہوں نے قدیم ہندوستانی ادب کا انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا اور انہیں ہندوستانیوں اور دوسرے لوگوں کو متعارف کرایا۔ ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1784 میں ہندوستان میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارے کے ذریعے بہت سے ہندوستانی متون کا ترجمہ کیا گیا، جن میں ابھیگیان شاکنتلم، بھگوت گیتا، منو اسمرتی اور ہتوپدیش جیسی کئی تحریریں شامل ہیں۔

1.10 نقل و حمل اور مواصلات کے ذرائع کی ترقی

(Development of the Means of Transport and Communication)

نقل و حمل اور مواصلات کے ذرائع جیسے ریل، ٹیلی گراف، ڈاک وغیرہ کی ترقی نے پورے ہندوستان کو شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک اتحاد کے دھاگے میں باندھ دیا۔ درحقیقت تیز رفتار ذرائع آمد ورفت کی منصوبہ بندی انتظامی سہولیات، فوجی دفاع، اقتصادی تجارت اور تجارتی استحصال کو مدنظر رکھ کر کی گئی تھی۔ مستقل سڑکوں کا جال بچھایا گیا جس کے ذریعے صوبے ایک دوسرے سے اور دیہی علاقوں کو بڑے شہروں سے جوڑا گیا۔ اگرچہ یہ ذرائع ہندوستان میں برطانوی راج کو مضبوط اور محفوظ بنانے کا ذریعہ بنے تو ساتھ ہی انہوں نے اس

حکمرانی کے خلاف ہندوستانی عوام کی سیاسی تحریک کو منظم کرنے میں بھی کافی مددگار ثابت ہوئی۔ جدید ریلوے، بس، ڈاک اور ٹیلی گراف کے بغیر کانگریس، دیگر ادارے اور تنظیمیں قومی سطح پر اپنا کام نہیں کر پاتی۔ اس نے ثقافتی قوتوں کو فروغ دے کر پورے ہندوستان میں جذباتی اتحاد کو مضبوط کیا۔ اسی لیے 1865ء میں ایڈیسن نے کہا تھا کہ ریلوے ہندوستان کے لیے وہ کام کرے گی جو عظیم خاندانوں نے پہلے کبھی نہیں کیا۔

1.11 نسلی امتیاز کی پالیسی (Racial Discrimination)

نسلی امتیاز کی برطانوی پالیسی نے جلتی ہوئی آگ میں گھی کا کام کیا اور قومی تحریک کی رفتار میں مزید اضافہ کیا۔ انگریز خود کو سب سے برتر سمجھتے تھے۔ انگریزوں سے پہلے بھی بہت سے غیر ملکی ہندوستان آئے اور یہاں آباد ہوئے اور رفتہ رفتہ ہندوستانی معاشرے کا اٹوٹ حصہ بن گئے لیکن انگریز غیر ملکی ہی بنے رہے۔ مختلف سیاسی حالات، رنگ، زبان، مذہب اور سماجی رسم و رواج کی وجہ سے انگریزوں نے کبھی بھی ہندوستانی عوام کی زندگی اور احساسات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہندوستانیوں کو حقارت اور نفرت بھری نظر دیکھتے تھے۔ ہندوستانیوں کو سیاہ فام یا مقامی کہا جاتا تھا۔ تقرری ہونے والوں پر کئی قسم کی پابندیاں لگائی جاتی تھی، وہ ریلوے کی فرسٹ کلاس میں یا اس ڈبے میں سفر نہیں کر سکتے تھے جس میں انگریز سفر کیا کرتے تھے، وہ یورپی کلبوں میں نہیں جا سکتے تھے، انگریزوں کے مقدمات کی سماعت ہندوستانی جج نہیں کر سکتے تھے، انگریزوں وغیرہ کی بنیاد پر اُن کے ساتھ امتیازی سلوک کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔

عام ہندوستانیوں کے لیے انگریز ناپاک، بدعتی اور لالچی تھے۔ ہندوستانیوں کے چہروں پر ان کے جذبات اور نفرت صاف دکھائی دیتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ احساسات پریس اور دیگر عوامی مقامات پر ٹھوس شکل اختیار کرنے لگے۔ شاید مشترکہ محبت کے احساس کی بجائے مشترکہ نفرت کے احساس نے انہیں ایک قوم کے طور پر متحد ہونے کے لیے زیادہ موثر انداز میں تحریک دی۔ ہندوستانیوں نے اس کے رویے کے خلاف واضح چیلنج دیے۔ 1866 میں کیشو چندر سین نے ایشیائیوں کو کمتر سمجھنے والوں کو یاد دلایا کہ یسوع مسیح خود ایک ایشیائی تھے۔ 1867 میں دادا بھائی نوروجی نے ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن آف لندن سے مطالبہ کیا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی اور تذلیل بند کی جائے۔ برطانوی حکومت کو انصاف کے معاملے میں بھی انگریزوں کا ساتھ دیتے دیکھ کر ہندوستانیوں کا غصہ مزید بڑھ گیا۔ سریندر ناتھ بنرجی کا کیس اس کی ایک مثال تھا، ان واقعات سے ہندوستانیوں نے صاف دیکھا کہ انہیں اپنی غلامی جیسی حالت کو بدلنے کے لیے برطانوی حکمرانوں سے لڑنا پڑے گا۔

اس نسلی امتیاز کی پالیسی کے حوالے سے ایک تنازعہ البرٹ بل (Ilbert Bill) کی شکل میں سامنے آیا۔ یہ بل 9 فروری 1833 میں وائسرائے رپن (Ripon) کی کونسل میں رکنِ قانون سر سی پی البرٹ (Sir C. P. Ilbert) نے پیش کیا تھا۔ اس بل کے ذریعے نسلی امتیاز کو روکنے کی ایک ناکام کوشش کی گئی۔ اس بل کے ذریعے ہندوستانیوں اور یورپیوں کو انصاف کے میدان میں برابری کی سطح پر لانے کی کوشش کی گئی۔ اس میں ہندوستانی مجسٹریٹ کو ہندوستان میں رہنے والے یورپیوں کے مقدمات پر غور کرنے کا حق دینے کا انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن پوری یورپی برادری اور یورپی ڈیفنس ایسوسی ایشن کی مشترکہ سخت مخالفت کی وجہ سے یہ بل منظور نہ ہو سکا۔ جس کی وجہ سے دونوں برادریوں (ہندوستانیوں اور یورپیوں) کے تعلقات بہت تلخ ہو گئے۔ تمام اعلیٰ انتظامی عہدوں پر برطانیہ کمیونیٹی کے لوگ ہی فائز

تھے۔ ہندوستانی عوام کا پڑھا لکھا طبقہ جو خاص طور سے اس پر ناراض تھا۔ اور اس واقعے نے ہندوستانیوں کو یہ احساس دلایا کہ انگریزوں جیسی منظم تحریک کتنی موثر ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا جس کی قیادت میں ہندوستان نے آزادی حاصل کی۔ اس لیے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس بل کے خلاف کیے گئے یورپیوں کی تحریک نے جتنا ہندوستانی قومی نظریئے کو فروغ دیا شاید یہ بل منظور ہو کر وہ کام نہ کر پاتی۔

1.12 سیاسی تنظیموں کا کردار (Role of Political Organisations)

سماجی-مذہبی تنظیموں کی طرح انیسویں صدی میں کچھ سیاسی تنظیمیں بھی قیام پذیر ہوئی جنہوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے منظم کوششیں کیں۔ ہندوستانیوں کے لیے یہ ایک نیا احساس تھا کہ لوگ ایک سیاسی تنظیم بھی بنا سکتے ہیں۔ کلکتہ میں زمینداروں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے 1838ء میں لینڈ ہولڈرز سوسائٹی (Landholders Society) کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی۔ 1851ء میں انہیں زمینداروں نے سیاسی مقاصد کے لیے برٹش انڈین ایسوسی ایشن (British Indian Association) کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اسی طرح مدراس میں مدراس نیٹو ایسوسی ایشن (Madras Native Association, 1852) اور مدراس مہاجن سبھا (Madras Mahajan Sabha, 1884) ، مہاراشٹر میں پونا سارو جنک سبھا (Poona Sarvajanik Sabha, 1870) اور بمبئی پریزیڈنسی ایسوسی ایشن (Bombay Presidency Association, 1885) وغیرہ کانگریس سے پہلے علاقائی سیاسی تنظیمیں تھیں جنہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں سیاسی بیداری میں فعال کردار ادا کیا۔

اس دوران کلکتہ میں ایک طاقتور سیاسی تنظیم نے جنم لیا جسے سریندر ناتھ بنرجی نے انڈین ایسوسی ایشن (Indian Association) کے نام سے 1876ء میں قائم کیا تھا۔ انڈین ایسوسی ایشن کے قائدین نے اپنی تنظیم کو ایک آل انڈیا شکل دینے کی پوری کوشش کی لیکن دیگر وجوہات کی بنا پر کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ بنیادی طور پر صرف بنگال تک ہی محدود رہی۔ لیکن 1833 میں انڈین ایسوسی ایشن کی کوششوں سے انڈین نیشنل کانفرنس (Indian National Conference) کا ظہور ہوا۔ اس کانفرنس کی پہلی کانفرنس 1883ء میں منعقد ہوئی جس میں ہندوستان کے مختلف خطوں سے لوگوں نے شرکت کی۔ اور اس کے مطالبات پہلی بار ہندوستانی سطح کے تھے۔ اس کے ذریعے بہت سے ایسے مطالبات کیے گئے جو تمام ہندوستانی نوعیت کے تھے۔ مثال کے طور پر سول سروس کے امتحانات ہندوستان میں بھی کرائے جائیں، آرمز ایکٹ کو منسوخ کیا جائے، قومی خزانے کو جمع کرنے کو اہمیت دی جائے، البرٹ بل کی ناکامی پر افسوس کا اظہار کیا، اور ہندوستان میں نمائندہ قانون ساز اسمبلیوں کا مطالبہ کیا جائے وغیرہ شامل تھے۔ مکمل طور پر کامیاب نہ ہونے کے باوجود اس کانفرنس کی اپنی اہمیت ہے۔ تمام قومی رہنماؤں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے اور ایک مشترکہ آل انڈیا قومی تنظیم کے قیام کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔ مذکورہ تنظیمیں خط اور میمورنڈم کے ذریعے حکومت پر سیاسی حقوق اور سہولیات کے لیے دباؤ ڈالنے کا کام کیا۔ اس سے ہندوستانیوں میں امید پیدا ہوئی کہ حکومتی مظالم کا مقابلہ متحد ہو کر کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا وجوہات کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب تھے جنہوں نے ہندوستانی قوم پرستی کے عروج میں اہم کردار ادا کیے۔ ان میں برطانوی حکمرانوں خصوصاً لارڈ لٹن کی جابرانہ اور جارحانہ پالیسیوں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کی افغان پالیسی، قحط اور وبا کے درمیان دہلی دربار کا انعقاد (1877)، جس میں ملکہ وکٹوریہ کو ہندوستان کی مہارانی قرار دینا اور ہندوستان کی عوامی تحریک کو ختم کرنے کے لیے ورناکیولر پریس ایکٹ (The Vernacular Press Act)، سول سروس کے امتحان کی عمر کو 21 سال سے کم کرکے 19 سال کرنا اور اسلحہ۔ ایکٹ (The Arms Act, 1878) جیسی دیگر جابرانہ اور جارحانہ پالیسیوں کی تشکیل ہندوستانیوں کے لیے عدم اطمینان کا باعث بنی۔ سریندر ناتھ بنرجی کے مطابق لارڈ لٹن کی رجعتی انتظامیہ نے عوام کو اپنے بے حس رویے سے بیدار کیا اور لوگوں کو زندگی میں آگے بڑھنے کی ترغیب دی۔ بین الاقوامی واقعات نے بھی ہندوستانی قوم پرستی اور قومی تحریک کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ امریکی اعلانِ آزادی (4 جولائی 1776) اور فرانسیسی انقلاب (1789) نے انیسویں صدی کی ہندوستانی جمہوری اور قومی تحریکوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اٹلی، اسپین اور یونان کے کامیاب انقلابات بھی ہندوستانی قوم پرستی کے عروج میں بہت مددگار ثابت ہوئے۔ راجہ رام موہن رائے نے اسپین میں بورژوا جمہوری انقلاب کی کامیابی کا جشن منانے کے لیے کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں ایک پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ Mazzini کی ینگ اٹلی ('Young Italy') اور Garibaldi کی 'Carbonari' انقلابی تنظیم کی مثال پر، 1870 کے بعد اس وقت کے بنگال میں کئی خفیہ تنظیمیں قائم ہوئیں۔ اسی طرح 1896ء میں ابیسینیا کے ہاتھوں اٹلی کی شکست اور 1905ء میں جاپان کے ہاتھوں روس کی شکست نے قوم پرستوں کے حوصلوں کو بے پناہ فروغ دیا۔ ان کے علاوہ تاریخی تحقیقات، متوسط طبقے کے دانشوروں کا عروج اور عیسائی مشنریوں کی ترویج اور برطانوی راج کے ذریعے انتظامی اتحاد کا قیام وغیرہ ایسی وجوہات تھیں جنہوں نے ہندوستانی قوم پرستی کے عروج میں اہم کردار ادا کیا۔

1.13 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں، ہندوستانی قوم پرستی کے علاوہ، قوم پرستی کے آغاز سے لے کر اس کی نشو و نما تک کا مختصر جائزہ لینے کی کوشش کی گئی۔ ہندوستانی قوم پرستی کا نوآبادیاتی نظریہ اسے ایک قوم کے طور پر کبھی بیان نہیں کرتا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کبھی ایک قوم نہیں رہا تھا اور مستقبل میں اس کے ایک بننے کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن قوم پرست مورخین نے اس خیال کو غلط ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی اور آج ہم بحیثیت قوم اپنی شناخت بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ اور ان نوآبادیاتی نظریات کو جھوٹا ثابت کرنے میں کامیاب بھی ہوئے. اب پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستانی قوم پرستی برطانوی راج کا تحفہ ہے؟ ہندوستان میں قوم پرستی کا احساس اس لیے پیدا نہیں ہوا کہ برطانوی حکمران ایسا چاہتے تھے، لیکن قوم پرستی کا عروج اور ترقی اس لیے ہوئی کہ برطانوی سامراج ہندوستان کو بری طرح سے لوٹ رہے تھے اور وہ ہندوستان کی غربت، بھوک اور بے روزگاری کی بنیادی وجہ تھے۔ ایک ایسے وقت میں جب مغربی ممالک ترقی کر رہے تھے اور خوشحال ہو رہے تھے، ہندوستان کو جدید نوآبادیاتی نظام کے تحت رہنا پڑا اور اُن کے ذریعے ہندوستان کی ترقی روک دی گئی۔ وہی سماجی، سیاسی اور معاشی عمل جس نے برطانیہ میں صنعتی، سماجی اور ثقافتی ترقی کی راہ ہموار کی، ہندوستان میں پسماندگی برقرار رہی۔ ہندوستان کے ہر خطہ میں جمود چھا گیا اور غربت بڑھنے لگی۔ جب ہندوستانیوں پر یہ حقیقت واضح ہوئی تو وہ سمجھنے لگے کہ انگریزوں کے خلاف لڑ کر ہی ہندوستان کو آگے بڑھانا ممکن ہے۔ اس

طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی قوم پرستی اور قومی تحریک سماجی تضادات، سامراج اور اس کے استحصالی نظام کی حالت سے اور اس استحصال کی حالت میں ہندوستانی سماج کے اندر پیدا ہونے والی سماجی اور معاشی قوتوں سے پیدا ہوئی ہے۔

1.14 کلیدی الفاظ (Keywords)

سوراجیہ	:	حکومت خود اختیاری
بنگالی	:	سریندر ناتھ بنرجی کے ذریعے شائع ہفتہ وار اخبار
مرات الاخبار	:	راجہ رام موہن رائے کے ذریعے شائع ہونے والا اخبار جو فارسی زبان میں شائع ہوتا تھا
لینڈ ہولڈرز سوسائٹی	:	ہندوستان کی پہلی سیاسی تنظیم جو 1837-38 میں بنگال میں دوار کا ناتھ ٹیگور کے ذریعے قائم ہوئی تھی۔
انڈین ایسوسی ایشن	:	انڈین نیشنل کانگریس سے قبل ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی تنظیم، اس تنظیم کو سریندر ناتھ بنرجی نے 1876 میں قائم کیا تھا۔

1.15 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1.15.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مشہور کتاب *Emergence of Indian Nationalism* کے مصنف ہیں؟
2. سب سے پہلے سوراجیہ کا ذکر کس نے کیا؟
3. امرت بازار پتریکا کے ایڈیٹر کون تھے؟
4. بال گنگادھر تلک کے کسی دو اخباروں کا ذکر کریں۔
5. اسلحہ ایکٹ (Arms Act) کب پاس ہوا؟
6. 'پوناسار وجنک سبھا' کی بنیاد کس نے رکھی؟
7. 'کامن ویل' اخبار کا تعلق کس سے ہے؟
8. ہندوستانی صنعتوں کو تباہ کرنے کے لیے برطانوی راج کے دو اقدامات کا ذکر کریں۔
9. قوم پرستی کا لفظ کس صدی میں ظہور ہوا؟
10. 'Imagined Community' کا تصور کس نے پیش کیا۔

1.15.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں قوم پرستی کی ارتقاء پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

2. ہندوستانی قوم پرستی کے عروج میں سیاسی اداروں کے کردار پر روشنی ڈالیں۔

3. قوم پرستی کے عروج میں سماجی۔مذہبی اصلاحی تحریک کے کردار پر ایک نوٹ لکھیں۔

4. ہندوستانی قوم پرستی کے عروج میں پریس کے کردار کا جائزہ لیں۔

5. برطانوی حکمرانوں کی نسلی امتیاز کی پالیسی نے قوم پرستی کے عروج میں کس طرح اہم کردار ادا کیا؟ ایک مضمون لکھیے۔

1.15.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں قوم پرستی کا عروج برطانوی راج کا تحفہ ہے۔آپ اس رائے سے کس حد تک متفق ہیں؟

2. ہندوستان میں قوم پرستی کے عروج کی معاشی وجوہات پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کریں۔

3. انگریزی تعلیم،اخبارات،رسائل اور ادب نے قوم پرستی کے عروج میں ایک نمایاں کردار ادا کیا؟ تجزیہ کریں۔

1.16 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Anderson, Benedict, *Imagined Communities: Reflections on the Origins and Spread of Nationalism*, Verso, London, 2006 (First Edition 1983).
2. Azad, Rohit, Janaki Nair et al., eds., *What the Nation Really Needs to Know*: *The JNU Nationalism Lectures*, Harper Collins, Noida, 2016.
3. Bandyopadhyay, Sekhar (ed), *Nationalist Movement in India: A Reader*, Oxford University Press, New Delhi, 2009.
4. Banerjea, Surendranath, *A Nation in Making*: *Being the Reminiscences of Fifty Years of Public Life*, Oxford University Press, New Delhi, 1925.
5. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin Books, India, 1989.
6. Chatterjee, Partha, *The Nation and Its Fragments: Colonial and Postcolonial Histories*, Princeton University Press, Princeton, 1993.
7. Habib, Irfan S. ed., *Indian Nationalism*: *The Essential Writings*, Aleph, New Delhi, 2017.
8. Heimsath, Charles Herman, *Indian Nationalism and Hindu Social Reform*, Princeton University Press, Princeton, 1964.
9. Hobsbawm, Eric J., *On Nationalism*, edited and introduced by Donald Sassoon, Little Brown, Great Britain, 2021.
10. Hobsbawm, Eric J., *Nations and Nationalism since 1780*: *Programme*, *Myth*, *Reality*, Cambridge University Press, Delhi, 2013 (first published 1990).
11. Nandy, Ashish, *The Illegitimacy of Nationalism: Rabindranath Tagore and the Politics of Self*, Oxford University Press, New Delhi, 1994.
12. Rai, Lajpat, *Young India*: *An Interpretation and a History of the Nationalist Movement from Within*, K.L. Tuteja ed., National Book Trust, India, 2021 (first pub. in 1916).
13. Smith, Anthony D., *Myths and Memories of the Nation*, Oxford University Press, Oxford, 1999.
14. Sarkar, Sumit, *Jadeed Hindustan* (Urdu), NCPUL, New Delhi, 2003.
15. Tagore, Rabindranath, *Nationalism*, *with an Introduction by Ramachandra Guha*, Penguin, New Delhi, 2009.
16. Thakurta, Tapati Guha, *The Making of a new* '*Indian*' *Art: Artists, Aesthetics and Nationalism in Bengal*, *c. 1850–1920*, Cambridge University Press, Cambridge, 1992.
17. Thapar, Romila, A.G. Noorani, and Sadanand Menon, *On Nationalism*, Aleph, New Delhi, 2016.

اکائی 2۔ پس منظر اور انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

(Background to, and the Establishment of the Indian National Congress)

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 سیفٹی والو نظریہ

2.2.1 سات جلدوں والی رپورٹ

2.2.2 رپورٹ کی تفتیش

2.2.3 سیفٹی والو نظریہ کے حق میں دوسری دلیل

2.2.4 دوسری دلیل کا جواب

2.3 کانگریس کے قیام کا پس منظر

2.4 پہلا اجلاس

2.4.1 صدارتی خطاب

2.4.2 شرکاء

2.4.3 قراردادیں اور کاروائی

2.5 ابتدائی کانگریسی قیادت کا ایک تنقیدی تجزیہ

2.6 اکتسابی نتائج

2.7 کلیدی الفاظ

2.8 نمونہ امتحانی سوالات

2.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید (Introduction)

انڈین نیشنل کانگریس (INC) ہندوستان کی سب سے قدیم اور نمایاں سیاسی جماعتوں میں سے ایک ہے۔ اس نے برطانوی راج سے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں ابھرتی ہوئی قوم پرستی کی لہر سے اسے استحکام حاصل ہوا اور اس نے عوام کو سیاسی اعتبار سے متحد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد 1885 میں اس دور میں رکھی گئی تھی جب ہندوستانی معاشرہ برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی کے تحت مختلف سماجی، اقتصادی اور سیاسی تبدیلیوں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ برطانوی حکومت کے خلاف ہندوستانی شکایات اور مطالبات کو بیان کرنے کے لیے ایک سیاسی پلیٹ فارم کے قیام کے خیال نے 1880 کی دہائی میں زور پکڑا۔ اے۔ او۔ ہیوم نامی ایک ریٹائرڈ برطانوی سرکاری افسر نے ایک سیاسی تنظیم بنانے کے لیے ہندوستانی دانشوروں اور رہنماؤں کو اکٹھا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے ایک کل ہند سیاسی پارٹی بنانے کا خیال پیش کیا جو ہندوستانی مفادات کی نمائندگی کر سکے۔ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنا پہلا اجلاس 28 سے 31 دسمبر 1885 تک بمبئی میں منعقد کیا۔ اس میں ہندوستان بھر سے تقریباً 72 مندوبین نے شرکت کی، جو مختلف علاقوں اور برادریوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ دادا بھائی نارو جی، دنشا واچا اور ویومیش چندر بنرجی جیسے قابل ذکر رہنما اس افتتاحی اجلاس میں شامل تھے۔ ابتدائی سالوں میں، انڈین نیشنل کانگریس کا مقصد تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے لیے برطانوی حکومت کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم کے طور پر کام کرنا تھا اور ایسی انتظامی اصلاحات کی تلاش تھی جو ہندوستانی شکایات کا ازالہ کر سکیں۔ ابتدائی طور پر، یہ ایک عوامی تحریک نہیں تھی بلکہ ابھرتے ہوئے ہندوستانی متوسط طبقے کے مفادات کی نمائندگی کرتی تھی۔ آئندہ سالوں کے دوران، انڈین نیشنل کانگریس ایک عوامی تحریک میں تبدیل ہوئی، جس میں متنوع پس منظر اور خطوں کے لوگوں کو شامل کیا گیا۔ یہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے لیے بنیادی تنظیم بن گئی، جس نے برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی کے خلاف قومی تحریک کی قیادت کی۔ انڈین نیشنل کانگریس نے ایم۔ کے۔ گاندھی، جواہر لعل نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور بہت سے دوسرے لوگوں کو ابھرنے اور آزادی کی جدوجہد کی قیادت کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔ اس تنظیم نے مختلف طریقوں سے ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں عدم تعاون، سول نافرمانی اور دیگر عوامی تحریکوں کے ذریعے اہم کردار نبھایا۔ اس نے ملک گیر مہمات، بائیکاٹ اور مظاہروں کا اہتمام کیا جس کے نتیجے میں ہندوستان نے 15 اگست 1947 کو برطانوی حکومت سے آزادی حاصل کی۔ اس اکائی میں ہم انڈین نیشنل کانگریس کے پس منظر اور اس کی قیادت اور ابتدائی مسائل کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں گے۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- کانگریس کے قیام سے متعلق بحث اور اس کے قیام کے پس منظر سے واقف ہو سکیں گے۔
- سات جلدوں والی رپورٹ کے بارے میں جان سکیں گے۔

- کانگریس کے پہلے اجلاس، صدارتی خطاب اور لائحہ عمل سے واقف ہو سکیں گے۔
- ابتدائی کانگریسی قیادت کا تنقیدی جائزہ لے سکیں گے۔

2.2 سیفٹی والو نظریہ (The Safety Valve Theory)

ہندوستانی قومی تحریک کی ترجمان انڈین نیشنل کانگریس کا قیام 1885 میں ہوا تھا۔ سیاسی طور پر متحرک اور متوسط بورژوا طبقے سے تعلق رکھنے والے 72 افراد نے گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی میں اس کی بنیاد رکھی تھی۔ اے۔او۔ ہیوم (A.O. Hume) نامی ایک ریٹائرڈ انگریز آئی۔ سی۔ ایس افسر نے اس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان 72 لوگوں نے کانگریس کی بنیاد کیوں رکھی اور یہی وقت اس کے لیے کیوں متعین کیا؟ اس سوال کے ساتھ سیفٹی والو کی ایک اہم داستان لمبے عرصے سے چلی آ رہی ہے۔ سیفٹی والو کی یہ داستان گذشتہ کئی پشتوں سے طالب علموں اور سیاستداں لوگوں کی گھٹی میں پلائی جا رہی ہے لیکن اگر ہم تاریخ کی سچائی کو کھنگالیں، تو پتہ چلتا ہے کہ اس فرضی داستان میں اتنا دم نہیں ہے جتنا عام طور سے مانا جاتا ہے۔

وہ قصہ اس طرح ہے کہ اے۔او۔ ہیوم اور ان کے ساتھیوں نے انگریزی سرکار کے اشارے پر انڈین نیشنل کانگریس کو قائم کیا تھا۔ وہ کوئی دوسرا شخص نہیں تھا بلکہ اس وقت کے وائسرائے لارڈ ڈفرن (Lord Dufferin) ہی تھے جن کے اشارے اور مشورے پر اس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں میں اس وقت پنپتی اور بڑھتی ہوئی بے اطمینانی کے بخارات کو بغیر کسی خطرہ کے باہر نکلنے کے لیے ہلکا، پرامن، بے ضرر، اور آئینی اخراج کا سیفٹی والو فراہم کیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ان کی بے اطمینانی ان کو متشدد انقلاب برپا کرنے کے لیے اکسا سکتی تھی۔ اس طرح کانگریس کو قائم کر کے یعنی سیفٹی والو فراہم کر کے ہندستانی عوام کی جوش مارتی ہوئی انقلابی توانائی کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اس قصہ کی اصل جڑ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں تشدد آمیز انقلاب دستک دے رہا تھا جو کانگریس کے قیام کی وجہ سے ٹل گیا۔ زیادہ تر مورخین اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں۔ آزاد خیال (Liberals) کانگریس کے قیام کو صحیح قدم بتاتے ہیں جبکہ انتہا پسند (Radicals) یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگرچہ کانگریس سامراجیت نواز نہیں تھی مگر مصالحت پسند ضرور رہی ہے۔ دائیں بازو والے انتہا پسند تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کانگریس شروع سے ہی ایک غیر قوم پرست تنظیم تھی۔ بہر حال سبھی مکتبہ فکر کے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ کانگریس کا قیام جس طریقے سے ہوا اس نے اس کے بنیادی کردار اور مستقبل میں اس کے ذریعے کیے جانے والے کاموں پر فیصلہ کن اثرات ڈالے ہیں۔

1916 میں شائع ہونے والے انتہا پسند رہنما لالہ لاجپت رائے کے ہفتہ وار اخبار ینگ انڈیا (*Young India*) کے ایک مضمون میں لاجپت رائے نے سیفٹی والو کے اس نظریے کا استعمال اعتدال پسند کانگریس گروہ پر حملہ کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس عنوان پر لمبی بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا کہ 'کانگریس کے قیام کا مقصد ہندوستان کو سیاسی آزادی دلانے سے کہیں زیادہ برطانوی حکومت کو خطرے سے بچانا تھا۔ کانگریس کے نزدیک برطانوی سلطنت کی بھلائی پہلے نمبر پر اور ہندوستان کی خیر خواہی دوسرے نمبر پر تھی۔' انہوں نے مزید کہا تھا کہ 'کوئی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ کانگریس اپنے نظریہ (انگریزی سلطنت کے تئیں وفاداری) کے تئیں ایماندار نہیں رہی ہے۔'

بالآخر انہوں نے دعویٰ کیا کہ ' کانگریس کی بنیاد یا طریقۂ پیدائش اس کو وطن پرست لوگوں کی نگاہ میں مجرم ٹھہرانے کے لیے کافی ہے۔'

1940ء میں رجنی پام دت (Rajani Palme Dutt) کی مستند تحریر انڈیا ٹوڈے (*India Today*) نے سیفٹی والو کی داستان کو بائیں بازو کا کچا مال قرار دیا۔ بڑے ہی پر زور انداز میں پام دت نے لکھا کہ حکومت کی سیدھی پہل اور رہنمائی کی وجہ سے کانگریس وجود میں آئی۔ اس کے لیے وائسرائے سے مل کر خفیہ اسکیم بنائی گئی تاکہ برطانیہ مخالف طاقتوں سے انگریزی حکومت کے تحفظ کے لیے اس (کانگریس) کا استعمال اسلحہ کے طور پر کیا جائے۔ یہ تنظیم آنے والے انقلاب کو ناکام کرنے کی کوشش یا اس کو روکنے کی پیش بندی تھی۔ یہ سچ ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ کانگریس ایک قوم پرست تنظیم میں تبدیل ہوگئی۔ اس کا قومی کردار اس کی وفادارانہ سیرت پر حاوی ہونے لگا اور یہ عوامی تحریکوں کا ذریعہ (vehicle) بھی بن گئی مگر اس کا ابتدائی گناہ، یعنی اس کی پیدائشی شکل اس کی سیاست پر مستقل داغ چھوڑ گئی۔

تنظیم کی حیثیت سے اس کا دوہرا رخ اس کی پوری تاریخ میں نظر آتا ہے یعنی اس کو پہلے حکومت نے بنایا پھر بعد میں یہ سامراج مخالف تحریک کی قائد بن گئی۔ اس نے حکومت کے خلاف جنگ بھی کی اور اس کے ساتھ مل کر بھی کام کیا۔ کانگریس کے دو رخ تھے۔ ایک طرف اس نے عوام کی تشدد پسند تحریکوں کے خلاف حکومت کا ساتھ دیا اور دوسری طرف اس نے قومی جدوجہد میں عوام کی قیادت کی۔ گوکھلے سے لے کر گاندھی تک کانگریس کی قیادت کا یہی دوہرا پن دراصل ہندوستان کے بورژوا طبقہ کے ڈھلمل کردار کو ظاہر کرتا ہے۔ برطانوی بورژوا کے خلاف برسر جنگ رہتے ہوئے اور ہندستانی عوام کی قیادت کی خواہش دل میں سنجوئے ہوئے، وہ اس بات کے لیے فکر مند تھی کہ بہت تیزی سے آگے بڑھنے سے، حکومت نوازوں کو مل رہی امتیازی سہولتوں کے خاتمہ کے ساتھ ان کی بھی سہولتیں ختم ہو سکتی ہیں۔ اس طرح کانگریس حقیقی انقلاب یعنی پر تشدد انقلاب کی مخالف بن گئی مگر کانگریس کا یہ کردار گاندھی کے وقت سے نہیں شروع ہوا بلکہ یہ چیز تو برطانوی حکومت نے اس کے قیام کے وقت ہی جان بوجھ کر اس کی گھٹی میں پلائی گئی۔ اس کا دوہرا کردار اپنی بلندیوں پر اس وقت پہنچا جب اس نے ماؤنٹ بیٹن کے سمجھوتہ کو تسلیم کر لیا۔

اس سے پہلے 1939 میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے سربراہ ایم ایس گولواکر (M.S. Golwalkar) نے بھی کانگریس کو نظریۂ سیکولرازم اور سیفٹی والو کی بنیاد پر وطن مخالف قرار دیا۔ انہوں نے اپنے رسالہ 'وی' (*We or Our Nationhood Defined*) میں یہ مان لیا تھا کہ ہندوؤں کے قومی شعور اور احساس کو ان لوگوں کے ذریعے تباہ و برباد کر دیا گیا جو وطن پرست ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ انہوں نے جمہوری اصولوں کو تقویت پہنچائی اور اس گمراہ کن نظریہ کی اشاعت کی کہ ہمارے قدیم دشمن حملہ آور مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ باتیں مشترک ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے دشمنوں کو اپنا دوست مان لیا اور اس طرح ہم نے سچی قوم پرستی کی جڑیں خود اپنے ہاتھوں کھود ڈالی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں چل رہی جنگ دو طرفہ (ہندوستانیوں اور انگریزوں کے ہی درمیان) نہیں بلکہ سہ طرفہ تھی۔ ہندوؤں کو ایک طرف مسلمانوں سے لڑنا پڑ رہا تھا اور دوسری طرف انگریزوں سے۔ ہندوؤں کو قومیت کے راستے سے ہٹانے کے لیے، گولوالکر کے مطابق، ہیوم (Hume)، کاٹن (Cotton) اور ویڈربرن (Wedderburn) کے ذریعے 1885 میں طے کی گئی پالیسی ہی ذمہ دار ہے۔ ان لوگوں نے اس وقت ابل رہی قوم پرستی کے جذبات کے خلاف سیفٹی والو کے طور پر کانگریس کو قائم کیا۔

اس وقت جاگ رہے ایک بڑے دیو کو سلا دینے کے لیے یہ ایک کھلونا تھا اور قومی شعور کو تباہ کرنے کا ہتھیار تھا۔ اور جہاں تک ان لوگوں کے مقصد کے پورا ہونے کی بات ہے وہ اس میں پوری طرح کامیاب رہے۔ آزاد خیال سی۔ ایف۔ اینڈریوز(C.F. Andrews) اور گرجا مکھر جی (Girija Mukerji) نے بھی 1938 میں شائع کی گئی اپنی تصنیف *The Rise and Growth of the Congress in India* میں سیفٹی والو والی بات کو پوری طرح تسلیم کیا ہے۔ وہ اس بات پر خوش ہیں کہ اس سے بیکار کے خون خرابے کو ٹالنے میں مدد ملی۔ 1947 سے پہلے اور بعد کے دسیوں ادیبوں اور سینکڑوں مصنفوں نے انہیں نظریات میں سے کسی نہ کسی کو ہرایا ہے۔

2.2.1 سات جلدوں والی رپورٹ (The Seven-Volume Report)

سیفٹی والو کے اس نظریہ کو تاریخی ثبوت فراہم کرنے میں سات جلدوں والی خفیہ رپورٹ کا رول فیصلہ کن رہا ہے جس کے بارے میں ہیوم نے بتایا کہ اس نے 1878 کی گرمیوں میں شملہ میں اس کو پڑھا تھا۔ اس کے مطالعے کے بعد ان کو پختہ یقین ہو گیا کہ ہندوستان میں بے اطمینانی ابال کھا رہی ہے اور نچلے طبقے میں تشدد کے ذریعے برطانوی حکومت کو ختم کرنے کی سازش چل رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان سات جلدوں کے راز کی چھان بین کریں جس کے مطالعہ کا دعوی ہیوم نے کیا ہے، یہ سمجھ لینا بہتر ہو گا کہ اس خفیہ رپورٹ کا رچاتذ کرہ کیسے شروع ہوا اور بعد میں وہ آگے کیسے بڑھا۔ اس کا ذکر ہم کو سب سے پہلے ویڈر برن کے ذریعے لکھی گئی ہیوم کی سوانح حیات' جو 1913 میں شائع ہوئی تھی' میں ملتا ہے۔ ویڈر برن ایک سیول سروس آفیسر تھا۔ ان کو ہیوم کے کاغذات میں بغیر تاریخ کا ایک میمورنڈم ملا۔ اس میں کانگریس کے قیام کے بارے میں ذکر تھا۔ انہوں نے اس دستاویز کا بڑی تفصیل سے حوالہ دیا ہے؟ یہ دستاویز کیا تھا اور ویڈر برن نے کیا لکھا تھا؟ اس کی بات آگے کی جائے گی۔ ابھی ہم ویڈر برن کے صرف ان حصوں پر بات کریں گے جن کا حوالہ ان کے بعد کئی مصنفوں نے اپنی تحریروں میں دیا ہے۔ لالہ لاجپت کے مطابق ہیوم آزادی کے متوالے تھے اور تاج برطانیہ کی سرپرستی میں ہندوستانیوں کو سیاسی آزادی دلانا چاہتے تھے، مگر بہر حال وہ انگریز محب وطن تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ برطانوی حکومت پر سنگین مصیبت آنے والی ہے تو انہوں نے بے اطمینانی کے اخراج کے لیے سیفٹی والو کی تشکیل کا ارادہ کیا۔

اپنی بات کے ثبوت میں لالہ لاجپت رائے نے ہیوم کے میمورنڈم سے ایک لمبا اقتباس نقل کیا ہے جو ویڈر برن کی کتاب میں تبصرے کے ساتھ چھپا ہے؟ چونکہ بعد کے کئی دانشوروں نے اس اقتباس کا حوالہ دیا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم یہاں پھر اس کو تفصیل سے تحریر کر دیں۔ ہیوم نے لکھا تھا کہ 'مجھے کئی موٹی موٹی جلدیں دکھائی گئیں جن میں بے شمار خبریں اور رپورٹیں درج تھیں۔۔۔ انگریزی اقتباسات یا ترجمے۔۔۔ طرح طرح کی خبریں، سبھی ضلع وار مرتب خبروں کی تعداد بے شمار تھی۔ کہا گیا تھا کہ اس وقت تیس ہزار سے زائد نامہ نگاروں نے اطلاعات دی ہیں۔' ہیوم کہتا ہے کہ خبروں کے یہ نسخے اس کے پاس صرف ایک ہفتہ ہی رہے۔ ان کی بہت ساری خبریں سب سے نچلے طبقہ کے لوگوں کی بات چیت پر مشتمل تھیں۔ یہ اطلاعات ظاہر کرتی تھیں کہ موجودہ حالات میں یہ غریب لوگ اپنی زندگی سے ناامید ہیں۔ فاقہ کشی سے ان کو مر جانے کا ڈر ہے۔ وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں اور متحد ہونا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک چھوٹا سا مایوس گروہ بلاوجہ حکومت کے خلاف ان کی جدوجہد میں شامل ہو جائے، ان کی قیادت کرے اور اس شورش کو قومی انقلاب کے راستے پر موڑ دے۔

جلد ہی ان ساتوں جلدوں کے بارے میں قسم قسم کی باتیں کہی جانے لگیں۔ حالانکہ لالہ لاجپت رائے نے اپنے اقتباس میں ان کے آغاز اور اوصاف کے سلسلہ میں کوئی تشریح نہیں کی تھی۔ 1933 میں گرمکھ نہال سنگھ نے ان ساری جلدوں کو سرکاری رپورٹ بتایا اور دوسری طرف اینڈریوز اور مکھرجی نے کہا کہ یہ سی۔ آئی۔ ڈی (.C.I.D) کے ذریعے تیار کی گئی خفیہ رپورٹیں تھیں جو ہیوم کو سرکاری حیثیت میں ہونے کی وجہ سے ملی تھیں۔ سب سے زیادہ ٹھوس اور زوردار دلیل رجنی پام دت نے دی ہے۔ انہوں نے لالہ راجپت رائے کے ذریعے ویڈر برن کے حوالہ سے لیا اقتباس پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'ہیوم کو اپنی سرکاری حیثیت کے تحت پولیس کی لمبی لمبی خفیہ رپورٹیں حاصل ہوئی تھیں۔'

بعد کے مورخین جن میں آر۔ سی۔ مجومدار (R.C. Majumdar) اور تاراچند (Tarachand) شامل ہیں، نے ان لوگوں کے اس خیالی ثبوت کو تاریخی حقیقت مان لیا۔ ہیوم کے ذریعے بیان کردہ ان دستاویزوں کو اتنا پختہ سرکاری دستاویز مانا جانے لگا کہ 1950 کی دہائی میں اور عہد حاضر میں کئی مورخین نے ملک کے محافظ خانوں کو کھنگالنے میں اپنی قیمتی صلاحیت، توانائی اور وقت کو جھونک دیا۔ جب ان کے ہاتھ اس کوشش میں کچھ نہ لگا تو انہوں نے یہ بات مان کر تسلی کر لی کہ 1947 میں ہندوستان چھوڑنے کے پہلے انگریزوں نے ان دستاویزوں کو ضائع کر دیا ہوگا۔ بہرحال اگر انہوں نے ذرہ برابر بھی سوجھ بوجھ سے کام لیا ہوتا اور اس سلسلہ میں تھوڑا سا بھی سوچتے تو شاید ان کو اپنی بات سے پیچھے ہٹنا پڑتا، کیونکہ ڈفرن (Dufferin) اور رپن (Ripon) کے ذاتی کاغذات کے دستیاب ہونے سے پہلے بھی تین قسم کے تاریخی ثبوت اور دلائل موجود تھے۔

2.2.2 رپورٹ کی تفتیش (Inquiry of the Report)

پہلا ثبوت تو اس نظام سے متعلق تھا جس کے تحت حکومت 1870 کی دہائی میں کام کرتی تھی۔ 1878 میں ہیوم شعبہ مال، زراعت اور تجارت کے سکریٹری تھے۔ ان شعبہ جات کے سکریٹری کی رسائی بھلا وزارت داخلہ کی فائلوں اور سی۔ آئی۔ ڈی رپورٹوں تک کیسے ہو سکتی تھی نیز اس وقت ان کا قیام شملہ میں تھا اور وزارت داخلہ کے کاغذات دہلی میں رکھے جاتے تھے۔ اس طرح تیس ہزار رپورٹز ان کے پاس کہاں سے آ گئے۔ اس وقت تو محکمہ جاسوسی میں کچھ ہی سو افراد کا عملہ تھا اور اگر لالہ لاجپت رائے کے بقول کانگریس کا قیام بغاوت ہونے کے خوف سے ہوا تھا تو ہیوم اور انگریز افسر شاہی نے فوراً یہ کام کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے سات سال کی لمبی مدت تک انتظار کیوں کیا؟ اگر یہ جلدیں سرکاری دستاویزات نہیں تھیں تو پھر یہ جلدیں کیا تھیں؟ اس کا سراغ ویڈر برن کی کتاب میں ملتا ہے۔ اگر کوئی مصنف ویڈر برن سے لیے اقتباس پر بھروسہ کرنے کے بجائے سیدھے ان کی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے تو ان کو اس میں موجود دوسرا تاریخی ثبوت مل جائے گا۔ لالہ لاجپت رائے، رجنی پام دت اور دوسرے لوگوں نے جن اقتباسات کا حوالہ دیا ہے وہ ویڈر برن کی کتاب کے صفحہ 80 اور 81 پر چھپے ہیں۔ ان سے دو صفحے پہلے 78 سے 80 تک اور ایک صفحہ آگے 81/80 پر ویڈر برن بتاتا ہے کہ یہ دستاویزات کیا تھے اور انہیں ہیوم کو کس نے دیا تھا؟ یہ اقتباسات کتاب کے جس باب میں ملتے ہیں اس کا نام 'Indian Religious Leaders' (ہندوستان کے مذہبی پیشوا) ہے۔ اس باب کے شروع میں ویڈر برن نے لکھا ہے کہ دھمکی سے بھرے خطرے کی اطلاع ہیوم کو خاص ذریعے سے ملی اور یہ ذریعہ

تھاان پیشواؤں کا جن کی زندگی مذہب کے لیے وقف تھی اور جو ملک میں ہر جگہ پائے جاتے تھے۔

ہیوم نے اپنے دستاویز میں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ جماعتوں اور طبقوں کے پیشوا (پیر) ہیں جو اعلیٰ خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں اور جن کی خواہش روحانی معراج حاصل کرنا ہوتی ہے اور ان کو اپنے مریدوں کے ذریعے زمین پر ہو رہے سارے واقعات کی خبر ہو جاتی ہے اور رائے عامہ بنانے میں ان کا کردار بڑا اہم ہے۔ ویڈر برن لکھتا ہے کہ وائسرائے اور لارڈ لٹن کے آخری دور میں ہیوم ایسے ہی پیروں کی صحبت میں آیا تھا۔ ان پیروں نے ہیوم سے اس لیے تعلق بنالیا تھا کیونکہ ہیوم کو مشرقی ملکوں کے مذاہب سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان پیروں کو یہ خدشہ تھا کہ پورے ملک میں پھیلی بدامنی کی نحوست ایک دن بھیانک سازش کی شکل اختیار کر لے گی اور ایسے حالات میں حکومت تک پہنچ رکھنے والے ہیوم جیسے لوگ ہی اس آفت کو ٹالنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہیوم نے لکھا کہ اس طرح یہ بات میرے سامنے آئی۔ اس پس منظر میں اگر صفحہ 81-80 کا مطالعہ کریں تو بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں سات جلدوں والی رپورٹ ہیوم کو ان پیروں سے ملی جس کی اطلاع ان کے ہزاروں چیلوں نے ان کو دی تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہیوم نے ان خبروں کی سچائی پر یقین کیسے کر لیا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک خاص مسلک کے پیروکار تھے۔ ان کا تعلق کسی ایک فرقہ یا مذہب سے نہیں تھا بلکہ وہ تمام مذاہب سے تعلق رکھتے تھے اور سبھی ملت و مسلک کو مانتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اور ان کے چیلے قول و قرار سے بندھے ہوتے تھے۔ وہ سب کسی پوشیدہ علم کی جستجو میں مصروف رہتے تھے اور وہ سب اس عہد کے پابند ہوتے تھے کہ خود کے علاوہ کسی دوسری سچائی کی تلاش کرنے والے کے سامنے جان بوجھ کر اپنے عہد کو نہیں توڑ سکتے تھے۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہی معاملہ تھا تو ان ہزاروں پیروں اور چیلوں کو کوئی جانتا کیوں نہیں تھا؟ ہیوم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مکمل راز داری ان کی زندگی کی خصوصیت تھی۔ انھوں نے ہیوم سے صرف اس لیے رابطہ قائم کیا کیونکہ وہ غیبی مصیبت کو ٹالنا چاہتے تھے۔

آخر میں ہم تاریخ نویسی کے تیسرے معیار پر غور کرتے ہیں جس کا انحصار پوری طرح وہم و گمان پر ہے۔ پیروں اور مریدوں کی خصلت کو ویڈر برن نے پوری طرح اجاگر نہیں کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ دوست سوانح نگاروں کی طرح اس نے اپنے دوست کی رازداری کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ مذہبی پیشوا اور ان کے پیروکار عام انسان ہی تھے جبکہ حقیقت کچھ اور تھی۔ تھیوسوفیکل تحریک اور میڈم بلاواسکی (Blavatsky) کی کچھ کتابوں اور وائسرائے رپن اور ڈفرن کی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ پیر اپنی انوکھی مشرقی مذہبی سوچ اور عمل کی وجہ سے پر اسرار مافوق الفطرت قوتوں کے مالک تھے۔ یہ ہزاروں میل دور سے رابطہ قائم کر سکتے تھے، بات کر سکتے تھے، کسی جگہ داخل ہو سکتے تھے، کہیں جا سکتے تھے، کسی جگہ بغیر دکھائی پڑے بیٹھ سکتے تھے اور کسی بھی شخص کے خیالات اور عقیدہ کو بغیر اس کے علم کے متاثر کر سکتے تھے۔

1881 میں ہیوم، میڈم بلاواسکی کے زیر اثر آئے تھے۔ میڈم کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کا اُن پیروں (گروؤں) سے تعلق ہے۔ انھوں نے ان پیروں کو مہاتما یعنی عظیم روحانی شخصیتیں بتایا ہے۔ دور دراز تبت میں ان مہاتماؤں کا پوشیدہ مسکن تھا لیکن وہ دنیا کے کسی

بھی آدمی سے اپنی روحانی طاقت کے ذریعے تعلق بنا سکتے تھے۔ایسے ہی ایک مہاتما کوٹ ہومی لال سنگھ (Koot Hoomi Lal Singh) سے بلاواسکی نے ہیوم کی ملاقات کرائی۔ نظروں سے اوجھل یہی مہاتما اپنے مریدوں کے ذریعے سے ہندوستان میں ہو رہے واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے۔ بلاواسکی کے دوسرے شاگرد اور پائینیر (*Pioneer*) کے اڈیٹر اے۔ پی۔ سینٹ (A.P. Sinnett) نے 1880 میں شائع ہوئی کتاب میں کوٹ ہومی لال سنگھ کے ایک خط کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ان مہاتماؤں نے اپنی کرامات کے ذریعے 1857 میں ہندستانی عوام کی بغاوت کو ناکام کر کے برطانوی حکومت کو گرنے سے بچالیا۔ مستقبل میں بھی یہ مہاتھا اسی قسم کے کسی اور موقع پر اپنی کراماتی طاقت کا استعمال کریں گے۔ہیوم کو اس طرح کی ساری باتوں پر پورا یقین تھا اور وہ خود بھی ایسی ہی پر اسرار طاقت حاصل کرنا چاہتے تھے جس سے حال اور مستقبل ان پر ظاہر ہو جائے۔ اسی مقصد کے تحت انہوں نے مہاتماؤں سے خط وکتابت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔یوں تو ہیوم کی بلاواسکی سے 1887 تک ان بن ہوگئی مگر ان پیروں اور مہاتماؤں میں ان کی عقیدت کم نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنے پسندیدہ ترین سیاسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے مہاتماؤں کے تعلق کو استعمال کرنا شروع کیا۔ان کی دلی منشا تھی کہ حکومت کا مزاج بدلے اور وہ ہندوستانیوں کا پاس ولحاظ رکھ کر کام کرے۔

دسمبر 1883 میں ہیوم نے رپن کو لکھا کہ میرا تعلق ایسے لوگوں سے ہے جن کو عوام دیکھ نہیں سکتی، پھر بھی ان کی قدرو منزلت کرتی ہے، ان کو بھگوان مانتی ہے اور یہ روحانی شخصیتیں عوام کی اس عقیدت مندی سے بخوبی واقف ہیں۔اس کا دعویٰ تھا کہ مافوق الفطرت قوت رکھنے والے کچھ ایشیائی لوگ عوام کے دل کی ہر ایک بات جانتے ہیں اور انہوں نے مجھے بھی کچھ حد تک عوام کا رازدار بنادیا ہے۔ جنوری 1884 میں انہوں نے رپن کو اطلاع دی کہ وہ تو 1848 سے ہی ان پیشواؤں کی صحبت میں آگیا تھا اور انہیں بزرگوں کی مداخلت سے 1848 کی تمام تحریکیں ناکام ہوئیں اور 1857 کی بغاوت کو کچلا جاسکا۔ دور دراز تبت سے یہی پیران (ہیوم) کے اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے ذریعے سے رپن کے اصلاحی قانون کو لاگو کرنے اور قومی انقلاب کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہیوم نے یہ بھی کہا کہ وہ رپن کو دوبارہ وائسرائے بنوانے کے لیے ملکہ کو منانے میں اور مقامی مخالفت کو کم کرنے میں انہیں کی مدد لے رہے ہیں۔

تھوڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ ہیوم نے ڈفرن کو بھی یہ بتانے کی کوشش کی۔انہوں نے ڈفرن کو یہ نہیں بتایا کہ اس کے مشیر مافوق الفطرت اشخاص ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کئی تاریخ نویسوں نے یہ مان لیا کہ ان کے یہ مشیر ہیوم کے دوست کانگریسی رہنما تھے۔ صرف ایک بار انہوں نے اس راز سے پردہ ہٹایا جب 1887 میں ڈفرن نے غصے میں آکر دریافت کیا کہ آخر تمہیں میرے رازدارانہ خطوط کا علم کیسے ہو گیا۔ یہ سن کر ہیوم نے بتایا کہ ان کے دوستوں نے بڑے پر اسرار طریقے سے ان خطوں کی فوٹو کاپیاں حاصل کی ہیں، لیکن جب ڈفرن نے ان کو اصلی نسخے دکھا کر یہ ثابت کر دیا کہ ان کی بات سراسر غلط ہے تو وہ لاجواب ہو گئے۔اس سے پہلے بھی ایک بار اشارے سے ہیوم نے ڈفرن کو یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ ان کے صلاح کار عام سیاسی لیڈر نہیں تھے بلکہ پہنچی ہوئی ہستیاں اور مہاتما تھے۔ یہ بات انہوں نے بڑے محتاط انداز میں میں کہی تھی۔ نومبر 1886 میں ڈفرن کے نام ایک خط میں انہوں نے کہا کہ وہ یہی کوشش کر رہا ہے کہ شملہ میں جن لوگوں نے انہیں سات حصوں پر مشتمل رپورٹ دکھائی تھی وہ انہیں ڈفرن کو دکھادے تاکہ وہ رپورٹوں کی حقیقت کو جانچ پرکھ سکیں جن کو انہوں نے اپنے ذاتی

طریقے سے حاصل کیا ہے۔ لیکن اس وقت وہ کہہ رہا تھا کہ یہ کام ناممکن ہے کیونکہ وہ پوشیدہ لوگ سیدھے وائسرائے سے بات ہی کرنا نہیں چاہتے، کیونکہ آپ نے وہ نہیں کیا جو آپ کو کرنا چاہیے تھا اور نہ آپ آگے ایسا کریں گے۔ پھر بھی ممکن ہے کہ ان کا (ہیوم) ایک خاص دوست جس نے شملہ میں 1878 میں اس کے ساتھ ایک ماہ گزارا ہے اور جس نے اکثر ہندوستان میں قیام کیا ہے، وائسرائے سے ملاقات کرنے کے لیے راضی ہو جائے۔ ہیوم نے اطلاع دی کہ 'اگر ایسا کوئی پرائیویٹ سکریٹری ان سے ملنے آئے اور کہے کہ ہیوم نے ان کو وائسرائے سے ملاقات کرنے کے لیے بھیجا ہے تو وہ ان سے ملاقات کرلیں۔ دس منٹ کے اندر ہی وہ سمجھ جائیں گے یہ مہمان کوئی معمولی آدمی نہیں ہے.... خدا ہی جانے کہ کبھی آپ کو ایسا موقع ملتا ہے کہ نہیں۔۔۔وہ پر اسرار طریقے سے حیرت انگیز کام کرتے ہیں۔'

دوسری طرف ہیوم بذات خود بہت پریشان تھا کیونکہ اپنی بات ثابت کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی شہادت نہیں تھی۔ انہوں نے وائسرائے سے کہا کہ وہ خود اپنے اوپر ناراض ہو رہا ہے اور حیران ہے کیونکہ جن باکمال حضرات کی رہنمائی میں وہ کام کر رہا ہے وہ عام لوگوں کے سامنے نہیں آنا چاہتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان میں مقیم سبھی یوروپی ہیوم کو پاگل اور جھوٹا سمجھتے تھے۔ اور اسی لیے انہوں نے وائسرائے کو بتایا کہ وہ سیاسی کام تو کرتا رہے گا مگر اپنے خفیہ دوستوں سے سارے تعلقات توڑ دیگا۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سات جلدوں والی وہ رپورٹ جس کو ہیوم نے شملہ میں دیکھا تھا، اس کو کانگریسیوں نے نہیں بلکہ اس کے مافوق الفطرت اور پر اسرار مہاتما دوستوں اور مشیروں نے تیار کیا تھا۔

2.2.3 سیفٹی والو نظریہ کے حق میں دوسری دلیل

(Second Argument in favour of the Safety Valve Theory)

دوسری دلیل جو سیفٹی والو کے ثبوت کے طور پر پیش کی جاتی ہے وہ وومیش چندر بنرجی (W.C. Bonnerjee) کے اس بیان پر مبنی ہے جو انہوں نے 1898 میں *Indian Politics* میں دیا تھا کہ کانگریس کس طرح وجود میں آئی اور کس طرح اس کی نشو نما ہوئی۔ یہ کام دراصل آوا اور ڈفرن کے مارکوئس فریڈرک ٹمپل بلیک ووڈ (لارڈ ڈفرن) کا ہے۔ بنرجی نے بتایا کہ ہیوم نے 1884 میں سوچا کہ سال میں ایک بار ہندوستان کے بڑے بڑے رہنماؤں کا ایک جلسہ کیا جائے جو 'صرف سماجی معاملوں پر غور کرے۔' وہ نہیں چاہتے تھے کہ 'سیاست ان کی بات کا موضوع ہو'، لیکن ڈفرن نے ان سے ٹھیک اس کا الٹا کرنے کے لیے کہا کہ وہ کوئی ایسی تنظیم بنائیں جس کے ذریعے حکومت کو ہندستانی عوام کے خیالات کی جانکاری ملتی رہے اور یہ تنظیم ملکہ برطانیہ کی مخالف پارٹی جیسا کردار ہندوستان میں نبھائے۔

2.2.4 دوسری دلیل کا جواب (Reply to the Second Argument)

اس دور کے حالات کا جائزہ لینے سے بنرجی کا بیان صداقت پر مبنی نہیں لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ان کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا یا وہ انیسویں صدی کے آخری دور میں انگریز حکومت کے غضبناک رد عمل سے کانگریس کو بچانا چاہتے تھے۔ کانگریس کے بارے میں ہیوم کی ہندستانی رہنماؤں سے جو باتیں ہوئیں وہ سیاست سے متعلق تھیں۔ اس سے پہلے کی تنظیمیں مثلاً پونا سار وجنک سبھا، بامبے پریسیڈنسی ایسوسی

ایشن، مدراس مہاجن سبھااورانڈین ایسوسی ایشن کے اکثر کام سیاسی ہی تھے۔انڈین سول سروس سے 1882 میں ہی ریٹائر ہونے کے بعد ہیوم ہندوستانیوں کو سیاست میں حصہ لینے کی نصیحت کرتے رہتے تھے۔وہ اپنے دوستوں سے متواتر یہ کہتے رہتے تھے کہ ان کو سماجی مسئلوں کو لے کر آپس میں بٹنا نہیں چاہیے۔ جنوری 1885 میں *Indian Spectator* کے اداریہ میں جب ہیوم کے دوست بی۔ ایم۔ مالا باری (B.M. Malabari) نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سماجی اصلاح کے لیے تحریک شروع کرنے کی تلقین کی۔اس مشورے کے جواب میں ہیوم نے 'انڈین اسپیکٹیٹر' کوایک خط لکھ کر مالا باری کے مشورہ کی تنقید کی اور خبردار کیا کہ ایسا قدم خطرناک ہوگا اور یہ تجویز پیش کی کہ سیاسی اصلاح کو سماجی اصلاح پر ترجیح دی جانی چاہیے۔

1888 میں ڈفرن نے 'سینٹ اینڈریوزڈے' کی دعوت کے موقع پر اپنی تقریر میں کانگریس کی بہت صاف لفظوں میں تنقید کی کہ وہ اپنے ذاتی فائدے کے لیے سیاسی تحریکیں چلا کر سماجی اصلاح کے کام کو نظر انداز کر رہی ہے جس میں کروڑوں کی بھلائی ہو سکتی ہے۔ڈفرن نے انہیں احساسات کا اظہار سکریٹری آف اسٹیٹ کو ایک خط لکھ کر کیا۔ڈفرن کے ذاتی کاغذات، جو 1950 کی دہائی کے آخری دنوں سے اہل علم طبقہ کو دستیاب ہیں، کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات صاف ہو جائے گی کہ کانگریس کی تشکیل میں ڈفرن نے نہ تو کوئی تعاون کیا اور نہ ہی اس کی سرپرستی کی۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے جب ہیوم نے 'انڈین اسپیکٹیٹر' کو خط کی ایک کاپی روانہ کی جس میں سماجی اصلاح کے متعلق مالا باری کے خیالات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا تھا اور جس کی تائید ڈفرن نے کی تھی۔انہوں نے ہیوم سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ان سے ملاقات کر لیں۔اس معاملے کی مکمل تصدیق بمبئی کے گورنر ڈونالڈ میکے (Donald Mackay) کے نام تحریر کردہ ڈفرن کے اس خط سے ہوتی ہے جو انہوں نے ہیوم سے پہلی ملاقات کے بعد مئی 1885 میں لکھا تھا کہ 'ہیوم نے مجھ کو بتایا ہے کہ وہ اور ان کے دوست ایک سیاسی میٹنگ کرنے جا رہے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے ٹھیک اسی طرح کا اجتماع جیسا کیتھولک آزادی کے پہلے اوکونیل (O' Connell) نے کیا تھا۔

نہ تو ڈفرن اور نہ ہی بمبئی اور مدراس کے گورنر اس کے آزاد خیال ساتھی تھے اور نہ الفرڈ لائل (Alfred Lyall)، جے۔ بی۔ لائل (J.B. Lyall)، ڈی۔ ایم۔ والیس (D.M. Wallace)، اے۔ کالون (A. Colvin) اور ایس۔ سی۔ بیلے (S.C. Bayley) جیسے قدامت پسند افسروں کو کانگریس سے کوئی ہمدردی تھی۔ڈفرن نے 1888 میں صرف پہلی بار ہی کانگریس کو برا بھلا کہا ہو ،ایسی بات نہیں ہے۔ انہوں نے رے (Ray) کو لکھا تھا کہ 'ہم کانگریس کا خاتمہ کر دیں گے۔ ہم اس کو رہنے نہیں دیں گے۔' اس سے پہلے مئی 1885 میں وہ رے کو لکھ چکے تھے کہ 'وہ کانگریس سے ہوشیار رہیں اور اصلاح پسندوں (reformers) اور رجعت پسندوں (reactionaries) کے نزدیک نہ پھینکیں۔' 18 جون 1885 میں رے نے اس کا جواب لکھ کے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ انگلینڈ کے سیاست میں ابھرے آئرستانی (Irish) نمائندوں کے مانند ہی ہندوستان میں 'ہندوستانی قومی پارٹی' کی شکل میں سیاسی کارکنوں نے بے چینی پیدا کر دی ہے۔اس سے پہلے مئی میں ہی رے نے ڈفرن کو خبردار کیا تھا کہ ہیوم ایک ایسی تنظیم کا مرکز بن گئے ہیں جو ہندوستانیوں کے دلوں میں وطن پرستی کا جذبہ اجاگر کر رہی ہے۔ دراصل مئی 1885 کے بعد سے ہی ڈفرن کو ہیوم سے سرد مہری ہو گئی۔ وہ ان سے کنارہ کش ہو گئے۔1886 کے بعد تو ڈفرن بنگالی بابوؤں اور مراٹھا برہمنوں پر بھی برسنے لگے کہ 'ان لوگوں کے مقاصد مشتبہ ہیں اور یہ کہ وہ ہندوستان

میں آئر لینڈ جیسی انقلابی کاروائی کرنا چاہتے ہیں۔' مئی۔ جون 1886 میں ڈفرن نے ہیوم کو آدھا پاگل، مکار، بے حد مغرور اور پرلے درجے کا جھوٹا آدمی بتایا۔ ہیوم کا صرف یہی قصور تھا کہ وہ ہوم رول (Home Rule) تحریک کا روحِ رواں بن گیا تھا۔ مختصر یہ کہ کانگریس کے وجود میں آنے کا سیفٹی والو والا نظریہ حقیقت میں مذہبی پیشواؤں کی کارگذاریوں تک ہی محدود ہے اور شاید انہیں سے اس کی ابتدا ہوئی۔

2.3 کانگریس کے قیام کا پس منظر (Background to the Establishment of the Congress)

اس تمام گفتگو سے یہ ثابت ہو گیا کہ کانگریس کا قیام کوئی انگریزی سازش نہیں تھی۔ بلکہ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ابھرنے والی قوم پرستی کی لہر کا مکمل اظہار تھی۔ 1870 کے آخر اور 1880 کے شروع میں ان ہندوستانیوں کی سیاسی سمجھ بوجھ میں مزید اضافہ ہوا اور 1885 تک یہ نقطہ انقلاب تک پہنچ گیا۔ اب ہندوستان کا ماہر سیاست داں اور جدید دانشور طبقہ انگریزی حکومت کے مدمقابل، ذاتی مفاد کے تنگ دائرے میں سوچنے کے بجائے وسیع زاویہ نظر سے قوم کی بھلائی کے بارے میں سوچنے لگے۔ ان کی یہ کاوش کامیابی سے بھی ہمکنار ہوئی۔ انہوں نے ملکی سطح پر ایک ایسی تنظیم کی بنا در کھی جس کا ایک ہی منبر، ایک ہی قبلہ اور ایک ہی امام تھا۔ برطانوی افسران نے عوام کا قوم پرستانہ جوش جو کانگریس کی بنیاد تھا، کو بھانپنے میں ذرہ برابر غلطی نہیں کی۔ وہ اسے شک کی نظر سے دیکھ رہی تھی اور انگریزی حکومت کے حق میں فال بدمان رہی تھی۔ جوں جوں لوگوں کی سیاسی سرگرمی تیز ہوتی گئی حکومت کو آئر لینڈ جیسی غداری، بغاوت اور شورش کا خیال بری طرح ستانے لگا۔

انگریزی حکومت کا یہ شبہ وقتی نہیں تھا، جو کہ حال ہی میں 1857 کی بغاوت کے ہیجان سے ابھر پائی تھی۔ اس کے ٹھوس تاریخی ثبوت تھے۔ سطحی طور پر اس زمانے میں قوم پرست ہندوستانیوں کے خاص مطالبات تھے، مثلاً سوتی کپڑوں پر درآمد محصول میں کمی نہ کرنا، اسلحہ رکھنے کا اختیار دینا، پریس کی آزادی، برما اور افغانستان میں توسیع پر روک، فوجی اخراجات میں تخفیف، قحط زدہ لوگوں کی مالی امداد میں اضافہ، سول سروسز میں ہندوستانیوں کی بھرتی، ہندوستانیوں کو نیم فوجی رضاکار دستہ میں شامل ہونے کا حق، ہندستانی ججوں کو انگریز شہریوں کے فوجداری مقدموں کی سنوائی کا اختیار، انگریز (ووٹروں) کے درمیان اس طرح کا پرچار کہ وہ اسی پارٹی کو ووٹ دیں جو ہندوستانیوں پر توجہ دے اور ان کی بھلائی کا خیال رکھے۔ ان مانگوں پر اگر الگ الگ غور کیا جائے تو بہت ہلکی لگیں گی، پھر بھی برطانوی حکومت آسانی سے ان کو ماننے والی نہیں تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اگر یہ مطالبے مان لیے گئے تو ہندستانی عوام پر حکومت کا شکنجہ ڈھیلا ہو جائے گا اور سرکاری مشینری کی چولیں ہل جائیں گی۔ 1875 اور 1885 کے درمیان کے سالوں میں نیا سیاسی ابھار اور زیادہ انتہا پسند نوجوان قوم پرست دانشوروں کی تخلیق ہوئی۔ انہوں نے نئی تنظیمیں قائم کی اور بخوبی یہ محسوس کیا کہ پرانی تنظیمیں اپنے منصوبوں اور سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں بہت تنگ نظر ہیں، مثلاً 'برٹش ایسوسی ایشن آف بنگال' دھیرے دھیرے زمیندار نواز بن گئی تھی اور اس طرح انگریزوں کے خلاف اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

'بامبے ایسوی ایشن' (The Bombay Association) اور 'مدراس نیٹیو ایسوسی ایشن' (Madras Native Association) جیسی جماعتیں رجعت پسند بن کر قریب المرگ ہو گئیں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ بنگال کے نوجوان قوم پرستوں نے

سریندر ناتھ بنرجی اور آنند موہن بوس کی قیادت میں 1876 میں 'انڈین ایسوسی ایشن' کی بنیاد ڈالی۔ مدراس کے نوجوان سی۔ راگھو چیر یار (C. Vijayaraghavachariar)، جی سبرامنیہ ایئر (G. Subramania Iyer)، پی۔ آنند چارلو (P. Anandacharlu) اور دوسروں نے 1884 میں 'مدراس مہاجن سبھا' قائم کی۔ کے۔ ٹی۔ تیلنگ (K.T. Telang) اور فیروز شاہ مہتا جیسے دانشوروں نے دوسرے بڑے رہنماؤں جیسے دادا بھائی فرام جی (Dada Bhai Framiji) اور دنشا پیٹی (Dinshaw Petit) سے سیاسی اختلاف کی بنیاد پر اپنا ناطہ توڑ لیا اور 1885 میں بمبئی پریسیڈنسی ایسوی ایشن (Bombay Presidency Association) قائم کی۔ دوسری دیگر تنظیموں میں صرف 'پونا سار وجنک سبھا' پہلے کی طرح کام کرتی رہی۔ اس وقت تک اس پر مکمل طریقے سے علم داں قوم پرور طبقہ کا ہی غلبہ تھا۔

انہیں ایام میں ملک میں نئی سیاسی زندگی پیدا ہونے لگی۔ مخصوص قوم پرست اخبارات 'دی ہندو' (*The Hindu*)، 'ٹریبون' (*Tribune*)، 'بنگالی' (*Bengalee*)، 'مہاراتا' (*Mahratta*) اور 'کیسری' (*Kesari*) جو ہندوستان کے سیاسی افق پر چھائے تھے، نیا پیغام دینے لگے۔ صرف امرت بازار پتر کا (*Amrita Bazar Patrika*) اس سے مستثنیٰ تھا۔ اس کی اشاعت تو پہلے ہی سے ہو رہی تھی اور 1878 میں یہ انگریزی زبان کا اخبار بن گیا۔ 1885 کے آتے آتے لوگ ایک کل سیاسی جماعت کی تشکیل کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگے۔ یہ لوگوں کی زندگی کا ضروری مقصد بن گیا۔ 1877 کے بعد اس مقصد کے حصول کے لیے جو بھی کوششیں کی گئیں ان کے بارے میں حال کے بہت سارے مؤرخین نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ 1883 کے بعد ان کوششوں میں مزید تیزی آئی، اور سیاسی سرگرمیوں نے زور پکڑا۔ کلکتہ سے شائع ہونے والے 'انڈین مرر' (*Indian Mirror*) نے تو اس مسئلہ کو لے کر باقاعدہ مہم چھیڑ رکھی تھی۔

دسمبر 1883 میں انڈین ایسوسی ایشن نے ایک کل ہند کانفرنس کا انعقاد کیا۔ یہی وجہ تھی کہ آل انڈیا نیشنل کانگریس سے جڑے سریندر ناتھ بنرجی 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے اجلاس میں شرکت نہ کر سکے۔ گذشتہ دس سالوں کے دوران بہت ساری تحریکوں کے چلانے کی وجہ سے ہندوستانیوں نے خاصہ تجربہ حاصل کر لیا تھا اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی۔ 1875 کے بعد سے سوتی کپڑا درآمدگی محصول کو لے کر لگاتار مہم چلتی رہی۔ یہ مہم ہندوستان میں سوتی کپڑا صنعت کے حق میں درآمدگی فیس کو برقرار رکھنے کے لیے چلائی جا رہی تھی۔ 78-1877 میں سرکاری نوکریوں میں ہندوستانیوں کی بھرتی کے لیے زبردست تحریک چلائی گئی۔ ہندوستانیوں نے لارڈ لٹن (Lord Lytton) کی افغانستان مہم کی سخت مخالفت کی اور حکومت کو مجبور کیا کہ وہ دوسری افغان جنگ میں ہوئے نقصان کی بھرپائی کرے۔ حکومت نے جب ورناکولر پریس ایکٹ (The Vernacular Press Act) کے ذریعے پریس پر شکنجہ کسنا چاہا تو انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اسی طرح آرمس ایکٹ (The Arms Act) کے تحت اسلحہ رکھنے پر جب پابندی لگائی گئی تب لوگوں نے شدید احتجاج کیا۔ 82-1881 میں پلانٹیشن لیبر ایکٹ (Plantation Labour) اور ان لینڈ امیگریشن ایکٹ (Inland Emigration Act) کے خلاف منظم تحریک چلائی گئی کیونکہ اس کے تحت باغان مزدوروں کو ایک طرح کا غلام بنا

دیا گیا تھا۔ 1883 میں البرٹ بل (Ilbert Bill) کی حمایت میں زبردست مہم چلائی گئی۔اس قانون کے مطابق ہندوستانی جج یوروپی شہریوں کے خلاف فوجداری مقدموں کی سنوائی کر سکتے تھے۔ یورپی شہریوں نے اس قانون کو پاس نہیں ہونے دیا مگر اس سے ہندوستانیوں نے ایک مفید سبق سیکھا کہ ان کی کوششیں کل ہند سطح پر منظم نہ ہونے کی وجہ سے ناکام رہیں۔اس کے بر خلاف یورپی شہریوں نے متحد ہو کر بل کی مخالفت کی تھی،اس لیے وہ کامیاب رہے۔اس کے بعد 1883 میں ہندوستان اور انگلینڈ میں سیاسی تحریک چلانے کے لیے ملکی سطح پر چندہ وصولنے کا کام شروع ہوا۔ 1885 میں رضاکار دستوں میں شمولیت کے لیے مہم شروع کی گئی اور انگریز ووٹ دہندوں سے درخواست کی گئی کہ وہ اسی نمائندہ کو ووٹ دیں جو ہندوستانیوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھائے۔ کئی ایک ہندستانی رہنماؤں کو انگلینڈ بھیجا گیا جہاں انہوں نے اپنی تقریروں کے ذریعے ہم وطنوں کے حقوق کی وکالت کی۔

اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ گذشتہ سالوں میں چلائی جارہی سیاسی مہم کی تکمیل کانگریس کے قیام کی شکل میں ہوگئی۔ 1885 تک ملکی سیاست ترقی کر کے ایسی منزل پر پہنچ گئی کہ کچھ بنیادی کام اور مقاصد کو مد نظر رکھ کر ان کے حصول کے لیے جد وجہد کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ بس اس کے لیے ضروری تھا کہ سبھی سیاسی کارکن متحد ہو کر کل ہند جماعت کے تحت کام کریں ہوں۔ جو لوگ ممبئی میں 28 جون 1885 کے اجلاس میں شریک ہوئے تھے ان کو بھی جوش دلایا گیا تھا کہ وہ ان مقاصد کے حصول کے لیے سرگرمی دکھائیں۔ کانگریس کی کامیابی یا ناکامی اور اس کے مستقبل کا انحصار اس بات پر مطلق نہیں ہے کہ اس کو کن لوگوں نے قائم کیا تھا بلکہ اس بات پر ہے کہ شروعاتی دور میں یہ اپنے عزم میں کہاں تک کامیاب رہی۔ ہندوستان اب قوم بننے کے مرحلہ میں داخل ہو گیا تھا اور ہندوستانی قومی تحریک کے بانیوں کا مقصد ہی اس عمل کو تیز کرنا، ہندوستانیوں کو متحد کر کے ایک قوم بنانا اور اسی حیثیت سے اس کی شناخت قائم کرنا تھا۔اس کے برعکس انگریز حکمراں اور اس کے حامی زور و شور سے کہا کرتے تھے کہ ہندوستان متحد یا آزاد نہیں ہو سکتا کیوں کہ یہ قوم نہیں ہے، بلکہ محض ایک جغرافیائی نام ہے۔ یہ سینکڑوں مذہب وملت اور نسلوں کا مجموعہ ہے۔ ہندوستانیوں نے اس مفروضہ کی بالکل پرواہ نہیں کی بلکہ یہ کہا کہ ہندوستان قوم بننے کی سمت میں گامزن ہے۔ تلک، سریندر ناتھ بنرجی اور بہت سارے دوسرے حضرات کہا کرتے تھے کہ ہندستان قوم بننے کے مرحلے میں ہے۔ کانگریسی رہنماؤں نے سمجھ لیا تھا کہ ملک کے سماجی، سیاسی اور مالی حالات لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ لوگوں کو ان حالات سے باخبر کرنا اور ان میں سیاسی فہم پیدا کرنا ضروری ہے۔اسی سے ان کے دل میں قومی اتحاد کے جذبات ابھارے جا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات کہ ہندوستان قوم بننے کے راستے پر ہے، یہی مان لینا کافی نہیں تھا۔اس عمل کو آگے بڑھانا، پختگی اور مضبوطی دینا ضروری تھا۔ کانگریس کا خاص مقصد ہی قومی اتحاد کو فروغ دینا تھا اور بعد میں اس کا حصول ہی اس کی بڑی کامیابی تھی۔ مثال کے طور پر پی آنند چارلو نے 1891 میں کانگریس کے اجلاس میں خطبہ صدارت میں یہ بات کہی تھی کہ کانگریس زبردست قوم ساز ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہی کانگریس کا سب سے شاندار کام ہے۔ کانگریس کے پہلے صدر ڈبلیو۔ سی۔ بنرجی کے ذریعے مرتب کیے گئے کانگریس کے بنیادی مقاصد میں ایک یہ تھا کہ قومی اتحاد کے جذبات کو پوری طرح مضبوط اور مکمل کیا جائے۔روسی سیاح آئی۔ پی۔ منایف (I.P.

(Minayeff) نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ بنرجی کے ساتھ سفر کرتے وقت میں نے دریافت کیا کہ کانگریس لیڈران کانگریس پارٹی سے عملاً کس نتیجہ کی امید کرتے ہیں۔ بنرجی نے جواب دیا کہ 'وہ ہندوستانیوں کے درمیان قومی احساسات اور اتحاد کے پنپنے کی امید کرتے ہیں۔' اسی طرح کانگریس کے پہلے اجلاس پر رائے زنی کرتے ہوئے بمبئی کے اندو پرکاش نے لکھا تھا کہ یہیں سے نئی زندگی کی شروعات ہوتی ہے۔ یہ لوگوں کے دلوں میں قومی جذبات پیدا کرنے میں اس طرح مددگار ہوگی کہ دور دراز کے لوگ مشترک ہمدردی اور مقاصد کے تحت آپس میں متحد ہو جائیں گے۔

ہندوستان کا قوم میں بدلنا ایک طویل تاریخی سفر تھا۔ اس کے علاوہ کانگریس کے رہنماؤں نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں کچھ ایسی تمدنی رنگارنگی ہے کہ کوئی خاص تدبیر یا قومی اتحاد قائم کرنے کے لیے کی جانی چاہیے جو دنیا کے دوسرے حصوں میں نا معلوم ہے۔ ملک کے سبھی علاقوں میں پہنچنے کے لیے یہ بھی طے پایا کہ کانگریس کا اجلاس باری باری سے سبھی علاقوں میں منعقد ہو۔ اور صدارت کی ذمہ داری وہاں کے کسی شخص کو نہ دے کر دوسرے علاقے کے آدمی کو دی جائے۔ سبھی مذاہب کے لوگوں تک پہنچنے کے لیے اور اقلیتوں کے دل سے خوف دور کرنے کے لیے 1888 کے اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ اگر کسی قرارداد پر ہندو یا مسلم نمائندوں کے بڑے حصے کو اعتراض ہو تو وہ پاس نہ ہو۔ 1899 میں اقلیتوں سے متعلق ایک قرارداد میں یہ دفعہ بھی شامل کی گئی کہ جہاں پارسی، عیسائی، مسلمان یا ہندو اقلیت میں ہوں وہاں کونسل میں ان کے منتخب نمائندوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ قرارداد پیش کرنے والے نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ ہندوستان یک رنگا ملک نہیں ہے اس لیے سیاسی طور طریقے یہاں یورپ جیسے نہیں ہیں۔ شروعاتی دور کے قومی رہنماؤں کا پختہ ارادہ ہندوستان کو سیکولر قوم بنانا تھا اور کانگریس بذات خود مکمل طور سے سیکولر تھی۔ کانگریس کا دوسرا بڑا مقصد ایک ایسا سیاسی اسٹیج یا پروگرام تیار کرنا تھا، جس کے تحت پورے ملک میں کام کر رہے سیاسی کارکنان کل ہند یا سطح پر جمع ہو کر لوگوں کو تعلیم کے ذریعے متحرک کر کے سیاسی سرگرمی جاری رکھ سکیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ لوگوں کی عام شکایتیں دور کی جائیں اور حکومت سے ان کے حصول کی لڑائی لڑی جائے۔ اسی وجہ سے کانگریس نے سماجی اصلاح کا کام ہاتھ میں نہیں لیا۔ کانگریس کے دوسرے اجلاس میں دادا بھائی نارو جی نے ایک اصول مرتب کیا اور کہا کہ نیشنل کانگریس خود کو صرف ان سوالات تک محدود رکھتی ہے کہ جن میں پوری قوم کا بلاواسطہ اشتراک ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہم ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت سے یہاں جمع ہوئے ہیں جس سے اپنے سیاسی ارادوں سے حکومت کو مطلع کر سکیں۔

اس نئی سیاست کی خصوصیات یعنی لوگوں کی مجموعی شرکت اور اجتماعی تحریک جیسی چیزیں ہندوستان کے لیے نئی تھیں اس لیے یہ نظریہ کہ سیاست پر کچھ لوگوں کی اجارہ داری نہیں، بلکہ یہ سب کی دلچسپی کی چیز ہے، ایسی بات عوام کے خیال میں بھی نہیں تھی۔ اور جب تک لوگ اس حقیقت کو نہ سمجھ لیں کسی بھی طرح کی سیاسی تحریک چلانا ناممکن تھا۔ اس شعور کی بنیاد پر ہی ایک اور باخبر سیاسی عقیدہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کانگریس کا اہم کام لوگوں کو بیدار کرنا، تربیت دینا، منظم کرنا اور ان میں عام رائے قائم کرنا تھا۔ وطن پرستوں کی شروعاتی سرگرمی اسی مقصد کے ہی حصول کے لیے تھی۔ سیاسی بیداری اور سمجھ پیدا کرنے اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کا کام سب سے پہلے تعلیم یافتہ طبقے میں شروع کیا گیا۔ بر وقت کانگریس کی خواہش لوگوں کی دشواریوں کو دور کرنے کے بجائے برطانیہ کی 'غلہ قانون مخالف تحریک' کی طرز

پر لگاتار سیاسی سر گرمی چلانا تھا۔ قومی رہنماؤں کے ساتھ عوام میں بھی خود اعتمادی پیدا کرنا ضروری تھا جس سے وہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کا استعمال کر کے دنیا کی سب سے طاقتور حکومت کے خلاف سیاسی مورچہ بندی کرنے کی کوشش کر سکیں۔ مگر یہ سب آسان نہیں تھا۔ ایسی بیداری کے لیے ایک طویل مدّت درکار تھی۔

2.4 پہلا اجلاس (The First Session)

انڈین نیشنل کانگریس کی پہلی نشست کے انعقاد کا سہرا ہیوم کو جاتا ہے۔ دسمبر 1884ء کے اوائل میں لارڈ رپن کو الوداع کہنے کے لیے وہ بمبئی گئے۔ وہاں وہ تین ماہ تک مقیم رہے اور اس دوران پریسڈنسی کے بارسوخ افراد سے مشاورت کی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے ذریعے سیاسی عمل کے پروگرام کو مرتب کیا۔ مارچ 1885ء میں یہ طے کیا گیا کہ انڈین نیشنل یونین (ابتداء میں یہی نام طے کیا گیا تھا) کی کانفرنس پونا میں کرسمس کے ہفتہ کے دوران منعقد ہوگی۔ ابتداء میں ہیوم اور اس کے ساتھیوں نے اس کانفرنس کے لیے کلکتہ کو مناسب مقام سمجھا لیکن بعد میں اس کے لیے پونا تجویز کیا گیا کیوں کہ یہ مرکزی مقام تھا اور پونا کی سارو جنک سبھا نے کانفرنس کے انعقاد کی ذمہ داری لی تھی۔ مناسب فنڈ بھی فراہم کرنے کا انتظام کیا۔ بدقسمتی سے پونا کو کانفرنس کی میزبانی کا موقع نہیں ملا اور کانفرنس بمبئی میں منعقد کی گئی کیوں کہ پونا میں ہیضہ کی وبا چل رہی تھی۔ کانگریس کا پہلا اجلاس دوشنبہ 28 دسمبر 1885 کو گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس میں 100 لوگوں نے شرکت کی تھی، جس میں 72 افراد غیر سرکاری عہدیدار تھے جن کو اراکین کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ کانگریس کے پہلے صدر ہونے کا اعزاز بنگال کے ویومیش چندر بنرجی کو جاتا ہے۔ وہ ہندوستان کے پہلے چار بیرسٹروں میں سے ایک تھے اور اس دور کے ماہر قانون تھے۔ ان کے اس انتخاب نے ایک بہترین مثال قائم کی کہ اس علاقہ سے باہر کی شخصیت کو صدر منتخب ہونا چاہیے جہاں اجلاس منعقد ہو رہا ہو۔

2.4.1 صدارتی خطاب (The Presidential Address)

کانگریس کے پہلے صدر کی تقریر کا مرکزی موضوع کانگریس کی وسعت، کردار اور اغراض و مقاصد پر مبنی تھا۔ اس کے علاوہ صدارتی خطاب میں کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو عوام کے ذہنوں میں کانگریس کے مقاصد سے متعلق تھی۔ صدر نے کانگریس کے اغراض و مقاصد کو واضح طور پر سمجھایا۔ اغراض و مقاصد اس طرح تھے:

1۔ ملک کے تمام لوگوں میں شخصی قربت اور دوستانہ ماحول کو فروغ دینا چاہیے۔
2۔ نسل، مذہب یا علاقائی عصبیت کا خاتمہ
3۔ قومی یکجہتی کے جذبات کا فروغ
4۔ موجودہ مسائل سے متعلق تعلیم یافتہ طبقات کی رائے ہموار کرنا
5۔ عوامی مفاد کے لیے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرنا

ان مطالبات کے علاوہ صدر نے ان تمام اعزازات کا تذکرہ کیا جو برطانیہ نے ہندوستان کو دیے تھے۔ انہوں نے یقین دلایا کہ تعلیم

یافتہ ہندوستانی افراد حکومت کے وفادار اور خیر خواہ ہیں۔ انہوں نے واضح کیا کہ کانگریس کے قیام کا مقصد حکمرانوں تک اپنے خیالات اور نظریات کی نمائندگی کرنا ہے اور ان پر سازش اور غداری کا الزام غلط ہے۔ وہ ہیوم کی صدارت کو قبول کر چکے تھے کیوں کہ ہندوستان میں برطانوی برادری کے کئی اراکین تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان پر اعتبار نہیں کرتے تھے۔ آخر کار صدر نے بہت ہی محتاط الفاظ میں یہ واضح کر دیا کہ کانگریس کیا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ حکومت کو استحکام اور وسعت دی جائے۔ اس طرح کی پالیسی نہ صرف حکومت بلکہ زیادہ تر عوام کے لیے مددگار ثابت ہوگی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ کانگریس حکومت میں نہ صرف اپنے طبقہ کے لیے بلکہ تمام ہندوستانیوں کے مفادات کے لیے اپنا حصہ مانگ رہی تھی۔ دراصل قومی یکجہتی کے علاوہ دوسری خواہشات کا اظہار نہیں کیا گیا۔ کانگریس قائدین کو برطانوی عدلیہ پر بہت زیادہ یقین تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ حکومت کی پالیسیاں ہندوستانیوں کے مفادات اور بھلائی اور ان کی ترقی سے متعلق ہو۔ اس مقصد کے تحت وہ حکمرانی میں اپنا زیادہ سے زیادہ رول چاہتے تھے اور یہ نمائندہ جاتی اداروں کی ترقی اور اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کی تقرری کے ذریعے ممکن تھا۔

2.4.2 شرکاء (The Participants)

اکثر یہ بحث رہی ہے کہ کانگریس میں ہمیشہ قانون دانوں کا غلبہ رہا ہے۔ مثلاً مشہور مورخ انیل سیل(Anil Seal) نے نشاندہی کی کہ کانگریس کے پہلے اجلاس میں تقریباً نصف افراد یعنی 72 میں سے 39 وکلا تھے۔ کئی دہائیوں تک ایک تہائی مندوبین کا تعلق قانونی پیشہ سے تھا۔ راجہ مہاراجہ، بڑے زمیندار اور دولت مند تاجر اس سے غیر حاضر تھے۔ کسان اور دستکار طبقہ اس جانب متوجہ نہیں ہوا۔ ہندوستان میں یہ مسئلہ تھا کہ تعلیم یافتہ افراد کے لیے ملازمت کے بہت کم مواقع تھے۔ اس لیے بڑی تعداد قانونی پیشوں سے وابستہ ہوگئی۔ قدیم اشرافیہ طبقے نے کانگریس کی کاروائی میں شرکت نہیں کی کیوں کہ وہ نئے حریت پسند نظریات سے خوفزدہ تھے۔ کچھ وقت کے لیے کئی رہنماؤں نے ہندوستان کی غریبی کے مسئلہ کو زیر بحث لایا اور خاص طور پر دادابھائی نوروجی نے جب کانگریس کے حالات پر بحث کی تو یہ طے کیا گیا کہ پہلے مرحلے میں نمائندہ اداروں کو منظوری دی جائے۔ کانگریس نے عوامی مباحثہ کے ذریعے مسائل پر توجہ دینا اور عرضیاں داخل کرنے کی پالیسی کو اپنایا اور یہ فطری تھا۔

2.4.3 قراردادیں اور کارروائی (Resolutions and Actions)

کانگریس کی کاروائی بہت ہی منظم اور بہترین انداز میں انجام دی گئی۔ قراردادیں پیش کی گئیں۔ مباحثے ہوئے اور پارلیمانی انداز میں قراردادیں منظور کی گئیں۔ ہر قرارداد کو ایک علاقے سے تعلق رکھنے والے رکن نے پیش کیا اور اس کی تائید دوسرے علاقے کے رکن نے کی۔ تمام تقاریر اعتدال پسندی، راست بازی اور تاج برطانیہ سے وفاداری سے متعلق تھیں۔ برٹن مارٹن نامی مورخ نے تبصرہ کیا کہ پہلا کانگریس کا اجلاس مکمل طور پر ایک پیشہ وارانہ نوعیت کا اجلاس تھا جو امریکہ اور انگلینڈ میں ہونے والے اجلاس سے کم تر نہیں تھا۔ کانگریس کے پہلے اجلاس میں 9 قراردادیں منظور کی گئیں۔

- پہلی قرارداد میں ہندوستانیوں کے مسائل و معاملات کی تفتیش کے لیے رایل کمیشن کے قیام کا مطالبہ کیا گیا اور اس میں ہندوستانیوں کی قابل لحاظ تعداد کی نمائندگی کی تجویز پیش کی گئی۔
- دوسری قرارداد میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کی انڈین کونسل کی برخواستگی کا مطالبہ کیا گیا۔ کانگریس چاہتی تھی کہ سکریٹری آف اسٹیٹ راست طور پر برٹش پارلیمنٹ کو جوابدہ ہونا چاہئے۔ یہ مطالبہ اس بنیاد پر کیا گیا کہ برطانوی افراد انصاف پسند ہوتے ہیں اور ان کو صحیح معلومات فراہم کی جائیں تو وہ صحیح راستے سے کبھی انحراف نہیں کریں گے۔
- ایک اور قرارداد خارجہ پالیسی سے متعلق تھی جس میں برما کو الحاق کرنے کی مذمت کی گئی۔
- دیگر قراردادوں میں دستور کی آزادی، مرکزی اور علاقائی قانون ساز مجلسوں کے اختیارات اور سول سروسز کے امتحانات برطانیہ اور ہندوستان میں بیک وقت منعقد کرنے اور فوجی اخراجات میں کمی سے متعلق تھے۔ اجلاس کے اختتام سے قبل کانگریس نے مزید دو فیصلے کیے۔
  - پہلے فیصلے کے مطابق کانگریس کے اجلاس میں منظور شدہ قراردادوں کو ملک کی تمام سیاسی انجمنوں سے توثیق حاصل ہونا۔
  - کانگریس کا اگلا اجلاس 28 دسمبر 1886 کو کلکتہ میں منعقد کرنا۔

یہ فیصلے اہم تھے اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ قائدین کانگریس کے اجلاس کو علیحدہ پروگرام نہ سمجھیں بلکہ اس کو تحریک کی شروعات کا نام دیا گیا۔ کانگریس کے اجلاس میں سماجی اصلاحات کا سوال نہیں اٹھایا گیا۔ بعض اراکین نے اس موضوع پر بحث کرنے پر زور دیا لیکن بنیادی اختلافات کی وجہ سے اس کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ بعض اراکین نے کئی لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے کمسن بیاہ، بیواؤں کی شادی جیسے مسائل کو ایک عوامی جلسہ میں زیر بحث لایا جو کانگریس کے اجلاس کے اختتام کے فوراً بعد اسی مقام پر منعقد کیا گیا تھا۔

2.5 ابتدائی کانگریسی قیادت کا ایک تنقیدی تجزیہ

(A Critical Appraisal of the Early Congress Leadership)

بعد کے بہت سے مورخین اور ناقدین نے ابتدائی دور کے قومی رہنماؤں کے سیاسی جدوجہد کے طریقوں، ان کی درخواستوں، عرضداشتوں اور گذارشات پر ہی اپنی توجہ مرکوز کی۔ یہ سچ ہے کہ ان کی یہ کاوش عوام کو مجموعی طور سے متحرک نہ کرسکی مگر انہوں نے اپنی تحقیق میں ان قائدین کی سرگرمی کے سب سے نمایاں پہلو کو ہی نظرانداز کر دیا۔ سیاسی سنت کی حیثیت سے مشہور جسٹس راناڈے نے 1891 میں ہی اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا۔ جب چھبیس سال کے نوجوان اور بے صبر گوکھلے نے پونا سارو جنک سبھا کے ذریعے کافی محنت اور توجہ سے مرتب کی گئی تھی عرضداشت پر حکومت کے دوسطر کے جواب کو پڑھ کر اپنی مایوسی کا اظہار کیا تھا، تب راناڈے نے ان کو مطمئن کرنے کے لیے کہا تھا کہ 'تم ملک کی تاریخ میں اپنی اوقات نہیں سمجھتے ہو، یہ عرضداشتیں رسمی طور پر تو حکومت کو دی گئی ہیں، البتہ ان کے مخاطب تو حقیقت میں ملک کے لوگ ہیں، تاکہ وہ ان معاملات پر غور کرنا سیکھ سکیں۔ یہ کام تو نتیجہ کی پرواہ کیے بغیر سالوں چلنا چاہیے کیونکہ اس طرح کی

سیاست اس ملک میں بالکل نئی ہے۔

ایک قومی تحریک کو پیدا کرنے کے بنیادی مقصد کے ایک حصے کے طور پر یہ ضروری تھا کہ ایک مشترکہ کل ہند قومی سیاسی قیادت کی تشکیل کی جائے، یعنی اسے تعمیر کیا جائے جسے مشہور اطالوی مارکسی اینٹونیو گرامشی (Antonio Gramsci) ایک تحریک کا مرکز کہتے ہیں کہ قومیں اور لوگ اسی وقت بامعنی اور موثر سیاسی عمل کے قابل بنتے ہیں جب وہ منظم ہوں۔ وہ 'عوام' یا 'تاریخی موضوع' تب بنتے ہیں جب وہ اس طرح منظم ہوتے ہیں۔ قومی تحریک کا پہلا زینہ ہی تب شروع ہوتا ہے جب اس کے علمبردار، لوگوں کو متحد کرنے کے لیے کمر کستے ہیں اور اس کی کامیابی کا انحصار بھی قائدین کے آپسی اتحاد پر ہوتا ہے جب ان کی مجموعی شناخت، ایک نظریہ، ایک مقصد اور ایک ہی طرح کے احساسات ہوں۔ مارچ 1885 میں کانگریس کے ہونے والے اجلاس میں شرکت کے لیے جو پرچہ سیاسی کارکنوں میں جاری کیا گیا تھا، اس میں لکھا تھا کہ 'کانگریس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ قومی ترقی میں لگے سارے مستعد کارکنان ایک دوسرے کو ذاتی طریقے سے اچھی طرح جان لیں۔ کانگریس کے پہلے صدر ڈبلو۔ سی۔ بنرجی نے اس بات کو دہرایا کہ کانگریس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ محبان وطن کے دلوں سے مذہبی، نسلی اور علاقائی نفرت پوری طرح نکل جائے اور ملک کی بھلائی کے لیے سلطنت برطانیہ کے چپہ چپہ میں بسنے والے کارکنان میں قربت و دوستی زیادہ مضبوط ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں کانگریس کے بنیاد گزار سمجھ گئے تھے کہ قومی تحریک کی پہلی ضرورت اس کی قیادت ہے یہ قیادت جو سماجی نظریاتی رنگت حاصل کرے گی وہ ایک ایسا سوال تھا جو قومی تحریک کی تشکیل کے بنیادی مقصد سے مختلف تھا۔ سماج کی یہ ساخت تو بہت ساری باتوں پر منحصر تھی جیسے سماج کے مختلف طبقات کا کردار اور ان کے نظریاتی کشمکش سے پیدا شدہ نتائج اور ان کے اثرات وغیرہ۔ ابتدائی رہنماؤں کا مقصد ہی سیاسی جمہوریت کو قومی اور بین الاقوامی شکل دینا تھا۔ ان کی سیاست عوام کی فرمانروائی کے اصول پر منحصر تھی۔ اس سلسلہ میں دادابھائی نارو جی نے اس طرح لکھا تھا کہ 'نیا سبق یہ ہے کہ راجے مہاراجے لوگوں کے لیے ہیں، لوگ ان کے لیے نہیں ہیں۔'

ابتدا میں کانگریس کی تشکیل پارلیمنٹ کی طرح ہوئی تھی۔ دراصل لفظ 'کانگریس' شمالی امریکہ کی تاریخ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے لوگوں کی جماعت۔ کانگریس کی اجلاسی کاروائی جمہوری طرز پر چلتی تھی۔ ایک ایک مسئلے پر فیصلے سے پہلے خوب بحثیں ہوتی تھیں۔ ضرورت پڑنے پر ووٹ کا سہارا لیا جاتا تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وہ افسر شاہی اور انگریزی حکومت نہیں تھی، جیسا کچھ مورخین نے سمجھنے میں غلطی کی ہے، بلکہ کانگریس تھی جس نے پارلیمانی جمہوریت کو دیسی شکل دے کر مقبول عام کیا۔ ٹھیک اسی طرح ابتدائی قومی رہنماؤں نے شہری آزادی (Civil Liberty) کے وجود کو قائم رکھنا اور اس کو فروغ دینا قومی تحریک کا لازمی جز بنا دیا تھا۔ انہوں نے تحریر و تقریر کی آزادی میں مداخلت اور تخفیف کے خلاف جدوجہد کی۔ انہوں نے عدالتی اور انتظامی اختیارات کی علیحدگی کے لیے مہم چھیڑی اور نسلی امتیاز کے خلاف جم کر لڑائی لڑی۔

برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد کے لیے ضروری تھا کہ حکومت کو ٹھیک سے سمجھا جائے اور اسی سمجھ کی بنیاد پر قومی نظریہ کی نشو و نما کی جائے۔ اس سلسلہ میں ابتدائی قومی لیڈران بیک وقت استاد اور شاگرد دونوں تھے۔ 1870 اور 1880 کی دہائیوں میں انگریزی

حکومت کے خلاف کوئی نظریہ پہلے سے موجود نہیں تھا۔ اپنے تجربہ اور موجودہ حالات کے مطالعہ سے حاصل نتائج کی بنیاد پر ہی رہنماؤں کو برطانوی مخالف نظریہ کو پروان چڑھانا تھا۔ ظاہر ہے کہ بغیر کسی نظریاتی اصول کے کوئی بھی قوی تحریک نہیں چلائی جاسکتی تھی۔ یہ بات ان رہنماؤں کو واضح طور پر معلوم تھی کہ ملک کے لوگ ایک قوم ہیں اور برطانوی حکومت ہماری دشمن ہے اور اسی دشمنی کے خلاف ہماری یہ جنگ ہے۔ ان کو کئی سوالات کے جوابات بھی فوراً دینے تھے، مثلاً کیا انگلینڈ ہندوستان کی ہمدردی میں حکومت کر رہا ہے؟ کیا حاکم اور محکوم کی دلچسپیوں میں فرق ہے؟ کیا یہ تضاد ہندستانی عوام اور نوکر شاہی میں ہے یا حکومت اور عوام کے درمیان یا پھر عوام اور طرز حکومت کے درمیان ہے؟ کیا ہندستانی عوام کی یہ جنگ عظیم برطانوی سلطنت کے مقابلہ چل سکے گی اور پھر یہ سوال کہ یہ جنگ لڑی کیسے جائے گی؟

ان اور ان جیسے دوسرے سوالات کے جوابات کو تلاش کرنے میں کئی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں، مثلاً اس دور کے قومی رہنما کم سے کم بیسویں صدی کے آغاز تک برطانوی حکومت کے کردار کو سمجھنے میں ہی ناکام رہے۔ مگر اس وقت ایسی غلطیوں کو کسی طرح ٹالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت حالات سے نمٹنے کے لیے ایسے کوئی تیار شدہ مناسب اصول لوگوں کو دستیاب نہیں تھے۔ ہاں، کچھ تھے مگر وہ بھی گھسے پٹے، بے جان اور غیر مؤثر۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت کے قومی رہنماؤں نے برطانوی حکومت کے خلاف سیدھے کوئی عوامی تحریک نہیں چلائی۔ اس کے برعکس انہوں نے حکومت کے خلاف صرف نظریاتی تحریک پر اکتفا کیا۔ یہاں اس بات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ قومی یا سامراج مخالف کوئی جدوجہد، حکومت مخالف بننے سے پہلے حکومت کے بارے میں مخالفت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے کانگریس کے بانیان نے حکومت کے بارے میں یہ تحریک واقعی بڑی عقلمندی سے چھیڑی۔ شروع ہی سے کانگریس نے خود کو ایک پارٹی کی شکل میں نہیں بلکہ ایک تحریک کی شکل میں پیش کیا۔ صرف ان بنیادوں اور وسیع مقاصد پر ایک رائے ہونے کے علاوہ، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، کانگریس میں شامل ہونے کے لیے کسی اور خاص طرح کے سیاسی اور اصولی قول و قرار کی ضرورت نہیں تھی۔ اس میں شامل ہونے کے لیے کسی خاص سماجی طبقہ اور گروہ کی پابندی بھی نہیں تھی۔ تحریک کی حیثیت سے اس نے جمہوریت اور سیکولر قومیت کے تئیں پابند سبھی مختلف سیاسی نظریات، رجحانات اور طبقات کے لوگوں کو اپنے اندر شامل کیا۔ اس کے علاوہ کانگریس نے اپنے آغاز سے ہی قائدین کی اعلیٰ صف میں مختلف سیاسی سوچ و معیار اور مختلف اقتصادی نظریات کے لوگ شامل کر رکھے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس دور کے رہنماؤں کے بنیادی مقاصد یہ تھے کہ لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کیا جائے، انہیں سیاسی اعتبار سے تعلیم دی جائے، تحریک کا ایک مرکز بنایا جائے، انگریزی حکومت کے خلاف قومی نظریہ کو ترقی دی جائے اور اس کی خوب اشاعت کی جائے۔

تاریخ، بے بنیاد پیمانہ سے نہیں بلکہ اپنے ٹھوس تاریخی معیار سے جانچ پرکھ کر یہ فیصلہ کرے گی کہ ابتدائی قومی تحریک اپنے بنیادی مقاصد کے حصول میں کہاں تک کامیاب یا ناکام رہی۔ اس معیار سے اس کی کامیابیاں بہت اہم ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ 1880 کی دہائی میں معمولی آغاز سے بڑھ کر بیسویں صدی کی مقبول عوامی تحریکوں میں سب سے زیادہ شاندار بن گئی۔ ابتدائی مرحلے میں اس کے دو بڑے رہنماؤں کے ذریعے اس کے کام کے جائزے سے متعلق مورخین یقیناً متفق ہوں گے۔ 1885 اور 1905 کے دوران کانگریس نے تحریک کے لیے جو زمین تیار کرنے کا کام کیا تھا، اس کے بارے میں دادابھائی ناروجی نے ڈی۔ ای۔ واچا (D.E. Wacha) کو جنوری 1905 میں

لکھا تھا کہ 'بیدار ہوتی ہوئی نسل میں کانگریس کے خلاف جو بے اطمینانی اور بے قراری ہے وہ اس کی دھیمی اور غیر ترقی یافتہ رفتار کی پیدا کردہ ہے۔ ... یہی اس کا سب سے اچھا ماحصل اور ثمرہ ہے۔ یہی اس کا ارتقاء یہی اُس کی ترقی ہے...اصل کام یہ ہے کہ انقلاب کی شروعات ہو ... چاہے یہ پرامن طریقے سے ہو یا پر تشدد، انقلاب کی شکل کیسی ہو یہ برطانوی حکومت کی دانائی اور نادانی اور انگریزوں کی کاروائی پر منحصر ہے۔

اسی طرح بیس سالوں کے دوران کانگریس کے ذریعے کیے گئے کاموں کا تجزیہ کرتے ہوئے گوپال کرشن گوکھلے نے 1907 میں لکھا تھا کہ ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ملک کی ترقی کی اسی منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہماری کامیابیاں چھوٹی ہی ہوتی ہیں اور ناامیدیاں بہت اور مشکل۔ جہاں تک اس جدوجہد کو لے جانے کی ذمہ داری خدا نے ہم پر ڈالی تھی، وہاں تک ہم پہنچ گئے ہیں۔ اب ہماری ذمہ داری ختم ہوتی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اب ہندوستان کی نئی نسل کو یہ ذمہ داری دی جاتی ہے کہ وہ اپنی کامیابیوں کے ذریعے ملک کی خدمت کرے۔ ہمیں یعنی موجودہ پیڑھی کے لوگوں کو تو اس بات سے مطمئن ہونا چاہئے کہ ہم نے اپنی ناکامیوں کے ذریعے ہی حتی المقدور ملک کی خدمت کی۔ یہ کام چاہے جتنا مشکل اور کٹھن رہا ہو مگر ناکامیوں کے اندر سے ایسی قوت ابھرے گی جو آگے چل کر نمایاں کارنامے انجام دے گی۔

اب ایک بار پھر ہم ہیوم کی طرف واپس آتے ہیں، آخر ہیوم کا کردار کیا تھا؟ اگر کانگریس کے بانیان میں اتنی صلاحیت، قابلیت اور وطن پرستی تھی تو ہم کو کانگریس کا خاص ناظم بنانے میں ان کو کون سی ضرورت پڑی تھی۔ بلاشبہ بااصول اور مثالی شخص کی حیثیت سے ہیوم نے اپنے سبھی ہم عصر وسیع النظر اور جمہوریت کے حامی اشخاص، جن میں لالہ راجپت رائے شامل تھے، کو اس طرح متاثر کیا تھا کہ ان کو تعاون دینے میں، ان لوگوں کو کسی طرح کی بدنامی کا خدشہ نہیں تھا۔ مگر اس کا صحیح جواب اس وقت کے حالات میں پوشیدہ ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض کے تناسب سے 1880 کی دہائی میں سیاسی سوچ رکھنے والے حضرات بہت کم تھے اور برطانوی حکمرانوں کی کھلی مخالفت کی جڑیں اس وقت تک مظبوطی سے جم نہیں سکی تھیں۔

دادا بھائی نارو جی، جسٹس رانا ڈے، فیروز شاہ مہتا، سبرامنیہ ایئر اور سریندر ناتھ بنرجی جیسے باہمت اور قول وقرار کے پابند لوگوں نے ہیوم سے اس لیے مدد لی، کیونکہ وہ اپنے کام کے آغاز میں ہی حکومت سے دشمنی مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کانگریس جیسی حکومت مخالف جماعت کا سربراہ کوئی رٹائرڈ انگریز سول افسر ہو تو اس کے تئیں حکومت کا شک وشبہ کم ہوگا اور اس طرح اس پر سرکاری حملے کی گنجائش بھی کم ہوگی۔ گوکھلے نے 1913 میں اپنی نمایاں انکساری اور سیاسی سوجھ بوجھ سے اس بات کو واضح کیا تھا کہ کوئی بھی ہندستانی انڈین نیشنل کانگریس کو قائم نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کوئی ہندستانی پورے ملک میں ایسی کوئی تحریک چلانے کے لیے آگے بڑھتا تو ملک کے حکمراں اس کو جود میں نہ آنے دیتے۔ اگر کانگریس کا بانی کوئی مشہور اور بڑا رٹائرڈ انگریز افسر نہ ہوتا تو ان دنوں سیاسی تحریک کے بارے میں ایسی بدگمانیاں پیدا ہوتیں کہ حکومت کو اس کے کچلنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جاتا۔ دوسرے لفظوں میں اگر ہیوم اور دوسرے وسیع النظر انگریزوں نے کانگریس کا استعمال سیفٹی والو کے طور پر کرنا چاہا ہو تو کانگریسی رہنماؤں نے ان کا ساتھ اس امید پر دیا کہ ہیوم کانگریس کے لیے برق گش آلہ کے طور پر کام آئیں گے حکومت کے ذریعے کانگریس پر گرنے والی ظلم کی بجلی سے وہ اسے بچالیں گے۔ بعد کے حالات نے یہ بات ثابت بھی کی۔

2.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ یہ ہندوستانی عوام میں بڑھتی ہوئی قوم پرستی کی مظہر تھی۔ کچھ لوگوں کے مطابق کانگریس کی بنیاد ایک ہندوستانی قوم پرستی کے ابلتے ہوئے لاوے کو باہر نکالنے کے لیے سیفٹی والو کے طور پر کی گئی اور ایسا برطانوی حکومت اور اس کے افسران کی حمایت سے ہوا۔ اس کے لیے ہیوم کی سات جلدوں والی پراسرار رپورٹ اور وومیش چندر بنرجی کے بیان کو بنیاد بنایا گیا۔ مزید تحقیق سے ثابت ہوا کہ ایسا نہیں تھا بلکہ کانگریس کا قیام اس وقت کے حالات کے تحت ہوا اور متعدد ابتدائی سیاسی انجمنوں نے اس کے لیے راہ ہموار کی۔ متعدد سیاسی رہنماؤں کی کوششوں سے ایک کل ہند سیاسی پلیٹ فارم کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں تمام علاقوں اور مذاہب کے لوگوں کو شامل کیا گیا۔ علاقائیت اور مذہبیت کو قطعاً درکنار کر کے اقلیتوں کے حقوق کی خصوصی رعایت کی گئی۔ ابتدائی دور میں کانگریس نے ایک انگریز کو برطانوی حکومت کے شک وشبہ کو کم کرنے کے لیے اپنا سرپرست منتخب کیا جب کہ وومیش چندر بنرجی اس کے پہلے اجلاس کے صدر بنے۔ ابتدائی دور میں کانگریس رہنما عرضداشتوں اور درخواستوں تک محدود رہے۔ انہوں نے برطانوی حکومت سے وفاداری کے ساتھ اپنی جائز مانگیں اٹھانے پر اکتفا کیا۔ حالانکہ ان کے اس طریقے پر ان کی تنقید کی گئی مگر اپنے مقاصد کے لحاظ سے قومی تحریک میں ان کی حصے داری سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ایک معمولی سی شروعات سے انہوں نے اسے ایک باقاعدہ تحریک میں تبدیل کر دیا۔

2.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

غلہ قانون مخالف تحریک	:	1838 میں انگلینڈ میں کوبدین(Cobden)اور برائٹ(Bright)کے ذریعہ بنائی گئی انجمن جو غلہ قانون کی اصلاح کی ضامن تھی۔
سیفٹی والو نظریہ	:	اسے حفاظتی ڈھال نظریہ بھی کہتے ہیں۔ اس کے مطابق کانگریس کو برطانوی حکومت کے اشارے پر عوام کے قوم پرستی کے جوش کو پرسکون انداز سے نکالنے کے لیے بنایا گیا۔

2.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

2.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. اے او ہیوم کون تھا؟
2. گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج کہاں واقع ہے؟
3. کانگریس کے پہلے اجلاس میں کتنے لوگ تھے؟
4. ابتدا میں کانگریس کا کیا نام تجویز کیا گیا؟
5. 'ینگ انڈیا' (*Young India*) ہفتہ وار اخبار میں کس نے سیفٹی والو نظریے کو لے کر اعتدال پسندوں پر حملہ کیا؟

6. 'انڈیا ٹوڈے' (*India Today*) کس کی تحریر ہے؟
7. کانگریس کا پہلا اجلاس کہاں منعقد ہوا؟
8. *The Rise and Growth of the Congress in India* کس کی تصنیف ہے؟
9. ہیوم نے سات جلدوں والی رپورٹ کہاں پڑھی تھی؟
10. ویڈر برن نے کس کی سوانح حیات لکھی؟

2.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سات جلدوں والی رپورٹ پر نوٹ لکھیے۔
2. سیفٹی والو نظریہ کے حق میں دوسری دلیل کے بارے میں بتائیے۔
3. پہلے اجلاس کے صدارتی خطاب پر نوٹ لکھیے۔
4. پہلے اجلاس کے مشارکین پر نوٹ لکھیے۔
5. پہلے اجلاس کی قرارداد پر نوٹ لکھیے۔

2.8.3 فصیلی جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ابتدائی کانگریسی قیادت کا تنقیدی تجزیہ کیجیے۔
2. کانگریس کے قیام کے پس منظر پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. سیفٹی والو نظریہ پر تفصیلی طور پر روشنی ڈالیے۔

2.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Chandra, Bipan, et al.. *India's Struggle for Independence*, *1857–1947*, Penguin, New Delhi, 1989.
3. Grover, B.L., *A Documentary Study of British Policy towards Indian Nationalism*, *1885–1909*, National Publications, Delhi, 1967.
4. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal*: *A New History of British India*, HarperCollins, Noida, 2021.
5. Mehrotra, S.R, *Emergence of Indian National Congress*, Rupa, Delhi, 2004.
6. Mukherjee, Amitabh, 'Genesis of the Indian National Congress', in *A Centenary History of the Indian National Congress* (*1885–1985*), B.N. Pande, General Editor, Academic Foundation, New Delhi, 1985, Vol.1: 1885–1919.
7. Ranjan Ray, Nisith, et al., *Concise History of the Indian National Congress*, *1885–*

1947, Vikas Publishing House, New Delhi, 2019.
8. Rag, Pankaj, 'Indian Nationalism, 1885–1905: An Overview,' *Social Scientist*, Vol. 23, Nos. 4-6, 1995, pp. 69–97.
9. Seal, Anil, *The Emergence of Indian Nationalism*: *Competition and Collaboration in the Later Nineteenth Century*, S. Chand and Co., New Delhi, 1968.
10. Tripathi, Amales, *Indian National Congress and the Struggle for Freedom*, *1885–1947*, Oxford University Press, New Delhi, 2014.
11. Wedderburn, William, *Allan Octavian Hume*, *C.B.*, *Father of the Indian National Congress*, *1829 to 1912*, T.F. Unwin, London, 1913.

اکائی 3۔اعتدال پسند

(Moderates)

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 اعتدال پسند

3.2.1 وجہ تسمیہ

3.2.2 سیاسی کام کے طریقے

3.3 اعتدال پسندوں کے مطالبات

3.3.1 آئینی اصلاحات کا مطالبہ

3.3.2 معاشی اصلاحات کا مطالبہ

3.3.3 انتظامی اور دوسری اصلاحات کا مطالبہ

3.3.4 یکساں شہری حقوق کا مطالبہ

3.4 حکومت کا ردعمل

3.5 اعتدال پسند قوم پرستی: ایک جائزہ

3.5.1 اعتدال پسندوں کی کامیابیاں

3.5.2 اعتدال پسندوں کی خامیاں

3.6 اعتدال پسند قوم پرستی کا زوال

3.7 اکتسابی نتائج

3.8 کلیدی الفاظ

3.9 نمونہ امتحانی سوالات

3.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی اور استحصال کرنے والی حکومت کے خلاف قوم پروری اور وطن پرستی کے جذبات تو برطانوی حکومت کے ابتدائی دور سے ہی موجود تھے۔اس کی مثالیں ہمیں متعدد حکمرانوں اور عوام کی برطانوی حکومت کے خلاف مزاحمت میں اور خصوصاً 1857 کی عظیم جنگ آزادی یا بغاوت میں نظر آتی ہیں۔البتہ منظم قوم پرستی یا ایک متحد ہندوستانی قوم ہونے کا احساس انیسویں صدی کے نصف آخر میں پروان چڑھا، جو کہ برطانوی حکومت میں ایک جغرافیائی اکائی کے طور پر ہندوستان کے متحد ہونے اور ہندوستان میں مغربی حریت پسندی، آزاد خیالی اور مساوات کے نظریات پھیلنے کی وجہ سے ممکن ہوا۔ 1885 تک آتے آتے متعدد سیاسی انجمنیں وجود میں آچکی تھیں، جن میں سے کچھ تو کل ہند نوعیت کی بھی تھیں۔انہیں انجمنوں کے ذریعے تیار کردہ ماحول میں ہندوستانی قوم پرستی کی سب سے بڑی علمبردار انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ان سب کے بارے میں آپ پچھلی اکائیوں میں پڑھ چکے ہیں۔اس اکائی میں ہم ہندوستانی قومی کانگریس کے ابتدائی دور (1885 سے 1907 تک) کے بارے میں بات کریں گے۔اس مرحلے کو 'اعتدال پسند مرحلہ' (Moderate Phase) بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ اس دور کے ابتدائی قوم پرست، جنہیں اعتدال پسند بھی کہا جاتا ہے، اپنے سیاسی خیالات میں میانہ روی یا اعتدال سے کام لیتے تھے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے آئینی اور پرامن ذرائع اختیار کرتے ہوئے اصلاحات کے مطالبے پر یقین رکھتے تھے۔

اعتدال پسندوں کو برطانوی احساس انصاف، منصفانہ طریقہ کار، دیانت اور ایمانداری پر پورا بھروسہ تھا جبکہ ان میں سے کچھ کا تو یہ بھی ماننا تھا کہ برطانوی حکمرانی ہندوستان کے لیے ایک اعزاز ہے، جو ہندوستان کو قدیم روایتی بندشوں اور سماجی پچھڑے پن سے نکال کر جدت پسندی کی طرف لے جائے گی۔ابتدائی قوم پرست کھلے ذہن اور اعتدال پسند سیاست میں پختہ یقین رکھتے تھے۔دادا بھائی نوروجی، بدرالدین طیب جی، فیروز شاہ مہتہ، سی، وجے راگھواچاریہ، دنشا آئی۔ واچا، پی۔ آنند چارلو، سریندر ناتھ بنرجی، رمیش چندر دت، آنند موہن بوس اور گوپال کرشن گوکھلے وغیرہ کچھ اہم اعتدال پسند رہنما تھے۔یہ لوگ برطانوی حکومت کے مکمل خاتمے اور حکومت خود اختیاری کے بجائے برطانوی حکومت کے تحت رہتے ہوئے انگلینڈ کے برطانوی شہری کی مانند تمام حقوق حاصل کرنا چاہتے تھے۔اس طرح وہ بعد کے کانگریسی جارحیت پسندوں (Extremist) سے یکسر مختلف تھے، جو برطانوی حکمرانی سے مکمل چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔اس گروپ کے ممبران میں تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے پیشہ ور افراد جیسے وکلاء، اساتذہ اور سرکاری اہلکار شامل تھے، جن میں سے کئی انگلینڈ میں تعلیم یافتہ تھے۔گاندھیائی دور کے آنے تک کانگریس کی قیادت پر انہیں اعتدال پسندوں کا دبدبہ بنا رہا، حالانکہ انہیں جارحیت پسندوں کی طرف سے شدید تنقید کا بھی نشانہ بننا پڑا جنہوں نے ان کے طریقہ کار کو 'سیاسی گداگری' (political mendicancy) کا نام دیا۔اس اکائی میں ہم ان کے مطالبات، طریقہ کار، ان کی کامیابیوں اور خامیوں کا تفصیلی جائزہ لینے اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک کو آگے لے جانے میں ان کا کتنا اہم کردار رہا تھا۔

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- اعتدال پسند کون تھے؟ جان سکیں گے۔
- اعتدال پسندوں کے طریقہ کار، ان کے مطالبات اور حکومتی رد عمل سے واقف ہو سکیں گے۔
- اعتدال پسند قوم پرستی کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- اعتدال پسند قوم پرستی کے زوال کے اسباب جان سکیں گے۔

3.2 اعتدال پسند (The Moderates)

3.2.1 وجہ تسمیہ (The Nomenclature)

اصلاحات کے مطالبات پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے، ابتدائی قوم پرستوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے آئینی اور پر امن طریقہ اختیار کیا۔ وہ برطانوی سلطنت کے ساتھ وفادار تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو ملک کی حکومت میں ایک مناسب اور جائز کردار ملنا ہی چاہیے۔ اگرچہ انہوں نے برطانوی حکمرانی کے دائرہ کار میں آئینی اور دیگر اصلاحات کا مطالبہ کیا، لیکن انہیں برطانیہ کے انصاف اور مساوی برتاؤ پر پورا بھروسہ تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستان کے ساتھ برطانوی تعلق کا تسلسل دونوں ممالک کے مفاد میں ہے۔ ابتدائی مرحلے میں، قوم پرستوں نے برطانیہ کے ساتھ اپنی وابستگی کو ایک فائدہ سمجھا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ برطانوی حکومت نے مختلف بے ضابطگیوں کو دور کر کے بہت اچھا کام کیا ہے۔ مغربی فکر، ثقافت، تعلیم، ادب اور تاریخ سے متاثر ہو کر، ابتدائی قوم پرستوں کے مطالبات جارحیت پسندانہ نہیں بلکہ نسبتاً معتدل نوعیت کے تصور کیے جاتے تھے۔ یہ بات کانگریس کے پہلے اجلاس میں سامنے رکھے مقاصد سے بھی واضح ہوتی ہے۔ بمبئی میں دسمبر 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت ویومیش چندر بنرجی نے کی اور اس اجلاس میں 72 ارکان شریک ہوئے۔ اجلاس میں ابتدائی قوم پرستوں نے جو مقاصد سامنے رکھے وہ کچھ اس طرح تھے؛

- ملک کے مختلف حصوں کے قوم پرست سیاسی کارکنوں میں دوستانہ روابط پیدا کرنا۔
- بلالحاظ ذات پات، مذہب یا صوبہ ملک میں قومی اتحاد کے جذبات کو فروغ دینا اور اسے استحکام بخشنا۔
- عوامی مطالبات کو مرتب کر کے حکومت کے سامنے پیش کرنا۔
- سب سے اہم یہ مقصد تھا کہ ملک میں رائے عامہ کی تربیت کرنا اور اسے منظم کرنا۔

3.2.2 سیاسی کام کے طریقے (Methods of Political Work)

1905ء تک ہندوستان کی قومی تحریک پر اعتدال پسند قوم پرست (Moderates) رہنما بنا کسی چنوتی کے چھائے رہے۔ ان کے سیاسی طریقہ کار کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ قانون کی چار دیواری اور اس کی حدود کے ہی اندر رہ کر دستوری احتجاج

(Constitutional Agitation) کی مہم چلاتے تھے اور آہستہ روی کے ساتھ پر امن انداز میں سیاسی ترقی چاہتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ اگر رائے عامہ ہموار کی جائے اور اسے منظم کیا جائے اور عوامی مطالبات کو حکومت کے سامنے عرضداشتوں، جلسوں اور قرار دادوں کی شکل میں پیش کیا جائے تو رفتہ رفتہ اور مرحلہ وار حکومت اسے پورا کر دے گی۔

ان کے سیاسی طریق کار کے دو پہلو تھے۔ ایک تو یہ کہ ملک کے لوگوں میں سیاسی شور پیدا کیا جائے، ایک مضبوط رائے عامہ قائم کی جائے، قومی روح بیدار کی جائے اور سیاسی مسائل سے عوام کو آگاہ کیا جائے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی عرضداشتوں اور قرار دادوں کی منزل مقصود بنیادی طور پر یہی تھی۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ قوم پروروں کے متعین کردہ رخ پر اصلاحات نافذ کرنے پر برطانوی حکومت کو آمادہ کیا جائے۔ معتدل قوم پرستوں کو یقین تھا کہ برطانوی قوم اور برطانوی پارلیمنٹ دونوں ہی ہندوستانیوں کے ساتھ انصاف کے خواہش مند ہیں لیکن انہیں ہندوستان کے صحیح حالات کا علم ہی نہیں ہے۔ چنانچہ ہندوستانی رائے عامہ کو تربیت دینے کے ساتھ ساتھ وہ برطانوی رائے عامہ کو بھی ہموار کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے پیش نظر وہ برطانیہ میں زور شور سے پروپیگنڈا کرتے تھے اور انہیں ہندوستانی عوام کے خیالات سے آگاہ کرنے کے لیے ممتاز ہندوستانیوں کے وفد برطانیہ بھیجتے۔ 1889ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی ایک برطانوی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا، جس نے 1890ء میں 'انڈیا' (*India*) نامی ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ دادا بھائی نوروجی نے اپنی زندگی اور اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ برطانیہ میں ہندوستانی مسئلے کو مقبول بنانے پر صرف کیا۔

تصویر 3.1: دادا بھائی نوروجی

Source: https://en.wikipedia.org/wiki/Dadabhai_Naoroji#/media/File:Dadabhai_Naoroji_1889.jpg

ہندوستان کی قومی تحریک کی تاریخ کا ایک طالب علم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ کس زور شور سے ممتاز اعتدال پسند لیڈر برطانوی حکومت کی وفاداری کے دعوے کیا کرتے تھے لیکن ان کی وفاداری کے اظہار کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ سچے قوم پرست نہیں تھے یا بزدل تھے۔ان کا ایمان داری سے یہ خیال تھا کہ تاریخ کی اس منزل میں برطانیہ کے ساتھ ہندوستان کا سیاسی تعاون ہندوستان کے حق میں مفید ہے۔ چنانچہ انگریزوں کو ہندوستان سے وہ نکالنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ ان کی کوشش تھی کہ برطانوی حکومت ہندوستان کی قومی حکومت میں تبدیل ہو جائے۔تاہم، آگے چل کر جب برطانوی حکومت کی خرابیاں ان کی سمجھ میں آئیں اور انہوں نے دیکھا کہ اصلاحات کے قومی مطالبے کو قبول کرنے کے لیے حکومت تیار نہیں ہے، تو اکثر لیڈروں نے حکومت کی وفاداری کا راگ الاپنا بند کر دیا اور خود اختیاری حکومت کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔مزید برآں اکثر لیڈروں کے معتدل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے خیال میں غیر ملکی حکمرانوں کو للکارنے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔یہ بھی ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس عہد کے تمام لیڈر معتدل رجحان نہیں رکھتے تھے۔ان میں سے کچھ کو ابتدا ہی سے برطانیہ کی نیک نیتی مشتبہ نظر آ رہی تھی۔وہ خود ہندوستانی عوام کے سیاسی اقدام کرنے اور اپنی قوت پر انحصار کرنے کے قائل تھے اور سیاسی و معاشی جدوجہد کے پروگرام کی تبلیغ کرتے تھے۔اس رجحان کی نمائندگی تلک اور بہت سے دوسرے لیڈر اور اخبارات کرتے تھے۔آگے چل کر ان لوگوں کو جارحیت پسند یا انتہا پسند کہا جانے لگا۔ان کے نقطہ نظر اور ان کی سرگرمیوں پر اگلی اکائی میں بحث کی جائے گی۔

3.3 اعتدال پسندوں کے مطالبات (Demands of the Moderates)

3.3.1 آئینی اصلاحات کا مطالبہ (Demand for Constitutional Reforms)

ابتدائی دور کے قوم پرست اپنے ملک کی حکومت میں اہم شریک کار بننے کے خواہش مند تھے اور وہ جمہوریت کے نام کی دہائی دیتے تھے لیکن اپنے نصب العین کے فوری حصول پر زور نہیں دیتے تھے۔ان کے فوری مطالبات انتہائی معتدل تھے۔انہیں آزادی کی منزلیں رفتہ رفتہ ہی طے کرنے کی توقع تھی۔اس اندیشے کی وجہ سے وہ انتہائی محتاط تھے کہ حکومت ان کی سرگرمیوں پر کہیں پابندی نہ عائد کردے۔ 1885ء سے 1892ء تک انہوں نے لیجسلیٹو کونسلوں کی اصلاح و توسیع ہی پر زور دیا۔ان کا مطالبہ تھا کہ کونسلوں کے ممبر عوام کے منتخب کردہ ہوں اور کونسلوں کے اختیارات میں اضافہ کیا جائے۔ان کے احتجاج سے مجبور ہو کر حکومت نے 1892ء میں کونسل ایکٹ منظور کیا، جس کے تحت امپیریل لیجیسلیٹو کونسل اور صوبائی کونسلوں کے ممبروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔کچھ ممبروں کو ہندوستانی بالواسطہ طور پر منتخب بھی کر سکتے تھے، لیکن اکثریت سرکاری ممبروں کی تھی۔سالانہ بجٹ پر بحث کرنے کی بھی کونسلوں کو اجازت دی گئی لیکن انہیں بجٹ پر ووٹ دینے کے حق سے ابھی محروم ہی رکھا گیا۔قوم پرست طبقہ 1892ء کے ایکٹ سے قطعی غیر مطمئن رہا۔اور اس نے اسے فریب سے تعبیر کیا۔ کونسلوں میں ممبروں کے تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ وہ ان کے اختیارات میں اضافے کا بھی مطالبہ کر رہے تھے۔ان کا سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ سرکاری خزانہ پر ہندوستانیوں کو اختیار حاصل ہو۔چنانچہ انہوں نے 'اگر نمائندگی نہیں، تو ٹیکس نہیں' کا نعرہ اختیار کیا، جو امریکا کی جنگ آزادی کے دوران میں امریکنوں کا نعرہ تھا۔بیسویں صدی کے آغاز میں جا کر قوم پرستوں نے 'سوراج' (حکومت اختیاری) کا مطالبہ شروع کیا۔یعنی سلطنت برطانیہ کی حدود میں ہندوستان کو بھی اس طرح کی حکومت خود اختیاری حاصل ہو جو آسٹریلیا اور کناڈا جیسی نو آبادیات

کو حاصل تھی۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے اس کا اعلان گوکھلے نے 1905ء میں اور دادابھائی نوروجی نے 1906ء میں کیا۔

3.3.2 معاشی اصلاحات کا مطالبہ (Demand for Economic Reforms)

ابتدائی دور کے قوم پروروں نے معاشی میدان میں ہندوستان کے افلاس اور معاشی بدحالی کی شکایتیں کیں اور جدید صنعتوں اور زرعی ترقی کے فقدان کا رونا رویا اور ان خرابیوں کا برطانوی پالیسیوں کو ذمہ دار قرار دیا۔ دادابھائی نوروجی نے 1881ء ہی میں اس کی شکایت کی تھی کہ ملک پر غیر ملکی سرمائے کا 'حملہ روز بروز بڑھ رہا ہے' جس کی وجہ سے 'ملک رفتہ رفتہ یک سر تباہ ہو رہا ہے۔' قوم پرستوں نے دیسی صنعتوں کی تباہی اور بربادی کا ملزم بھی انگریزوں کو قرار دیا۔ ہندوستان کے افلاس کا واحد علاج انہوں نے یہ تجویز کیا کہ جدید صنعتوں کو ملک میں تیزی سے رائج کیا جائے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ جدید صنعتوں کے قیام میں حکومت مدد دے اور تحفظاتی محصول (tariff) کے ذریعے سے ان کا تحفظ کرے۔ ہندوستانی صنعتوں کے فروغ کے لیے انہوں نے برطانوی مال کے بائیکاٹ اور دیسی سامان کے استعمال کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ مثلاً 1896ء میں پونا (Pune) میں اور مہاراشٹر کے دوسرے شہروں میں طالب علموں نے سودیشی کی تحریک کے سلسلے میں کھلے عام بدیشی سامان کو نذر آتش کیا۔ قوم پرستوں کو شکایت تھی کہ ہندوستان کی دولت کے بہاؤ کا رخ انگلینڈ کی طرف ہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ اسے بند ہونا چاہئے۔ کسانوں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے مالگذاری میں تخفیف کرنے کا اور باغات میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانے کا بھی انہوں نے مطالبہ کیا۔ ٹیکسوں کی بڑھی ہوئی شرحوں کو بھی ہندوستان کے افلاس کا ایک سبب قرار دیتے ہوئے انہوں نے نمک پر ٹیکس ہٹانے اور دوسرے ٹیکسوں میں تخفیف کی مانگ کی۔ اسی طرح انہوں نے فوجی اخراجات پر شدید نکتہ چینی کی اور اس میں بھی کمی کرنے کا مطالبہ کیا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، زیادہ سے زیادہ قوم پرستوں کا یہ خیال پختہ ہوتا گیا کہ غیر ملکی سامراج کے ہاتھوں ملک کے معاشی استحصال، اس کی بڑھتی جارہی غربت اور معاشی پسماندگی کا وزن ان فوائد سے کہیں زیادہ ہے جو غیر ملکی حکومت سے ملک کو حاصل ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں جان و مال کو جو تحفظ حاصل تھا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دادابھائی نوروجی نے لکھا تھا:

> ایک حیرت ناک جھوٹ یہ ہے کہ ہندوستان میں جان و مال کو تحفظ حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی کسی چیز کا وہاں وجود نہیں ہے۔ ہاں ایک معنی میں جان و مال کا تحفظ کیا جاتا ہے، یعنی کوئی ایک دوسرے کو مار نہیں سکتا اور مقامی مطلق العنانوں سے نجات ہے.... لیکن خود برطانیہ کے پنجے سے جان و مال کو قطعاً نجات نہیں ہے اور اس کے نتیجے میں زندگی بھی غیر محفوظ ہے۔ ہندوستان کی دولت بھی محفوظ نہیں ہے... جو محفوظ اور بالکل محفوظ ہے، وہ برطانیہ کا مفاد ہے جو بالکل محفوظ و مستحکم ہے۔ ہندوستان کی دولت کو ہڑپ کر لینے کا اور اسے برطانیہ لے جانے کا اس کا حق بالکل محفوظ ہے۔ چنانچہ ہر سال ہندوستان کے خزانے سے تین کروڑ یا چار کروڑ پونڈ سالانہ برطانیہ چلا جاتا ہے... میں کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ہندوستان کو نہ مالی تحفظ حاصل ہے اور نہ جانی... لاکھوں ہندوستانیوں کے لیے زندگی نام ہے نیم فاقہ کشی یا فاقہ کشی کا یا قحط اور بیماری کا۔

امن وامان کے بارے میں دادابھائی نے لکھا تھا۔

> ہندوستان میں کہاوت ہے کہ پیٹھ پر مارو، لیکن خدا کے لیے پیٹ پر نہ مارو۔ دیسی آمروں کے تحت لوگ جو پیدا کرتے تھے، وہ ان ہی کے پاس رہتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی مار ان کی پیٹھ پر پڑتی تھی۔ برطانوی ہند کے حکمرانوں کے تحت آدمی امن میں ہے اور اس

کی پیٹھ پر مار کبھی نہیں پڑتی، لیکن بڑے پر امن اور ان دیکھے طریقے سے، بڑی پر کاری سے اس کی روح نکال لی جاتی ہے۔ وہ امن کے ساتھ فاقہ کشی کرتا ہے اور امن کے ساتھ مر جاتا ہے اور ملک میں امن وامان بھی قائم رہتا ہے۔

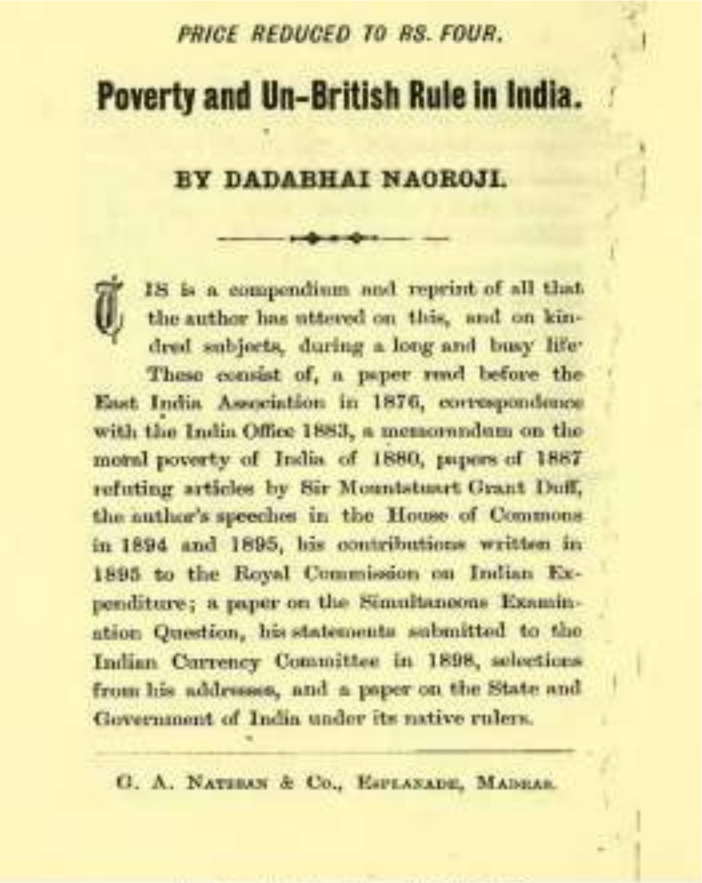

PRICE REDUCED TO RS. FOUR.

Poverty and Un-British Rule in India.

BY DADABHAI NAOROJI.

THIS is a compendium and reprint of all that the author has uttered on this, and on kindred subjects, during a long and busy life. These consist of, a paper read before the East India Association in 1876, correspondence with the India Office 1883, a memorandum on the moral poverty of India of 1880, papers of 1887 refuting articles by Sir Mountstuart Grant Duff, the author's speeches in the House of Commons in 1894 and 1895, his contributions written in 1895 to the Royal Commission on Indian Expenditure; a paper on the Simultaneous Examination Question, his statements submitted to the Indian Currency Committee in 1898, selections from his addresses, and a paper on the State and Government of India under its native rulers.

G. A. NATESAN & Co., ESPLANADE, MADRAS.

تصویر 3.2- نوروجی کی کتاب پوورٹی اینڈ ان برٹش رول ان انڈیا کا پہلا صفحہ

(Source: https://en.wikisource.org/wiki/Page:Folk-lore_of_the_Telugus.djvu/148)

3.3.3 انتظامی اور دیگر اصلاحات کا مطالبہ (Demand for Administrative and Other Reforms)

اس دور میں ہندوستان نظم ونسق میں جن اصلاحات کا مطالبہ کر رہا تھا، ان میں سب سے اہم مطالبہ یہ تھا کہ اعلا سطح کی انتظامی ملازمتوں کو ہندوستانی بنایا جائے یعنی ان میں ہندوستانیوں کو بھی شامل کر کے اہم ذمہ داریاں دی جائیں۔ ان کا یہ مطالبہ سیاسی، معاشی اور اخلاقی اصولوں پر مبنی تھا۔ معاشی اعتبار سے اعلا سطح کی ملازمتوں پر اہل یورپ کی اجارہ داری، دو لحاظ سے نقصان دہ تھی۔ ایک تو اہل یورپ کو بھاری بھاری تنخواہیں دی جاتی تھیں، جس کی وجہ سے ہندوستانی انتظامیہ بے حد خرچیلی بن گئی تھی لیکن ان ہی جیسی استعداد رکھنے والے ہندوستانیوں کو ان سے بہت کم تنخواہیں ملتی تھیں۔ دوسرے اہل یورپ اپنی تنخواہوں کا بڑا حصہ ملک سے باہر بھیج دیتے تھے اور پنشن کی رقم بھی انہیں برطانیہ میں ادا کی جاتی تھی، اس عمل سے ہندوستان کی دولت کا بہاؤ تیز ہو جاتا تھا۔ سیاسی اعتبار سے قوم پروروں کا خیال تھا کہ انتظامی عہدوں پر اگر ہندوستانیوں کا تقرر کیا جائے تو ہندوستان کی ضروریات کا وہ زیادہ خیال رکھیں گے۔ اس مسئلے کے اخلاقی پہلو پر گوپال کرشن گوکھلے نے 1897ء میں یوں روشنی ڈالی تھی:

> غیر ملکی انتظامی کی صرف یہی ایک خرابی نہیں ہے کہ وہ انتہائی خرچ طلب ہے۔ اس سے بھی زیادہ اس میں اخلاقی خرابی مضمر ہے۔ موجودہ نظام کے تحت ہندوستانی نسل کو کمتر بنانے کی یا اس کو محدود کرنے کا عمل جاری ہے۔ ہمیں احساس کمتری کی ایک ایسی فضا میں ساری زندگی بسر کرنی ہوتی ہے، جس میں ہمارے طویل القامت افراد کو بھی جھکنا پڑتا ہے... جس قدر طویل القامت بننے کے ہم اہل ہیں، وہ قامت موجودہ نظام کے تحت حاصل کر لینا ہمارے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ خود اپنے اوپر حکومت کرنے والی ہر قوم میں جو اخلاقی بلندی ہوتی ہے، وہ ہم اپنے اندر محسوس ہی نہیں کر سکتے۔ ہم میں جو انتظامی اور فوجی اہلیتیں ہیں، ان سے کام نہ لینے کی وجہ سے، وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ اس طرح سے ہم اپنے ہی ملک میں لکڑہارے اور سقہ بن کر رہ جائیں گے۔

قوم پرستوں کا مطالبہ تھا کہ عدلیہ کو انتظامیہ سے علاحدہ کیا جائے۔ وہ ججوں کے اختیارات کو کم کیے جانے کے مخالف تھے اور لوگوں کو بے اسلحہ کر دینے کی سرکاری پالیسی کی بھی مخالفت کرتے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ حکومت عوام پر بھروسہ کرے اور انہیں ہتھیار بند ہونے کی اجازت دے تاکہ وقت ضرورت وہ اپنی اور اپنے ملک کی حفاظت کے اہل بن سکیں۔ وہ حکومت پر زور دیتے تھے کہ ریاست فلاحی سرگرمیاں شروع کرے اور انہیں ترقی دے۔ عوام الناس میں پرائمری تعلیم کے رائج کیے جانے پر وہ اصرار کرتے تھے۔ اسی طرح ان کے مطالبات میں اعلا اور فنی تعلیم کی سہولتیں فراہم کیے جانے کا بھی مطالبہ شامل تھا۔ وہ اس پر زور دیتے تھے کہ کسانوں، مہاجنوں سے نجات دلانے کے لیے زرعی بینکوں کو فروغ دیا جائے۔ زراعت کی ترقی کے لیے، نیز ملک کو خشک سالی سے بچانے کے لیے آبپاشی کے پروگرام میں وسیع پیمانے پر توسیع کی جائے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ علاج اور صحت کی سہولتوں میں اضافہ کیا جائے اور پولیس کے نظام میں اس طرح اصلاح کی جائے کہ اپنے فرائض ایمان داری و تندہی سے انجام دے کر وہ عوام میں مقبول ہو۔ قوم پرست لیڈروں نے ان ہندوستانی مزدوروں کے دفاع میں بھی آواز اٹھائی، جو اپنے افلاس کی وجہ سے تلاش روزگار میں جنوبی افریقہ(South Africa)، ملایا (Malaya)، ماریشس (Mauritius)، ویسٹ انڈیز (West Indies) اور برطانوی گیانا (British Guina) وغیرہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ ان میں بیش تر ملکوں میں انہیں شدید مظالم اور نسلی تفریق کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ جنوبی افریقہ میں ان کا حال خصوصیت سے خراب تھا، جہاں موہن داس کرم چند گاندھی ہندوستانیوں کے بنیادی انسانی حقوق کے دفاع میں جدوجہد کر رہے تھے۔

3.3.4 یکساں شہری حقوق کا مطالبہ (Demand for Equal Civil Rights)

ابتدائی دور کے قوم پرستوں نے تقریر و تحریر کی آزادی کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ ان آزادیوں پر کسی قسم کی پابندی عائد کیے جانے کی کوششوں کی وہ شدید مخالفت کیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان آزادیوں کو بچانے کی جدوجہد، تحریک آزادی کا اہم حصہ بن گئی تھی۔ 1897ء میں بمبئی کی حکومت نے بال گنگادھر تلک اور دوسرے لیڈروں پر اس الزام میں مقدمہ چلایا کہ اپنی تقریروں اور تحریروں سے وہ حکومت کے خلاف عوام میں بددلی پیدا کرتے ہیں۔ انہیں بہت لمبی لمبی سزائیں دی گئیں۔ اسی زمانے میں پونا کے ناتو برادران کو بلا مقدمہ چلائے ہوئے ملک بدر کر دیا گیا۔ سارے ملک نے یک زبان ہو کر عوامی آزادی پر اس حملے کے خلاف احتجاج کیا۔ تلک جو، اب تک مہاراشٹر ہی کے رہنما تھے، یکایک کل ہند لیڈر بن گئے۔ امرت بازار پتریکا نے لکھا: 'اس وسیع ملک میں کوئی بھی ایسا گھر نہیں ہے جہاں تلک کا

بڑے دکھ کے ساتھ ذکر نہ کیا جاتا ہو اور ان کی قید کو خانگی مصیبت نہ متصور کیا جاتا ہو۔' تلک کی گرفتاری نے ملک میں ایک برقی رو سی دوڑا دی اور اس کے ساتھ ہی قومی تحریک کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

3.4 حکومت کا ردعمل (Government's Response)

برطانوی ارباب اختیار جو ابتدا ہی سے ترقی پذیر قومی تحریک کے مخالف رہے تھے، انڈین نیشنل کانگریس سے بھی مشکوک ہو گئے۔ ڈفرن سے لے کر نچلے درجے کے برطانوی افسر تک قوم پرست لیڈروں کو بے وفا بابو، شورش پسند برہمن اور تشدد پسند بدمعاش کہنے لگے۔ حالانکہ شروع میں اس مخالفت کا اعلانیہ اظہار نہیں ہوا، کیوں کہ ان لوگوں کو توقع تھی کہ ہیوم کی قیادت میں قومی تحریک اور اس کی ترجمان انڈین نیشنل کانگریس، برطانوی حکومت کے لیے کسی نقصان کا باعث نہ بن سکے گی۔ دسمبر 1886ء میں تو وائسرائے نے انڈین نیشنل کانگریس کے وفد کے اراکین کو گارڈن پارٹی میں مدعو کیا تھا۔ مگر یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ انڈین نیشنل کانگریس سرکاری افسروں کا آلہ کار نہ بن سکے گی، کیوں کہ وہ رفتہ رفتہ ہندوستانی قوم پرستی کا مظہر بنتی جارہی تھی۔ چنانچہ برطانوی افسروں نے انڈین نیشنل کانگریس کی اور دیگر قومی ترجمانوں کی اعلانیہ نکتہ چینی شروع کر دی۔ 1887ء میں ڈفرن نے اپنی ایک عوامی تقریر میں کانگریس پر حملے کیے اور اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے اسے ایک معمولی اقلیت کا نمائندہ کہا۔ 1900ء میں لارڈ کرزن نے وزیر ہند کو یہ خبر سنائی تھی کہ کانگریس لڑکھڑا کر گرنے والی ہے اور میری عظیم آرزوؤں میں ایک یہ آرزو بھی ہے کہ اپنے ہندوستان کے دوران قیام میں، سکون کے ساتھ مرنے میں اس کی مدد کروں۔ برطانوی افسروں نے لڑاؤ اور حکومت کرو (Divide and Rule) کی پالیسی بھی تیز تر کر دی۔ انہوں نے سید احمد خاں، راجا شیر پرشاد اور دوسرے برطانیہ نواز اصحاب کو کانگریس مخالف تحریکیں چلانے پر آمادہ کیا۔ لیکن قومی تحریک کے فروغ کو روکنے میں سرکاری کوششیں ناکام رہیں۔

3.5 اعتدال پسند قوم پرستی: ایک جائزہ (Moderate Nationalism: An Assessment)

3.5.1 اعتدال پسندوں کی کامیابیاں (Achievements of the Moderates)

بعض ناقدوں کے خیال میں قومی تحریک اور نیشنل کانگریس کو ابتدائی دور میں زیادہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ جن اصلاحات کے لیے قوم پرستوں نے جدوجہد کی تھی، ان میں سے بہت کم حکومت نے قبول کیں۔ ناقدوں کا یہ خیال بھی ہے کہ اُس دور میں قومی تحریک عوام میں جڑ نہیں پکڑ سکی تھی۔ اس تنقید میں کچھ حد تک صداقت ضرور ہے لیکن ناقدوں کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ابتدائی دور میں قومی تحریک سراسر ناکام رہی۔ وسیع پیمانے پر قومی بیداری پیدا کرنے میں وہ کامیاب ثابت ہوئی اور اس نے عوام میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ ایک قوم یعنی ہندوستانی قوم ہیں۔ اس نے لوگوں کو سیاسی کام کی تربیت دی، ان میں جمہوریت اور قوم پرستی کے تصور کو مقبول بنایا، ان میں جدید نقطہ نظر کی تبلیغ کی اور برطانوی حکومت کے نتائج سے انہیں آگاہ کیا۔ سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ برطانوی سامراج کی معاشی ہیئت سے اور اس کے اس کردار سے واقف کرایا کہ اس نے ہندوستان کو خام مال فراہم کرنے والا ملک، برطانوی مال کی منڈی اور برطانوی سرمائے کی کھپت کا ایک میدان بنا دیا

ہے۔اس نے ایک مشترک سیاسی و معاشی پروگرام پیش کیا، جسے قبول کر کے ہندوستانی قوم آگے چل کر سیاسی جدوجہد شروع کر سکتی تھی۔اس نے اس سیاسی حقیقت کو ثابت کر دیا کہ ہندوستان پر ہندوستان کے مفاد میں حکومت کرنی چاہئے۔حب الوطنی کو اس نے ہندوستانی زندگی کا ایک جزو بنا دیا۔ایک طرف اس کی خامیوں کو دور کرنا آنے والی نسلوں کا کام تھا۔ تو دوسری طرف آنے والے زمانے کے لیے اس کی کامیابیاں مضبوط قومی تحریک کی بنیاد بنیں۔

3.5.2 اعتدال پسندوں کی خامیاں (Limitations of the Moderates)

معتدل قوم پرستوں کی سیاست اس عقیدے پر مبنی تھی کہ برطانوی حکومت کی اندرونی طور پر اصلاح کی جاسکتی ہے۔ لیکن سیاسی اور معاشی مسائل کے بارے میں لوگوں کی معلومات میں اضافے نے اس عقیدے کی جڑیں کھوکھلی کر دی۔خود اعتدال پسندوں کی سیاسی تحریک بڑی حد تک اس کی ذمہ دار ہے۔قوم پرست اہل قلم اور سیاسی شورش پیدا کرنے والے لوگ، ہندوستان کی غریبی کا ذمہ دار برطانوی حکومت کو قرار دیتے تھے۔سیاسی سمجھ رکھنے والے ہندوستانیوں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ برطانیہ کا مقصد صرف ہندوستان کا استحصال کرنا اور ہندوستان کو لوٹ کر انگلینڈ کو مالدار بنانا ہے۔انہوں نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ ملک اس وقت تک معاشی اعتبار سے ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ برطانوی حکومت کی جگہ پر ایک ایسی حکومت برسر اقتدار نہ آئے جسے خود ہندوستانی چلاتے ہوں۔قوم پرستوں نے اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ہندوستانی صنعتوں کا فروغ صرف ہندوستانی حکومت ہی کے تحت ممکن ہے جو تحفظ دے کر ان کو ترقی دے سکتی ہے۔غیر ملکی حکومت کے نقصان دہ معاشی نتائج،ان تباہ کن قحط سالیوں کی شکل میں ہندوستانیوں کے سامنے آچکے تھے جنہوں نے 1896 اور 1900 میں لاتعداد انسانی جانیں لی تھی۔

1892 سے لے کر 1905 تک جو سیاسی واقعات ظہور پذیر ہوئے انہوں نے قوم پرست ہندوستانیوں کو مایوس کیا اور وہ تند و تیز سیاسی روش اختیار کرنے پر غور کرنے لگے۔1892 کا انڈین کونسل ایکٹ قطعی مایوس کن تھا کیونکہ اس نے ہندوستانیوں کو ان سیاسی حقوق سے بھی محروم کر دیا تھا جو اس وقت انہیں حاصل تھے۔1898 میں قانون پاس کیا گیا جس کی رو سے غیر ملکی حکومت کے خلاف بے اطمینانی کے جذبات پیدا کرنا جرم قرار دیا گیا تھا۔1899 میں کلکتہ کارپوریشن میں ہندوستانی ممبروں کی تعداد کم کر دی گئی۔1904 میں ہندوستانی سرکاری راز کا قانون (Indian Official Secrets Act) پاس کیا گیا جس نے اخبارات کی آزادی محدود کر دی۔1897 میں ناٹو برادران کو بلا مقدمہ چلائے ہوئے جلاوطن کر دیا گیا، بلکہ عوام کو ان کے جرم سے بھی آگاہ نہیں کیا گیا۔اسی سال لوک مانیہ تلک اور دوسرے ہندوستانی ایڈیٹروں کو غیر ملکی حکومت کے خلاف عوام کو بھڑکانے کے جرم میں قید کی طویل سزائیں دی گئیں۔ان واقعات نے عوام میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ مزید سیاسی حقوق دینے کی جگہ پر حکومت ان حقوق کو بھی چھین رہی ہے جو انہیں حاصل ہیں۔لارڈ کرزن کی کانگریس دشمن روش نے بھی زیادہ سے زیادہ لوگوں کو یقین دلایا کہ برطانوی حکومت کی موجودگی میں ملک کی سیاسی و معاشی ترقی کی توقع کرنا بے سود ہے۔گوکھلے جیسے معتدل لیڈر نے بھی شکوہ کیا کہ نوکر شاہی روز افضوں طور پر خود غرض اور قومی آرزوؤں کی اعلانیہ مخالف ہوتی جا رہی ہے۔سماجی و ثقافتی اعتبار سے بھی برطانوی حکومت کی ترقی پسندی ختم ہو چکی تھی۔پرائمری اور فنی تعلیم آگے نہیں بڑھائی جا رہی تھی۔اس کے

ساتھ ہی سرکاری افسر اعلی تعلیم سے بدظن اور مشکوک ہوتے جارہے تھے اور ملک میں اس کی ترویج و ترقی کی ہمت شکنی کر رہے تھے۔1904 کے انڈین یونیورسٹی ایکٹ نے ہندوستانیوں پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ حکومت یونیورسٹیوں پر سرکاری گرفت کو مضبوط تر کرنا اور اعلی تعلیم کی ترقی کو روکنا چاہتی ہے۔ان حالات نے زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں کا یہ عقیدہ پختہ کر دیا کہ معاشی ایا سی ثقافتی ترقی کے لیے حکومت خود اختیاری کا حصول ضروری ہے اور سیاسی غلامی قوم کے باڑ کو مارنے کے مترادف ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس کے ابتدائی اجلاس 1905 تک

صدر	مقام	سال	اجلاس
ڈبلیو سی بنرجی	ممبئی	1885	پہلا
دادابھائی نوروجی	کولکاتہ	1886	دوسرا
جسٹس بدرالدین طیب جی	چنئی	1887	تیسرا
جارج یول	الہ آباد	1888	چوتھا
سر ولیم ویڈربرن	ممبئی	1889	پانچواں
فیروز شاہ مہتا	کولکتہ	1890	چھٹا
پی آنند اچارلو	ناگپور	1891	ساتواں
ڈبلیو سی بنرجی	الہ آباد	1892	آٹھواں
دادابھائی نوروجی	لاہور	1893	نواں
الفریڈ ویب	چنئی	1894	دسواں
سریندر ناتھ بنرجی	پونا	1895	گیارہواں
رحمت اللہ سیانی	کولکتہ	1896	بارہواں
ایم سی شنکرن نائر	امراوتی	1897	تیرہواں
اے ایم بوس	چنئی	1898	چودھواں
رومیش چندر دت	لکھنؤ	1899	پندرہواں
این جی چندرورکر	لاہور	1900	سولہواں
ڈی ای واچا	کولکتہ	1901	سترہواں
سریندر ناتھ بنرجی	احمد آباد	1902	اٹھارہواں
لال موہن گھوش	چنئی	1903	انیسواں
سر ہنری کاٹن	ممبئی	1904	بیسواں
گوپال کرشن گوکھلے	بنارس	1905	اکیسواں

3.6 اعتدال پسند قوم پرستی کا زوال (Decline of Moderate Nationalism)

انڈین نیشنل کانگریس کے اندر کچھ نوجوان عناصر ابتدائی قوم پرستوں کے کارناموں سے مطمئن نہیں تھے اور اعتدال پسندوں کے پر امن آئینی احتجاج کے طریقوں کے سخت ناقد تھے۔ نوجوان ارکان نے برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی کا مقابلہ کرنے کے لیے یورپی انقلابی طریقوں کو اپنانے کی وکالت کی جب کہ مرکزی دھارے کے اعتدال پسند قوم پرست، ابھی تک برطانوی حکومت کے وفادار رہے اور ان کی خود حکومت حاصل کرنے کی خواہش میں جوش وولولہ نہ تھا۔ ابتدائی قوم پرست اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہے، جس سے رہنماؤں کا ایک اور گروہ پیدا ہوا جسے جارحیت پسند یا انتہا پسند قوم پرست کہا جاتا ہے۔ جارحیت پسند قوم پرستوں کے سب سے نمایاں رہنما بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے اور بپن چندر پال تھے، جنھیں اجتماعی طور پر لال، بال، پال کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 1907 کے سورت اجلاس میں یہ تقسیم کھل کر سامنے آگئی اور جارحیت پسندوں کو کانگریس سے الگ کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے 1916 میں دوبارہ دونوں دھڑوں کے اتحاد تک کوئی اہم پیش رفت نہ ہو سکی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران آزادانہ طور پر مولانا آزاد الہلال اور البلاغ کے ذریعے حکومت پر تنقید کرتے رہے اور بال گنگا دھر تلک، اینی بیسنٹ کے ساتھ مل کر ہوم رول تحریک چلاتے رہے، جب کہ کانگریس اس دوران برطانوی حکومت کی حمایت میں کھڑی رہی کیونکہ اسے امید تھی کہ اس کے بدلے حکومت اس کے مطالبات تسلیم کر لے گی۔ حالانکہ کانگریس کو 1919 کے مونٹیگیو چیمسفورڈ ایکٹ کے ذریعے زیادہ خاص کچھ حاصل نہ ہوا۔ علاوہ ازیں اخبارات کے ذریعے دیگر قوم پرست بھی حکومت پر تنقید کرتے رہے۔ لیکن ان سب سے کوئی کل ہند عوامی تحریک وجود میں نہ آسکی۔ 1916 سے گاندھی، جنوبی افریقہ سے کامیاب ستیہ گرہ تحریک کے بعد واپس آگئے اور چمپارن اور کھیڑا سے برطانوی حکومت کے خلاف مزاحمت شروع کی، جس سے کہ گاندھیائی دور کا آغاز مانا جاتا ہے۔

3.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ہوا جو ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک میں ایک نہایت اہم مرحلہ تھا۔ ابتدائی دور میں ہندوستانی قوم پرستوں نے اپنے سیاسی طور طریقوں میں شدت پسندی سے احتراز کیا۔ وہ حکومت برطانیہ کے وفادار رہے اور انہیں لگتا تھا کہ حکومت برطانیہ کو ہندوستان کے حالات کا صحیح علم نہیں ہے، جس کی وجہ سے عام ہندوستانیوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے مکمل آزادی کے بجائے برطانوی حکومت کے اندر رہ کر حکومت خود اختیاری اور کسی حد تک خود مختاری کے لیے جدوجہد کی۔ اس دور کے حالات پر نظر رکھتے ہوئے ان کا یہ طریقہ کار کافی حد تک صحیح بھی معلوم ہوتا تھا، کیونکہ برطانوی حکومت ایک جابرانہ حکومت تھی جو کسی بھی طریقے کی مزاحمت کو بآسانی کچل سکتی تھی۔ نتیجتاً قومی تحریک ہی خطرے میں پڑ جاتی۔ ایسے میں حکومت ہند سے براہ راست ٹکر لینے کا خطرہ نہیں مول لیا جاسکتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ تحریک کو ابھی عوامی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی اور ابھی اسے عوام میں قوم پرستی اور اپنے حق کے لیے لڑنے کے جذبے کو بیدار کرنا تھا۔ اعتدال پسند رہنماؤں کو برطانوی احساس انصاف اور عدالت پر پورا بھروسہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ عرضداشتوں اور مراسلوں کے ذریعے ہندوستان میں اصلاحات لائی جائیں اور حکومت برطانیہ کو ہندوستانیوں کے حقیقی حالات سے باخبر کیا

جائے۔ حالانکہ اس کے ساتھ ہی انہوں نے برطانوی حکمرانی کی استحصالی نوعیت کا بھی انکشاف کیا اور یہ بتایا کہ کس طرح برطانوی حکومت ہندوستانی نوآبادی سے اس کی تمام دولت کھینچ لینے پر تلی ہوئی ہے۔ دادا بھائی نوروجی کے بقول یہ گرم چھری سے مکھن کاٹنے کے مترادف تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح نوآبادیاتی پالیسیوں سے ہندوستانی مقامی صنعت کی تباہی اور بربادی رونما ہوئی۔ اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود ابتدائی قوم پرستوں کی ناکامی کا سبب یہ بنا کہ وہ کھل کر کبھی بھی برطانوی حکومت کی مخالفت کی ہمت نہ جٹا سکے جس کی وجہ سے آگے چل کر ان کی تحریک سالانہ جلسوں اور عرضداشتوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ 1907 میں سورت تقسیم کے بعد شدت پسندوں کو کانگریس سے نکال باہر کر دیا گیا جس کی وجہ سے برطانوی حکومت کے خلاف کوئی متحدہ محاذ نہ قائم کیا جا سکا اور یہ صرف مہاتما گاندھی کے ہندوستانی سیاست کے میدان میں اترنے کے بعد ہی ممکن ہو سکا۔

3.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

'سوراج' : (حکومت اختیاری) سوراج ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے 'خود حکمرانی۔' ہندوستانی سیاست میں اس کا استعمال غیر ملکی حکمرانی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے کیا گیا۔

تحفظاتی محصول : (Tarrif) کسی ملک کی اپنی صنعت کو بچانے کے لیے دوسرے ملک کے سامان پر لگایا گیا محصول۔

3.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

3.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ہندوستانی قومی تحریک کے ابتدائی مرحلے کو کیا کہا جاتا ہے؟
2. کسی دو اعتدال پسند رہنماؤں کا نام بتائیے۔
3. کیا ابتدائی قوم پرست برطانوی حکومت سے مکمل آزادی چاہتے تھے؟ ہاں/نہیں
4. کس کے طریقوں کو سیاسی گداگری کا نام دیا گیا؟
5. انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس کب منعقد ہوا؟
6. کانگریس کے پہلے اجلاس میں کتنے لوگ شامل تھے؟
7. انڈین نیشنل کانگریس کی ایک برطانوی کمیٹی کا قیام کب عمل میں آیا؟
8. 'ملک پر غیر ملکی سرمائے کا حملہ روز بروز بڑھ رہا ہے' کس نے کہا؟
9. *Poverty and Un-British Rule in India* کس نے لکھی؟
10. جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے حقوق کی مہم کون چلا رہے تھے؟

3.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. کانگریس کے ابتدائی قوم پرستوں کو اعتدال پسند کیوں کہا جاتا تھا؟ مختصر الفاظ میں بتائیے۔
2. اعتدال پسندوں کے سیاسی کام کے طریقوں پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. اعتدال پسندوں کے آئینی اصلاحات کے مطالبات پر مختصر اً روشنی ڈالیے۔
4. ابتدائی قوم پرستوں کی طرف حکومت کا ردعمل بیان کیجیے۔
5. اعتدال پسند قوم پرستی کے زوال پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔

3.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اعتدال پسند قوم پرستی کے عروج وارتقا پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. اعتدال پسندوں کے مطالبات پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. اعتدال پسند قوم پرستی کی کامیابیوں اور خامیوں پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

3.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Argov, D., *Moderates and Extremists in the Indian Nationalist Movement*, *1883–1920*, Bombay, 1967.
2. Bandyopadhyay, Sekhar (ed.), *Nationalist Movement in India: A Reader*, Oxford University Press, New Delhi, 2009.
3. Banerjea, Surendranath, *A Nation in Making*: *Being the Reminiscences of Fifty Years of Public Life*, Oxford University Press, London, 1925.
4. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin Books, New Delhi, 1989.
5. Masselos, Jim, *Indian Nationalism*: *An History*, Sterling Publishers, Bangalore, 1991.
6. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal*: *A New History of British India*, HarperCollins, Noida, 2021.
7. Nandy, Ashish, *The Illegitimacy of Nationalism: Rabindranath Tagore and the Politics of Self*, Oxford University Press, New Delhi, 1994.
8. Rai, Lajpat, *Young India*: *An Interpretation and a History of the Nationalist Movement from Within*, K.L. Tuteja ed., National Book Trust, India, 2021 (first pub. in 1916).
9. Sarkar, Sumit, *Modern India*, *1885–1947*, Macmillan, Madras, 1983.
10. Seth, Sanjay, 'Rewriting Histories of Nationalism: The Politics of 'Moderate Nationalism' in India, 1870–1905', *The American Historical Review*, Vol. 104, No. 1, 1999, pp. 95–116.

اکائی 4۔ انتہا پسند

(The Extremists)

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 انتہا پسند

4.3 انتہا پسندی کے عروج کے اسباب

4.4 انتہا پسندوں کے مقاصد اور طریق ہائے کار

4.5 تقسیمِ بنگال اور سودیشی تحریک کے دوران انتہا پسندوں کا کردار

4.6 سورت اجلاس اور کانگریس میں پھوٹ

4.7 اکتسابی نتائج

4.8 کلیدی الفاظ

4.9 نمونہ امتحانی سوالات

4.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

4.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

4.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید (Introduction)

28دسمبر 1885 کوانڈین نیشنل کانگریس کا قیام جدید ہندوستان کی تاریخ کاایک اہم واقعہ ہے۔اس کے بعد ہندوستان کی تاریخِ آزادی کاایک نیادور شروع ہوتاہے۔انڈین نیشنل کانگریس نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں مرکزی کردار ادا کیا۔ 1885ء سے لے کر تقریباً1905ءتک کانگریس کی سیاست کواعتدال پسندوں (Moderates)کادور کہاجاتاہے۔اعتدال پسندر ہنماؤں میں بنیادی طور پر دادابھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتا، سریندر ناتھ بنرجی، مہادیو گووند راناڈے، بدرالدین طیب جی، گوپال کرشن گوکھلے اور وویش چندبنرجی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اعتدال پسندر ہنما آئینی طریقِ کار سے ہندوستان کی آزادی چاہتے تھے۔انہیں برطانوی حکومت کے عدل وانصاف پر بے پناہ یقین تھا۔اعتدال پسندر ہنماؤں نے دعاؤں، درخواستوں،ارضیوں اور وفود کے ذریعے حکومت کے سامنے اپنے مطالبات پیش کیے۔اس لچک اوراعتدال پسندانہ رویے کی وجہ سے انتہاپسندر ہنماؤں نے اسے سیاسی گداگری (political mendicancy) کانام دیا۔انیسویں صدی کے اواخراور بیسویں صدی کے اوائل میں جب انڈین نیشنل کانگریس کی اعتدال پسند سیاست کی ناکامی واضح ہوگئی توکانگریس کی صفوں میں ابھری ایک نئی جماعت نے پرانے اعتدال پسند قائدین کے نظریات اور طریقوں کی سخت تنقید کی۔ یہ انتہا پسند تحریک بنیادی طور پر برطانوی ہند کے تین صوبوں بنگال، بمبئی اور پنجاب میں بالترتیب بپن چندر پال، بال گنگادھر تلک اور لالہ لاجپت رائے کی قیادت میں شروع ہوئی۔اعتدال پسند سیاست کے برعکس،انتہاپسند نظریات کے حامل رہنماؤں نے خودایثاری، خودانحصاری، سودیشی اور بائیکاٹ جیسے نئے اصول پیش کیے تھے۔ان اصولوں کے ذریعے ان کا مقصد حصولِ سوراج تھا، جسے انہوں نے اپنا آخری ہدف قرار دیا تھا۔اس نظریے کے حامی ایک بنیادپرست پالیسی استعمال کرناچاہتے تھے، جس کے تحت غیر ملکی اشیاءاور حکومت کا بائیکاٹ، دیسی اشیاء کے استعمال اور قومی تعلیم وحکومت کے قیام پر زور دیاگیا۔ان نظریات، طریق ہائے کار اور اصولوں کے ٹکراؤ کی وجہ سے انڈین نیشنل کانگریس سورت میں اپنے تئیسویں اجلاس میں منقسم ہوگئی۔اس اکائی میں ان انتہاپسند نظریات کے عروج وترقی،ان کے عروج کی وجوہات اور ان کے اصولوں اور سرگرمیوں کاایک مختصر جائزہ لینے کے کوشش کی جائے گی۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعدآپ

- انڈین نیشنل کانگریس کے انتہاپسند نظریے اوراس کے عروج کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ان کے اصولوں، مقاصد، حکمت عملی اور سرگرمیوں کے بارے میں اپنی رائے قائم کر سکیں گے۔
- کچھ انتہاپسندر ہنماؤں کے بارے میں دلچسپ معلومات حاصل کریں گے۔
- تقسیم بنگال اور سودیشی تحریک میں انتہاپسند نظریات اور رہنماؤں کے کردار کو سمجھ پائیں گے۔
- سورت اجلاس میں پھوٹ کے بارے میں اہم معلومات سے استفادہ کریں گے۔

4.2 انتہا پسند (Extremists)

انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ایک طرف لوگوں کا سیاسی شعور تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا، اور دوسری طرف برطانوی حکومت سے مراعات حاصل کرنے میں کانگریس رہنماؤں کو زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ نوآبادی استحصال بلا روک وٹوک جاری تھا۔ کسانوں، مزدوروں اور اشراف طبقے میں بڑے پیمانے پر عدم اطمینان اور مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ اعتدال پسند رہنماؤں کی مقبولیت میں مسلسل کمی آرہی تھی۔ حالات نے رہنماؤں کے ایک ایسے طبقے کو آگے لایا جو اپنے مطالبات میں بنیاد پرست تھے اور بنیاد پرست قوم پرستی پر یقین رکھتے تھے۔ سیاسی سرگرمیوں سے متعلق عسکریت پسند قوم پرستانہ نقطہ نظر کی طرف بنیاد پرست رجحانات، جو 1890 کی دہائی میں ابھرنا شروع ہوئے تھے، 1905 تک ٹھوس شکل اختیار کر گئے۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں لبرل یا اعتدال پسند قوم پرستوں کے گداگرانہ رویہ اور ان کی مغرب پر مبنی اخلاقیات اور عام لوگوں سے بیگانگی کو تنقید کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔ اس لبرل قوم پرستی کے جواب میں انتہا پسند لوگوں نے تخلیقی خود ترقی کا راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے دیسی صنعتیں شروع کیں اور مادری زبانوں میں تعلیم کا انتظام کیا جو قومیت کے جذبے سے لبریز تھی۔ اعتدال پسند نظریہ پر پہلا تنقیدی حملہ اربندو گھوش نے اپنی کتاب *New Lamps for Old* کے ذریعے کیا گیا۔ اربندو گھوش کی یہ تحریریں 94-1893 کے درمیان، بمبئی سے شائع ہونے والے اندو پرکاش (*Indu Prakash*) نامی دو لسانی (انگریزی و مراٹھی) اخبار میں شائع ہوئیں تھی۔ انتہا پسند نظریے کے اصولوں، مقاصد اور اُن کے کام کرنے کے طریقے پر روشنی ڈالنے سے قبل ہمارے لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریے کے عروج کی وجہ کو سمجھ لیا جائے۔

4.3 انتہا پسندی کے عروج کے اسباب (Reasons for the Rise of Extremism)

انتہا پسندوں کے عروج کی سب سے اہم وجہ اعتدال پسندوں کی ناکامی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ برطانوی حکومت ان کے کسی بھی اہم مطالبے کو تسلیم نہیں کر رہی تھی۔ سیاسی طور پر باخبر افراد میں سے عسکریت پسند زیادہ مایوس ہو گئے اور سیاسی کارروائی کے زیادہ موثر طریقے تلاش کرنے لگے۔ یہاں تک کہ خود اعتدال پسند رہنما بھی کانگریس کے ابتدائی دور میں حاصل کردہ کامیابیوں سے مطمئن نہیں تھے۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ برطانوی حکمرانوں نے ہمیں دھوکہ دیا ہے۔ یہ احساس زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگا کہ ہندوستان کو ترقی کی راہ پر صرف ایک ہندوستانی حکومت (سوراج) ہی لے جاسکتی ہے۔ اس لیے کانگریس کے اندر لوگوں کا ایک گروہ ابھرا جس نے نئے نظریات اور اصولوں کے ساتھ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی جو ابتدائی کانگریس کی پالیسیوں سے مختلف تھے۔ کانگریس کی مصنوعی شکل اس مسئلے کی مکمل کم ذمہ دار تھی۔ کانگریس کے آغاز میں سماج کا صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بشمول زمیندار، ڈاکٹر، انجینئر، صحافی، وکیل اور تاجر وغیرہ اس کے شرکاء تھے۔ اس کا معاشرے کے نچلے یا متوسط طبقے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اروبندو گھوش کے مطابق کانگریس محنت کش طبقے سے دور ایک غیر قوم پرست اور مکمل طور پر ناکام تنظیم رہی ہے۔ قومی سرگرمیوں کے پہلے دور نے لوگوں میں سودیشی اور خود انحصاری کو بڑھایا۔ تلک، اروبندو اور بپن چندر پال نے بار بار قوم پرستوں پر زور دیا کہ وہ ہندوستانی عوام کی صلاحیتوں پر بھروسہ رکھیں۔ جہاں ایک طرف تعلیم کے پھیلاؤ سے عوامی بیداری میں اضافہ ہوا، وہی دوسری طرف تعلیم یافتہ طبقے میں بے روزگاری کے اضافے نے غربت اور

نوآبادیاتی دور میں ملکی معیشت کی پسماندہ حالت کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ ہندوستان میں مغربیت صرف ہندوستان کی تباہی کا باعث بنی، جس کے ذریعے ہندوستانی قومی شناخت کو برطانوی سلطنت میں غرق کرنے کی کوشش کی گئی۔

انتہا پسند اعتدال پسند نظریہ سے مکمل طور پر غیر مطمئن اور ناراض تھے۔ ان کے مطابق، کانگریس کا سیاسی مذہب صرف تاجِ برطانیہ (British Crown) سے وفاداری کا اظہار کرنا، مرکزی اور صوبائی قانون ساز کونسلوں میں اپنے لیے رکنیت حاصل کرنا، (بقول اشونی کمار دت) سال میں ایک بار 'تین دن کے تماشے' کے دوران بحث کرنا، قرار دادیں پاس کرنا اور پھر بکھر جانا تھا۔ اس کے ارکان زیادہ تر جز وقتی سیاست دان تھے، جو اپنی زندگی میں کامیاب پیشہ ور تھے۔ خود تلک نے ان لوگوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ سال میں ایک بار برساتی مینڈک کی طرح ٹرّانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ برطانوی حکومت کی طرف سے کانگریس کے مطالبات کو مسلسل نظر انداز کرنا بھی انتہا پسندی کی ظہور کا اہم وجہ بن گیا۔ انڈین کونسل ایکٹ (1892)، جو انتظامیہ میں ہندوستانیوں کی حصہ داری بڑھانے اور قانون سازی کے کام کو جمہوری بنیادوں پر نافذ کرنے کے لیے لایا گیا تھا، مکمل طور پر مایوس کن رہا۔ لالہ لاجپت رائے نے کہا تھا کہ شکایات کے ازالے اور مراعات کے حصول کے لیے بیس سال سے زیادہ کی کوششوں کے نتیجے میں انھیں روٹی کے بجائے پتھر ملا۔ حکومت کی لاپرواہی کے رویے نے انتہا پسند رہنماؤں کو حکومت کے خلاف سخت اقدامات اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ لالہ لاجپت رائے نے کہا کہ ہندوستانیوں کو اب بھکاری بن کر مطمئن نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی انگریزوں کے احسانات کی بھیک مانگنی چاہیے۔

کیمبرج مکتبہ فکر کے مفکرین نے کانگریس کے اندر گروہ بندی کو انتہا پسندوں کے عروج کی ایک اہم وجہ قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق ہر گروہ کانگریس پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ہندوستان میں منظم عوامی زندگی کی تقریباً ہر سطح پر بہت سے گروہ واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ بنگال میں برہمو سماج کے اندر تقسیم اور دو اخباری گروہوں کے درمیان تلخ دشمنی تھی۔ اعتدال پسند رہنما سریندر ناتھ بنرجی کی ترمیم کردہ 'بنگالی' اور انتہا پسند رہنما موتی لال گھوش کی ترمیم کردہ 'امرت بازار پتریکا' کے درمیان لڑائی اس وقت سے جاری تھی جب انڈین ایسوسی ایشن نے اپنے قیام کے بعد انڈین لیگ پر اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ اسی طرح وندے ماترم کے ایڈیٹر کے عہدے کو لے کر ایک طرف اربندو گھوش اور دوسری طرف بپن چندر پال اور برہما باندھو اپادھیائے (Brahmabandhav Upadhyay) کے درمیان ٹکراؤ نظر آتا ہے۔ یہ گروہ بندی پنجاب میں زیادہ واضح تھی۔ لاہور برہمو سماج میں تین گروہ قائم ہو چکے تھے، اسی طرح آریہ سماج میں بھی تقسیم ہو چکی تھی۔ دیانند کی وفات کے بعد، پنجاب میں آریہ سماج کے اعتدال پسند کالج گروہ اور انتہا پسند احیا پسند گروہ کے درمیان پھوٹ پیدا ہو چکا تھا۔ یہ کشمکش لالہ ہری کرشن لال اور لالہ لاجپت رائے کے درمیان بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مہاراشٹر میں پونا سارو جنک سبھا پر کنٹرول کے لیے بال گنگادھر تلک اور گوکھلے کے درمیان مقابلہ تھا۔ یہ تنازعہ 1895ء میں اس وقت کھل کر سامنے آیا جب تلک نے تنظیم کو سنبھالا اور گوکھلے نے اس کی مخالفت میں دکن سبھا کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کر دی۔ واش بروک نے مدراس کا تجزیہ بھی اسی بنیاد پر کیا ہے۔ اُن کی تحقیق کے مطابق مدراس میں تین گروپ آپسی ٹکراؤ میں مصروف تھے۔ اس بنیاد پر کیمبرج اسکالروں کا خیال ہے کہ کانگریس کی تقسیم انتہا پسندی کے عروج اور گروہوں کے ٹکراؤ پر مشتمل تھا۔

ظاہر ہے کہ کیمبرج مکتبہ فکر کا یہ تجزیہ حقائق کی بنیاد پر درست معلوم ہوتا ہے لیکن انہوں نے اس گروہ بندی نظریہ پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ یہ سمجھنا بھی مشکل ہے کہ حریف گروہ کانگریس پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اتنا بے چین کیوں تھا، جبکہ اس وقت کانگریس کے پاس نہ تو کوئی باقاعدہ سیاسی پلیٹ فارم تھا اور نہ ہی کسی بڑی سیاسی تحریک کی قیادت کرنے کی حالت میں تھی۔ کانگریس کی حیثیت محض ایک سالانہ پلیٹ فارم سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ اور نہ ہی اس کے پاس کوئی بڑا خزانہ تھا جس پر قبضہ کرنے کے لیے ان حریف گروہوں میں لڑائی ہوتی۔

مندرجہ بالا وجوہات کے علاوہ برطانوی منتظم بالخصوص لارڈ کرزن کی جارحانہ اور جابرانہ پالیسیوں نے بھی انتہا پسندوں کے عروج میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے بہت سے عوام مخالف قانونی اور انتظامی اقدامات اٹھائے جس سے پڑھے لکھے ہندوستانیوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ 1899 میں کلکتہ میونسپل ترمیمی قانون کے ذریعے کلکتہ میونسپل کارپوریشن میں منتخب نمائندوں کی تعداد کو کم کیا گیا۔ اسی طرح 1904ء میں انڈین یونیورسٹی ایکٹ نے کلکتہ یونیورسٹی کو مکمل حکومتی کنٹرول میں لا دیا تھا۔ اگرچہ کرزن نے اس قانون کو تعلیمی معیار کو بڑھانے کی کوشش کے طور پر پیش کیا تھا، لیکن اس قانون کے ذریعے کالجوں کے الحاق اور مالی امداد پر حکومتی کنٹرول قائم کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سینیٹ کے منتخب اراکین کی تعداد کم کر دی گئی اور ان کی جگہ نامزد اراکین کی تعداد بڑھا دی گئی، جو حکومت کے حامی ہوا کرتے تھے۔ اس قانون کے ذریعے 1905 عیسوی کے بعد طلباء کی تشدّد پسندی کو کنٹرول کرنے کے لیے بہت سارے من مانی طریقے استعمال کیے گئے۔ اس کے علاوہ سب سے سنگین مرحلہ تقسیم بنگال کی صورت میں سامنے آیا جس نے انتہا پسند نظریات کو جنم دینے میں بہت اہم کردار ادا کیا جس کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ بنگال کی اس تقسیم کے ذریعے، کرزن بنگالی قوم پرستوں کو کمزور کرنا چاہتا تھا جو کانگریس کو کنٹرول کر رہے تھے۔ کرزن نے خود 1900ء میں سیکرٹری آف اسٹیٹ ہیملٹن کو ایک خط لکھا، جس میں انہوں نے کہا کہ کانگریس اپنے زوال کی طرف بڑھ رہا ہے اور میری دلی خواہش ہے کہ اپنے دور حکومت میں اسے اپنے انجام تک پہنچتا دیکھوں۔ لیکن کانگریس کو کمزور کرنا تو بہت دور، کرزن کے اقدامات نے اس کے احیاء کے لیے ایک لائف لائن کا کام کیا۔ اس کے بعد انتہا پسند رہنماؤں نے کانگریس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تاکہ اسے نوآبادیاتی حکمرانی کے ساتھ براہ راست اور عسکری تصادم کی راہ پر گامزن کیا جا سکے۔

انیسویں صدی کے آخری سالوں میں ہندوستان کی بگڑتی ہوئی معاشی حالت نے ہندوستانی قومی عمل میں انتہا پسندی کے عروج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ 97-1896 اور 1900-1899 کے شدید قحط اور مہاراشٹر میں پھیلنے والے طاعون (plague) کے نتیجے میں لاکھوں افراد مر گئے۔ حکومتی امداد بھی محدود اور انتہائی غیر منظم رہی۔ طاعون کی تحقیقات کے بہانے برطانوی افسران گھروں میں گھس کر خواتین کے ساتھ بدتمیزی اور فحش حرکتیں کیا کرتے تھے۔ جب تلک نے اپنے اخبار 'کیسری' میں اس فعل پر تنقید کی تو انہیں 1897ء میں 18 ماہ سخت قید کی سزا سنائی گئی۔ تلک کے مطابق سرکاری اہلکار بہت سخت اور بدعنوان تھے اور وہ مددگار ہونے کے بجائے بہت نقصاندہ ثابت ہوتے تھے۔ طاعون کے دوران مظالم سے متاثر ہو کر بال کرشن ہری چاپیکر(Balkrishna Hari Chapekar)) وسودیو ہری چاپیکر(Vasudeo Hari Chapekar) نے کمشنر برائے وباء والٹر چارلس رینڈ (Walter Charles Rand)اور لیفٹیننٹ ائرسٹ (Ayerst) کو قتل کر دیا۔ عوام بھی قحط کو حکومتی پالیسیوں کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ اور اس دوران دہلی دربار کی تنظیم نے عوام

کو مزید ناراض کر دیا۔ 1903 میں کانگریس کے صدارتی خطاب میں لال موہن گھوش نے حکومت کی جانب سے غریب عوام پر بھاری ٹیکس لگانے اور ایک شاندار جشن منانے پر تنقید کی جبکہ اسی دوران لاکھوں لوگ بھوک سے فوت ہو رہے تھے۔ ان واقعات سے یقیناً انتہا پسند تحریک کو حوصلہ ملا ہو گا۔

سوامی وویکانند، بنکیم چندر چٹر جی اور سوامی دیانند سرسوتی جیسے دانشوروں نے بہت سے نوجوان قوم پرستوں کو اپنے مضبوط اور واضح دلائل سے متاثر کیا۔ انہوں نے ہندوستان کے سنہری ماضی کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ ان مفکرین نے ماضی میں ہندوستانی تہذیب کی فراوانی کا حوالہ دے کر مغربی برتری کے افسانوں کو توڑ دیا۔ نوجوان پُرامن اور آئینی احتجاج کے طریقوں پر سخت تنقید کرتے تھے جنہیں 'تین استدعاؤں' یعنی دعا، درخواست اور احتجاج (Prayers, Petitions, and Protest) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان طریقوں کو انتہا پسندوں نے سیاسی گداگری کے نام سے موسوم کیا۔ تقسیمِ بنگال کی تحریک کے دوران اعتدال پسندوں کی پرامن کوششوں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ مورلے نے تقسیم واپس لینے کے بجائے اس کی تصدیق کی، جس کی وجہ سے انتہا پسندوں میں غصہ پھیل گیا۔ اعتدال پسند بھی حکومت کے جابرانہ اقدامات سے غیر مطمئن تھے۔ عوامی جلسوں اور پریس پر پابندی عائد کی گئی۔ تحریک کے کارکنوں کے خلاف مقدمات درج کر کے انہیں سزائیں دی جا رہی تھیں۔ تحریک کے متعدد حامیوں کو جلاوطن کر دیا گیا اور طلباء پر غیر انسانی مظالم ڈھائے گئے۔

اخبارات، رسائل و مجلات نے انتہا پسند قوم پرستی کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دوران ہندوستان میں بے شمار اخبارات اور رسائل شائع ہوئے جس نے لوگوں میں سیاسی بیداری اور قومی جذبہ بیدار کرنے میں بے مثال کردار ادا کیا۔ 1870ء تک برطانوی ہندوستان میں تقریباً 650 اخبارات شائع ہو چکے تھے۔ سمیت سرکار کے مطابق 1885ء میں 299,000 اخبارات شائع ہوئے اور 1905ء تک ان کی تعداد 817,000 تک پہنچ گئی۔ ان میں سے اکثر اخبارات مقامی زبانوں میں شائع ہوتے تھے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان اخبارات و رسائل کی اشاعت مغربی اثرات کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی لیکن انتہا پسند رہنماؤں نے ان رسائل میں برطانوی حکومت کی مخالفت اور اعتدال پسند رہنماؤں کی ناکامیوں کو بڑھ چڑھ کر پیش کیا۔ ان میں مراٹھا، کیسری، *Dawn*، سنجیونی، پنجابی، *Young India* وغیرہ نے سودیشی تحریک کے دوران خوب شہرت حاصل کی۔ سودیشی تحریک کے دوران کیسری کی روزانہ بیس ہزار کاپیاں شائع ہوتی تھی۔ اس طرح ان اخبارات اور رسائل نے انتہا پسندی تحریک کو توسیع دینے میں کافی اہم تعاون ادا کیا۔

4.4 انتہا پسند قوم پرستوں کے مقاصد اور طریقہ ہائے کار

(Objectives and Methods of Extremist Nationalists)

جب ہم اعتدال پسند جماعت کے اصول اور طریقِ کار کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے اعتدال پسند رہنماؤں کو برطانیہ کی انصاف پسندی پر اٹل یقین تھا۔ وہ برطانوی راج کے حامی اور مداح تھے۔ انہوں نے کبھی حکومت سے لڑائی کی بات نہیں کی۔ اس لیے انہوں نے دعاؤں، درخواستوں، عرضیوں، میمورنڈم اور وفود کے ذریعے حکومت پر زور دے کر اپنے جائز مطالبات تسلیم کرانے کی کوشش کی۔ برطانوی

حکومت سے عقیدت رکھنے والے رہنماؤں کے طریقے اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ یہ آزاد خیال رہنما مکمل طور پر قانونی طریقوں پر منحصر تھے۔ وہ ہر سال کانگریس کے اجلاسوں میں منظور ہونے والے مطالبات کو اخبارات اور تقاریر کے ذریعے عام لوگوں تک پہنچاتے تھے اور حکومت ہند برطانوی کی خدمت میں بڑی بڑی عرضداشتیں اور میمورنڈم پیش کرتے تھے جس میں نہایت شائستہ زبان استعمال کی جاتی تھی۔

اس کے برعکس، انتہا پسند جماعت کے رہنماؤں نے اپنے مطالبات کی منظوری کے لیے کچھ سخت طریقے اپنائے۔ درخواستوں اور میمورنڈم کے پرانے طریقوں کے برعکس اُنہوں نے سول نافرمانی کے طریقوں پر عمل کیا۔ انتہا پسندوں نے غیر ملکی اشیاء اور مصنوعات کے بائیکاٹ اور دیسی اشاء کو اپنانے کا نعرہ لگایا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے بنارس(1905) اور کلکتہ(1906) اجلاس میں کانگریس کے دونوں جماعتوں کے درمیان بائیکاٹ، سودیشی اور سوراج کے حوالے سے گرما گرم بحث ہوئی۔ اس کے ساتھ قومی تعلیم اور ستیہ گرہ پر بھی زور دیا گیا۔ اس طرح وہ اپنا مقصد یعنی سوراج حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لالہ لاجپت رائے نے کہا کہ سودیشی کے فروغ سے انگریزوں کو مالی نقصان ہوگا، جس کی وجہ سے ہم انگریزوں پر دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ اس نئی سیاست کو نئے علاقائی ادب سے نظریاتی تحریک ملی، جس نے ہندوستانی قوم کو اس کے مخصوص ثقافتی ورثے یا تہذیب کی بنیاد پر بیان کرنے کے لیے بحث کی بنیاد بنائی۔ حکومت کے زیر کنٹرول اداروں کی جگہ ایک قومی تعلیمی منصوبہ بھی بنایا گیا۔ انتہا پسند گروہ کا منصوبہ طلباء کو بھی تحریک کا حصہ بنانا تھا۔ جب حکومت نے سودیشی تحریک کے دوران طلبہ کے خلاف تادیبی کارروائی کی دھمکی دی تو طلبہ کو یونیورسٹیاں چھوڑنے کے لیے کہا گیا۔ سر گروداس بنرجی نے بنگال میں نیشنل کونسل آف ایجوکیشن تشکیل دیا۔ مدراس میں پچائیپا نیشنل کالج (Pachaiyappa National College) قائم ہوا۔ اسی اثناء میں پنجاب میں ڈی اے وی تحریک نے بھی زور پکڑ لیا۔

انتہا پسندوں نے تعاون کرنے والی تنظیموں کو بھی فروغ دیا۔ دیہی صفائی، حفاظتی پولیس کے کام، وغیرہ کے لیے رضاکارانہ تنظیمیں قائم کی گئیں۔ اس تحریک کا مقصد بپن چندر پال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ عوام میں کوآپریٹو اداروں کی مدد سے مشترکہ بھلائی کے لیے ایک طاقتور شہری احساس بیدار کرنا، آہستہ آہستہ آزاد شہری کی طویل اور بھاری ذمہ داریوں سے متعلق تربیت دینا اور پھر پورے ملک میں فعال سیاسی ادارے قائم کرنا ہے، تاکہ لیڈر عوام سے براہ راست رابطہ قائم کر سکیں اور منظم رائے عامہ کے ذریعے حکومت پر وقتاً فوقتاً دباؤ ڈالا جا سکے جس سے عام لوگوں کے حقوق میں بتدریج اضافہ ہوتا رہے۔

4.5 تقسیمِ بنگال اور سودیشی تحریک کے دوران انتہا پسندوں کا کردار

(Role of the Extremists during the Partition of Bengal and the Swadeshi Movement)

سودیشی تحریک دراصل تقسیمِ بنگال کے خلاف ایک تحریک کے طور پر شروع ہوئی تھی۔ تقسیمِ بنگال کا پہلا عوامی اعلان دسمبر 1903 میں کیا گیا تھا۔ اس تقسیم کا سبب بنگال پریزیڈنسی ک توسیع تھی، اس لیے اس کے انتظامی کاموں کو آسان بنانے کے لیے تقسیم ضروری تھا۔ لیکن اس وقت تقسیمِ بنگال عمل میں نہ آسکا۔ کرزن نے 1905 میں بنگال کو فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کیا۔ برطانوی حکومت کے لیے اس

تقسیم کا مقصد انتظامیہ کو آسان بنانا تھا۔ لیکن حقیقت اس سے مختلف تھی۔ دراصل کرزن بنگال میں پھیلی ہوئی قومی طاقت کو توڑنا چاہتا تھا۔ اتنی بڑی ریاست کا نظم و نسق چلانا واقعی مشکل تھا لیکن انگریزوں نے اس ریاست کو تقسیم کرنے کا فیصلہ انتظامی وجوہات پر نہیں بلکہ سیاسی وجوہات کی بنیاد پر کیا۔ بنگال ہندوستان میں ترقی پذیر قومی شعور کا مرکز تھا۔ انگریزوں نے تقسیمِ بنگال کا فیصلہ اسی قومی شعور پر حملہ کرنے کے مقصد سے کیا تھا۔ حکومت ہند کے اس وقت کے ہوم سکریٹری ریسلی نے کہا کہ غیر منقسم بنگال ایک عظیم طاقت ہے۔ تقسیم ہونے سے یہ کمزور ہو جائے گا، اور اس سے ہمارے دشمن تقسیم ہو کر کمزور ہو جائیں گے۔ اس تقسیم کے ذریعے اصل بنگال میں بنگالیوں کی آبادی کو کم کر کے انہیں اقلیت میں شامل کرنا تھا۔ اس کے علاوہ اس تقسیم کی ایک اور بنیاد مذہبی بھی تھی۔

تقسیم سے پہلے بنگال میں مغربی بنگال، بنگلہ دیش، بہار اور اڑیسہ کے علاقے شامل تھے، جس کا رقبہ 189000 مربع کلومیٹر اور آبادی تقریباً 8 کروڑ تھی۔ یہ علاقہ اس وقت تقریباً فرانس کے برابر تھا۔ تقسیم کے بعد ڈھاکہ، چٹاگانگ اور راجشاہی حصوں کو بنگال سے الگ کر کے آسام کے ساتھ ملا دیا گیا اور مشرقی بنگال اور آسام کے نام سے ایک نیا صوبہ تشکیل دیا گیا جس کا دارالحکومت ڈھاکہ منتخب کیا گیا۔ بقیہ حصہ مغربی بنگال رہا جس کا دارالحکومت کلکتہ رکھا گیا۔ حکومت نے تقسیم کا خاکہ 19 جولائی 1905 کو عوام کے سامنے پیش کیا اور اگلے ہی دن یعنی 20 جولائی کو بنگال کی تقسیم کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان کے مطابق 16 اکتوبر 1905 کو تقسیمِ بنگال عمل میں لایا گیا۔

تقسیمِ بنگال کے خلاف احتجاج میں سودیشی اور بائیکاٹ تحریکوں نے جنم لیا۔ پہلی بار، 13 جولائی 1905 کو، کرشن کمار مترا نے اپنے میگزین 'سنجیوانی' میں تقسیمِ بنگال کے خلاف سودیشی اور بائیکاٹ کی تحریک کے بارے میں بات کی۔ اس کے لیے 7 اگست 1905 کو کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں منیندر راناتھ کی قیادت میں ایک تاریخی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا اور وہاں سے سودیشی تحریک کا باقاعدہ اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد پورے بنگال میں عوامی جلسے ہوئے، جن میں دیسی یعنی ہندوستانی اشیا کے استعمال اور برطانوی سامان کے بائیکاٹ کے فیصلے کیے گئے۔ کئی مقامات پر غیر ملکی کپڑوں کو جلایا گیا اور غیر ملکی اشیاء فروخت کرنے والی دکانوں پر دھرنے لگائے گئے۔ لوگوں نے برطانوی اشیاء، سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں وغیرہ کا بائیکاٹ کیا۔ اس تحریک میں ہندو اور مسلم طلبہ نے بڑی تعداد میں حصہ لیا۔ عبدالرسول، لیاقت حسین، مظفر خان وغیرہ اس تحریک کے ممتاز مسلم رہنما تھے۔ تقسیمِ بنگال کے دن (16 اکتوبر 1905) کو یوم سوگ کے طور پر منایا گیا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے کہنے پر لوگوں نے اس دن کو رکھشا بندھن کے دن کے طور پر منایا تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باہمی بھائی چارہ اور محبت بڑھ سکے۔ تقسیمِ بنگال کے موقع پر رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنا مشہور گانا 'آمر سونار بنگلہ' لکھا جو بعد میں بنگلہ دیش کا قومی ترانہ بن گیا۔ اس تحریک کا مرکزی گیت وندے ماترم بن گیا، جو بنکم چندر چٹرجی کے ناول 'آنند مٹھ' سے ماخوذ ہے۔ سریندر ناتھ بنرجی، کرشن کمار مترا، پرتھوی چندر رائے اور ستیش چندر مکھرجی جیسے لیڈروں نے بنگالی، سنجیوانی، ہت وادی اور ڈان (*Dawn*) جیسے اخبارات اور رسائل کے ذریعے تقسیم کی تجویز کے خلاف تحریک چلائی۔ کلکتہ کی سڑکوں پر جلوس نکالے گئے اور ہڑتالیں کی گئیں۔ سریندر ناتھ بنرجی اور آنند موہن بوس نے دو بڑے جلسوں سے خطاب کیا۔ ایک جلسہ عام میں 50 ہزار اور دوسرے جلسے میں 75 ہزار لوگ جمع تھے۔ اس سے پہلے کبھی اتنی بڑی تعداد میں لوگ اس قومی تحریک کے جھنڈے تلے جمع نہیں ہوئے تھے۔

نوجوان اس تحریک کی جان تھے جس کے نتیجے میں برطانوی حکومت نے اس تحریک کو دبانے کے لیے 22 اکتوبر 1905 کو کارلائل مراسلہ ('Carlyle Circular') جاری کیا۔ اس میں بنگال حکومت کی طرف سے تمام ضلع مجسٹریٹوں کو مطلع کیا گیا تھا کہ تمام سرکاری امداد یافتہ اسکولوں اور کالجوں کے پرنسپلوں کو سخت ہدایات دی جائیں کہ اگر ان کے طلباء اس تحریک کا حصہ بنتے ہیں تو ان کی سرکاری مالی امداد بند کر دی جائے گی۔ اس حکم نامے پر بنگال کے چیف سکریٹری آر۔ ڈبلیو۔ کارلائل نے دستخط کیے تھے، اس لیے اسے کارلائل سرکلر کے نام سے جانا گیا۔ اس مراسلے کے خلاف شدید رد عمل ہوا۔ 16 نومبر 1905 کو کلکتہ میں ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد کی گئی، جس میں رابندر ناتھ ٹیگور، سریندر ناتھ بنرجی، بپن چندر پال جیسے معروف رہنما موجود تھے۔ اس کانفرنس میں نیشنل ایجوکیشن کونسل (National Education Council) کے قیام کا فیصلہ کیا گیا، جو 15 اگست 1906 کو قائم کر دیا گیا۔ اس کونسل کا مقصد قومی کنٹرول کے ذریعے عوام کو ایسی ادبی، سائنسی اور فنی تعلیم فراہم کرنا تھا جو قومی زندگی کے دھارے سے جڑی ہو۔ اسی کے مطابق 15 اگست 1906 کو بنگال نیشنل کالج قائم کیا گیا۔ اربندو گھوش کو اس کالج کا پہلا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ ستیش چندر مکھرجی کی طرف سے 1902 میں قائم کی گئی ڈان سوسائٹی نے بنگال میں قومی تعلیم کو پھیلانے کا فریضہ بھی خوب انجام دیا۔ اس تحریک میں دیسی فن کی ترقی بھی نظر آتی ہے۔ دیویندر ناتھ ٹیگور کے بھائی اسنیدر ناتھ ٹیگور نے قدیم ہندوستانی فن کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کے لیے 1906 میں انڈین سوسائٹی آف اورینٹل آرٹس (Indian Society of Oriental Arts) کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے نے منتخب نمایاں فنکاروں کو وظائف بھی فراہم کیے تھے۔ اس ادارے کی طرف سے پہلا وظیفہ نندلال بوس کو دیا گیا تھا۔ سودیشی تحریک میں پہلی بار سماج کے تقریباً ہر طبقے نے حصہ لیا۔ اس جدوجہد آزادی میں پہلی بار خواتین نے حصہ لیا اور پہلی بار محنت کش طبقے کے مسائل کو سیاسی شکل دی گئی۔ خواتین نے غیر ملکی چوڑیاں اور برتن استعمال کرنا چھوڑ دیا، دھوبی نے غیر ملکی کپڑے دھونے سے انکار کر دیا اور پجاریوں نے غیر ملکی چینی سے بنے پرساد (تبرک) کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

شروع میں، سودیشی تحریک میں اعتدال پسند اور انتہا پسند دونوں کا کردار یکساں نظر آتا ہے، لیکن آہستہ آہستہ انتہا پسندوں کی گرفت مضبوط ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ انتہا پسند نظریے نے لوگوں کو تحریک کے لیے زیادہ ترغیب دی۔ اعتدال پسندوں کا خیال تھا کہ پرامن تحریک عدم تعاون کے ذریعے کامیابی حاصل کر سکتی ہے، لیکن انتہا پسندوں کا خیال تھا کہ اگر چوکیدار، کانسٹیبل، معاون، منصف اور کلرک کام کرنا چھوڑ دیں تو منٹوں میں آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ انتہا پسند نظریات کے حامل کچھ رہنما پر تشدد مزاحمت کی تیاریوں میں بھی مصروف تھے۔ انکا خیال تھا کہ اگر سرکار تشدّد کا سہارا لیتی ہے تو اس کے جواب کے لیے ہمیں بھی تیار رہنا چاہیے۔ مثال کے طور پر اروند گھوش جیسے انتہا پسند رہنما انقلاب پسندوں سے مسلسل رابطے میں رہے۔ اسی طرح جس چیز نے اس تحریک کو کامیاب بنانے میں سب سے اہم کردار ادا کیا وہ بائیکاٹ تھا، اور اس کا پرچار انتہا پسند رہنماؤں نے ہی کیا۔ اس تحریک میں رضاکارانہ تنظیموں نے بھی اہم کردار ادا کیا، جن میں ڈان سوسائٹی اور سودیش بندھو سمیتی کی خدمات قابل تعریف ہیں۔ ان تمام تنظیموں کا تعلق انتہا پسند رہنماؤں سے تھا۔ باریسال کے ایک استاد اشونی کمار دت نے سودیشی تحریک کے دوران 'سودیشی بندھب سمیتی' (Swadeshi Bandhab Samiti) بنائی تھی۔ یہ ایک ایسی تنظیم تھی جس نے زیادہ تر مسلم کسانوں کو سودیشی تحریک کے لیے متاثر کیا۔ بعد میں اس تنظیم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے پریشان ہو کر برطانوی حکومت نے

1908ء میں اس پر پابندی لگادی۔

سودیشی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے انتہا پسند رہنماؤں نے روایتی تہواروں، مذہبی میلوں، لوک روایات، لوک موسیقی اور لوک تھیٹر کے اسٹیجز کا بھی سہارا لیا۔ تلک کے زیر اہتمام گنپتی مہوتسو(1893)اور شیواجی جینتی(1897) نے اس تحریک کو بہت مقبول بنایا۔ مغربی ہندوستان میں شروع ہونے والے اس تہوار نے بنگال کے لوگوں تک سودیشی تحریک کا پیغام پہنچانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ سودیشی تحریک کی ایک اور خصوصیت خودانحصاری اور خودایثاری کا نعرہ تھا۔ مشتعل افراد کا خیال تھا کہ حکومت کے خلاف جدوجہد جاری رکھنے کے لیے لوگوں میں خودانحصاری کا جذبہ بیدار کرنا بہت ضروری ہے۔اورانتہاپسند رہنماؤں نے اس کام کو بخوبی نبھایا۔

انتہاپسندوں کی کوششوں کی وجہ سے سودیشی اور بائیکاٹ کی تحریکیں پورے ملک میں پھیل گئی۔ بال گنگادھر تلک نے ممبئی اور پونے میں اس تحریک کا پرچار کیا۔اجیت سنگھ اور لالہ لاجپت رائے اس تحریک کو پنجاب اور اتر پردیش کے دیگر علاقوں میں لے گئے۔ شمالی ہندوستان میں سودیشی تحریک نے راولپنڈی، کانگڑا، ملتان اور ہریدوار میں زور پکڑا۔ سید حیدر رضا نے دہلی میں اس تحریک کی قیادت کی۔ چدمبرم پلئی نے مدراس پریذیڈنسی میں اس کی قیادت کی جہاں بپن چندر پال نے اپنی تقریروں سے تحریک کو مزید مضبوط کیا۔ بال گنگادھر تلک انتہا پسند رہنماؤں میں سرخیل تھے۔انہوں نے سودیشی تحریک کو نہ صرف مہاراشٹر بلکہ پورے ہندوستان میں پھیلانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ مہاراشٹرا میں انہوں نے اس تحریک کو پھیلانے کے لیے سودیشی واستو پرچارنی سبھا (Swadeshi Vastu Pracharini Sabha) قائم کی تھی۔ تلک نے قوم پرستی کے جذبے کو پھیلانے کا ایک شاندار اور منفرد طریقہ دریافت کیا۔1893 میں پہلی بار، اُنہوں نے گنپتی مہوتسو منایا، جو پورے مہاراشٹر میں بڑے جوش اور عقیدت کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ یہ تہوار قوم پرستی کے پرچار کا ایک ذریعہ بنا لیکن اُسکے کچھ منفی اثرات بھی ظاہر ہوئے۔اسی طرح انہوں نے 1896 میں شیواجی جینتی کی تقریبات کو استعمال کیا اور نوجوان مراٹھوں کو قومی جدوجہد کے لیے تیار کیا۔ شاید وہ پہلے قوم پرست رہنما تھے جنہوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ کسانوں، مزدوروں اور کاریگروں کا قومی تحریک میں ایک اہم کردار ہو سکتا ہے اور اس لیے ان لوگوں کو بھی کانگریس سے وابستہ ہونا چاہیے۔

اپنے نظریات اور سودیشی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے تلک نے اپنے اخبار 'کیسری' کے ذریعے بہت سے رسالے شائع کیے۔ سودیشی تحریک کے دوران اس اخبار کی شہرت اتنی بڑھ گئی کہ 08-1907 میں اس کی بیس ہزار کاپیاں شائع کی گئی۔ تلک کے دو اخباروں 'کیسری' اور 'مراٹھا' نے مہاراشٹر کے لوگوں میں قومی جذبات پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے سودیشی تحریک کو پھیلانے کے لیے مہاراشٹر کے صنعت کاروں سے بھی رابطہ قائم کیا، لیکن ان صنعت کاروں، جن میں زیادہ تر پارسی اور گجراتی تھے، نے اس تحریک میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ یہ بات واضح رہے کہ اس تحریک کا سب سے زیادہ فائدہ صنعت کاروں کو ہی پہنچا۔ تلک کو 1897ء میں ایک مقالے کی وجہ سے اٹھارہ ماہ قید کی سزا سنائی گئی جو کیسری میں شائع ہوا تھا۔ تلک کو سزا دینے کے فیصلے کی ملک بھر میں شدید مخالفت کی گئی۔ قوم پرست اخبارات اور سیاسی تنظیموں نے انسانی حقوق اور آزادئ صحافت پر حملے کے خلاف ملک گیر تحریک شروع کی۔ اس جدوجہد میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو تلک کی کافی تنقید کرتے تھے۔اس طرح تلک راتوں رات ایک کل ہند رہنما کے طور پر مقبول ہوگئے۔ لوگوں نے انہیں لوک مانیہ

کا خطاب دیا۔ جب 1897 میں امراوتی کے کانگریس اجلاس میں سریندر ناتھ بنرجی نے بہت جذباتی انداز میں تلک کی جدوجہد کی تعریف کی، تب اجلاس میں موجود تمام لوگ نے تلک کی عزت میں کھڑے ہو گئے۔ سودیشی تحریک کے دوران انہوں نے نعرہ دیا کہ ''سوراج ہمارا پیدائشی حق ہے اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گا'' جو کافی مقبول ہوا۔

کانگریس میں تقسیم کے بعد، جب تلک کو 1908 میں دوبارہ 8 سال قید کی سزا سنائی گئی، تو اس کے خلاف احتجاج کے لیے وسیع پیمانے پر کارروائیاں ہوئیں۔ اخبارات نے اعلان کیا کہ تلک کی پیروی کرتے ہوئے وہ بھی صحافت کی آزادی کے لیے اپنی جان قربان کر دیں گے۔ جس دن (22 جولائی 1908) تلک کو سزا سنائی گئی، اس دن بمبئی کے تمام بازار بند رہے اور یہ بندش ایک ہفتے تک جاری رہی۔ جب پولیس نے مزدوروں کو کام سے واپس بھیجنے پر مجبور کیا تو انہوں نے شدید احتجاج کا مظاہرہ کیا۔ کئی مقامات پر پولیس اور مزدوروں کے درمیان جھڑپیں ہوئیں۔ برطانوی حکومت نے مزدوروں کو دبانے کے لیے فوج بلائی، جس کی وجہ سے 16 مزدور ہلاک اور 50 کے قریب کارکن شدید زخمی ہوئے۔ لینن نے مزدوروں کی اس جدوجہد کی تعریف کی اور کہا کہ 'ہندوستان کا محنت کش طبقہ اب سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا ہے۔' یہ سب لوک مانیہ تلک کی وجہ سے ممکن ہوا۔ بلاشبہ وہ ایک قوم پرست رہنما تھے جنھوں نے لوگوں میں قومی شعور بیدار کرنے کے لیے ایک تحریک کا کام کیا۔

4.6 سورت اجلاس اور کانگریس میں پھوٹ (Surat Session, and Split in the Congress, 1907)

تحریک کے شروعاتی سے ہی اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے درمیان کشمکش صاف نظر آتی ہے۔ اعتدال پسند اس تحریک کو بنگال کا مسئلہ کہہ کر بنگال تک محدود کرنا چاہتے تھے لیکن انتہا پسند اس تحریک کو ایک قومی رنگت دینا چاہتے تھے۔ تقسیمِ بنگال 16 اکتوبر 1905 کو عمل میں آیا اور تقریباً دو ماہ بعد بنارس میں کانگریس کا اکیسواں اجلاس ہوا جس میں گوپال کرشن گوکھلے صدر منتخب ہوئے۔ اس اجلاس میں تقسیمِ بنگال کی مذمت کی گئی اور سودیشی قرارداد پاس کی گئی۔ اسی اجلاس میں لالہ لاجپت رائے نے پہلی بار کانگریس کے پلیٹ فارم پر ستیہ گرہ کا استعمال کیا۔ لیکن پرنس آف ویلز کے استقبال کے حوالے سے دونوں جماعتوں میں اختلاف تھا۔ اعتدال پسندان کے استقبال کے حق میں تھے لیکن انتہا پسندوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اسی سودیشی تحریک کے دوران ہی کلکتہ میں کانگریس کا بائیسواں اجلاس منعقد ہوا۔ اب انتہا پسندوں کا اثر سودیشی تحریک میں بھی سرگرم ہو گیا تھا، اس لیے ان کی خواہش تھی کہ کانگریس کا صدر ان کے گروہ سے مقرر کیا جائے تاکہ وہ اپنے کام اور نظریات سے متعلق قراردادیں پاس کر سکیں۔ کانگریس کے آئین کے مطابق جہاں اجلاس منعقد کیا جائے گا وہاں کا کوئی مقامی شخص یا استقبالیہ کمیٹی کا رکن صدر نہیں بن سکتا۔ اس لیے بپن چندر پال اور انتہا پسند تلک کو اس اجلاس کا صدر بنانا چاہتے تھے اور تلک کی خواہش تھی کہ لالہ لاجپت رائے کو صدر بنایا جائے۔ دوسری جانب اعتدال پسند صدر کے عہدے کے لیے کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھے جس کے نام پر انتہا پسند بھی رضامندی ظاہر کر دیں۔ اور ہوا یہ کہ اس وقت کے سب سے بزرگ اور تجربہ کار رہنما دادابھائی نوروجی کا نام بھوپیندر ناتھ باسو نے اعتدال پسندوں کی طرف سے پیش کیا جس کی مخالفت کوئی بھی نہ کر سکا۔ اس طرح دادابھائی نوروجی بائیسویں اجلاس کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی اجلاس میں انتہا پسندوں کی کوششوں سے سودیشی، بائیکاٹ، سوراج اور قومی تعلیم سے متعلق چار قراردادیں منظور کی گئیں۔ لیکن ان کا

مسودہ بہت مبہم تھا۔ پہلی بار دادا بھائی نوروجی نے سوراج کو قومی تحریک کا ہدف قرار دیا۔ اس اجلاس کا صدارتی خطاب نوروجی کی جگہ ان کے سیکرٹری محمد علی جناح نے پڑھا۔

کلکتہ اجلاس میں طے پایا گیا کہ کانگریس کا اگلا اجلاس ناگپور میں ہوگا، اور اعتدال پسندوں کو خدشہ تھا کہ ناگپور کی استقبالیہ کمیٹی پر انتہا پسندوں کا غلبہ ہے اور تلک کے صدر بننے کے زیادہ امکانات ہیں۔ لہٰذا، اعتدال پسندوں نے ایک چال چلائی اور سورت میں اس اجلاس کو منعقد کرانے میں کامیابی حاصل کی، جو مہاراشٹر پریزیڈنسی کا علاقہ تھا۔ اس لیے کانگریس کے دستور کے مطابق، تلک صدر کے لیے اپنا نام پیش نہیں کر سکے۔ آخر کار، سفارت کاری کا سہارا لیتے ہوئے اعتدال پسندوں نے اپنے ہی گروہ کے ایک شخص راس بہاری بوس کو صدر منتخب کر لیا۔ اعتدال پسندوں کے ممتاز رہنما فیروز شاہ مہتا تقسیم کی تیاری کر چکے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ انتہا پسندوں کے ساتھ رہنا بہت خطرناک کن ثابت ہو سکتا ہے۔ گوکھلے نے انتہا پسندوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ کو سرکار کی طاقت کا احساس نہیں ہے۔ اگر کانگریس انتہا پسندوں کے مشوروں پر عمل کرتی تو حکومت کو ہمیں ختم کرنے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگیں گے۔ تلک اور گوکھلے نے کانگریس میں تقسیم کے خطرے کو محسوس کیا، اور اسے ٹالنے کی بھرپور کوششیں کی تھیں۔ گوکھلے نے اپنے ایک دوست کو یہاں تک لکھا تھا کہ تقسیم کا مطلب تباہی ہے اور پھر دونوں طبقوں کو دبانے میں نوکر شاہی کے لیے کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئے گی۔ لیکن گوکھلے کی شخصیت اتنی پُراثر نہیں تھی کہ وہ فیروز شاہ مہتا جیسے طاقتور رہنما کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ 26 دسمبر کو، سورت اجلاس دریائے تاپتی کے کنارے منعقد ہوا۔ انتہا پسند اس افواہ سے بہت مشتعل تھے کہ اعتدال پسند کلکتہ اجلاس کی چار قراردادوں کو غیر موثر بنانا چاہتے ہیں۔ انتہا پسندوں کی طرف سے اعتدال پسندوں کا بہت مذاق اڑایا گیا، جس کی وجہ سے اعتدال پسند کافی رنجیدہ اور مایوس کن تھے۔

دونوں فریق تصادم کے لیے تیار تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے پر شور مچانا شروع کر دیا یہاں تک کہ لڑائی کی نوبت آ پہنچی۔ لوگ ایک دوسرے پر کرسیاں پھینکنے لگے۔ اسی دوران کسی اجنبی شخص نے اسٹیج پر جوتا پھینکا جو فیروز شاہ مہتا اور سریندر ناتھ بنرجی کو لگا اور کچھ ہی دیر میں سورت کے اس اجلاس میں دونوں کیمپوں کے درمیان جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں تلک کو اپنے ساتھیوں سمیت کانگریس سے الگ ہونا پڑا۔ کانگریس کی اندرونی تقسیم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 1908 میں حکومت نے تلک پر غداری کا مقدمہ چلایا اور انہیں منڈالے جیل میں 6 سال قید کی سزا سنائی۔ اسی طرح دوسرے انتہا پسند رہنما بھی کسی نہ کسی جرم میں قید کر لیے گئے۔ اربندو گھوش نے بعد میں لکھا کہ تلک جانتے تھے کہ کانگریس میں پھوٹ ایک بہت بڑی تباہی ہو گی کیونکہ ان کے خیال میں کانگریس اس وقت ایک قومی ضرورت تھی، ایک قومی حقیقت تھی اور اس سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ بعد میں تلک نے اس اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن فیروز شاہ مہتا اور اس کے حامیوں کا ضدی رویہ برقرار رہا، اُن میں کوئی نرمی نہیں ائی۔ اس طرح سورت کا اجلاس منسوخ کر دیا گیا اور الہ آباد میں کانگریس کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت راش بہاری بوس نے کی۔ اس اجلاس میں انتہا پسندوں کو کانگریس سے الگ کر دیا گیا۔ منٹو نے مورلے کو لکھا کہ سورت میں کانگریس کا زوال ہمارے لیے ایک عظیم فتح تھی.

اس طرح سورت میں کانگریس کی تقسیم نے سودیشی تحریک کی توانائی کو تباہ کر دیا۔ حکومت نے جابرانہ پالیسی اختیار کی اور اس

تحریک کو بے رحمی سے دبانا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہات تھیں جنہوں نے اس تحریک کو غیر موثر بنانے میں مدد کی۔ مظاہرین کے پاس کوئی موثر تنظیم نہیں تھی۔ خود انتہا پسند لیڈروں میں بھی سوراج کے مقصد کے بارے میں مختلف آراء تھیں۔ 1907 کے فرقہ وارانہ فسادات نے بھی ہندو مسلم اتحاد کو کمزور کر دیا اور زیادہ تر مسلمان اس تحریک سے الگ ہو گئے۔ اس طرح 1908 تک سودیشی تحریک کافی کمزور ہو چکی تھی۔ 6 دسمبر 1910 کو جارج پنجم انگلینڈ کے بادشاہ بن گئے۔ ان کی یاد میں 12 دسمبر 1911 کو دہلی میں ایک شاہی دربار کا اہتمام کیا گیا۔ جہاں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ دوم نے شہنشاہ کی جانب سے تقسیمِ بنگال کو منسوخ کرنے کا اعلان کیا۔ واضح رہے کہ یہ اعلان ارنڈیل کمیٹی کی سفارش پر کیا گیا تھا۔ اسی دوران 1911 میں ہی ہندوستان کے دارالحکومت کو کلکتہ سے دہلی منتقل کرنے کا اعلان بھی کیا گیا جسے 1912 عیسوی میں عملی شکل دی گئی۔

4.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

بلاشبہ انتہا پسند رہنماؤں نے اپنے مقاصد اور طریق ہائے کار سے ہندوستانی عوام کے ایک بڑے حصے کو متاثر کیا۔ اعتدال پسند سیاست صرف پڑھے لکھے بورژوازی یا متوسط طبقے تک محدود تھی۔ انتہا پسند رہنماؤں نے اس قومی تحریک کو متوسط نچلے طبقے، طلباء، کسانوں، مزدوروں اور کاریگروں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ انتہا پسند اس تحریک کو دیہات کے غریب لوگوں تک لے جانے میں کامیاب نہیں ہوئے، جو آگے گاندھی کی قیادت میں ممکن ہو پایا، لیکن اس کے باوجود یہ نظریہ سماج کے ایک بڑے طبقے کو قومی تحریک سے جوڑنے میں کامیاب رہا۔ اعتدال پسندوں کو یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ حکومت شدت پسندوں سے ان کے خوف کی وجہ سے بات کر رہی ہے نہ کہ ان کی طاقت کی وجہ سے۔ انتہا پسندوں کو یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ اعتدال پسند ان کی جدوجہد میں ان کے لیے ڈھال کا کام کر سکتے ہیں۔ گوکھلے اور تلک جیسے قائدین نے کانگریس کے اتحاد کی اہمیت کو سمجھا لیکن دوسرے قائدین ان کی حکمت عملی کو سمجھنے میں ناکام رہے اور اس کا نتیجہ تمام قومی رہنماؤں کو جھیلنا پڑا۔ سب سے پہلی بار سودیشی تحریک کے دوران ہی خواتین نے تحریکِ آزادی میں حصہ لیا، حالانکہ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت ان کی تعداد بہت کم تھی۔ انتہا پسندوں کو اعتدال پسندوں کے خلاف جو ناراضگی تھی وہ ان کے مقاصد کے بارے میں نہیں تھی بلکہ ان کے اختیار کردہ راستوں کے بارے میں تھی۔ وہ اعتدال پسندوں کے گداگرانہ سیاسی نظریے سے تھک چکے تھے۔ اس کے برعکس انتہا پسند رہنماؤں نے سودیشی، بائیکاٹ، خود حکمرانی اور قومی تعلیم کے نعرے دیے اور اپنی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے انتہائی اقدامات کا سہارا لیا۔ ان کا خیال تھا کہ صرف خود حکمرانی ہی ہندوستان کی ترقی اور خود انحصاری کی راہ ہموار کر سکتی ہے۔ تلک، اروبندو گھوش، بپن چندر پال جیسے رہنماؤں نے دیگر قوم پرست رہنماؤں سے اپیل کی کہ وہ ہندوستانیوں کی طاقتوں اور خصوصیات کو پہچانیں۔

نفاق ڈالو اور حکومت کرو کی برطانوی پالیسی نے سودیشی تحریک کو بہت نقصان پہنچایا، لیکن انتہا پسند رہنماؤں کے کچھ غلط طریقوں نے بھی اس تحریک کو متاثر کیا۔ بلاشبہ انتہا پسند رہنما قومی تحریک کے بارے میں بہت ایماندار تھے۔ لیکن قومی تحریک کو پھیلانے میں انہوں نے نادانستہ طور پر جو طریقے اختیار کیے وہ زیادہ تر مذہبی نوعیت کے تھے۔ تلک کے گنپتی مہوتسو، شیواجی جینتی اور بنگال میں بہت سے دیوی دیوتاؤں کو اس تحریک کی علامت بنایا گیا۔ اگرچہ ان طریقوں کو دنیا میں مختلف جگہوں پر سیاسی شعور پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے لیکن

اس وقت کے ہندوستان کا سماجی ڈھانچہ دنیا کے دیگر خطوں سے بالکل مختلف تھا۔ حکومت خود فرقہ پرست طاقتوں کو ہوا دے رہی تھی اور ایسے ماحول میں قومی رہنماؤں کے لیے مذہبی رسومات اور اداروں کا سہارا لیناکافی خطرناک ثابت ہوا۔ اس مذہبی نوعیت کی وجہ سے بد قسمتی سے بنگال کے مسلمانوں کی اکثریت نے سودیشی تحریک میں حصہ نہیں لیا اور کچھ فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہو گئے۔ اس فرقہ وارانہ سیاست کی وجہ سے 1907 میں بنگال میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے۔ یہ مسلم لیگ کے عروج کی ایک بڑی وجہ تھی۔ برطانوی راج نے بھی وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو سودیشی تحریک کو کمزور کرنے کے لیے اکسایا۔ اس طرح، ان قوم پرست رہنماؤں کے کردار کی وجہ سے اس تحریک میں منفی رنگت پیدا ہو گئی۔ اس سب کے باوجود، سودیشی تحریک کی شکل میں انتہا پسند سیاست نے سماج کے ایک بڑے طبقے میں قوم پرستی کا شعور بیدار کیا جو اس سے پہلے قوم پرستی سے ناواقف تھے۔ ان مشتعل افراد نے رائے عامہ بنانے کے بہت سے نئے طریقے ایجاد کیے، حالانکہ وہ خود ان طریقوں کو اچھی طرح استعمال نہیں کر سکے۔ شاید اگر کانگریس متحد ہو کر تحریک کو آگے لے جاتی تو اس کی کامیابی مختلف ہوتی۔ لیکن سورت کی تقسیم کے بعد انتہا پسند رہنماؤں کو دبا دیا گیا اور اس کے بعد اعتدال پسند سیاست بھی ایک طرح سے حاشیے پر پہنچ گئی۔ کانگریس میں پھر سے جوش اس وقت شروع ہوا جب گاندھی نے تحریکِ آزادی کی قیادت اختیار کی۔

4.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

سودیشی تحریک	:	تقسیمِ بنگال کو منسوخ کرنے کے مقصد سے چلائی گئی تحریک جس میں ملکی اشیاء اور مصنوعات کے استعمال پر زور دیا گیا اور برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا گیا تاکہ برطانوی تجارت کو نقصان پہنچا کر حکومت سے اپنے مطالبات کو تسلیم کرایا جائے۔
سوراج	:	حکومت خود اختیاری یا وہ ریاست جس میں حکمرانی کا اختیار وہاں کے لوگوں یا مقامی حکمراں کے ہاتھ میں ہو۔
کیسری	:	ایک مراٹھی اخبار ہے جو 4 جنوری 1881 کو لوک مانیہ بال گنگادھر تلک نے شروع کیا۔ اس اخبار کو ہندوستانی قومی آزادی کی تحریک کے ترجمان کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ سودیشی تحریک میں اس نے کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔
ڈان	:	ڈان سوسائٹی کا ہفتہ وار میگزین جس کی بنیاد ستیش چندر مکھرجی نے رکھی تھی۔

4.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

4.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. تلک نے گنیش مہوتسو کب شروع کیا؟
2. تقسیمِ بنگال کے خلاف کس دن کو یوم راکھی کے طور پر منایا گیا؟
3. ڈان سوسائٹی (Dawn Society) کی بنیاد کس نے رکھی؟

4. 1907 کے کانگریس سورت اجلاس کی صدارت کس نے کی تھی؟
5. کتاب 'گیتار ہسیہ' کس انتہا پسند رہنما نے لکھی؟
6. ارنڈیل کمیٹی (Arundel Committee/1906) کا تعلق کس واقعہ سے ہے؟
7. انڈین سوسائٹی آف اورینٹل آرٹس کی بنیاد کب اور کس نے رکھی؟
8. 'بنگالی' اخبار کا ایڈیٹر کون تھا؟
9. سودیشی تحریک سے وابستہ دو سرکردہ مسلم رہنماؤں کے نام بتائیں۔
10. کانگریس کے کس اجلاس میں سوراج کو قومی تحریک کا ہدف قرار دیا گیا؟

4.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تقسیم بنگال پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. سودیشی تحریک کی اہمیت کی وضاحت کیجیے۔
3. انتہا پسندوں کا عروج، گروہ بندی کا نتیجہ تھا۔ وضاحت کیجیے۔
4. انتہا پسندانہ نظریات پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔
5. بنگال میں سودیشی تحریک کی قیادت میں تلک کے کردار پر ایک مختصر نوٹ قلم بند کیجیے۔

4.9.3 تفصیلی جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. انتہا پسند نظریہ کے عروج کی وجوہات پر تفصیلی بحث کیجیے۔
2. سودیشی تحریک پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔
3. سودیشی، سوراج، بائیکاٹ اور قومی تعلیم انتہا پسند رہنماؤں کے ہتھیار تھے۔ وضاحت کیجیے۔

4.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Argov, Daniel, *Moderates and Extremists in the Indian Nationalist Movement (1883–1920)*, Asia Publishing House, New York, 1968.
2. Bandyopadhyay, Sekhar (ed.), *Nationalist Movement in India: A Reader*, Oxford University Press, New Delhi, 2009.
3. ____________________, *From Plassey to Partition: A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
4. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin, New Delhi, 1989.
5. Heimsath, Charles Herman, *Indian Nationalism and Hindu Social Reform*, Princeton University Press, Princeton, 1964.
6. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal: A New History of British India*,

HarperCollins, Noida, 2021.
7. Pradhan, G.P., *Lokmanya Tilak*, National Book Trust, India, 2005 (first pub. in 1994).
8. Rai, Lajpat, *Young India*: *An Interpretation and a History of the Nationalist Movement from Within*, K.L. Tuteja ed., National Book Trust, India, 2021 (first pub. in the USA in 1916).
9. Rao, Parimala V., *Foundations of Tilak's Nationalism*: *Discrimination, Education and Hindutva*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.
10. Sarkar, Sumit, *Jadeed Hindustan* (Urdu), NCPUL, New Delhi, 2003.

اکائی 5۔ دادابھائی نوروجی اور بدرالدّین طیب جی

(Dadabhai Naoroji and Badruddin Tyabji)

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 دادابھائی نوروجی کے حالات زندگی

5.3 دادابھائی نوروجی بطور اعتدال پسند رہنما

5.4 دولت کی نکاسی کا نظریہ

5.5 دادابھائی نوروجی: معاشی قوم پرستی سے سیاسی قوم پرستی تک

5.6 بدرالدّین طیب جی کے حالات زندگی

5.7 بدرالدّین طیب جی کا سیاسی کردار اور تعلیمی اصلاحات

5.8 بدرالدّین طیب جی: ہندوستانی قومی تحریک کے معروف رہنماء

5.9 کانگریس میں فرقہ وارانہ اتحاد کے فروغ میں بدرالدّین طیب جی کا کردار

5.10 تعلیم کی حمایت میں بدرالدّین طیب جی کا کردار

5.11 اکتسابی نتائج

5.12 کلیدی الفاظ

5.13 نمونہ امتحانی سوالات

5.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

5.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

5.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

5.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید (Introduction)

دادابھائی نوروجی اور بدرالدّین طیب جی ہندوستانی قوم پرست تحریک کی بااثر شخصیات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ان دونوں شخصیات نے برطانوی نوآبادیاتی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے منفرد انداز میں کام کیا۔ دادابھائی نوروجی (1917–1825) ان سرکردہ ہندوستانی قوم پرست رہنماؤں میں سے ہیں جنہوں نے معاشی قوم پرستی کے جذبات کو ابھارا اور اس کا پرچار کیا۔ دادابھائی نوروجی ہندوستانی سیاست کی ایک قابل ذکر شخصیت ہیں، جنہیں 'ہندوستان کے عظیم مرد بزرگ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ ایک ماہر تعلیم، ماہر معاشیات اور سیاسی رہنما تھے۔انہوں نے اپنی مشہور کتاب *Poverty and Un-British Rule in India* میں دولت کی نکاسی کا نظریہ پیش کیا۔اس نظریہ کے مطابق وہ لکھتے ہیں کہ وسائل ہندوستان سے برطانیہ بھیجے جاتے تھے، جن کے بدلے میں ہندوستان کو کوئی مادی فائدہ حاصل نہیں ہوتا تھا۔اس نظریہ نے برطانیہ کے ذریعے کیے گئے استحصال کی ان مختلف شکلوں کے بارے میں بتایا، جن کی وجہ سے ہندوستان میں مسلسل غریبی بڑھتی جارہی تھی۔انہوں نے واضح کیا کہ کس طرح برطانوی نوآبادیاتی پالیسیاں ہندوستان کو معاشی طور پر کمزور کررہی ہیں۔1886 میں، وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بھی بنے۔انہوں نے برطانوی حکمراں حلقے میں 'خود حکمرانی' اور ہندوستانی قوم پرستوں کے مطالبات پیش کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ برطانوی پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہونے والے پہلے ہندوستانی ہیں۔ نوروجی مردوں اور عورتوں کے ساتھ مساوی سلوک پر یقین رکھتے تھے اور تعلیم نسواں کی وکالت کرنے والوں کے پیشرو ثابت ہوئے۔ایک معتدل رہنما کے طور پر، انہوں نے ہر قسم کے ذات پات کے امتیاز اور جبر کے خلاف آواز اٹھائی، اور آئینی طریقہ کار کی اہمیت کو برقرار رکھا۔

بدرالدّین طیب جی (1906–1844) انیسویں صدی کے اواخر اور بیسوی صدی کے اوائل میں برطانوی ہند کے ایک ممتاز وکیل اور سیاسی رہنما تھے۔ وہ شہری حقوق اور سماجی انصاف کے حامی تھے۔ بدرالدّین طیب جی اپنی ابتدائی زندگی سے ہی رام موہن رائے اور ایشور چندر ودیا ساگر جیسے سماجی مصلحین کے کاموں سے متاثر تھے۔ 1887 میں، انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے مدراس اجلاس میں صدر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے ہندوستانی سماج میں برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی کے تحت امتیازی سلوک اور عدم مساوات جیسے مسائل کو حل کرنے کے لیے انتھک محنت کی۔ وہ ہندوستان میں مختلف برادریوں کے درمیان بین المذاہب ہم آہنگی اور اتحاد کو فروغ دینے کے لیے جانے جاتے تھے۔ وہ متنوع اور مخلوط معاشرے کے لیے مذہبی رواداری اور تعاون کی اہمیت پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے لندن انڈیا سوسائٹی اور ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن جیسی تنظیمیں قائم کیں تاکہ جدوجہد آزادی میں برطانیہ کی عوام کی بھی حمایت کو یقینی بنایا جائے۔

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دادابھائی نوروجی اور بدرالدّین طیب جی کی حالات زندگی کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے۔
- دادابھائی نوروجی کے دولت کی نکاسی کے نظریے کو سمجھ سکیں گے۔

- تحریک آزادی میں دادابھائی نوروجی اور بدرالدّین طیب جی کے کردار سے واقف ہوں گے۔
- سیاسی اور معاشی قوم پرستی میں دادابھائی نوروجی کی حصہ داری کو جان سکیں گے۔
- سیاسی اور تعلیمی اصلاحات میں بدرالدّین طیب جی کے کردار سے واقف ہوں گے۔

5.2 دادابھائی نوروجی کی حالات زندگی (Biographical Sketch of Dadabhai Naoroji)

دادابھائی نوروجی (1825–1917) ایک سیاسی اور سماجی رہنما، ماہر تعلیم اور قوم پرست تھے جنھوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ 4 ستمبر 1825 کو بمبئی میں ایک پارسی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، نوروجی پالنجی دورڈی، ایک تاجر تھے اور ان کی والدہ، مانک بائی، ایک امیر پارسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم بمبئی کے ایک پرائمری اسکول اور پھر ثانوی تعلیم الفنسٹن انسٹی ٹیوٹ میں حاصل کی۔ وہ فطری فلسفہ، حساب اور سیاسی معاشیات میں بیحد دلچسپی رکھتے تھے اور 1845 میں انہوں گریجویشن کی تعلیم مکمل کی۔ گریجویشن کے بعد انہوں الفنسٹن انسٹی ٹیوٹ میں ہی نیٹیو ہیڈ اسسٹنٹ کے طور پر اپنا کیریر شروع کیاجہاں 1850 میں انہیں حساب اور فطری فلسفہ کا اسٹنٹ پروفیسر بنا دیا گیا۔ایسا کرنے والے وہ پہلے ہندوستانی تھے۔ نوروجی مختلف تجارتی اور کاروباری منصوبوں میں بھی مشغول رہے۔ وہ کپاس کی ایک معروف تجارتی فرم، کاما اینڈ کمپنی، کے شراکت دار بھی تھے۔1855 میں وہ کمپنی کے شراکت دار کے حیثیت سے انگلینڈ گئے۔کاروبار کے ساتھ ساتھ وہ یونیورسٹی کالج ،لندن کے پہلے ایشیائی پروفیسر بن گئے، جہاں وہ تقریباً ایک دہائی تک گجراتی پڑھاتے رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ برطانیہ میں گزارا، جہاں وہ مختلف سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں مصروف رہے اور انگلینڈ کی رائے عامہ کو ہندوستان کے حق میں ہموار کرتے رہے۔ اس ضمن میں کئی سوسائیٹیاں بھی قائم کیں۔ 1865 میں ویومیش چندر بنرجی اور فیروشاہ مہتہ وغیرہ کے ساتھ مل کر لندن انڈیا سوسائٹی قائم کی اور پھر 1866 میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی، جس کا مقصد ہندوستانی سیاسی نقطہ نظر کو برطانوی عوام تک پہنچانا تھا۔ اس انجمن نے بہت سے معروف انگریز افسروں کی حمایت حاصل کی، اور برطانوی پارلیمنٹ کے ساتھ اثر ورسوخ پیدا کرنے میں کامیاب رہی۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ پہلی تنظیم تھی جس کے ممبران ہندوستان کے مختلف صوبوں سے تھے۔ وہ دنشاواچا اور اے۔ او۔ ہیوم کی طرح ایک ممتاز

تصویر 3.1: دادابھائی نوروجی

Source: https://en.wikipedia.org/wiki/Dadabhai_Naoroji#/media/File:Dadabhai_Naoroji_1889.jpg

سیاسی شخصیت اور انڈین نیشنل کانگریس کے اہم رکن تھے۔ وہ 1886، 1893 اور 1906 میں کانگریس پارٹی کے صدر رہے ہیں۔ وہ 'دولت کی نکاسی' کے نظریے کے لیے جانے جاتے ہیں، جس کے ذریعے انہوں نے نوآبادیاتی معاشی استحصال کو اجاگر کیا۔ نوروجی نے دلیل دی کہ برطانوی سلطنت کی معاشی پالیسیاں ہندوستان کو اس کی دولت سے محروم کر رہی ہیں۔ وہ 1885 سے لے کر 1888 تک بمبئی کی قانون ساز کونسل کے رکن بھی رہے ہیں۔ 1892 میں، دادابھائی نوروجی برطانوی ہاؤس آف کامنز (House of Commons) کے لیے منتخب ہونے والے پہلے ہندوستانی بن گئے۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر کی حیثیت سے انہوں نے اپنے ملک کے مسائل برطانوی عوام اور سیاست دانوں کے سامنے بار بار پیش کیے۔ ان کے 'دولت کی نکاسی' کے نظریے کے نتیجے میں ہی، 1896 میں ہندوستانی اخراجات پر ایک رائل کمیشن قائم کیا گیا۔ نوروجی خود اس کمیشن کے رکن تھے جس نے ہندوستان پر مالی دباؤ کا جائزہ لیا۔ ایک خاص مدت تک برطانوی پارلیمنٹ میں خدمت انجام دینے کے بعد، دادابھائی نوروجی ہندوستان واپس آگئے اور سماجی اور سیاسی مسائل میں شمولیت اختیار کی۔ 30 جون 1917 کو ان کا انتقال بمبئی میں ہوا۔ ان کی وفات سے ہندوستانی سیاست میں ایک تاریخی دور کا خاتمہ ہوا، اور انہوں نے اپنے پیچھے ہندوستان کی آزادی کے لیے نمایاں کوششوں کی میراث چھوڑی۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں ان کا تعاون، ان کے معاشی نظریات اور برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستانی مفادات کی نمائندگی نے انہیں ہندوستانی تاریخ میں ایک قابل احترام شخصیت بنا دیا ہے۔

5.3 دادابھائی نوروجی بطور اعتدال پسند رہنما (Dadabhai Naoroji as a Moderate Leader)

اگرچہ اعتدال پسند اور انتہا پسند متضاد نقطہ نظر رکھتے ہیں، تاہم آزادی کی جدوجہد کے ابتدائی مرحلے میں ان کی شراکت بہت اہم ہے۔ دادابھائی نوروجی، سریندر ناتھ بنرجی، فیروز شاہ مہتا، گوپال کرشن گوکھلے، ایم۔ جی۔ راناڈے جیسے اعتدال پسند مغربی سیاسی اقدار کے غیر تنقیدی مداح تھے۔ انہوں نے مساوات، اظہار رائے کی آزادی، پریس کی آزادی اور نمائندہ حکومت کے اصول کو روایتی مقامی سیاست سے برتر سمجھا جس کی تعریف انہوں نے 'ایشیائی استبدادیت' سے کی۔ برطانوی حکمرانی میں ان کا یقین اتنا مضبوط تھا کہ انہوں نے ہندوستان میں اس کے تعارف کو ایک مشیت خداوندی کے مشن کے طور پر قبول کیا۔ ان کا ماننا تھا کہ برطانوی حکمرانی ماضی کی غلط حکمرانی کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں نمائندہ حکومت (Representative Government) کو متعارف کرانے میں برطانوی پارلیمنٹ کی ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہوئے، دادابھائی نوروجی نے کہا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت برطانوی راج کے اصولوں سے قاصر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ برطانوی راج نے ہندوستان میں امن و امان کے تحفظ میں مقامی بادشاہت کے بنیادی فرائض کو پورا کیا، لیکن نمائندہ حکومت کے اصول کو متعارف کرانے میں اس کی ہچکچاہٹ انتہائی مایوس کن ہے۔ لہٰذا، برطانوی آزاد خیالی کی مدح خوانی کے باوجود بھی برطانوی حکومت اپنی حکمرانی کی نوعیت کو تبدیل کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ یہ اعتدال پسند فلسفہ فصاحت کے ساتھ سریندر ناتھ بنرجی (1848-1925) نے 1895 کے کانگریس کے اجلاس میں بیان کیا تھا۔ برطانوی حکمرانی کی تعریف کرتے ہوئے، بنرجی نے یہ استدلال کیا تھا کہ 'ہم انگلینڈ سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہندوستان میں اپنی حکمرانی کے کردار کو بتدریج تبدیل کرے، اسے آزاد خیالی کے نظریہ پر قائم کرے، اور اسے ملک اور لوگوں کے نئے ترقی یافتہ ماحول کے مطابق بنالے۔ اس کے بعد ہی ہندوستان اپنے آپ کو ایک آزاد ریاست کی عظیم وفاق میں

پائے گا، جس کی اصلیت، کردار اور ادارے انگریزی ہو، اور جو برطانیہ کے ساتھ اپنے مستقل اور ناقابل تحلیل اتحاد پر خوش ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ اعتدال پسند برطانوی آزاد خیالیت کی زد میں آچکے تھے اور انہیں یہ یقین کرنے پر آمادہ کیا گیا تھا کہ طویل مدت میں برطانوی پارلیمنٹ اپنا فرضی مشن پورا کرے گا۔ ایسا لگتا ہے کہ بنرجی نے دادا بھائی نوروجی کے خیال کی بازگشت کی تھی جنہوں نے 1893 کے پونا خطاب میں ہندوستان کے مستقبل کے تحفظ کے لیے 'انگریزوں کے ساتھ وفاداری' کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ اپنے 'وفادار' رویے کے باوجود، نوروجی شاید پہلے کانگریسی تھے جنہوں نے کانگریس کے سیاسی کردار کے لیے سختی سے بحث کی جس کی شناخت اس سے پہلے ایک غیر سیاسی پلیٹ فارم کے طور پر کی جاتی تھی۔ نوروجی نے کانگریس کو ایک سیاسی ادارے کے طور پر پیش کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی جو لوگوں کی سیاسی امنگوں کو برطانوی حکمرانوں کے سامنے پیش کرے۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں اعتدال پسندوں کے کردار کو نظر انداز کرنا غلط ہوگا۔ انہوں نے دو وجوہات کی بنیاد پر برطانوی حکومت کے ساتھ وفادار رویہ اختیار کیا تھا:

- اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اعتدال پسندوں نے کبھی بھی ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف عوامی تحریک نہیں چلائی۔ انہوں نے حکومت کی تنقید کرتے ہوئے ان عظیم نظریات کو مد نظر رکھا جن پر برطانوی تہذیب کھڑی تھی۔ انہوں نے در حقیقت ایک سیاسی مکالمے کا آغاز کیا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔
- ہندوستان کی قومی تحریک میں اعتدال پسندوں کا آئینی اور پرامن طریقہ تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس نے مستقبل میں دوسرے قسم کے سامراج مخالف مظاہروں کے لیے زمین ہموار کی۔

5.4 دولت کی نکاسی کا نظریہ (Theory of the Drain of Wealth)

دراصل، دولت کی نکاسی کا نظریہ دادا بھائی نوروجی کی ایجاد نہیں ہے۔ تقریباً 230 سال قبل 1776 میں ایڈم اسمتھ نے اپنی تصنیف *The Wealth of Nations* میں برطانوی حکمرانوں کو 'ہندوستان کے لٹیرے' قرار دیا تھا۔ 1857 میں کارل مارکس نے تقریباً وہی الفاظ استعمال کیے جو دادا بھائی نوروجی نے دولت کی نکاسی بیان کرنے کے لیے استعمال کیے تھے۔ دادا بھائی خود اپنے ایک درجن پیشرو اور ہمعصر انگریزوں کا حوالہ دیتے ہیں جنہوں نے دولت کی نکاسی کی حمایت کی۔ انیسوی صدی میں، ہندوستان سے برطانیہ کی طرف دولت کی نکاسی نے درآمدات کے مقابلے میں برآمدات کے غیر منقولہ اضافی اشیاء کی شکل اختیار کی۔ 1867 میں، دادا بھائی نوروجی نے پہلی بار اپنے مقالے 'England's Debt to India' میں یہ خیال پیش کیا کہ برطانیہ اپنی حکمرانی کے معاوضے کے طور پر ہندوستان سے دولت نکال رہا ہے۔ اس طرح، ہندوستان میں جمع ہونے والے کل محصولاتی آمدنی سے تقریباً ایک چوتھائی حصہ ملک سے باہر نکل کر انگلینڈ کے وسائل میں شامل کیا جاتا ہے۔ دادا بھائی نوروجی نے اپنی زندگی دولت کی نکاسی کے نظریے کے فروغ کے لیے وقف کر دی جسے وہ ہندوستان میں برطانوی راج کی بنیادی برائی سمجھتے تھے۔ چونکہ اس وقت قومی آمدنی کے حساب کتاب کے اعداد و شمار کے طریقے معیاری نہیں تھے، اس لیے ہندوستان سے برطانیہ منتقل ہونے والی دولت کے حجم اور مقدار پر اختلاف ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان سے برطانیہ تک دولت کا مسلسل انخلا اس وقت کے قوم پرست رہنماؤں کے لیے غیر متنازعہ مسئلہ تھا۔ صرف برطانوی حکومت کے کچھ اہلکاروں نے اس

نظریہ کو مکمل طور پر نامنظور کیا، اور اس پر تنقید کی۔

دادا بھائی نوروجی نے اپنی کتاب *Poverty and Un-British Rule in India* میں دولت کی نکاسی کے اسباب، مقدار اور نتائج کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان سے دولت کی نکاسی یا وسائل کے اخراج نے ہندوستان میں وسیع پیمانے پر غربت کو فروغ دیا ہے۔ اس کے علاوہ، حکومت ہند کو برطانیہ میں لوگوں کو ان کی سیاسی، انتظامی اور تجارتی خدمات کے لیے بھاری ادائیگیاں کرنی پڑتی تھیں۔ ان ادائیگیوں کو ہوم چارجز (Home Charges) کہا جاتا تھا۔ ہوم چارجز میں مندرجہ ذیل مدّات شامل ہیں:

- انگلینڈ میں نسبتاً زیادہ شرحوں پر اٹھائے گئے عوامی قرضوں پر سود۔
- ریلوے اور آبپاشی کے کام کی طرف سالانہ وظیفوں کی ادائیگی۔
- سول محکموں کے سلسلے میں ادائیگی جہاں انگریز ملازم کام کرتے تھے۔
- ہندوستان کے دفتری اخراجات بشمول ریٹائرڈ عہدیداروں کی پنشن جنہوں نے ہندوستان میں کام کیا تھا یا جنہوں نے انگلینڈ میں ہندوستان کے لیے کام کیا تھا۔
- فوج اور بحری اہلکاروں کا پنشن اور ان کے رخصتی وظیفے (Furlough Allowances)۔

نوروجی کے دولت کی نکاسی کے نظریے کا خلاصہ اس طرح کیا جا سکتا ہے:

- دولت کی نکاسی کی مختلف شکلوں میں ہندوستان سے برطانیہ جانے والے درآمدات (خام مال اور دیگر اشیاء) شامل ہیں۔ اس کے بعد خام مال کو تیار شدہ اشیاء میں تبدیل کر کے بڑے داموں پر فروخت کیا جاتا تھا۔
- برطانوی حکومت ہند نے لوگوں پر بھاری ٹیکس عائد کر کے محصولات بڑھائے۔ تاہم، ان محصولات کا ایک اہم حصہ برطانوی انتظامیہ اور برطانیہ میں بنیادی ڈھانچے کے منصوبوں پر خرچ کیا جاتا تھا۔
- انہوں نے ہندوستانی صنعتوں پر برطانوی پالیسیوں کے منفی اثرات کو اجاگر کیا۔ برطانوی صنعتوں میں تیار شدہ اشیاء کی ترجیح نے روایتی ہندوستانی صنعت اور دستکاری کو تباہ کر دیا۔ اس پالیسی نے نہ صرف ہندوستانی معیشت کو کمزور کیا بلکہ برطانوی اشیا پر انحصار بھی پیدا کیا۔
- انہوں نے استدلال کیا کہ ہندوستان میں برطانوی سرمایہ کاری سے ہندوستانی معیشت کو اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا ہونا چاہیے تھا۔ برطانوی کمپنیوں کے ذریعے کمائے گئے منافع کو ہندوستانی ترقی میں خرچ کرنے کے بجائے برطانیہ واپس بھیج دیا جاتا تھا۔
- نوروجی نے تعلیم اور روزگار کے حوالے سے برطانوی پالیسیوں کی تنقید کی۔ اعلیٰ درجے کے انتظامی اور فوجی عہدے ہندوستانیوں کے بجائے انگریزوں کے لیے مختص کرنے کے عمل نے ہندوستان کی دانشورانہ سوچ اور انسانی وسائل کو ضائع کیا۔
- کمپنی کے ملازمین اپنی بچت کو برطانوی مارکیٹ میں لگا دیتے تھے۔

- برطانوی ہند میں کام کرنے والے سپاہیوں کا اسلحہ، زرہ بکتر اور وردی برطانوی صنعتوں سے خرید اجاتا تھا۔

نوروجی نے اپنے دلائل کی تائید کے لیے اپنی کتاب *Poverty and Un-British Rule in India* (1901) میں شماریاتی ثبوت پیش کیے ہیں۔ انہوں نے برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستانی مفادات کی وکالت کی۔ اگرچہ دولت کی نکاسی کے نظریے پر تنقید کی گئی، لیکن اس نے ہندوستانی قوم پرست تحریک کے دوران نوآبادیاتی استحصال اور معاشی ناانصافی پر مباحثوں کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نظریے نے ہندوستان پر برطانوی حکومت کے معاشی اثرات کی بھی وضاحت کی۔

دادا بھائی نوروجی پہلے شخص تھے جنہوں نے ہندوستان میں نوآبادیاتی حکومت کو غریبی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ سونے اور وسائل کی شکل میں دولت کی نکاسی کی مقدار اور حجم بیان کرنا ناممکن تھا۔ اس کا اندازہ کچھ مصنفین کے اعداد و شمار کے حوالہ جات سے لگایا جا سکتا ہے۔ جارج ونگیٹ نے اندازہ لگایا کہ 1835 سے 1851 تک سالانہ 4221611 پاؤنڈ ہندوستان سے باہر نکل رہے تھے۔ ولیم ڈگبی نے اندازہ لگایا کہ 1757 سے 1815 تک تقریبا 500 سے 1000 پاؤنڈ کی نکاسی ہوئی ہے۔ ہندوستانی قوم پرست جیسے دادا بھائی نوروجی، ڈی۔ای۔ واچا، جی۔ وی۔ جوشی، آر۔ سی۔ دت وغیرہ نے دولت کی نکاسی کی مقدار کے بارے میں اپنا حساب لگایا ہے۔ دادا بھائی نوروجی نے مختلف اندازے لگائے اور اپنے حسابات کی بنیاد پر نظر ثانی بھی کی ہے۔ دادا بھائی نوروجی نے برطانوی راج کے آغاز سے لے کر 66–1865 تک دولت کی نکاسی کے اعداد و شمار کل 1500 ملین پاؤنڈ بتایا ہے۔ 1897 میں، دادا بھائی نوروجی نے 1883 سے 1892 تک ہندوستان سے برطانیہ منتقل ہوئی 359 کروڑ روپے کی دولت کی نکاسی کا حساب لگایا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دادا بھائی نوروجی نے تعلیم، مرکزی انتظامیہ، نظم و ضبط، ملک کے سیاسی اتحاد، ریلوے، ٹیلی گراف، ہسپتال، سیکورٹی وغیرہ کے حوالے سے ہندوستان میں انگریزوں کے تعاون کو دل سے تسلیم کیا تھا، لیکن وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے نتائج سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکے۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں برطانوی حکومت غیر برطانوی تھی، جس کی عکاسی ان کی کتاب کے عنوان (*Poverty and Un-British Rule in India*) سے ہوتا ہے۔ انہوں نے ہندوستان میں حقیقی برطانوی حکومت دیکھنے کی شدید خواہش کا اظہار کیا تھا۔ یکم جولائی 1900 کو انڈین فمین ریلیف فنڈ (Indian Famine Relief Fund) کے سلسلے میں برطانیہ میں منعقدہ ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ 'اگر ہندوستان میں غیر برطانوی حکومت نہ ہوتی تو برطانیہ کو موجودہ صورتحال سے سے دس گنا زیادہ فائدہ ملتا۔' دادا بھائی نوروجی اکثر برطانوی حکومت کے کیے گئے وعدوں اور یقین دہانیوں کا حوالہ دیتے تھے۔ وہ اکثر اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہندوستان کی خوشحالی، برطانیہ کی خوشحالی کی شرط ہے۔ شاید یہ ان کی قائل کرنے والی حکمت عملی تھی کہ انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے دوسرے اجلاس میں اس بات کا اعادہ کیا کہ کانگریس کا وجود برطانوی حکومت کے خلاف کوئی بغاوت نہیں ہے بلکہ یہ برطانوی حکومت کے استحکام میں ایک بنیادی پتھر ہے۔ 1893ء کے لاہور اجلاس میں انہوں نے کہا کہ 'کانگریس صرف حکومت کی حمایت کے خواہشمند ہیں۔ ... ہماری خواہش ہے کہ دنیا کی مہذب قوموں میں ہماری مادی اور سیاسی بلندی کی خاطر ہمارا تعلق برطانیہ کے ساتھ طویل عرصے تک قائم رہے۔' انہوں نے برطانوی حکومت کو مضبوط بنانے کے لیے لوگوں کے تعاون پر زور دیا۔

5.5 دادابھائی نوروجی: معاشی قوم پرستی سے سیاسی قوم پرستی تک

(Dadabhai Naoroji: From Economic Nationalism to Political Nationalism)

دادابھائی نوروجی نے ہندوستان میں برطانوی راج پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ انہوں نے برطانوی حکومت کی طرف سے فراہم کردہ تحفظ کی حقیقت کو بے نقاب کیا۔ 1895 میں انہوں نے ہندوستان میں برطانوی راج کی نوعیت کو سمجھ لیا، اور بتایا کہ برطانوی ہند در حقیقت برطانوی ہند ہے نہ کہ ہندوستان کا ہندوستان۔ لیکن وہ بنیاد پرست مطالبات کو آگے بڑھانے میں سست ثابت ہوئے۔ انہوں نے دولت کی نکاسی کے خطرات کو بے نقاب کیا اور ہندوستانی معیشت پر اس کے اثرات کی نشاندہی کی۔ ان کے مطابق، دولت کی نکاسی کی وجہ سے ہی ہندوستان میں قحط واقع ہوئے۔ یہ نکاسی صرف دولت تک محدود نہیں رہی، بلکہ سیاسی اور فکری نکاسی بھی تھی۔ دادابھائی نوروجی کہتے ہیں ماضی میں غیر ملکی حملے ہندوستان کے لیے زیادہ نقصان دہ نہیں تھے، لیکن ہندوستان میں انگریزوں کی حکمرانی استحصال کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ دادا بھائی نوروجی نے برطانیہ اور چین کے درمیان افیون تجارت کی مخالفت کی، کیونکہ یہ ایک غیر اخلاقی عمل تھا۔ انہوں نے کہا کہ ایک طرف برطانوی حکومت ہندوستان کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کر رہی ہے تو دوسری طرف برطانوی نوآبادیاں، مثال کے طور پر آسٹریلیا ترقی کر رہا ہے، لیکن ہندوستان کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ برطانوی حکومت کو قائل کرنے کی بے فائدہ کوششوں کے بعد، دادابھائی نوروجی برطانوی حکمرانوں کی طرف سے کسی قسم کی اصلاح نہ کرنے پر مایوس ہو گئے، جس کی وجہ سے ان کے اندر بے وفائی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ ان کی بے وفائی کے جذبہ کا مظاہرہ ان کی 1904 اور 1905 کی تقریروں میں ملتا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ خود حکمرانی ہی ہندوستان کی مصیبت کا واحد حل ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے بنارس اجلاس میں انہوں نے کہا کہ 'خود حکمرانی کے بغیر ہندوستان، دولت کی نکاسی کے نتیجے میں ہونے والی غربت، بدحالی اور تباہی سے کبھی بھی نجات حاصل نہیں کر سکے گا۔' اس طرح، دادابھائی نوروجی معاشی قوم پرستی سے سیاسی قوم پرستی کی طرف آ گئے۔ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ انہیں معاشی قوم پرستی کی وجہ سے ہی سیاسی قوم پرستی حاصل ہوئی۔ 1896 میں، انہوں نے ویلبی کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں دولت کی نکاسی ایک اجنبی ملک کے ذریعے وسائل کے غیر فطری حکومت کا نتیجہ ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے کلکتہ اجلاس میں، دادابھائی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ہندوستانی عوام کے تمام سیاسی مطالبات کا خلاصہ 'خود حکمرانی یا سوراج' میں ہے۔

چالیس سال سے زیادہ عرصے سے انہوں نے سرکاری نقطہ نظر میں تبدیلی کی امیدیں وابستہ رکھی تھیں۔ چار دہائیوں تک دادابھائی نوروجی اور ان کے برطانوی اور ہندوستانی دوستوں نے ملک کے نظم و نسق کے نقائص کو برطانوی عوام کے سامنے لانے کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ انہیں ملک بھر میں بے شمار افراد کی ہمدردی اور حوصلہ افزائی ملی تھی، لیکن وہ حکومتی نظام چلانے والے عہدیداروں کو متاثر کرنے سے قاصر رہے۔ 1896 میں بمبئی میں طاعون پھوٹ پڑا، جو 1897 میں پورے ہندوستان میں پھیل گیا تھا۔ اپریل 1897 میں، دنشا واچا اور گوکھلے لندن پہنچے، اور کیمبرج میں دادا بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔ سریندر ناتھ بنرجی اور سبرامنیا ایر بھی انگلینڈ میں رائل کمیشن (Royal Commission) کے سامنے ثبوت پیش کرنے کے لیے تیار تھے۔ دادا بھائی اور ان کے ساتھیوں نے برطانیہ میں ایک

'پلیٹ فارم مہم 'کا اہتمام کیا، تاکہ برطانوی عوام کو ہندوستان کی اصل حالت سے واقف کیا جائے۔ دادابھائی نے ساؤتھ لیمبتھ، سنڈر لینڈ، کلافم، ایڈنبرا، ہیسٹنگز، لیوشام اور دیگر مقامات پر لوگوں کو اپنی بیان بازی سے متاثر کیا۔

1897 میں، لندن انڈین سوسائٹی کے زیر اہتمام برطانیہ میں مقیم ہندوستانیوں کی ایک کانفرنس میں قرارداد پاس کی گئی۔ قرارداد میں کہا گیا کہ ڈیڑھ سو سالوں کے قحط اور طاعون، بڑھتی ہوئی غربت، احمقانہ سرحدی پالیسی، ہندوستانی پریس کی آزادی کو سلب کرنا اور انتظامیہ کی نااہلی؛ غیر برطانوی نظام حکومت کے بنیادی وجوہات ہیں۔ ہندوستانیوں نے مطالبہ کیا تھا کہ برطانوی حکومت ہند برطانوی اصولوں، برطانوی اداروں اور برطانوی شہریت پر مبنی ہونی چاہیے؛ اور موجودہ ظالمانہ، غیر برطانوی اور خود غرض اصولوں پر نہیں۔ اس میں قحط، طاعون اور سرحدی جنگ کے اخراجات برطانوی خزانے سے ادا کرنے پر زور دیا گیا۔ یاد رہے کہ برطانیہ ہر سال ہندوستان سے بلامعاوضہ تقریباً تیس یا چالیس ملین روپیوں کی دولت لے جاتا تھا۔ اس کے علاوہ، سرحدی جنگ کو ختم کیا جائے؛ اور افغانستان کے آزادی پسند اور جنگ پسند لوگوں اور ہندوستان کے درمیان ایک طاقتور اور ناقابل تسخیر رکاوٹ بنائی جائے۔ 1906 میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کے کلکتہ اجلاس میں صدر منتخب ہوئے۔ یہ معرکتہ الآرا اجلاس تھا۔ یہاں اعتدال پسندوں اور انتہاپسندوں میں زبردست مقابلہ تھا۔ اس رسہ کشی میں کانگریس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ لیکن یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا اور دادابھائی کی وجہ سے کانگریس پہلے سے زیادہ سرگرم عمل ہوگئی۔ انتہاپسندوں کے مقصد کو جزوی طور پر اس لحاظ سے پورا کیا گیا کہ نوروجی نے باضابطہ طور پر سودیشی تحریک، بائیکاٹ، قومی تعلیم اور خود حکمرانی کی قراردادوں کی توثیق کی۔

5.6 بدرالدّین طیب جی کی حالات زندگی (Biographical Sketch of Badruddin Tyabji)

بدرالدّین طیب جی ایک شیعہ سلیمانی بوہرہ خاندان میں بھروچ کے قریب کامبے میں اکتوبر 1844 میں پیدا ہوئے۔ وہ سلیمانی بوہرہ برادری کے رکن ملا طیب علی بھائی میاں کے سات بیٹوں میں سب سے چھوٹے تھے جنہوں نے اپنے تمام بیٹوں کو تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی تھی۔ بدرالدّین کے دادا، حاجی بھائی، دراصل کامبے میں رہتے تھے۔ وہ کامبے چھوڑ کر بمبئی میں آباد ہوئے تھے۔ فروری 1803 کی زبردست آگ نے ان کے مال ومتاع کو تباہ کردیا۔ غربت سے تنگ آکر وہ کامبے واپس آگئے جہاں 20 ستمبر 1803 کو ان کے بیٹے طیب علی کی پیدائش ہوئی۔ طیب علی صرف آٹھ سال کے تھے جب حاجی بھائی کا انتقال ہوگیا۔ طیب علی ایک غریب آدمی تھا، جو اپنی ذہانت کی وجہ سے ایک مشہور تاجر بن گیا تھا۔ طیب علی نے خود نوشت بھی لکھی ہے۔ انہوں نے 'کتاب اخبار کابل طیبی' بھی لکھنی شروع کی تھی، جس میں طیب جی کے قبیلے سے متعلق اہم واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے توقع کی تھی ان کی اولاد بھی اپنے خاندان سے متعلق تمام اہم واقعات اس کتاب میں درج کریں گے۔ طیب علی سلیمانی بوہرہ برادری کے ایک اہم شخص تھے۔ بوہرہ کا مطلب سوداگر ہے۔ بوہرا ایک پھلتا پھولتا تجارتی گروہ ہے جو زیادہ تر مغربی ہندوستان میں آباد ہے۔ بوہرا برادری میں سے زیادہ تر ان لوگوں کی اولاد شامل ہیں، جنہوں نے گیارہویں صدی میں یمنی عرب تاجروں کے ذریعے اسلام قبول کیا تھا۔

بدرالدّین نے قرآن پڑھنا اسکول میں سیکھ لیا تھا۔ انہوں نے دادامکبہ مدرسہ میں ہندستانی، فارسی، گجراتی اور ریاضی کی تعلیم حاصل

کی۔ بدرالدّین اوران کے دو بھائی بمبئی ایلفنسٹن انسٹی ٹیوشن میں پڑھنے والے پہلے تین مسلمان طالب علم تھے۔اپنے بھائی قمرالدین سے متاثر ہو کر، بدرالدّین نے 1860 میں لندن کے نیو بری ہائی پارک کالج سے تعلیم حاصل کی۔ 1864 میں وہ ہندوستان واپس آگئے، لیکن اس وقت ان کے والد طیب علی کا انتقال ہو چکا تھا۔16 جنوری 1865 کو بدرالدّین کی شادی ہوئی، اور 30 ستمبر 1865 کو وہ برطانیہ روانہ ہوگئے۔اس دورے میں ان کی ملاقات دادا بھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتا، ڈبلیو۔ سی۔ بونرجی اور ہورمزجی واڈیا سے ہوئی، جوتاحیات ان کے دوست رہے۔دسمبر 1867 میں، وہ ہندوستان واپس آگئے،اور بمبئی ہائی کورٹ میں بطور وکیل کام کرنا شروع کیا۔ 1873 میں، وہ بمبئی میونسپل کارپوریشن کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ 1875 سے 1905 تک، وہ یونیورسٹی آف بمبئی کے سینیٹ کے رکن رہے۔انہوں نے 1882 سے 1886 تک بمبئی قانون ساز کونسل میں خدمات انجام دیں۔فیروز شاہ مہتا اور کاشی ناتھ ترمبک تلنگ کے ساتھ، 1885 میں، انہوں نے بمبئی پریزیڈنسی ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی۔ حقیقت میں، بدرالدّین اور ان کے بھائی قمرالدّین انڈین نیشنل کانگریس کے بانی اراکین میں شامل تھے۔کانگریس میں ان کو کافی مقبولیت حاصل تھی، کیونکہ وہ بمبئی ایلفنسٹن انسٹی ٹیوشن کے فارغ التحصیل تھے،اور برطانیہ سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ وہ 1887 کے مدراس اجلاس میں، انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے مسلمان صدر بنائے گئے۔وہ ہمیشہ اس موقف کے حامی رہے کہ مسلمانوں کو کانگریس کی کارکردگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔کانگریس کے اجلاس میں مختلف سیاسی موضوعات پر جو تقاریر انہوں نے کیں وہ ان کی غیر معمولی سیاسی سوجھ بوجھ کی عکاسی کرتی ہیں۔ایک خوش اخلاق آدمی کے طور پر، وہ انگریزوں اور ہندو برادری کے ساتھ ہم آہنگ تھے۔ 1895 میں، وہ بمبئی ہائی کورٹ میں پہلے مسلمان اور تیسرے ہندوستانی جج مقرر ہوئے۔ 1906 میں، دل کا دورہ پڑنے سے ان کا لندن میں انتقال ہوا۔

بدرالدّین طیب جی

[illegible]

5.7 بدرالدّین طیب جی کا سیاسی کردار اور تعلیمی اصلاحات

(Political Activities, and Educational Reforms of Badruddin Tyabji)

بدرالدّین طیب جی کو منتخب میونسپل اتھارٹی کی کارکردگی پر بھروسہ تھا۔ 1872 کے میونسپل قانون نے ہندوستان کی سب سے بڑی میونسپل کارپوریشن کی ترقی کی راہ ہموار کی۔اس قانون کے تحت پہلے انتخابات 1873 میں ہوئے تھے۔ٹائمز آف انڈیا (23 جنوری 1883) لکھتا ہے کہ "1873 کے پہلے الیکشن میں معروف لوگ جیسے جمسیت جی جیجی بھائی، جمسیت جی پالون جی کپاڈیہ، ڈاکٹر تھامس بلینی، بدرالدّین طیب جی اور نوروجی فردون جی نے صرف ایک ووٹ حاصل کیا۔تاہم، 1875 کے انتخابات میں، بدرالدّین ایک امیدوار کے طور پر کھڑے ہوئے اور پھر مسلسل چار انتخابات میں ایک ممبر کے طور پر منتخب ہوئے۔

شہر کے معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے دوران، بدرالدّین مسلم کمیونٹی کی حالت سے غافل نہیں تھے جو سماجی اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ تھی۔ مارچ 1876 میں، بدرالدّین نے مسلمانوں کی بہتری اور ترقی کے لیے انجمن اسلام بمبئی قائم کی۔ وہ یورپیوں کے ہاتھوں ہندوستانیوں کے ساتھ ذلت آمیز اور امتیازی سلوک کے لیے بھی کم حساس نہیں تھے۔ انہوں نے پریس کے لیے ایک خط میں لکھا کہ "نسلی برتری کے مفروضے کی بنیاد پر ایک مغرور یورپی حجام کا مقامی باشندوں کے لیے اپنے دروازے بند کرنا، حقیر اور مضحکہ خیز ہے۔" لیکن اگر ریاست کے اعلیٰ افسران بھی اس غرور اور تکبر کے شکار ہو گئے، تو یقیناً یہ ایک بڑا اور حقیقی خطرہ بن جاتا ہے۔ ایک عوامی تقریر میں، بدرّالدین نے لارڈ لٹن کی برطانوی تیار شدہ کپاس کے اشیاء پر محصولات ختم کرنے کی تجویز کے خلاف احتجاج کیا۔ اگست 1882 میں، بدرالدّین کو بمبئی کے گورنر کی قانون ساز کونسل کا رکن نامزد کیا گیا۔ اسی سال انہوں نے ہنٹر کمیشن کے سامنے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا خلاصہ پیش کیا، جبکہ انجمن اسلام نے اس حالت کو سدھارنے کا مطالبہ کیا۔

قانونی پیشے کے علاوہ، بدرالدّین کو تعلیم سے بہت لگن تھی۔ بدرالدّین نے انجمن اسلام کو اپنے نظریات کا پرچار کرنے کے لیے استعمال کیا۔ تنظیم کے اہم کارکنوں میں بدرالدّین طیب جی، ناخدا محمد علی روگے، قمرالدین، منشی ہدایت اللہ اور منشی غلام محمد شامل تھے۔ اس تنظیم کے پہلے صدر قمرالدّین تھے، جب کہ روگے نائب صدر بنے۔ انجمن نے بدرالدّین طیب جی اور عباس طیب جی کے ساتھ ایگزیکٹو کمیٹی کا بھی انتخاب کیا تھا۔ 1930 میں ڈانڈی مارچ میں اپنے کردار کی وجہ سے عباس طیب جی کافی مقبول ہوئے تھے۔ اس انجمن کا مقصد مسلم معاشرے میں تعلیم فراہم کرنا اور بڑے پیمانے پر بہتری لانا تھا۔ اس انجمن نے ممبادیوی کے گوکل داس تیج پال اسکول میں ایک الگ "اینگلو ہندی کلاس" شروع کی تھی۔ اس انجمن نے جلد ہی ایک اسکول کی ضرورت کو محسوس کیا، اور فنڈ اکٹھا کرنے کی ایک قابل ذکر مہم شروع کی گئی۔ یہ اسکول 20 ستمبر 1880 کو قائم کیا گیا، اور بدرالدّین نے اپنے دو بیٹوں کو اس اسکول میں بھیج کر نئے منصوبے پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔ بمبئی حکومت کی طرف سے مختص کی گئی چھ ہزار روپیہ کا سالانہ عطیہ اور جمع کی گئی امداد اس اسکول کے لیے ناکافی ثابت ہوئے۔ اس کے بعد بدرالدّین نے میونسپلٹی کو چھ ہزار روپیہ سالانہ امداد دینے پر آمادہ کیا۔

تعلیم کے معاملے میں بدرالدّین مسلمانوں کے درپیش مشکلات سے غافل نہیں تھے۔ انہوں نے ان مسئلے پر گورنر کونسل کے سینئر ممبر مسٹر ایل۔ سی۔ ایشبومر اور گورنر سر جیمز فرگوسن کے ساتھ بحث کی۔ اس وقت بمبئی کے لوگوں میں ایک واضح اور عجیب سوچ یہ تھی کہ کوئی مسلمان بمبئی کا شریف (Sheriff) نہیں بن سکتا ہے۔ بدرالدّین نے اس معاملے کو ہنٹر کمیشن کے نوٹس میں لایا۔ اس لیے، بدرالدّین کی سفارش پر جناب رحمت اللہ سیانی کو بمبئی کا شریف مقرر کیا گیا۔ اس طرح، سر جیمز فرگوسن نے بدرالدّین کو یقین دلایا کہ مسلم کمیونٹی کے ساتھ مکمل انصاف کیا جائے گا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ مسلم شریف کے مطالبے میں دیگر برادریوں نے گرم جوشی سے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ انہوں نے انجمن کے حوالے سے اپنے غیر مسلم دوستوں سے بھرپور تعاون طلب کیا تھا۔ جب انہوں نے فیروز شاہ مہتا کو انجمن کے مدرسے کا معائنہ کرنے کی دعوت دی؛ تو فیروز شاہ مہتا نے بی۔ ایم۔ واگلے، ایس۔ پی۔ پنڈت، نانا مورارجی اور کیخسرو کبراجی کے ساتھ مدرسے کا معائنہ کیا، اور اس شہر میں مسلمانوں کے تمام طبقات میں تعلیم کو فروغ دینے کی ترغیب کی حوصلہ افزائی کی۔

ہنٹر کمیشن کے آنے سے پہلے بدرالدّین نے محسوس کیا تھا کہ مسلمانوں کے درمیان پرائمری تعلیم کا نظام صحیح بنیادوں پر قائم نہیں ہے۔انہوں نے اس بات پر زور دے کر کہا کہ مسلم آبادی کی ضروریات کے حوالے سے کوئی نظام نہیں اپنایا گیا ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ مسلم آبادی کی ضروریات کے حوالے سے کوئی تعلیمی نظام نہیں اپنایا گیا ہے۔ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے بہت حد تک سرکاری اسکولوں میں داخلہ نہیں لیتے تھے کیونکہ ان کی خصوصی ضروریات کو پورا نہیں کیا جاتا تھا۔ چونکہ مسلمان ہندوستانی، فارسی اور عربی کی تعلیم کو زیادہ اہمیت دیتے تھے،اوراس لیے وہ گجراتی، مراٹھی یا انگریزی پڑھانے والے اسکولوں میں داخلہ نہیں لیتے تھے۔انہوں نے کہا کہ بااثر مسلمان اپنے معاشرے کی ضروریات کے مطابق تعلیمی نظام کی حمایت کریں گے۔ وہ انگریزی تعلیم سے بالکل لاتعلق تھے، کیونکہ وہ اسے اپنی کلاسیکی زبانوں کے مطابق نہیں سمجھتے تھے۔اس لیے مناسب یہ ہے کہ مشرقی تعلیم کو مغربی ادب، فنون اور علوم کے ساتھ پڑھایا جائے۔بدرالدّین نے تجویز پیش کی کہ ہندستانی اور فارسی کے ساتھ ساتھ ریاضی کو بھی متعارف کرایا جائے جو مقامی گجراتی اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے پیشہ ورانہ تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ بدرالدّین نے رائے دی کہ ان مستحق شاگردوں پر بہت غور کیا جائے، جن کے والدین معمول کی فیس ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ بدرالدّین نے کہا کہ انگریزی تعلیم کی کمی، سیاسی تعصبات اور فارسی اور عربی کی اہمیت میں کمی کی وجہ سے بہت سے مسلم گریجویٹ روزگار حاصل نہیں کر پاتے ہیں۔ مسلمانوں کی حالت سدھارنے کے لیے اعلیٰ عہدیداروں نے اور کئی کوششیں کیں، لیکن درج ذیل حالات نے انھیں جہالت سے آزاد نہیں ہونے دیا:

- ماضی کی سلطنت کی شان پر فخر کے احساس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو موجودہ حالات سے ہم آہنگ نہیں کر پاتے تھے۔
- ہندوستانی، فارسی اور عربی ادب کی محبت اور فخر نے انہیں یورپ کے جدید فنون، علوم اور ادب کی تعریف کرنے سے دور رکھا۔
- ایک مبہم احساس، کہ یورپی تعلیم، اسلامی روایات کے خلاف ہے اور کفر والحاد یا عیسائیت کی طرف لے جاتی ہے، نے مسلانوں کو جدید تعلیم سے دور رکھا۔
- مسلم نوجوانوں کے لیے موزوں اسکول فراہم کرنے میں تعلیمی حکام کی جانب سے ناکامی یا کوتاہی۔
- غربت جو انہیں موجودہ اسکولوں سے بھی تعلیم حاصل کرنے سے روکتی تھی۔
- یہ احساس کہ ملکی حکومت ان کی بگڑتی ہوئی صورتحال کا کوئی جائزہ نہیں لیتی اور انہیں اس حالت سے نکالنے کے لیے کچھ نہیں کرتی۔
- یہ احساس کہ سرکاری اسکولوں میں انگریزی تعلیم کی کوئی عملی اہمیت نہیں ہے۔

انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کو بتدریج اس بات کا قائل ہونا چاہیے کہ ماضی کو ثابت کرنے اور اس کے قابل ہونے کا واحد طریقہ موجودہ مواقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہے،اوران کی بے حسی ان کی حالت کو بہتر نہیں کر سکتی ہے۔ان کا ماننا تھا کہ جلسوں کے انعقاد، بیان بازی، اخبارات میں مقالے چھاپنے سے ان کے ہم مذہبوں کو ان کی موجودہ بے حسی کے مہلک نتائج سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ بدرالدّین مسلمانوں کے تئیں حکومت کی بے حسی پر سخت تنقید کرتے تھے۔ یہ بے حسی 1857 کی عظیم ہندوستانی بغاوت میں مسلمانوں کے کردار کی

پیداوار تھی۔ بدرالدّین کو مسلمانوں کی تعلیمی حالت اور تعلیمی مسائل کا بخوبی علم تھا۔ مسلمانوں کی پسماندہ تعلیمی صورتحال سے متعلق بدرالدّین کے اعداد و شمار سے ہنٹر کمیشن بہت متاثر ہوا۔ یکم نومبر 1882 کو ہنٹر کمیشن کے سامنے، انہوں نے مسلمانوں کی پسماندگی کے بارے میں ایک میمورنڈم پیش کیا، جس میں انہوں نے تکنیکی تعلیم کا بھی ذکر کیا تھا۔ انہوں نے گورنمنٹ لاء کالج کو بہتر بنانے پر بھی زور دیا تھا۔

1883 کا سیاسی منظر نامہ بمبئی کی عوامی زندگی میں ایک خاص تثلیث (بدرالدّین، فیروز شاہ اور تلنگ) کے عروج کی نمائندگی کرتا ہے۔ بدرالدّین نے 18 مئی 1882 کی حکومت ہند کی اس قرارداد کی حمایت کی، جس میں مقامی حکومت خوداختیاری (Local Self-Government) کی حوصلہ افزائی کے لیے حکومت کے منصوبے کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ مقامی حکومت خوداختیاری کا مقصد لوگوں کو خود اپنے معاملات کا انتظام کرنے پر آمادہ کرنا تھا۔ بدرالدّین طیب جی کا ماننا ہے کہ مقامی حکومت خوداختیاری کی اسکیم نے وائسرائے رپن کو ہندوستانی تاریخ میں لافانی بنادیا۔ اسی دوران 1883 میں البرٹ بل پر ہنگامہ کھڑا ہوا۔ بدرالدّین طیب جی نے 1883 میں البرٹ بل تنازعہ کے تناظر میں اہم کردار ادا کیا۔ البرٹ بل برطانوی ہندوستان میں وائسرائے کونسل کے لاء ممبر (Law Member) سر کورٹنے پیر گرین البرٹ نے متعارف کرایا۔ اس بل کا مقصد ہندوستانی ججوں کو یورپی مجرموں کے مقدمات چلانے کا اختیار دینا تھا۔ اس بل سے پہلے صرف یورپی ججوں کو ایسے مقدمات چلانے کا اختیار حاصل تھا۔ طیب جی نے استدلال کیا کہ یہ بل قانون کے سامنے مساوات کو فروغ دے گا، اور قانونی نظام میں موجود نسلی امتیاز کو ختم کرے گا۔ تاہم، البرٹ بل کو ہندوستان میں یورپی برادری کی طرف سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ بہت سے یورپیوں کا خیال تھا کہ ہندوستانی جج یورپی مجرموں پر مقدمہ چلانے کے قابل نہیں ہیں۔ مخالفت اتنی شدید تھی کہ یورپی برادری کے تحفظات کو پورا کرنے کے لیے اس بل کو روک دیا گیا۔ طیب جی کی کوششوں اور دیگر ہندوستانی رہنماؤں (دادابھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتا) کی حمایت کے باوجود البرٹ بل نے ہندوستانی ججوں کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ یورپی مجرموں پر مقدمہ چلائیں۔ یہ سمجھوتہ ہندوستان میں برطانیہ کے ذریعے عملائے گئے نسلی تعصبات کی عکاسی کرتا تھا۔

ایک اور شکایت، جس نے بدرالدّین کے پڑھے لکھے ہم وطنوں کو تکلیف دی، لندن میں انڈین سول سروس امتحان کے لیے ہندوستانی امیدواروں کی عمر کی حد میں اضافہ کرنا تھا۔ بائیس سال کی عمر کی اصل حد کو کم کر کے اکیس، اور بعد میں انیس کر دیا گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آٹھ سالوں میں امتحانات دینے والے 28 ہندوستانی امیدواروں میں سے صرف ایک ہی امیدوار کامیاب ہوا۔ لارڈ رپن نے بہت خوبی سے اس شکایت کو بھی دور کرنے کی کوشش کی۔ بدرالدّین نے وائسرائے سے درخواست کی کہ عمر کی حد بڑھانے کے لیے وہ سکریٹری آف اسٹیٹ پر دباؤ ڈالے۔ رپن نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور سکریٹری آف اسٹیٹ کو عمر کی حد بڑھانے کا مشورہ دیا۔ لیکن مؤخر الذکر نے ایسا نہ کرنے کا انتخاب کیا۔ 1884 میں، سر جمشیت جی جیجی بھائی کی صدارت میں بمبئی میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا، جس میں بدرالدّین نے کہا: "کیا حکومت کی طرف سے یہ مذاق نہیں ہے کہ وہ ایک سانس میں یہ اعلان کرے کہ تمام تقرریاں ہندوستان کے باشندوں کے لیے کھلی ہیں، اور اگلے ہی سانس میں ایسے قوانین وضع کرے جو 100 میں سے 99 کے لیے ناممکن ہیں۔ یہ کوششیں رائیگاں نہیں ہوئی، لیکن بدرالدّین کو اس وقت تسلی مل گئی جب ان کے انیس سالہ بیٹے محسن نے نہ صرف انڈین سول سروس امتحان پاس کرلیا، بلکہ فہرست میں ان کا نام سب سے پہلا تھا۔

بدرالدّین طیب جی نے بمبئی پریزیڈنسی ایسوسی ایشن میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ یہ تنظیم ایک سیاسی تنظیم تھی جو 1852 میں بمبئی پریزیڈنسی کے لوگوں کو درپیش سیاسی اور سماجی مسائل سے نمٹنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ یہ انجمن بے حال ہو چکی تھی اور بدرالدّین نے اسے دوبارہ منظم کرنے اور از سرِ نو زندہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ دادابھائی نوروجی، دنشاواچا، اور فیروز شاہ مہتا اس انجمن کے سرگرم کارکن رہے ہیں۔ انہوں نے لوگوں کے مفادات کو یقینی بنانے کے لیے ہندوستانی قانون ساز کونسلوں میں منتخب ہندوستانی اراکین کو شامل کرنے کی دلیل پیش کی۔ اس تحریک نے ہندوستانیوں کے حقوق اور مفادات کی وکالت کی۔ اس کا مقصد سیاسی بیداری کو فروغ دینا اور نوآبادیاتی نظام میں اصلاحات کے لیے رائے عامہ کو متحرک کرنا تھا۔ اس انجمن نے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالنے میں ایک اہم کردار ادا کیا، جو بعد میں تحریک آزادیٔ ہند کی ایک اہم سیاسی تنظیم بن گئی۔

اسی دوران، اے۔او۔ ہیوم ہندوستان کے سیاسی منظر نامے پر نمودار ہوئے۔ اے۔او۔ ہیوم انڈین سول سروس افسر تھے اور 1882 میں ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ ان کا مقصد ملک میں ایک قومی تنظیم قائم کرنا تھا جسے "انڈین نیشنل کانگریس" کا نام دیا گیا۔ اس طرح، پونا میں ایک کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی گئی جس میں تمام دلچسپی رکھنے والے افراد کو اپنی رائے دینے کی دعوت دی گئی۔ کراچی، احمد آباد، سورت، بمبئی، پونا، مدراس، کلکتہ، بنارس، الہ آباد، لکھنؤ، آگرہ اور لاہور میں مقامی سلیکٹ کمیٹیاں تشکیل دی گئیں تاکہ وفود کی تقرری اور کانفرنس میں شرکت کی جا سکے۔ 19 دسمبر 1885 کو بمبئی پریزیڈنسی ایسوسی ایشن نے ہیوم کی کوششوں کو سراہتے ہوئے ایک قرارداد منظور کی اور بمبئی میں ہونے والے انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے اجلاس کے انتظامات کرنے کی پیشکش کی۔ یہ کانفرنس 27 دسمبر 1885 کو گوکل داس تیجپال سنسکرت کالج بمبئی میں منعقد ہوئی۔ ڈبلیو۔ سی۔ بونرجی اس تحریک کے پہلے صدر بن گئے۔ قمرالدین، رحمت اللہ سیانی اور عبداللہ مہر علی دھرمسی بمبئی پریزیڈنسی ایسوسی ایشن کے منتخب کردہ کانگریس کے مندوبین میں شامل تھے۔

5.8 بدرالدّین طیب جی: ہندوستانی قومی تحریک کے معروف رہنماء

(Badruddin Tyabji as a Reputable Indian Nationalist Leader)

انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے اجلاس کے فوراً بعد، ڈبلیو۔ سی۔ بونرجی نے بدرالدّین کو خط لکھ کر اگلے کانگریس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ انہوں نے مزید کہا کہ پچھلے سال آپ کی عدم موجودگی ہم سب کے لیے بہت مایوسی کا باعث تھی۔ یہ اجلاس انتہائی اہمیت کا حامل رہے گا کہ اگر آپ ہمارے مباحثوں میں شرکت کریں گے اور اس کی صدارت کریں گے۔ لیکن بدرالدّین کی صحت نے انہیں اس اعلیٰ اعزاز کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دی جو انہیں پیش کی گئی تھی۔ 1886 میں، وہ اپنی صحت کی بحالی کے لیے برطانیہ روانہ ہو گئے اور دسمبر 1886 میں کلکتہ کے کانگریس اجلاس میں شرکت نہیں کر سکے۔ 20 اکتوبر 1887 کو دادابھائی نوروجی نے بدرالدّین طیب جی کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ مدراس میں ہونے والے کانگریس کے اگلے اجلاس کی صدارت کریں۔ کانگریس قائدین نے محسوس کیا کہ اگر بدرالدّین اگلے کانگریس اجلاس کی صدارت کریں، تو تنظیم مختلف پہلوؤں سے مضبوط ہو گی۔ تقریباً اسی وقت ایک خصوصی مسلم ایسوسی ایشن بنانے کی متوازی

کوششیں کی جارہی تھیں۔ 28 نومبر 1887 کو بدرالدّین نے کلکتہ کی مرکزی قومی محمڈن ایسوسی ایشن کے سکریٹری سید امیر علی کی طرف سے ایک خط موصول کیا۔ خط میں سید امیر علی نے لکھا کہ 'مسلمانوں کے درمیان بڑھتی ہوئی یکجہتی، ان کی مادی اور سیاسی ترقی کے حصول کے لیے، شہر کلکتہ میں ایک کانفرنس منعقد کرنا ضروری ہے۔ اس کانفرنس میں ایسے اہم سوالات پر بحث کی جائے جو مسلم برادری کے عمومی مفادات کو متاثر کرتے ہوں۔' انہوں نے مزید کہا کہ 'یہ ظاہر ہے کہ جب تک برطانوی حکومت کے تحت اپنے جائز اور آئینی مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے ہمارے خیالات اور عمل کا اتحاد نہ ہو، تب تک ہم صرف ایک ثانوی اہمیت کی برادری بن کر رہ جائیں گے اور ہم سیاسی ترقی کے کام میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کریں گے۔' اس مقصد کے لیے انہوں نے 2، 3 اور 4 فروری 1888 کو ایک کانفرنس بلائی اور بدرالدّین طیب جی کو کانفرنس میں شرکت کرنے کی دعوت دی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کانفرنس بھائی چارے اور ہمدردی کے رشتوں کو جوڑ دے گی جس سے ان کی سیاسی ترقی کو تقویت ملے گی۔

3 دسمبر 1887 کو، ہیوم نے، انڈین نیشنل کانگریس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے کہا کہ "میں ذاتی طور پر یقین رکھتا ہوں کہ اس عہدے کے لیے آپ نہ صرف بہترین، بلکہ واحد لائق شخص ہیں، اور مجھے پوری امید ہے کہ آپ اس حیثیت کو قبول کریں گے، جس کے لیے آپ کو اپنے ہم وطنوں نے بالکل متفقہ آواز سے بلایا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہیوم کا خط حاصل کر لیتے، بدرالدّین نے اسی تاریخ (3 دسمبر 1887) پر امیر علی کو جواب بھیجا تھا کہ مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ آپ نے مجھے فروری 1888 میں کلکتہ میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ جواب میں میں عرض کرتا ہوں کہ میں مسلمانوں کی اخلاقی، سماجی اور سیاسی ترقی کے لیے سب سے زیادہ خوشی محسوس کروں گا۔ لیکن آپ کو معلوم ہوگا کہ میں ہمیشہ سے یہ رائے رکھتا ہوں کہ سیاسی سوالات کے سلسلے میں مسلمانوں کو اپنے ہم وطنوں (ہندوؤں اور پارسیوں) کے ساتھ ایک مشترکہ مقصد بنانا چاہیے۔ مجھے اس بات پر افسوس ہے کہ کلکتہ کے مسلمان بمبئی اور کلکتہ کے گزشتہ کانگریس اجلاسوں میں شرکت کرنے سے باز رہے ہیں۔ اس لیے اگر مجوزہ محمدن کانفرنس کا آغاز محض انڈین نیشنل کانگریس کے حریف کے طور پر کیا جارہا ہے، تو مجھے اس کی مکمل مخالفت کرنی چاہیے، کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ ہمیں مدراس کانگریس اجلاس میں حصہ لینا چاہئے۔ دوسری طرف اگر یہ محمدن کانفرنس کسی دشمنی کے جذبے سے شروع نہیں کی گئی ہے تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہمیں ایک الگ کانفرنس منعقد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لہذا، اس خط سے بدرالدّین طیب جی کی فطری شائستگی، اعتدال پسندی، بالغ نظری اور غیر معمولی بصیرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد انڈین نیشنل کانگریس کا تیسرا اجلاس بدرالدّین طیب جی کی صدارت میں 26 دسمبر 1887 کو مدراس میں منعقد ہوا۔ انہوں نے اجلاس میں اس بات کا اعتراف کیا کہ کانگریس نے اپنے وجود کے مختصر عرصے میں بہت ترقی حاصل کی ہے؛ اور اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ یہ مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ کریں گی، جنہوں نے کانگریس کے پچھلے دو اجلاسوں کی کارروائی سے اپنے آپ کو الگ رکھا ہے۔ اجلاس کی کاروائی خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لیے بدرالدین کے کردار کو سراہا گیا۔ راما سوامی مدلیار نے اظہار تشکر پیش کیا، جس میں انہوں نے بدرالدّین طیب جی کی قابلیت، تدبیر اور خوش مزاجی کی پذیرائی کی۔

5.9 کانگریس میں فرقہ وارانہ اتحاد کے فروغ میں بدرالدّین طیب جی کا کردار

(Badruddin Tyabji's Role in Promoting Communal Amity in the Congress)

بدرالدّین طیب جی قومی اتفاق رائے کے ارتقا پر اپنے اصرار میں کتنے سخت تھے۔ان کا خیال تھا کہ ہندوستان ایک قوم بننے کے عمل میں ہے۔بدرالدّین نے انڈین نیشنل کانگریس کے تیسرے اجلاس کے بعد ایک ایسا سمجھوتہ کرنے کی کوشش میں کوئی وقت ضائع نہیں کیا جو کانگریس کو مضبوط کرے اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف کھینچ لے۔جب بدرالدّین کانگریس کو مضبوط کرنے میں مصروف تھے، امیر علی ایک مسلم کانفرنس کے لیے اپنے منصوبوں کو آگے بڑھا رہے تھے۔بدرالدّین نے امیر علی کو (خط) لکھا کہ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے آپ کو ترقی کے پیمانے پر بلند کریں نہ کہ دوسرے لوگوں کو ان حقوق سے لطف اندوز ہونے سے روکیں جن کے وہ اہل ہیں۔اگر کوئی ایسی تجویز پیش کی جائے جس سے مسلمانوں کو ہندوؤں کے تابع کر دیا جائے یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے انتظامی اختیار ہندوؤں کو دیا جائے تو میں بھی پوری طاقت سے اس کی مخالفت کروں گا۔لیکن کانگریس کی ایسی کوئی تجویز نہیں ہے۔اس کے مقاصد یکساں طور پر تمام برادریوں کی بہبودی اور بہتری کے لیے ہیں۔بدرالدّین طیب جی نے اسی تاریخ پر سید احمد خان اور نواب عبداللطیف کو بھی اسی طرح کے خط بھیجے تھے۔ان کے علاوہ انہوں نے 14 جنوری 1888 کو نواب محسن الملک کو خط لکھ کر بتایا کہ کانگریس کا مقصد عام طور پر ہندوستان کے تمام پڑھے لکھے اور ذہین لوگوں کی رائے کو دھیان میں لا کر ہندوستان کے مفادات کو فروغ دینا ہے۔یہی وجہ ہے کہ میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ کیوں مسلمانوں کو دوسری برادریوں کے ساتھ مل کر کام نہیں کرنا چاہیے۔انہوں نے کہا کہ میں ان وجوہات کو نہیں سمجھ سکتا ہوں جن کی وجہ سے ہمارے دوستوں جیسے امیر علی، عبداللطیف اور سید احمد خان کو کانگریس سے الگ ہونے پر آمادہ کیا گیا ہے۔انہوں نے کہا کہ 'میں نے اپنے آپ کو ان کے ساتھ رابطے میں رکھا ہے تاکہ یہ دیکھ سکوں کہ کیا اس نامعقول اختلاف کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے، نہ صرف بنگال کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان، بلکہ دو پریزیڈنسیوں کے مسلمانوں کے درمیان بھی۔'

28 دسمبر 1887 کو سید احمد خان نے محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کے لکھنؤ اجلاس میں کہا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے مفادات کی حفاظت نہیں کر سکتا ہے۔17 جنوری 1888 کے ٹائمز آف انڈیا میں سید احمد کی لکھنؤ کی تقریر شائع ہوئی، اور اس نے کافی سنسنی پیدا کی۔24 جنوری 1888 کو سید احمد نے بدرالدین کو جوابی خط لکھا، جس میں انہوں نے اتحاد کے نظریے کو رد کیا۔انہوں نے کہا کہ نیشنل کانگریس نام کی کوئی تنظیم نہیں ہو سکتی اور نہ ہی یہ تمام لوگوں کے لیے یکساں فائدہ مند ہو سکتی ہے۔18 فروری 1888 کو بدرالدّین نے سید احمد کو دوسرا خط بھیجا جس میں وہ لکھتے ہیں کہ 'یقیناً ایسے سوالات ہیں جو کسی ایک نسل یا برادری یا صوبے کے فائدے کے لیے ہو سکتے ہیں، لیکن ایسے سوالات پر کانگریس میں ہرگز بحث نہیں ہونی چاہیے۔' بدرالدّین کا خیال تھا کہ ثقافتی اور مذہبی تفریق میں ہندوؤں کے ساتھ متحد ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔اس پر سید احمد نے شدید اختلاف کا اظہار کیا تھا۔اس کے بعد بدرالدّین نے سید احمد کو مذہبی رواداری کی طرف مائل کرنے کی کوئی مزید کوشش نہیں کی۔تاہم، انہوں نے کانگریس کے نظریات کو پھیلانے کی کوشش جاری رکھی۔

مذکورہ بالا تمام واقعات اس بات کی نمائندگی کرتے ہیں کہ بدرالدّین طیب جی 'مذہبی قومیت' کے نصب العین پر یقین نہیں رکھتے

تھے۔ہندوستان کی مختلف برادریوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے، بدرالدّین نے مختلف ہندوستانی برادریوں کو جوڑنے کی کوشش کی۔ان کا خیال تھا کہ اچھی حکومت، انتظامیہ میں اصلاحات، بہتر معاشی نظام، ٹیکسوں میں کمی، بہتر نظام عدلیہ اور سرکاری ملازمتوں سے ملک کے کسی معاشرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا ہے۔1888 کے کانگریس اجلاس میں بدرالدّین نے شرکت نہیں کی، کیونکہ قمرالدّین بستر مرگ پر تھے، اور روگے ذہنی تناؤ کا شکار ہو چکے تھے۔اس کے بعد قمرالدّین اور روگے کا انتقال ہو گیا اور بدرالدّین کی تنہائی گہری ہو گئی۔ قمرالدّین اور روگے وہ لوگ تھے جنہوں نے بدرالدّین کی زندگی کے ہر مرحلے میں رہنمائی کی تھی۔

5.10 تعلیم کی حمایت میں بدرالدّین طیب جی کا کردار

(Role of Badruddin Tyabji in the Promotion of Education)

انیسوی صدی کے اواخر اور بیسوی صدی کے اوائل میں بدرالدّین طیب جی نے تعلیم کی وکالت میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ اس وقت مغربی تعلیم کے پرزور حامی تھے جب روایتی اور جدید نظام تعلیم کے درمیان بحث چل رہی تھی۔ان کا خیال تھا کہ مغربی اور ہندوستانی تعلیم کا امتزاج ایک جامع اور عملی نقطہ نظر فراہم کر سکتا ہے۔طیب جی تعلیمی اصلاحات کے لیے مباحثوں اور تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انہوں نے ان اقدامات کی حمایت کی جن کا مقصد تعلیمی معیار کو بہتر، قابل رساں اور نصاب کو وقت کی ضروریات کے مطابق تیار کرنا تھا۔ مسلمانوں میں جدید تعلیم کو فروغ دینے پر انہوں نے علی گڑھ تحریک اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی حمایت کی۔انہوں نے تعلیم نسواں کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اس کے مقصد کی فعال حمایت کی۔انہوں نے لڑکیوں کے لیے اسکولوں اور کالجوں کے قیام کی وکالت کی، جس کا مقصد تعلیم کے ذریعے خواتین کو بااختیار بنانا تھا۔ وہ نہ صرف تعلیمی معاملات سے وابستہ رہے بلکہ سیاسی میدان میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔1887 میں انڈین نیشنل کانگریس کے تیسرے صدر کے طور پر، انہوں نے قومی ترقی اور سماجی ترقی کے لیے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ان کی صدارت نے سیاسی منظر نامے کے اندر تعلیمی مسائل پر بیداری کے ایک دور کو نشان زد کیا ہے۔ہندوستانی قومی تحریک میں تعلیم کی حمایت بدرالدّین کی ایک بڑی تحریک تھی جس کا مقصد روایتی اور جدید تعلیم میں توازن پیدا کرنا، پسماندہ لوگوں کو بااختیار بنانا اور تعلیم کے ذریعے قومی شناخت کے احساس کو فروغ دینا تھا۔

بدرالدّین عوامی زندگی میں بھی اتنے ہی باکمال تھے جتنے نجی زندگی میں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ سید احمد خان ان کے نظریات کے مخالف تھے۔ لیکن سید احمد خان کی وفات پر بدرالدّین نے انجمن کا تعزیتی اجلاس بلایا اور سید احمد خان کی تعلیمی خدمات کو سراہا۔انہوں نے سید احمد خان کے اعزاز میں علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تجویز کی پرجوش حمایت کی۔1886ء میں سید احمد خان نے محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی اور اس کے مستقل سیکرٹری بن گئے۔اگرچہ ابتدا میں یہ تعلیم کے لیے وقف تھی، لیکن بہت جلد یہ سید احمد کے سیاسی نظریات کی تبلیغ کا پلیٹ فارم بن گئی، اور بدرالدّین نے اس سے دور رہنے کی کوشش کی۔1903 میں، سید احمد کی وفات کے پانچ سال بعد بدرالدّین کو کانفرنس کے بمبئی اجلاس کی صدارت کے لیے مدعو کیا گیا۔اس اجلاس میں ہندوستان بھر سے نمائندے موجود تھے، جن میں خواجہ الطاف حسین حالی، گورنر لارڈ لیمنگٹن، آغا خان اور جمسیت جی جیجی بھائی شامل تھے۔

جولائی 1906 میں، بدر الدّین نے علی گڑھ کالج ایسوسی ایشن میں ایک اجتماع سے خطاب کیا، اور کہا کہ ''سر تھامس نے ٹھیک کہا ہے کہ ایک ہی کالج ہندوستان کے پچاس یا ساٹھ ملین مسلمانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ہمارے پاس یہ ادارے پورے ہندوستان میں ہونے چاہئے۔ آخر میں، انہوں نے کہا کہ 'مجھے امید ہے کہ یہ کالج نہ صرف شمال مغرب کے لیے بلکہ پورے ہندوستان کے لیے مسلم تعلیم اور روشن خیالی کا ایک حقیقی مرکز بن جائے۔' انہوں نے یہ بھی کہا کہ 'ہندوستان میں ایسا کوئی مسلمان نہیں ہے، یقیناً بمبئ میں نہیں، جو علی گڑھ کی تمام تر خوشحالی اور کامیابی کا خواہاں نہ ہو۔' اگرچہ یہ ان کی آخری عوامی تقریر تھی، لیکن ان کی آنکھوں اور عمومی صحت میں نمایاں بہتری درج کی گئی تھی اور ان کا عمومی نقطہ نظر کافی خوشگوار تھا۔ 19 اگست 1906 کو حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے بدر الدّین طیب جی کا انتقال ہوا۔ ان کی وفات کی خبر سے پورے ملک میں کہرام مچ گیا۔ جناب یوسف علی نے انہیں ایک دلچسپ خراج تحسین پیش کیا اور کہا، 'ہر وہ مقصد جو کسی بھی طرح سے عوام کی بھلائی سے جڑا ہوتا تھا، بدر الدّین اس کے حصول میں اپنی ساری کوششیں صرف کرتا تھا۔ ان کا دل کشادہ تھا اور ان کے ذہن نے پورے ملک سے متعلق سوالات کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔' الغرض، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں میں ان سے زیادہ کوئی اور مسلمان محبوب نہیں تھا۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ بال گنگادھر تلک نے بھی ان کے جنازے میں شرکت کی۔

5.11 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

دادابھائی نے تعلیم کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج کامیابی کے ساتھ طے کیے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر پہلے وہ الفنسٹن کالج جہاں سے انہوں نے گریجویشن کیا تھا، میں اسکول ماسٹر اور پھر ریاضی اور فطری فلسفے کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ کچھ دن ملازمت کے ساتھ رفاہ عامہ کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہے اور مختلف تعلیمی، سماجی اور مذہبی اصلاحی انجمنوں کے قیام کے ذریعے بمبئ شہر میں اپنی عوامی زندگی کا آغاز کیا اور پھر ایک تجارتی فرم کے نمائندے کی حیثیت سے انگلینڈ جا پہنچے۔ لندن میں بھی آپ تعلیم و تعلم سے جڑے رہے اور یونیورسٹی کالج لندن میں گجراتی پڑھانے والے پہلے ایشیائی پروفیسر بن گئے۔ اسی کی ساتھ انہوں نے لندن انڈیا سوسائٹی اور ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن جیسی تنظیمیں قائم کیں تاکہ برطانوی عوام اور سیاستدانوں کو ہندوستان کے حالات سے آگاہ کیا جا سکے اور ان کی توجہ ہندوستانی مسائل کی طرف مبذول کرائی جا سکے۔ دادا بھائی نوروجی اور بدر الدّین طیب جی مثالی رہنما تھے جن کی شراکتیں سیاست اور معاشیات کی حدود سے ماورا تھیں۔ انصاف، مساوات اور آزادی کے لیے ان کی غیر متزلزل لگن آنے والی نسلوں کے لیے حوصلہ افزائی کا کام کرتی ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے بانی رکن کے طور پر، انہوں نے ہندوستانیوں کے حقوق اور فلاح و بہبود کی وکالت کی۔ دادا بھائی نوروجی نے برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستانی نمائندگی کے لیے انتھک مہم چلائی۔ نوروجی کے 'دولت کی نکاسی کے نظریے' نے برطانوی نوآبادیت اور ہندوستان کی معیشت پر اس کے مضر اثرات پر روشنی ڈالی۔ ان کی تحقیق نے مستقبل کے ماہر اقتصادیات اور قوم پرستوں کے لیے نوآبادیاتی پالیسیوں کو چیلنج کرنے اور معاشی آزادی حاصل کرنے پر زور دیا۔ نوروجی دیانتداری اور ہندوستانی قوم پرستی کے معیار تھے۔ ان کی زندگی ہندوستان کی نسلوں کو انصاف، مساوات اور آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

بدر الدّین طیب جی ان عظیم ہندوستانیوں میں سے ایک تھے جنہوں نے قومی بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔ 1867 میں بیرسٹری

پاس کرنے کے بعد بمبئی پریسیڈنسی کے پہلے ہندوستانی بیرسٹر ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ 1895 میں جج مقرر ہوئے۔ 1903 میں انہوں نے پہلے ہندوستانی چیف جسٹس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور بال گنگادھر تلک کی ضمانت ایک ایسے مقدمے میں منظور کر لی جسے تین جج پہلے رد کر چکے تھے۔ انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کو ایسی مضبوط اور مربوط حمایت فراہم کی جو تنظیم کے لیے بڑی طاقت کا باعث بنا۔ ان کی سب سے بڑی خدمت ان کے وسیع اور بردبار نقطہ نظر میں ہے جو مسلمانوں کو قومی یکجہتی اور مسلم ثقافت کے تحفظ کی طرف راغب کرتا ہے۔ فیروز شاہ مہتا اور تلنگ کے ساتھ بدرالدّین بمبئی کے عظیم شہر کا ایک مخلص خادم تھا۔ انہوں نے بمبئی پریزیڈنسی ایسوسی ایشن کو قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ایسوسی ایشن کے ذریعے بدرالدّین نے بمبئی کے لوگوں اور قومی تحریک کے درمیان ایک مضبوط ربط قائم کیا۔ مسلمانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے انہوں نے بمبئی میں انجمن اسلام قائم کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ، بدرالدّین کا شمار ہمیشہ کے لیے عظیم ججوں میں ہوتا رہے گا۔ بحیثیت جج ان کی ہمت اور غیر جانب داری مشہور تھی۔ مزید برآں، بدرالدّین ایک ایسے مفکر تھے جنہوں نے اس وقت ہندوستان کے سیاسی اتحاد کی بات کی جب وہ محض ایک دھندلا تصور معلوم ہوتا تھا۔ لیکن بدرالدّین قوم کے اتحاد اور سالمیت کی ضرورتوں کو محسوس کرنے کی بصیرت رکھتے تھے۔

5.12 کلیدی الفاظ (Keywords)

شیریف	:	(Sherriff) ناظم عدالت، تھانیدار، کوتوال
سوراج	:	خود حکمرانی۔
دولت کی نکاسی	:	دولت کی نکاسی ہندوستان سے برطانیہ دولت کا یکطرفہ بہاؤ ہے جس کے بدلے ہندوستان کو کوئی معاضہ نہیں ملتا ہے۔
مذہبی ہم آہنگی	:	مذہبی ہم آہنگی سے مراد مذہب اور مذہب کے پیروکاروں کے درمیان پرامن ہم بودی، ہم موجودیت، توازن اور اتحاد کی حالت ہے۔
سودیشی	:	مقامی، ملکی۔

5.13 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

5.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد کس نے ڈالی؟
2. بمبئی پریزیڈنسی ایسوسی ایشن کا بانی کون ہے؟
3. 1906 میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کس نے کی؟
4. *Poverty and Un-British Rule in India* کس کی تصنیف ہے؟

5. انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے مسلم صدر کون تھے؟
6. دادابھائی نوروجی کی وفات کب ہوئی؟
7. محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کس نے قائم کی؟
8. *The Wealth of Nations* کس کی تصنیف ہے؟
9. تین معروف اعتدال پسند رہنماؤں کے اسمائے گرامی تحریر کیجیے؟
10. انجمن اسلامی کی بنیاد کس نے ڈالی ہے؟

5.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہوم چارجز سے کیا مراد ہے؟
2. دادابھائی نوروجی اور بدرالدّین طیب کی خالات زندگی پر مختصر روشنی ڈالیے۔
3. کن طریقوں سے دادابھائی نوروجی اعتدال پسند سیاست کا مظہر تھا؟
4. کس طرح دادابھائی نوروجی معاشی قوم پرست سے سیاسی قوم پرست بن گئے؟
5. انجمن اسلامی پر ایک مختصر نوٹ تحریر کریں۔

5.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. دادبھائی نوروجی کے دولت کی نکاسی کے نظریے پر بحث کیجیے۔
2. بدرالدّین طیب جی کے سیاسی کردار اور تعلیمی اصلاحات پر ایک مضمون تحریر کریں۔
3. تحریک آزادی میں فرقہ وارانہ اتحاد کے فروغ میں بدرالدّین طیب جی کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

5.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandhopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition: A History of Modern India*, Orient Longman Private Limited, New Delhi, 2004.
2. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2014.
3. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin, New Delhi, 2000.
4. Grover and Grover, *A New Look at Modern Indian History*, S. Chand & Co. Ltd., New Delhi, 1983.
5. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal*: *A New History of British India*, HarperCollins, Noida, 2021.
6. Moin, A., and Shaheeda Zaidi eds. *Encyclopaedia of the Indian National Congress*, *Vol. 1.*, S. Chand and Co. Ltd., New Delhi, 1976.
7. Noorani, A.G., *Badruddin Tyabji*, Ministry of Information and Broadcasting, Government of India, 1969.
8. Sarkar, Sumit, *Modern India*, *1885–1947*, MacMillan, New Delhi, 1982.

اکائی 6۔ لال، بال اور پال

(Lal, Bal, and Pal)

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید
6.1 مقاصد
6.2 لالہ لاجپت رائے: حالات زندگی
6.3 لالہ لاجپت رائے بطور سماجی مصلح
6.4 لالہ لاجپت رائے کا نظریۂ قومیت
6.5 تعلیم سے متعلق لالہ لاجپت رائے کے خیالات
6.6 ہندوستانی قومی تحریک میں لالہ لاجپت رائے کا کردار
6.7 بال گنگادھر تلک کے حالات زندگی
6.8 سماجی اصلاح سے متعلق تلک کے خیالات
6.9 ہندوستانی معیشت کے بارے میں تلک کے نظریات
6.10 تلک کے سیاسی نظریات
6.11 بپن چندر پال: حالات زندگی
6.12 بپن چندر پال بطور قوم پرست
6.13 بپن چندر پال کے سیاسی خیالات
6.14 ہندوستانی قومی تحریک میں بپن چندر پال کا کردار
6.15 لال بال پال اور انتہا پسندی
6.16 اکتسابی نتائج
6.17 کلیدی الفاظ
6.18 نمونہ امتحانی سوالات
6.19 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید (Introduction)

ابتداء سے ہی انڈین نیشنل کانگریس مغربی تعلیم اور مغربی سیاسی نظریات سے متاثر تھی۔ کانگریس آزاد خیالی (Liberalism) کے اصولوں پر عمل پیرا تھی۔ اس کا سیاسی نقطہ نظر سیکولر، جمہوری اور سماجی مساوات پر مبنی تھا۔ اس کے آزاد خیال فلسفے کے بنیادی اصول تھے:

ا۔ انسانی وقار پر اعتقاد۔ ۲۔ افراد کا حقِ آزادی۔ ۳۔ بلالحاظِ نسل، مذہب، زبان و ثقافت تمام مردوں اور خواتین کی برابری۔

شروع میں کانگریس نے قانون کی حکمرانی، یکسانیت، مساوات اور سیکولرازم کی حمایت کی، اور آمرانہ حکمرانی کی مخالفت کی۔ انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی پہلی نسل برطانوی طرز زندگی سے لازوال شفقت، برطانوی عدلیہ پر یقین اور برطانوی حکمرانوں کے تئیں گہری محبت رکھتی تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ برطانوی حکومت اور انگریزی تعلیم نے ان کو آزادی، مساوات، جمہوریت اور انسانی وقار جیسے نظریات سے روشناس کرنے میں بڑی حد تک مدد کی۔ وہ دعوی کرتے تھے کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں امن و امان قائم کرنے اور موثر انتظامیہ متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یورپی آزاد خیالوں کی طرح انیسویں صدی کے کانگریس رہنما بھی بتدریج ترقی اور نشوونما پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ یہ ترقی ان کو برطانوی حکمرانوں کی رضامندی اور ہمدردی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس لیے انہوں نے حصول ترقی کے لیے آئینی طریقوں پر زور دیا۔ قومی یکجہتی ان کی بنیادی فکر تھی۔ وہ مذہبی اختلافات کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے خلاف تھے۔ وہ سیاست کو مذہب سے دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور اپنے نقطہ نظر میں سیکولر تھے لیکن تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی نوجوان نسل نے اپنے سے پیش رو (پچھلی) نسل کی پوری سوچ کو مسترد کردیا۔ ملک میں بدلتے ہوئے حالات اس صورتحال کے ذمہ دار تھے۔ انہوں نے ملک کے سوراج یا آزادی کے لیے ایک زیادہ بنیاد پرست نظریہ پیش کیا۔ نوجوان قوم پرستوں کے رویے سے کانگریس کے عمر رسیدہ رہنما حیران ہوگئے۔ ان نوجوان قوم پرستوں کو 'انتہا پسند' اور ان کے فلسفے کو 'انتہا پسندی' کا نام دیا گیا۔ یہ نوجوان قوم پرست انتہا پسند عقائد اور طرز عمل میں آزاد خیالوں سے مختلف تھے۔ انتہا پسند برطانوی نظام کے عدلیہ پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ یہ نوجوان قوم پرست نام نہاد آئینی طریقوں اور ابتدائی کانگریس رہنماؤں کی ذریعے اختیار کردہ ارتقائی حکمت عملی سے تنگ آچکے تھے۔ انتہا پسندوں نے بنیاد پرست اور دلیرانہ حکمت عملی کو ترجیح دی۔ انہوں نے تحریک کی حمایت اور عوام کو متحرک کرنے کے لیے ثقافتی طریقوں اور مذہبی روایات کا استعمال کیا۔

اس طرح نوجوان قوم پرست قومی تحریک کو ایک نئی سمت اور جہت دینے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کی نوعیت کے بارے میں ایک گہرا اور تنقیدی نقطہ نظر پیش کیا۔ یہ مجموعی سماجی اور سیاسی صورتحال لالہ لاجپت رائے، بال گنگادھر تلک اور بپن چندر پال کی مشہور تکڑی کی قیادت میں شروع ہوئی۔ ان میں سے ہر ایک نے ہندوستان میں قوم پرست فکر اور تحریک کی ترقی میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ مندرجہ ذیل صفحات میں ایک ایک کرکے اس تکڑی (لالہ لاجپت رائے، بال گنگادھر تلک اور بپن چندر پال) کے سیاسی افکار اور قومی تحریک میں ان کی شراکت داری کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

لالہ لاجپت رائے، جنہیں پنجاب کیسری یا پنجاب کا شیر بھی کہا جاتا ہے، ایک آزادی پسند اور قوم پرست رہنما تھے۔ وہ سوراج (خود

حکمرانی) کے حامی تھے،اورانہوں نے سودیشی اور عدم تعاون کی تحریک سمیت برطانوی راج کے خلاف مختلف تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔رائے اپنی شعلہ انگیز تقریروں اور تحریروں کے لیے بھی جانے جاتے تھے۔انہوں نے پنجاب نیشنل بینک کی بنیاد ڈالی،اور ڈی۔اے۔وی۔کالج لاہور کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا۔ لوک مانیہ بال گنگادھر تلک ہندوستانی قومی تحریک میں صف اول کے رہنماؤں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ ایک عالم، مفکر اور پرجوش قوم پرست اور سوراج کے مضبوط حامی تھے۔بطور صحافی، مصنف اور خطیب،انہوں نے برطانوی حکمرانی کے خلاف عوام کو متحرک کرنے کی کوشش کی۔انہوں نے ہندوستانیوں کے اندر خود انحصاری اور ثقافتی فخر کو اجاگر کیا۔سوراج کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ 'سوراج میرا پیدائشی حق ہے،اور میں اسے لے کر رہوں گا۔'انہوں نے ہندوستانیوں میں اتحاد اور قوم پرستی کو فروغ دینے کے لیے گنیش چترتھی جیسے تہواروں کا استعمال کیا۔قوم پرستانہ سرگرمیوں کی وجہ سے ان کو برطانوی حکومت نے کئی بار سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا۔ بپن چندر پال تاریخ ہند کے ایک عظیم آزادی پسند اور انقلاب پسند رہنما تصور کیے جاتے ہیں۔وہ ایک عظیم قوم پرست، سماجی مصلح اور ادیب تھے۔ان کی تحریروں نے بہت سے ہندوستانیوں کو متاثر کیا اور مختلف ہندوستانیوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا۔بپن چندر پال تلک کی قوم پرستی اور سماجی اصلاح کے نظریات سے بہت متاثر تھے۔بپن چندر پال، سوراج (خود حکمرانی)، عوامی ترقی اور تعلیم کے پرجوش حامی تھے۔وہ ہندوستانی ثقافت اور سماج کے احیاء میں یقین رکھتے تھے اور لوگوں میں حب الوطنی کی تحریک پیدا کرنے کے لیے انتھک محنت کرتے تھے۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- لالہ لاجپت رائے، بال گنگادھر تلک اور بپن چندر پال کی حالات زندگی کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے۔
- ہندوستانی قومی تحریک میں لال بال اور پال کے کردار سے واقف ہونگے۔
- لال بال اور پال کے سماجی اصلاحات اور سیاسی نظریات کے بارے میں جان جائیں گے۔
- لالہ لاجپت رائے اور بپن چندر پال کے نظریۂ قومیت اور تعلیم سے آگاہ ہو جائیں گے۔

6.2 لالہ لاجپت رائے کے حالات زندگی (Biographical Sketch of Lala Lajpat Rai)

28 جنوری 1865 میں، لالہ لاجپت رائے (1865–1928) پنجاب کے ایک گاؤں ڈھوڈیکے میں پیدا ہوئے۔ان کے والد شری رادھا کشن اردو اور فارسی کے استاد تھے اور انہیں علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ان کی والدہ، گلاب دیوی، مذہبی سوچ رکھنے والی خاتون تھی۔لالہ لاجپت رائے نے اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول اور مشن اسکول لدھیانہ سے حاصل کی۔اپنے اسکول کے دنوں سے ہی، انہوں نے پڑھنے، لکھنے اور بولنے کا شوق پیدا کر لیا جو ساری زندگی جاری رہا۔انہوں نے لڑکپن میں ہی غیر نصابی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا اور قائدانہ سرگرمی کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ رائے نے اپنی اعلی تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور میں حاصل کی۔ وہ پیشے سے وکیل تھے

اور حصار میں اپنی وکالت شروع کی، اور بعد میں لاہور چلے گئے۔ رائے نے برطانوی راج کے خلاف ہندوستانی قوم پرست تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے نامور رکن، اور سوراج (خود حکمرانی) کے حامی تھے۔ انہوں نے سودیشی اور عدم تعاون تحریک جیسی مختلف تحریکوں میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے جابرانہ برطانوی پالیسیوں کے خلاف کئی مظاہروں کی قیادت کی، جیسے سائمن کمیشن، وغیرہ۔ 1928 میں سائمن کمیشن کے خلاف احتجاج کے دوران لاہور میں لالہ لاجپت رائے پر برطانوی پولیس نے بے دردی سے لاٹھی چارج کیا۔ لاٹھی چارج کی وجہ سے وہ شدید زخمی ہوگئے، اور 17 نومبر 1928 کو ان کی وفات ہو گئی۔ ان کی وفات نے بڑے پیمانے پر غم و غصے کی لہر کو جنم دیا، جو تحریک آزادی کے لیے ایک اہم لمحہ بن گیا۔ لالہ لاجپت رائے تحریک آزادی میں قربانی اور عزم کے جذبے کی مثال ہے۔ صحافت سے انہیں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ انہوں نے دو جرائد 'وندے ماترم' اور 'دی پنجابی' جاری کیے۔ علاوہ ازیں انہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جیسے، آریہ سماج، *The Story of My Deportation*، *Unhappy India*، *England's Debt to India* وغیرہ۔ 1895 سے 1900 تک، انہوں نے مزینی، گیریبالڈی، شیواجی اور سوامی دیانند پر سوانحی تصنیفات لکھیں۔

لالہ لاجپت رائے

6.3 لالہ لاجپت رائے بطور سماجی مصلح (Lala Lajpat Rai as a Social Reformer)

لالہ لاجپت رائے آریہ سماج کی سرگرمیوں سے متاثر تھے اور 1882 میں، وہ آریہ سماج کے اولین رہنماؤں میں بھی شامل ہو چکے تھے۔ روہتک میں انہیں مقامی آریہ سماج کا سکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے روہتک کو آریہ سماج کی سرگرمیوں کا سب سے نمایاں مرکز بنا دیا۔ لالہ لاجپت رائے نے آریہ سماج کو ایک عملی سماجی تنظیم میں تبدیل کیا۔ انہوں نے ملک کے مختلف حصوں میں قحط کے دوران عوام کے لیے اپنی خدمت انجام دیں۔ انہوں نے ثابت کیا کہ انگریزوں کے خلاف جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے خود انحصاری اور خود مددی (Self-Help) کی اشد ضرورت ہے۔ 1896، 1899–1900 اور 1907–08 کے قحط زدگان، اور 1905 کے کانگرا میں آنے والے زلزلے سے متاثرین کی بہتری کے لیے، انہوں نے انتھک محنت کی۔

ایک سماجی مصلح کے طور پر، انہوں نے چھوا چھوت کے خاتمے کے لیے بھی کام کیا اور اس مقصد کے لیے آریہ سماج کی طرف سے شروع کی گئی مہم کی بھرپور حمایت کی۔ انفرادی سطح پر گوپال کرشن گوکھلے اور لالہ لاجپت رائے جیسے کانگریسی رہنماؤں کا خیال تھا کہ قومی تخلیق نو کے لیے اچھوت کا خاتمہ اور سماجی اصلاح ضروری ہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ دنیا کی دیگر اہم تحریکوں کی طرح اس سماجی اصلاح کو بھی قومی منظوری حاصل کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی ہوگی۔ پسماندہ طبقات کو ایک باعزت مقام بخشنے کے لیے، لالہ لاجپت رائے نے اسکول بنانے کے لیے لاہور میں زمین خریدی۔ انہوں نے بے سہارا بچوں کے لیے یتیم خانے قائم کیے، جس پر ان کو حکومت نے بھی کافی سراہا۔ جہاں تک

ہندو سماج، اچھوتوں اور خواتین کی اصلاح کا تعلق تھا وہ ایک عظیم سماجی و اقتصادی نظریہ کار ثابت ہوئے۔

6.4 لالہ لاجپت رائے کا نظریۂ قومیت (Nationalist Outlook of Lala Lajpat Rai)

لالہ لاجپت رائے نے قوم پرستی کی چار شکلیں پیش کی ہیں: اول انتہا پسندی، دوم دہشت گردی، سوم تعمیر پسندی، چہارم اعتدال پسندی۔ یہ درجہ بندی موجودہ دور میں مطالعہ کرنے والے کو عجیب لگ سکتی ہے۔ درحقیقت یہ تصوراتی علاقے کو ایک غیر مانوس انداز میں تراشتی ہے۔ یہ نظریات بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی قوم پرستانہ مباحثوں میں زیر بحث تھے۔ رائے کے مطابق، ہندوستانی قوم پرستی کے ان تمام اقسام کے لیے برطانوی حکومت ناقابل قبول تھی۔ اِن میں سے ہر ایک قسم کی قوم پرستی نوآبادیاتی طاقت اور ابھرتی ہوئی ہندوستانی قومیت کی طرف ایک خاص رویہ اختیار کرتی ہے۔

انتہا پسندی (Extremism): رائے نے انتہا پسندی کو قوم پرستی کی سب سے بنیادی شکل قرار دیا ہے۔ رائے کے مطابق، انتہا پسندی نوآبادیاتی نظام کو ایک حکومت کے طور پر تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے۔ ہندوستانی تناظر میں، انتہا پسند وہ تھے جنہوں نے ہندوستان میں برطانوی راج کی ظاہری حقیقت کو بھی قبول نہیں کیا۔ یعنی انہوں نے برطانوی عملداری کی حقیقت کو مزاحمت کے ہدف کے طور پر بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لالہ لاجپت رائے نے بال گنگادھر تلک اور لالہ ہردیال کو اس قسم کے قوم پرستوں کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق، ہندوستان میں انگریزوں کی حیثیت غیر قانونی سمندری قزاقوں اور لٹیروں کی طرح تھی۔ انتہا پسند نوآبادیاتی طاقت کو حقیقی قومی دشمن کے طور پر تسلیم کرکے ان کی عزت کرنے سے انکار کرتے تھے۔

دہشت گردی (Terrorism): لالہ لاجپت رائے کے نزدیک قوم پرستی کی دوسری قسم دہشت گردی ہے۔ موجودہ سیاسی مفہوم کے برعکس، دہشت گردی انتہا پسند قوم پرستی سے زیادہ مقبول سمجھی جاتی تھی۔ ہندوستانی نوآبادیاتی تناظر میں، دہشت گرد قوم پرست وہ تھے جنہوں نے برطانوی حکومت کو ناپسندیدہ اور ناجائز حکومت کے طور پر تسلیم کیا تھا۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا دشمن ایک حکومتی نظام ہے؛ تو انہوں نے (یعنی ایک قوم نے) اپنی قومی جدوجہد دوسرے قوم کے خلاف شروع کی، یا ایک نوآبادیاتی قوم نے دوسرے ناجائز نوآبادیاتی حکومت کے خلاف جدوجہد قائم کی، یا انہوں نے اپنے ملک سے غیر قانونی حکومت کو ہٹانے کی کوشش کی۔ لالہ لاجپت رائے کے مطابق، اروبندو گھوش اپنے ابتدائی دور میں ایسے ہی ایک قوم پرست تھے۔

تعمیر پسندی (Constructivism): قوم پرستی کی تیسری قسم تعمیر پسندی ہے۔ رائے کے مطابق تعمیری قوم پرستوں کی واضح مثالیں آریہ اور برہمو سماج تحریکوں سے تعلق رکھنے والے کارکن تھے۔ تعمیر پسندوں کا مقصد ایک ایسی قوم کی تعمیر کرنا تھا جس کا مقصد حقیقی ہندوستان کا حصول تھا، نہ کہ نوآبادیاتی تناظر کا ہندوستان۔ اسی لیے تعمیر پسندوں نے بنیادی طور پر ان لوگوں کے لیے سماجی اور مادی حالات کو تبدیل کرنے پر توجہ مرکوز کی، جو اس وقت اس قومی ریاست میں آباد تھے۔ اس وجہ سے ان قدامت پسند قوم پرستوں نے معاشی اور سماجی ترقی کے حق میں آزادی کے سیاسی ہدف کو چھوڑ دیا۔ اس طرح، تعمیر پسند قوم پرست نہ صرف نوآبادیاتی تسلط کی سیاسی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں، بلکہ

نوآبادیاتی حکمرانی کی قانونی حیثیت کو بھی قبول کرتے ہیں۔ رائے تعمیر پسندوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ 'وہ لوگ بھی آزادی چاہتے تھے لیکن ایک دم نہیں۔' انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے رکن ابوالکلام آزاد جیسے تعمیر پسند ممتاز مسلم رہنماؤں کو اس زمرے میں شامل کیا ہے۔

اعتدال پسندی (Moderatism): رائے کی درجہ بندی میں قوم پرستی کا آخری زمرہ اعتدال پسندی ہے۔ اعتدال پسند قومی حیثیت کی خواہش اپنے مفاد کے لیے نہیں، بلکہ اس لیے کرتے تھے کیونکہ یہ کسی دوسرے کے لیے اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ قوم پرستی کا ایک ایسا زمرہ تھا جسے رائے نے تصوراتی طور پر سب سے زیادہ حیران کرنے والا پایا۔ درحقیقت، وہ اس قوم پرستی کی سنجیدگی پر شکوک اور شبہات کا شکار تھے۔ یہ شکوک و شبہات ان کے مشاہدے کی وجہ سے پیدا ہوئے کیونکہ اعتدال پسندوں کی وابستگی قوم پرستی سے اس قدر مختلف تھی کہ وہ شاید ہی قوم پرست دکھائی دیتے تھے، کیونکہ اعتدال پسند مکمل طور پر نوآبادیاتی تسلط کو تسلیم کرتے تھے۔

6.5 تعلیم سے متعلق لالہ لاجپت رائے کے خیالات (Educational Ideas of Lala Lajpat Rai)

ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے لالہ لاجپت رائے نے ملک کی تعلیمی ترقی پر بھی اپنی توانائی صرف کی تھی۔ آریہ سماج اور اس کے تعلیمی پروگرام نے ان کی امنگوں کی تکمیل کا ذریعہ فراہم کیا اور ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز ثابت ہوا۔ وہ ابتداء سے ہی ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ ان کے لیے تعلیم انتہائی اہمیت کی حامل تھی کیونکہ قوم کا مستقبل اسی پر منحصر ہے۔ لالہ لاجپت رائے کا خیال تھا کہ قوم پرستی یا حب الوطنی کی تعلیم تعلیمی نظام میں شامل ہونی چاہیے۔ انہوں نے قوم کے لیے مضبوط جذبہ رکھنے والے طلبہ پیدا کرنے کے لیے نیشنل کالج کا قیام عمل میں لایا۔ 1886 میں، لاجپت رائے نے قوم پرست تعلیم کے فروغ کے لیے ڈی۔ اے۔ وی۔ تحریک کی بنیاد رکھی۔ بنگال میں نیشنل کالج کے قیام سے پہلے، دیانند اینگلو ویدک کالج لاہور ملک کا واحد قوم پرست ادارہ تھا۔

ان کا خیال تھا کہ عام تعلیم ریاست کی طرف سے فراہم کی جانی چاہیے اور اس کا خرچہ ریاست کی آمدنی سے وصول ہونا چاہیے۔ ریاست کو ایک مشترکہ قومی تعلیمی نظام خود فراہم کرنا چاہیے۔ ریاست کو چاہیے کہ وہ ابتدائی تعلیم، فنی اور صنعتی تعلیم کے لیے بھی انتظامات کرے۔ ان کے مطابق تعلیم کا مقصد انسان کی ہمہ گیر ترقی کا حصول ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ انسان آزادانہ طور پر سوچنے اور عمل کرنے کے قابل بن جائے۔ لاجپت رائے نے یہ بھی کہا کہ انگریزی زبان کے ذریعے دی جانے والی جدید تعلیم کے متعدد نقصانات ہیں۔ 1905 میں کلکتہ میں قومی تعلیم کے موضوع پر ایک اہم اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس کا بنیادی مقصد تعلیم کو قومی کنٹرول کے تحت فراہم کرنا تھا۔ لالہ لاجپت رائے نے محسوس کیا تھا کہ ملک کی سیاسی آزادی معاشرے کی سماجی آزادی کے بغیر ناممکن ہے، اور پسماندہ طبقات کی اصلاح کے بغیر کوئی سیاسی آزادی ممکن نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان طبقات کی ترقی کی اصل بنیاد 'تعلیم' ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ تعلیم ہی پسماندہ لوگوں کو بنیادی حقائق سے روشناس کر سکتی ہے اور انھیں اپنے فکر و عمل کو پاکیزہ بنانے کی طرف لے جا سکتی ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ 'شدھی تحریک' کی تقریبات کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکتا جب تک کہ انہیں تعلیم فراہم نہیں کی جائے۔ انہوں نے پنجاب کے ہندوؤں اور آریہ سماجیوں سے عاجزانہ اپیل کی کہ وہ ان طبقوں کو تعلیم فراہم کرنے کے لیے مالی امداد پیش کرے۔

1909 میں، لالہ لاجپت رائے نے جالندھر میں اچھوتوں کے لیے چند اسکول قائم کیے: دو کانگڑا میں اور دو لاہور میں۔ جولائی 1913 میں، انہوں نے دلت اسکول قائم کرنے کے لیے لاہور میں دریائے راوی کے قریب 21 ہزار روپے کی لاگت سے زمین خریدی۔ انہوں نے اہل وطن کو خبردار کیا کہ اگر انہوں نے اچھوتوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا تو انگریز انہیں حصول سوراج کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کریں گے۔ یاد رہے کہ لالہ لاجپت رائے کا یہ خدشہ بعد میں درست ثابت ہوا۔ مذکورہ حقائق کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ لاجپت رائے نے ہندوستان کے پسماندہ طبقات کی بہتری کے لیے انتھک محنت کی تاکہ ان کی سماجی، معاشی اور فکری حیثیت کو بلند کیا جا سکے۔ وہ ہندو سماج کے لیے ان طبقات کی اہمیت کو جانتے تھے اور ساری زندگی ان کے لیے کام کرتے رہے۔ پسماندہ طبقات کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے پر انہوں نے نہ صرف ہندو اعلیٰ طبقوں، بلکہ برطانوی حکومت کی بھی تنقید کی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ معاشرے میں صرف تعلیم ہی ان کا رتبہ بلند کر سکتی ہے اور جب بھی ضرورت پڑی انہوں نے اس مقصد کے لیے وقت کے ساتھ مالی مدد کی بھی پیشکش کی۔

6.6 ہندوستانی قومی تحریک میں لالہ لاجپت رائے کا کردار

(Role of Lala Lajpat Rai in the Indian National Movement)

ہندوستانی قومی تحریک میں لالہ لاجپت رائے کا کردار کثیر الاطراف یا کثیر جہتی تھا۔ انہوں نے ہندوستانی کسانوں، مزدوروں اور طلباء کے حقوق کی حمایت کی۔ انہوں نے 1905 میں سودیشی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جس کا مقصد برطانوی اشیاء کا بائیکاٹ کرنا اور ہندوستانی صنعتوں کو فروغ دینا تھا۔ انہوں نے ہندوستانیوں پر زور دیا کہ وہ برطانوی اقتصادی مفادات کو نقصان پہنچانے کے لیے ہندوستانی مصنوعات خریدیں اور استعمال کریں۔ 1905 میں، انہوں نے تقسیم کی شدید مخالفت کی، جو انگریزوں کی جانب سے 'نفاق ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے اس تقسیم کی پالیسی کے خلاف ہندوستانیوں کو متحد کرنے کے لیے انتھک کوشش کی۔

1905 میں، انڈین نیشنل کانگریس نے لالہ لاجپت رائے کو ہندوستانی سیاسی شکایات برطانوی عوام کے سامنے رکھنے کے لیے منتخب کیا۔ گوپال کرشن گوکھلے کے ساتھ انہوں نے انگلینڈ کے مختلف حصوں میں سیاسی مہم چلائی، اور انگریزوں کے سامنے غیر ہمدرد نوکر شاہی حکومت کی برائیوں کو اجاگر کیا۔ بڑی فصاحت اور حقائق اور اعداد و شمار کے ساتھ، انہوں نے ہندوستان کے غریب، بھوکے اور مظلوم لوگوں کی نمائندگی کی۔ ان کے بیانات نے انگریزوں کو بہت متاثر کیا۔ لالہ لاجپت رائے نے قوم پرستی کو ایک نیا مفہوم دیا۔ ان کے نزدیک "حب الوطنی" کا مطلب عزت نفس، آزادی اور انصاف سے بے پناہ محبت تھا۔ دسمبر 1905 کے بنارس کانگریس اجلاس میں لالہ لاجپت رائے نے بنگال میں احتجاج کو دبانے کے لیے حکومت کے جابرانہ اقدامات کی شدید مخالفت کی۔ تقسیم بنگال کے بعد ہی لال بال پال 'ہندوستانی سیاست کی مشہور تثلیث' کے طور پر سامنے آگئے۔ یہ لالہ لاجپت رائے اور دیگر قوم پرست ہی تھے جنہوں نے کلاسیکی ہندوستانی اقدار کے نظام میں سب سے پہلے سوراج کو ہندوستان کا پیدائشی حق تصور کیا۔ انہوں نے پنجاب کالونائزیشن ایکٹ (Punjab Colonisation Act) اور آبپاشی کے نرخوں میں اضافے کی مخالفت کی۔ حکومت ان کی سرگرمیوں سے اس قدر خوفزدہ تھی کہ 9 مئی 1907 کو اس نے لالہ لاجپت رائے کو گرفتار کرکے برما کے منڈالے قلعے میں قید کردیا۔

برطانوی حکومت متعدد ممالک میں ہندوستانی قوم پرست تحریک کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کر رہی تھی۔ اپریل 1914 میں، اس کوشش کو ناکام کرنے کے لیے لالہ لاجپت رائے انگلینڈ اور اس کے فوراً بعد امریکہ چلے گئے۔ انہوں نے برطانوی اور امریکی رائے عامہ کو ہندوستان میں برطانوی مظالم سے خبردار کیا۔ پہلی عالمی جنگ کے پیش نظر برطانوی حکومت نے لالہ لاجپت رائے کو ہندوستان واپس آنے سے روک دیا۔ اگرچہ وہ پانچ سال تک سیاسی جلاوطنی پر مجبور ہو گئے، لیکن انہوں نے برطانیہ مخالف پرچار جاری رکھا۔ 1916 میں، جب تلک اور اینی بیسنٹ نے ہندوستان میں ہوم رول تحریک شروع کی، تو لالہ لاجپت رائے نے براڈوے نیویارک میں 'انڈین ہوم رول لیگ آف امریکہ' قائم کی۔ لیگ کا مقصد ہندوستان میں ہوم رول تحریک کی حمایت کرنا؛ ہندوستان اور امریکہ میں اس طرح کی دیگر تنظیموں کے ساتھ تعاون کرنا اور ہندوستان اور امریکہ کے درمیان ہر قسم کے دوستانہ تعلقات کو آگے بڑھانا تھا۔

ستمبر 1920 میں کلکتہ میں کانگریس کے خصوصی اجلاس میں لالہ لاجپت رائے کو کانگریس کا صدر منتخب کیا۔ ان کی قیادت میں کانگریس نے جلیانوالہ باغ سانحہ کی یاد میں برطانوی حکومت کے ساتھ عدم تعاون کی قرارداد منظور کی۔ 1921 میں، انہیں گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کی رہائی اور عدم تعاون تحریک سے دستبرداری کے بعد، لاجپت رائے نے سی۔ آر۔ داس اور موتی لال نہرو کی قائم کردہ سوراج پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 نے دس سال کے اندر ایک نئے قانونی کمیشن کی تقرری کا وعدہ کیا تھا اور اس کے نتیجے میں 1927 میں سائمن کمیشن کی تقرری ہوئی۔ اس کمیشن میں ہندوستانیوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے، اس کی شدید مخالفت کی گئی۔ دسمبر 1927 میں انڈین نیشنل کانگریس نے اس کے خلاف ایک قرارداد پاس کی۔ اس کے بعد حکومت نے دفعہ 144 نافذ کر دیا، تاکہ لوگوں کو سائمن کمیشن کی تشکیل پر ناراضگی ظاہر کرنے سے روکا جاسکے۔ لالہ لاجپت رائے نے سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرے کرنے کے لیے جلوس کی قیادت کی۔ 30 اکتوبر 1928 کو لاہور میں بائیکاٹ کے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے ان کے سینے پر لاٹھیاں برسائی گئی، جس کی وجہ سے 17 نومبر 1928 کو ان کی موت واقع ہو گئی۔ اس واقعے کے بارے میں جو انہوں نے کہا وہ ایک پیشین گوئی ثابت ہوئی۔ انہوں نے کہا 'مجھ پر لگنے والا ہر دھچکا برطانوی سامراج کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگا ـــ میں نہیں جانتا کہ میں رہوں گا یا نہیں، لیکن میرے بعد میری روح لوگوں کو آزادی کے لیے مزید قربانیاں دینے کی تلقین کرتی رہے گی۔'

6.7 بال گنگادھر تلک کے حالات زندگی (Biographical Sketch of Bal Gangadhar Tilak)

23 جولائی 1856 کو بال گنگادھر تلک (1856–1930) ہندوستان کے مغربی ساحل پر رتناگیری ضلع میں ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد گنگادھر پنت ایک استاد اور سنسکرت اسکالر تھے۔ ان کی پرورش راسخ العقیدہ اور روایتی ماحول میں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ ان کے اندر سنسکرت اور قدیم ہندوستانی مذہب اور ثقافت سے محبت پیدا ہوئی۔ جب وہ دس سال کے تھے تو ان کے والد کا تبادلہ پونے میں ہو گیا۔ اس سے ان کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع حاصل ہو گیا۔ 1876 میں گریجویشن مکمل کرنے کے بعد انہوں نے 1879 میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ لیکن انہوں نے سرکاری ملازمت کے بجائے ملک کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ 1876 میں انہوں نے پونا میں 'نیو انگلش اسکول' قائم کیا اور اسکول کے استاذ کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ تلک نے محسوس کیا کہ چھوٹے بچوں کو تعلیم

دینا کافی نہیں ہے بلکہ جوانوں کو بھی سماجی و سیاسی حقیقت سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ 1881 میں انہوں نے انگریزی میں 'مراٹھا' اور مراٹھی میں 'کیسری' اخبارات شروع کیے۔ 1885 میں انہوں نے ایک کالج شروع کرنے کے لیے دکن ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی جسے بعد میں اس وقت کے بمبئی کے گورنر کے نام پر فرگوسن کالج کا نام دیا گیا۔ کیسری میں اپنی تحریروں کے ذریعے انہوں نے عوام کو ان کے حقوق اور مہاراشٹر کی تاریخ سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ سے حکومت نے انہیں کئی مواقع پر سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا۔ انہوں نے سودیشی تحریک کی سخت حمایت کی۔ 1908 میں انہیں چھ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ برما کے منڈالے جیل سے رہائی کے بعد انہوں نے ہوم رول کے نظریے کو عام کیا۔ یکم اگست 1920 کو ان کی وفات ہوئی۔ ان کی مشہور تصانیف میں سے ایک *Origin or the Antiquity of the Vedas* ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے دلیل دی ہے کہ رگ وید 4500 قبل مسیح میں تحریر کی گئی ہے۔ اپنی ایک اور کتاب *The Arctic Home in the Vedas* میں انہوں نے تجویز کیا کہ آریائی اصل میں آرکٹک علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی سب سے مشہور کتاب *Geeta Rahasya* ہے جو گیتا کی تعلیمات کے بارے میں ایک فلسفیانہ تحقیق ہے۔

بال گنگادھر تلک

(Photo: Twitter | [illegible])

6.8 سماجی اصلاح سے متعلق تلک کے خیالات (Tilak's Ideas Concerning Social Reform)

1888 میں، پونے میں سماجی مصلحین نے اسکولوں اور کالجوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے مخلوط تعلیم کی تجویز پیش کی۔ تلک نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ خواتین اپنا زیادہ تر وقت گھر کے کاموں میں گزارتی ہیں۔ اس لیے ان کا نصاب لڑکوں کے نصاب سے مختلف ہونا چاہیے۔ خواتین کی مخصوص ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مخصوص خواتین اسکول اور کالج قائم ہونے چاہئے۔ 1889 میں، امریکہ سے واپسی کے بعد پنڈت رمابائی نے پہلے بمبئی اور اس کے بعد پونے میں بیواؤں کے گھر کے طور پر شارداسادن قائم کیا۔ یہ بیواؤں کے لیے ایک قسم کا رہائشی اسکول تھا اور اس کی مالی امداد امریکی مشنری کرتے تھے۔ تاہم تلک نے غیر ملکی ذرائع سے مدد قبول کرنے پر شارداسادن کی تنقید کی۔ شارداسادن کے مشاوراتی بورڈ کے ممبران راناڈے اور بھنڈارکر نے غیر ملکی ایجنسیوں سے مدد لینے میں کوئی کراہت محسوس نہیں کی۔ جب تلک کی تنقید مضبوط ہوتی گئی، تو راناڈے اور بھنڈارکر کو مشاوراتی بورڈ سے استعفیٰ دینا پڑا۔ ایک اور متنازعہ مسئلہ عمر رضامندی بل (Age of Consent Bill) تھا جو 1891 میں متعارف کیا گیا۔ اس بل کا مقصد لڑکیوں کی شادی کی عمر کو بڑھانا تھا۔ ایسا کم سن شادیوں کی حوصلہ شکنی کے لیے کیا گیا تھا۔ تاہم تلک نے اس بنیاد پر اس بل کی مخالفت کی، کیونکہ یہ غیر ملکی حکومت

کے ذریعے ہندوستانیوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرتا ہے۔ سماجی مسائل پر ان تنازعات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تلک ایک سماجی رجعت پسند تھے۔ تاہم، تلک کے سماجی نقطہ نظر کی تحقیق کرنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ الزام مکمل طور پر جائز نہیں ہے۔

تلک سماجی اصلاحات کے مخالف نہیں تھے۔ انہوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سماجی اداروں اور طریقوں کو بدلنا چاہیے۔ درحقیقت انہوں نے اپنے طریقے سے راسخ العقیدہ سوچ اور فکر کے خلاف جنگ لڑی۔ تاہم، سماجی اصلاحات سے متعلق ان کا نظریہ آزاد خیال مصلحین اور اعتدال پسندوں سے مختلف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انسانی معاشرہ ہمیشہ بہاؤ کی حالت میں رہتا ہے، اور بتدریج اور سست رفتار میں بدل جاتا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ ماضی کے ساتھ اچانک اور مکمل وقفہ کبھی نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر ماضی کے ساتھ تعلق اچانک توڑ دیا جائے، تو اس سے معاشرے میں انتشار پیدا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا، تلک شدید اور انتہا پسندانہ تبدیلی کے حق میں نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سماجی اصلاحات بتدریج متعارف کرائی جائیں۔ تلک نے مصلحین کو ماضی سے رشتہ مسترد کرنے پر خبردار کیا۔ انہوں نے مصلحین پر زور دیا کہ وہ ہماری روایت کی قابل قبول خصوصیات کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ اس لیے، وہ قانون سازی کے ذریعے اصلاحات نافذ کرنے کے مخالف تھے۔ مزید، مغربیت کی تقلید کرنے پر تلک نے مصلحین کی مخالفت کی۔ تلک نے کبھی بھی اس بات کو قبول نہیں کیا کہ ہر ایک مغربی خیال یا عمل اچھا ہو سکتا ہے۔ تلک کھلے ذہن کے مالک تھے اور مغربی تہذیب کی ہر اچھائی قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ مثال کے طور پر، انہوں نے قومی تعلیم کی اسکیم میں مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی کو شامل کیا۔ اس لیے، ان کی قومی تعلیم کی اسکیم مغربی اور مشرقی علم، روایات اور ثقافت کا بہترین امتزاج تھی۔ تلک کا خیال تھا کہ ہندوستانی سماج جن برائیوں سے دوچار ہے وہ زیادہ تر غیر ملکی تسلط کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے تلک کے نزدیک سب سے اہم کام حصول سوراج تھا جو تمام لوگوں کی متحدہ کوشش سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ تلک کا ماننا تھا کہ حصول سوراج سماجی اصلاح سے زیادہ اہم ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد سماجی اصلاحات شروع کی جا سکتی ہیں۔

6.9 ہندوستانی معیشت کے بارے میں تلک کے نظریات (Tilak's Ideas on Indian Economy)

تلک کی قوم پرستی ثقافت اور معیشت پر منحصر تھی۔ انہوں نے معاشی بنیادوں پر قوم پرستی کی وکالت کی۔ انہوں نے دادا بھائی نوروجی کے نظریۂ دولت کی نکاسی (Drain of Wealth) کو قبول کیا، اور ملک کے وسائل کا استحصال کرنے پر برطانوی حکومت کی تنقید کی۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستان میں غیر ملکی اداروں اور سرمایہ کاری نے خوشحالی کا بھرم پیدا کیا ہے؛ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں کی لاپرواہ پالیسیوں نے مقامی صنعتوں، تجارت اور فن کو تباہ کر دیا ہے۔ برطانوی مصنوعات کی آمد نے ہندوستانی دستکاری کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ جب تلک نے محسوس کیا کہ غیر ملکی حکومت سے مقامی صنعتوں کو تحفظ فراہم کرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی، تو انہوں نے غیر ملکی اشیا کے بائیکاٹ اور دیسی یا مقامی اشیا کے استعمال پر زور دیا۔ ایک بے تکلف اور نڈر صحافی کے طور پر تلک نے چھوٹے یا بڑے تمام مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ 1879 میں حکومت نے زرعی امداد قانون (Agricultural Relief Act) پاس کیا تاکہ کسانوں کو ساہوکار وں کے استحصال سے راحت بخشی جائے۔ اس قانون کے دفعات معتدل تھے اور اس نے زمین گروی رکھنے کو ممنوع قرار دیا۔ تلک نے ساہوکاروں کا ساتھ دیا اور 'کیسری' میں اپنے مضامین کے ذریعے اس قانون کی تنقید کی۔ انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ کسانوں کی حالت زار کا

ذمہ دار ساہوکاروں کو ٹھہرانا غلط ہے۔ درحقیقت یہ ساہوکار ہی تھے جو انہیں کاشت جاری رکھنے کے لیے سرمایہ فراہم کرتے تھے۔ مزید یہ کہ ساہوکار خود شہر کے مہاجنوں سے قدرے کم شرح سود پر بھاری رقم ادھار لیتے تھے۔ اگر کسان قرض ادا کرنے میں ناکام رہتے تو ساہوکار کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ اس قانون نے کسانوں کو تحفظ فراہم کیا لیکن اس نے ساہوکاروں کو مکمل طور پر غیر محفوظ بنا دیا۔ اس سے کسانوں اور ساہوکاروں کے درمیان دشمنی پیدا ہوئیں۔ لہذا، اس حوالے سے یہ قانون نامناسب تھا۔ اسی لیے، تلک نے اس قانون کو ختم کرنے یا واپس لینے کی بات کی۔ تلک نے برطانوی صنعتکاروں کے خلاف ہندوستانی مزدوروں کے مطالبات کی حمایت کی۔ مثال کے طور پر 1897 میں تلک اوران کے ساتھیوں نے برٹش انڈین ریلوے میں مزدوروں کے مطالبات کی نمائندگی کی۔ 1897 میں حکومت نے ایک قانون پاس کیا جس کا مقصد کونکن (Konkan) کے علاقے میں زمینداری نظام کو منظم کرنا تھا۔ کونکن علاقے میں، زمیندار یا خوط کسانوں کے لیے انتہائی استحصالی ہو چکے تھے۔ تلک خود خوط طبقے سے وابستہ تھے، اس لیے وہ مجوزہ قانون سے ناراض تھے اور اس کی تنقید کرتے ہوئے کیسری میں مضامین کا ایک سلسلہ لکھا۔ یہاں انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ کونکن میں خوط اور مزارع (Tenant) کے درمیان تعلقات ایک پرانی روایت ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ حکومت کا اختیار صرف محصول کی طلب تک محدود ہے اور اسے مزدوروں کی اجرت کے شرائط کا فیصلہ کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ تلک نے استدلال کیا کہ اگر حکومت چائے کے باغات کے معاملے میں ایسا نہیں کر رہی ہے، تو اسے کھوت اور مزارع کے تعلقات میں بھی مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔

6.10 تلک کے سیاسی نظریات (Political Ideas of Tilak)

تلک کی سب سے اہم شراکت سیاست میں تھی۔ انہوں نے لالہ لاجپت رائے اور بپن چندر پال کے ساتھ کانگریس میں ایک نئی قسم کی سیاسی فکر کی شروعات کی۔ انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی نوعیت کا تجزیہ کیا۔ ان کا ماننا تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس کو عوامی تحریک میں تبدیل ہونا چاہئے؛ اسے صحیح معنوں میں قومی اور جمہوری بننا چاہئے اور اسے پرانے طریقِ کار کو ترک کرنا چاہئے۔ تلک علمی لحاظ سے کوئی سیاسی فلسفی نہیں تھے۔ وہ ایک عملی سیاست دان تھے اور ان کا بنیادی مقصد ہندوستان کی سیاسی آزادی کو بحال کرنا تھا۔ تلک کا سیاسی فلسفہ ہندوستانی روایت میں پیوست تھا لیکن انہوں نے تمام مغربی اثرات کو رد نہیں کیا۔ انہوں نے سوراج کو ایک روحانی مفہوم عطا کیا۔ ان کے مطابق نظریۂ سوراج سیاسی یا اقتصادی پہلو سے زیادہ تھا۔ سوراج خوشگوار زندگی کی آسائشیں فراہم کرنے والے معاشی نظام سے بھی بڑھ کر ہے۔ ان کے مطابق، سوراج سیاسی، سماجی، اقتصادی اور روحانی پہلوؤں میں ایک مکمل خود مختار حکومت ہے۔

تلک نے محسوس کیا کہ مادیت پرستی انسانی زندگی کو پست کرتی ہے اور اسے حیوانی سطح تک پہنچا دیتی ہے۔ تلک چاہتے تھے کہ انسان کو خود نظم وضبط اور کوششوں کے ذریعے حیوانی لذتوں سے دور رہنا چاہئے، اور اپنی خواہشات کو سربلند کر کے حقیقی خوشی حاصل کرنی چاہئے۔ اس لیے وہ انسانی زندگی کی تکمیل کو نہ صرف حقوق کے حصول میں بلکہ فرائض کی انجام دہی میں بھی تصور کرتے ہیں۔ انسان کو اپنے عزیز واقارب کی اخلاقی، روحانی اور مادی بھلائیوں کے لیے کام کرنا چاہئے۔ تاہم یہ سب کچھ ایسی صورت میں ممکن ہوگا جب تمام مرد اور عورت ہر قسم کے تسلط سے آزاد ہوں۔ سوراج کے حصول کے لیے تلک نے مغربی آزاد خیال اداروں، آئینی حکومت، قانون کی حکمرانی، فرد کی آزادی، جیسے

تصورات کی موافقت کو قبول کیا۔اس طرح، تلک کا سیاسی فلسفہ قدیم ہندوستانی اقدار اور مغربی آزاد خیال اداروں کی ایک دلچسپ امتزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔

تلک کے مطابق، لوگوں کے درمیان اتحاد، یکجہتی اور مشترکہ ورثہ قوم پرستی کی سب سے اہم قوت ہوتی ہے۔ مشترکہ ورثے کا علم اور اس پر فخر نفسیاتی اتحاد کو فروغ دیتا ہے۔لوگوں میں اس فخر کو جگانے کے لیے تلک نے اپنی تقریروں میں شیواجی اور اکبر کا ذکر کیا۔اس کے علاوہ، انہوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ مشترکہ مفاد ایک مشترکہ جدوجہد کے احساس کو زندہ کرتا ہے اور قوم پرستی کے احساس کو تقویت بخشتا ہے۔اتحاد کا نفسیاتی بندھن بعض اوقات غیر فعال بھی ہو سکتا ہے۔ایسے میں تلک نے لوگوں کو متحرک کرنے کے لیے مذہب کے استعمال کی تجویز پیش کی۔ تلک نے قوم پرستی کے جذبے کو بیدار کرنے میں تاریخی اور مذہبی تہواروں، جھنڈوں اور نعروں کی زبردست علامتی اہمیت کو تسلیم کیا۔ان کا خیال تھا کہ جب لوگوں کو متحرک کرنے کی بات آتی ہے تو یہ علامتیں معاشی عوامل سے زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔اس طرح، تلک نے گنپتی اور شیواجی تہواروں کی شکل میں ان علامتوں کو استعمال کیا۔

تاہم، راسخ العقیدہ ہندو رسومات کی قبولیت کے پیش نظر، تلک پر کثیر مذہبی ہندوستان میں فرقہ پرست ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔ان کا ہندو راسخ العقیدہ کردار اس وقت منظر عام پر آگیا، جب انہوں نے 1890 کے عمر رضامندی قانون کی مخالفت کی، جس میں لڑکیوں کی شادی کی عمر دس سے بارہ سال تک بڑھادی گئی۔جب کہ اعتدال پسند ترجمان راناڈے نے اس بل کو سراہا تھا۔ تلک نے اس قانون کو ہندو سماج میں ایک غیر ضروری مداخلت کے طور پر پیش کیا۔اسی طرح، تلک کی طرف سے گائے کو تحفظ بخشنے کی کوشش میں مسلمان انتہا پسند مہم سے کافی دور ہو گئے۔ یہاں تلک نے ہندو عقیدے کا تقدس برقرار رکھ کر مسلمانوں کے جذبات کو مکمل طور پر نظرانداز کیا۔مزید برآں، شیواجی اور گنپتی کے اعزاز میں قومی تہواروں کی تنظیم نے مسلمانوں کو تحریک آزادی سے غیر منسلک قرار دیا۔ لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ ان تمام مذہبی شکلوں کا بنیادی مقصد حب الوطنی کو اجاگر کرنا تھا۔ دراصل، تلک نے مذہبی تہواروں کی آڑ میں انگریزوں کے خلاف ایک متحرک قوم پرست پلیٹ فارم قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔

6.11 بپن چندر پال کے حالات زندگی (Biographical Sketch of Bipin Chandra Pal)

7نومبر 1858 کو بپن چندر پال(1858–1932) ضلع سلہٹ کے پول گاؤں میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام رام چندر پال اور ان کی والدہ کا نام نارائنی تھا۔انہوں نے ابتدائی تعلیم دو مشنری اسکولوں سے حاصل کی تھی۔ 1875 میں، انہوں نے پریزیڈنسی کالج میں داخلہ حاصل کیا، اور اگلے چار سال تک کلکتہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے۔ بپن چندر پال سوامی وویکانند کی تعلیمات سے بہت متاثر تھے۔ 1886 میں، بپن چندر پال انڈین نیشنل کانگریس کا حصہ بن گئے۔اس کے بعد، وہ بال گنگادھر تلک اور لالہ لاجپت رائے کے ساتھ، انڈین نیشنل کانگریس کے اندر انتہا پسند دھڑے کے سرکردہ رہنما بن گئے۔ وہ ایک نامور مصنف اور صحافی تھے۔ان کی تصنیفات میں *Indian Nationalism*: Its *Principles and Personalities*، *The New Spirit and Studies in*

وغیرہ شامل ہیں۔ وہ کئی اخبارات جیسے بندے ماترم، پریڈیشک، سوراج، اور نیو انڈیا کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ اپنی تحریروں کے ذریعے انہوں نے برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی پر شدید تنقید کی، اور ہندوستان کی مکمل آزادی کی حمایت کی۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھے۔ انہوں نے مقامی مصنوعات کا استعمال، غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ اور خود انحصاری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے 1905 کے تقسیم بنگال کی شدید مخالفت کی، جسے انگریزوں نے قوم پرست تحریک کو کمزور کرنے کے لیے شروع کیا تھا۔ انہوں نے سودیشی اور عدم تعاون جیسی انقلابی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ذاتی اور مالی مشکلات کا سامنا کرنے کے باوجود، پال ہندوستان کی آزادی کے مقصد کے لیے ثابت قدم رہے۔ 20 مئی 1932 کو ان کا انتقال کلکتہ میں ہوا۔ انہوں نے اپنی خودنوشت *Memories of My Life and Times* بھی لکھی ہے۔ *Hinduism*

6.12 بپن چندر پال بطور قوم پرست (Bipin Chandra Pal as an Indian Nationalist)

اروبندو گھوش نے بجا طور پر بپن چندر پال کو قوم پرستی کے عظیم ترین مبلغ کے طور پر پیش کیا ہے۔ انہوں نے 'مکمل آزادی' کے نظریے کی بھرپور حمایت کی، جسے کانگریس نے 1929 میں اپنا مقصد تسلیم کیا تھا۔ انہوں نے 1921 کے باریسال خطاب میں زور دے کر کہا کہ وہ نہیں چاہتے ہیں کہ انگلینڈ اور فرانس کی طرح ہندوستان میں بھی ایک طبقاتی حکومت قائم ہو جائے۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان ایک وفاقی جمہوریہ بن جائے، جس میں ہر صوبہ اور ہر ضلع کو مقامی خود مختاری حاصل ہو۔ مزید، بپن چندر پال نے لاجپت رائے اور تلک کی طرح قوم پرستی کی انتہا پسند شکل کی حمایت کی۔ ان کی قوم پرستی میں برطانوی اشیاء اور دکانوں کا بائیکاٹ کرنا، برطانوی کپڑوں کو جلانا، اور ہڑتالوں اور برطانوی کارخانوں کی تالہ بندی شامل تھی۔ ان کی قوم پرستی سودیشی، بائیکاٹ اور قومی تعلیم میں جھلکتی ہے۔ انہوں نے غربت اور بے روزگاری کے خاتمے کے لیے مقامی مصنوعات کے استعمال اور غیر ملکی اشیاء کے بائیکاٹ کی تبلیغ اور حوصلہ افزائی کی۔ وہ ہندوستان سے سماجی برائیوں کو دور کرنا چاہتے تھے اور تنقید کے ذریعے قوم پرستی کے جذبات کو ابھارنا چاہتے تھے۔

6.13 بپن چندر پال کے سیاسی خیالات (Political Ideas of Bipin Chandra Pal)

معروف قوم پرست بپن چندر پال برطانوی راج سے حصول آزادی کے لیے اپنے بنیاد پرست اور عسکری انداز کے لیے جانے جاتے تھے۔ ان کے سیاسی نظریات کی جڑیں قوم پرستی، اشتراکیت اور سامراج مخالف اصولوں پر مشتمل ہیں۔ بپن چندر پال ہندوستانی قوم پرستی کے حامی تھے، اور ہندوستانیوں کی خود مختاری اور آزادی کے موروثی حقوق میں یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے سودیشی کے پرچار، برطانوی اشیا کے بائیکاٹ اور معاشی خود انحصاری کے ذریعے مقامی صنعتوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے برطانوی نوآبادیاتی انتظامیہ کے ذریعے ہندوستانی وسائل کے استحصال اور ہندوستانی ثقافت اور شناخت کو دبانے کی مذمت کی۔ وہ اشتراکیت سے متاثر تھے اور سماجی اور معاشی مساوات کی ضرورت پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے آزاد ہندوستان کا وہ نظریہ پیش کیا جو استحصال سے پاک ہو اور ایک مساوی معاشرہ بنانے پر زور دے رہا ہو۔ انہوں نے عدم تعاون اور عام نافرمانی تحریکوں میں برطانوی راج کے خلاف بڑے پیمانے پر متحرک ہونے کی وکالت کی۔ انہوں نے

مغربی سامراج کے خلاف ایشیائی اقوام کے درمیان یکجہتی کی بھی وکالت کی۔ درحقیقت، ان کے سیاسی نظریات کو قوم پرستی، اشتراکیت، سامراج مخالف اور عسکریت پسند رجحانات میں پیش کیا جاسکتا ہے، جس کے ذریعے انہوں نے نچلی سطح پر عوام کو متحرک کرکے آزادی، سماجی انصاف اور مساوات حاصل کرنے کی کوشش کی۔

مزید برآں، انہوں نے اپنے اخبارات اور کتابوں کے ذریعے، غیر ملکی اشیاء کے بائیکاٹ، سودیشی اور سوراج کے نظریات کو مقبول بنایا۔ انہیں انڈین نیشنل کانگریس کے دائرے میں ایک انتہا پسند رہنما سمجھا جاتا تھا۔ لیکن، 1919 کے بعد، وہ مشہور سیاستدان بال گنگادھر تلک کی عسکری پالیسیوں کے قریب آگئے تھے۔ اس کے بعد پال نے بنگالی قوم پرستوں کے ساتھ اتحاد کیا جو عظیم قومی رہنما گاندھی کی سیاست سے نالاں تھے۔ 1912 سے 1920 تک انہوں نے اپنی تحریروں میں ہندوستان کے لیے مختلف جغرافیائی خطوں اور سماجوں پر مشتمل ایک وفاق کا پرچار کیا۔ 1920 کے بعد وہ فعال قومی سیاست سے دور رہے لیکن اپنے سیاسی خیالات کا مظاہرہ بنگالی جرائد میں کرتے رہے۔

6.14 ہندوستانی قومی تحریک میں بپن چندر پال کا کردار

(Role of Bipin Chandra Pal in the Indian National Movement)

بپن چندر پال ایک ہمہ جہت شخصیت تھی، اور ان کی صلاحیتیں ان کے مختلف پیشوں میں جھلکتی تھیں۔ وہ بنگال میں نشاۃ ثانیہ کے اہم رہنما تھے۔ انہوں نے لوگوں کے ذہنوں میں قدامت پسندی کے خلاف احتجاج اور تنقید کا جذبہ پیدا کیا۔ انہوں نے ابتدا میں برہمو سماج میں شمولیت اختیار کی، ویدانت کی طرف رجوع کیا اور شری چیتنیا کے وشنو فلسفے سے متاثر رہے۔ وہ ابتداء سے ہی سیاست سے متاثر تھے، اور سریندر ناتھ بنرجی کو اپنا گرو مانتے تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے بال گنگادھر تلک، لالہ لاجپت رائے اور اروبندو گھوش کے ساتھ مل کر کام کیا۔ 1886 کے اجلاس سے ان کی وابستگی انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ ہوئی۔ بپن چندر پال نے 1887 کے مدراس کانگریس اجلاس میں The Arms Act, 1887 کی منسوخی کی قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے ہندوستانیوں کے حقوق پر زور دیا۔ کانگریس کے الہ آباد اجلاس میں بپن چندر پال نے ملک میں صنعتی حالت اور تکنیکی تعلیم کی بہتری کے لیے کمیشن بنانے کی قرارداد کی حمایت کی۔

1898 میں، بپن چندر پال برطانوی وظیفے پر مذہبی علوم کا مطالعہ کرنے کے لیے انگلینڈ چلے گئے۔ لیکن انہوں نے ایک سال کے بعد اپنا وظیفہ ترک کردیا اور ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کرنے لگے۔ 1900 میں، وہ حب الوطنی کے جذبے کے ساتھ ہندوستان واپس آئے اور تحریک آزادی میں شامل ہوگئے۔ انہوں نے، اپنے ہفتہ وار جریدے *New India* کے ذریعے سیکولرازم، عقلیت پسندی اور قوم پرستی کا پرچار کیا۔ وہ تلک کے ہندو قوم پرستی کے تصور سے متفق نہیں تھے، لیکن انہوں نے "مخلوط حب الوطنی" کے تصور کی تبلیغ کی جو ہندوستان جیسے کثیر مذہبی ملک کے لیے موزون تھا۔ 1906 میں، انہوں نے ایک قوم پرست روزنامہ 'بندے ماترم' شروع کیا۔ 1907 کے بنگال، آسام، متحدہ صوبوں اور مدراس کے دورے میں انہوں نے برطانوی اشیا کا بائیکاٹ اور قومی تعلیم کے اصولوں کی تبلیغ کی۔ اگست 1908 میں، جیل سے رہا ہونے کے بعد انہوں نے انگلینڈ میں جلاوطنی کی زندگی اختیار کی۔

انگلینڈ میں تین سال کے قیام 11-1908 کے دوران، بپن چندر پال نے ایک نئی سیاسی فکر کو وجود بخشا۔ انہوں نے برطانوی سلطنت کو ایک وفاقی یونین کے طور پر دوبارہ تشکیل دینے کی استدعا کی جس میں ہندوستان، برطانیہ اور تمام برطانوی خود مختار نوآبادیاں برابر اور آزاد شراکت دار کی حیثیت سے کام کریں گے۔ ہندوستان واپس آکر انہوں نے ایک ماہانہ جریدہ *Hindu Review* شروع کیا، جس کے ذریعے انہوں نے وفاقی یونین کے نظریے کی تشہیر کی۔ اس کے بعد وہ اینی بیسنٹ اور بال گنگادھر تلک کی ہوم رول تحریک میں شامل ہو گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد، انہوں نے تلک کی قیادت میں کانگریس کی طرف سے انگلینڈ کی مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کے سامنے ہندوستان کے سیاسی مطالبات کی نمائندگی کی۔ 1921 میں، انہوں نے باریسال میں ہونے والی بنگال کی صوبائی کانفرنس کی صدارت کی۔

6.15 لال، بال، پال اور انتہا پسند قوم پرستی (Lal, Bal, Pal, and Extremist Nationalism)

انتہا پسندی، اعتدال پسندوں کے نظریے سے مختلف تھی۔ آزاد خیال یا اعتدال پسند اس وہم میں ڈوبے ہوئے تھے کہ برطانوی راج ہندوستان کی بھلائی کے لیے ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ انگریز ہندوستانیوں کو جمود، پسماندگی اور غیر معقول روایات کی غلامی سے نجات دلانے آئے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں برطانیہ کی آمد مشیت خداوندی تھی۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ برطانوی راج کا تسلسل ہندوستان کے لیے فائدہ مند ہے؛ اس لیے، وہ اس کے تسلسل کے خواہش مند تھے۔ اعتدال پسندوں کا خیال تھا کہ وہ آئینی طریقوں سے اور برطانوی راج کے ساتھ وفادار رہ کر اپنے مطالبات حاصل کر لیں گے۔ انہوں نے سیاست کو ایک سیکولر معاملے کے طور پر قبول کر لیا۔ ان کے نزدیک مذہب کو سیاست کے ساتھ ملانا ایک ناپسندیدہ عمل تھا۔ اعتدال پسند صرف وہی مطالبہ کرتے تھے جو برطانوی سلطنت کے شہری بجا طور پر کر سکتے تھے۔

اس کے برعکس، لال بال پال کو برطانوی راج کی فیاضی یا انسان دوست فطرت کے بارے میں کوئی بھرم نہیں تھا۔ ان کے نزدیک برطانوی راج کے اعلیٰ صفات بیان کرنا بے معنی تھا۔ لوگوں کو غلام بنانے اور وسائل کا استحصال کرنے کے لیے انہوں نے اپنا سامراجی نظام ہندوستان میں قائم کیا تھا۔ اس نوآبادیاتی حکومت سے ہندوستان کو جمود، پسماندگی اور غیر معقول روایت کی غلامی سے نجات نہیں ملے گی۔ یہ سب ایک سامراجی منصوبہ ہے اور اس میں کوئی چیز خدائی نہیں ہے۔ چونکہ مادی فوائد برطانوی راج کا بنیادی مقصد تھا، اس لیے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ انگریز ہندوستانی مطالبات اور خواہشات کے بارے میں ہمدردانہ رویہ اختیار کریں گے۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں بدترین قحط کے دوران بھی غذائی اجناس کی درآمدات کو نہیں روکا۔ لہٰذا، برطانیہ کا ضمیر جگانا ایک فضول عمل تھا۔

لالہ لاجپت رائے نے قوم پرستی کی تشکیل اور نوآبادیاتی حکومت کے خلاف عوام کو متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک انتہا پسند رہنما کے طور پر، انہوں نے برطانوی راج سے آزادی حاصل کرنے کے لیے زور آور اور بنیاد پرست طریقوں کی وکالت کی۔ بال گنگادھر تلک اور بپن چندر پال کے ساتھ، انہوں نے سوراج یا خود حکمرانی کے مقصد کو بھی آگے بڑھایا۔ رائے نے برطانوی پالیسیوں اور نظریات کی شدید مخالفت کی۔ 1905 میں، انہوں نے تقسیم بنگال کی شدید تنقید کی۔ انہوں نے برطانوی اشیاء کے بائیکاٹ اور ہندوستانی صنعتوں کے فروغ کی وکالت کرتے ہوئے سودیشی تحریک میں سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ ان کی قیادت کی خصوصیات میں ان کی اشتعال انگیز تقاریر، قوم پرستانہ جوش اور

آزادی کی لگن شامل ہیں۔ انہوں نے بلاخوف و تردید برطانوی حکومت کے خلاف مظاہرے کیے۔ ایک انتہا پسند رہنما کے طور پر لالہ لاجپت رائے کی میراث حصول سوراج کے غیر متزلزل وابستگی میں مضمر ہے۔ تلک نے نوآبادیاتی ہندوستانی تناظر میں آئینی طریقہ کار کی افادیت کو مسترد کر دیا۔ اس سلسلے میں ان کی دلیل مندرجہ ذیل تین نکات پر بنیاد رکھتی ہے :

- انہوں نے محسوس کیا کہ آئینی طریقوں کی اہمیت صرف آئینی حکومت کے تحت ہے۔ اس لیے آئینی طریقے اپنانے سے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔
- ان کا استدلال یہ تھا کہ انگریز اپنے مفادات کے خلاف کسی بھی چیز کو تسلیم نہیں کریں گے، اس لیے ہمیں اپنے مطالبے کی حمایت میں افسر شاہی پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام لوگوں کو قومی تحریک میں شامل کر کے کیا جا سکتا ہے۔ تاہم، آئینی طریقوں سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔
- لوگوں کو جذباتی طور پر ابھارنے کے لیے تلک نے لوگوں کے مطالبات کی بنیاد 'فطری حقوق' کے نظریہ پر رکھی۔ دوسری طرف آئینی طریقوں نے مطالبات کی بنیاد 'قانونی حقوق' کے نظریہ پر رکھی تھی۔ تلک نے محسوس کیا کہ قانونی حقوق کا موقف کمزور اور جوش و جذبہ ابھارنے سے قاصر ہے۔ لہذا، تلک نے 'سوراج' کا مطالبہ 'فطری حق' کے طور پر کیا، نہ کہ برطانوی یقین دہانیوں کی بنیاد پر۔

آزاد خیالوں کے نزدیک مقاصد کی پاکیزگی اتنی ہی اہم تھی جتنی کہ ذرائع کی پاکیزگی۔ مغربی روایت میں، آزاد خیال سیاست کو ایک سیکولر معاملہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے مذہب کو سیاست سے دور رکھا۔ لیکن اس معاملے پر تلک کا نظریہ بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے بلاشبہ سیاست کو مذہب سے الگ رکھنے کی خواہش کو قبول کیا، لیکن ہر حال میں نہیں۔ مذہب ہمیشہ لوگوں کے طاقتور جذبات کو اجاگر کرتا ہے۔ تلک نے محسوس کیا کہ اس طاقتور جذبے کو سیاست میں استعمال کیا جا سکتا ہے، خاص طور پر انیسویں صدی کے اوائل میں۔ تلک کے نزدیک قومی تحریک کا آخری ہدف سوراج تھا۔ لوگوں کو تحریک میں شامل کرنے کے لیے، انہوں نے سوراج کے مقصد کو مذہبی اصطلاحات میں بیان کیا، اور اس بات پر زور دیا کہ سوراج ہماری مذہبی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ مذہب اور ویدانت کا فلسفہ ہر فرد کی مساوی روحانی حیثیت اور تقدیر پر زور دیتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مذہب کسی بھی قسم کی غلامی کے خلاف ہے اور سوراج نہ صرف سیاسی بلکہ فطری اور روحانی ضرورت بھی ہے۔ تلک نے کہا کہ سوراج ہر آدمی اور گروہ کے لیے ایک اخلاقی اور مذہبی ضرورت ہے۔ لہذا، اپنی اخلاقی تکمیل اور مذہبی فرائض کی انجام دہی کے لیے انسان کو آزاد ہونا چاہیے۔ الغرض، سیاسی آزادی کے بغیر روحانی آزادی ناممکن ہے۔

انتہا پسندوں کے منصوبے میں قومی تعلیم، بائیکاٹ، سودیشی اور غیر فعال مزاحمت (Passive Resistance) شامل تھیں۔ لال بال پال تثلیث نے ان پروگراموں میں سے ہر ایک کی ترقی میں تعاون کیا۔ ہندوستان میں متعارف کیے گئے مغربی نظام تعلیم کا مقصد لوگوں کا ایک ایسا طبقہ تیار کرنا تھا جن کا خون ہندوستانی ہو، لیکن فکری اور ثقافتی طور پر مغرب کے قریب اور برطانوی حکومت کے وفادار ہو۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانی قوم پرست اس نظام تعلیم سے غیر مطمئن تھے۔ قوم پرست چاہتے تھے کہ لوگوں میں ان کے اپنے مذہب، ثقافت اور ورثے کے لیے احترام اور وابستگی کا احساس پیدا ہو۔ اس لیے انہوں نے تعلیم کی ایک مختلف اسکیم تیار کی جسے انہوں نے 'قومی تعلیم' کا نام

دیا۔انہوں نے استدلال کیا کہ قومی تعلیم کی اسکیم کے تحت،اسکولوں اور کالجوں کو ہندوستانیوں کے زیر انتظام ہونا چاہیے۔

لالہ لاجپت رائے اور بال گنگادھر تلک نے بائیکاٹ کی حمایت کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ معاشی استحصال برطانوی سامراج کے بنیادی مقاصد میں سے ایک تھا۔ ان کی پالیسیاں ہندوستانی صنعتوں، دستکاریوں اور تجارت کی تباہی کی ذمہ دار تھیں۔ اس لیے، انتہا پسندوں نے غیر ملکی اشیاء استعمال نہ کرنے کا پختہ عزم کیا۔ اس عزم نے تین طریقوں سے ہندوستانی قوم پرستی کو اجاگر کرنے میں مدد کیا:

- اس نے سامراجی استحصال کے بنیادی مقصد کو نقصان پہنچایا۔
- اس سے ہندوستانی عوام میں قوم کی بھلائی کے لیے اپنے فوری مفادات کو قربان کرنے کا عزم پیدا کیا، اور قوم پرستی کے احساس کو پروان چڑھانے میں مدد کیا۔
- اس سے ہندوستانی صنعت، تجارت اور دستکاری کو ہندوستانی معیشت میں اپنا مقام دوبارہ حاصل کرنے میں مدد کیا۔

سودیشی بائیکاٹ کا ایک مثبت حصہ تھا جس نے لوگوں کو دیسی مصنوعات استعمال کرنے کی تلقین کی۔ اس نے پڑھے لکھے ہندوستانیوں پر بھی زور دیا کہ وہ نوکر شاہی کی ملازمتوں کے بجائے پیداوار کے میدان میں قسمت آزمائیں۔ سودیشی تحریک نے اس میں ہندوستانیوں کو صنعت و تجارت کے فن میں تربیت دینے کا منصوبہ بھی شامل کیا۔ ظاہر ہے، سودیشی تحریک کی کامیابی کا انحصار بائیکاٹ کی کامیابی پر تھا۔ اس طرح، سودیشی ہندوستانی صنعت، تجارت اور دستکاری کی تعمیر نو کا ایک مثبت پروگرام تھا۔ اس کے علاوہ، یہ ملک کے تسلط میں سامراجی مفادات کو کمزور کرنے کا ایک طاقتور سیاسی ہتھیار بھی تھا۔ غیر فعال مزاحمت قوم پرستوں کا ایک اور اہم ہتھیار تھا۔ ایک لحاظ سے یہ بائیکاٹ کی توسیع تھی۔ بائیکاٹ کا مطلب یہ تھا کہ غیر ملکی مصنوعات کا استعمال نہ کیا جائے اور ملک کی انتظامیہ کو چلانے میں غیر ملکی افسر شاہی کی مدد نہ کی جائے۔ غیر فعال مزاحمت نے ٹیکس اور محصولات کی عدم ادائیگی پر اصرار کیا۔ اس طرح، غیر فعال مزاحمت ایک انقلابی پروگرام تھا، اور یہ برطانوی سامراج کے خلاف ایک خاموش بغاوت تھی۔ لالہ لاجپت رائے اور بال گنگادھر تلک کے ساتھ ساتھ، بپن چندر پال نے بھی برطانوی حکومت کے خلاف بنیاد پرست نقطہ نظر کی وکالت کی۔ وہ ہندوستان کے لیے سوراج یا خود حکمرانی کے نظریہ پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے نوآبادیاتی تسلط کے خلاف ہندوستانیوں کو اپنی ثقافتی شناخت اور ورثے پر فخر کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

6.16 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ہندوستانی قومی تحریک میں لالہ لاجپت رائے، بال گنگادھر تلک اور بپن چندر پال کی خدمات تاریخ کے لازوال نشانات ہیں۔ ان کی لگن، پرجوش قوم پرستی اور انتھک کوششوں نے عوام کو متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے سودیشی، سوراج اور عدم تعاون کے پیغام نے بالآخر حصول آزادی کی راہ ہموار کی۔ لالہ لاجپت رائے، سیاست میں تلک کے ہیرو تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مکمل آزادی کے بغیر سمجھوتہ ممکن نہیں ہے، اسی لیے وہ گاندھی کی تحریک کو خیالی سمجھتے تھے۔ تلک نے قومی تحریک میں مذہب کے ایک اہم کردار کا تصور پیش کیا، لیکن سماج میں اس کے غلط استعمال کی مخالفت کی۔ وہ سیاست میں انتہا پسند تھے اور سماجی اصلاحات کے مسئلے میں قدامت پسند۔ اگرچہ ان کا سیاسی

فلسفہ ہندوستانی روایات سے جڑا ہوا تھا، لیکن وہ جدیدیت کے مخالف نہیں تھے۔ وہ ہندوستانی عوام کی تعلیم مغربی پیمانے پر چاہتے تھے۔ تلک کو اکثر فرقہ پرست رہنماؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔ تاہم، اگرچہ انہوں نے ہندو مسلم فسادات کے دوران ہندوؤں کی حفاظت کی، لیکن انہوں نے ان کو امن برقرار رکھنے کا بھی مشورہ دیا۔ یہ دراصل انگریز حکمران تھے جنہوں نے دو برادریوں کے درمیان دراڑیں پیدا کیں، اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اکسایا۔ 1907 کے بعد، تلک وسیع ذہنیت اور بصیرت افروز رہنما کے طور پر سامنے آ چکے تھے۔ یہ ان ہی کی ذہانت اور کوشش تھی کہ 1917 میں لکھنؤ معاہدے کے ذریعے ہندو مسلم سمجھوتہ واقع ہوا۔ قومی تعلیم، بیباک صحافت اور سیاسی تنظیم یہ تین محاذ تھے جن پر تلک نے تمام عمر جدوجہد کی۔ بپن چندر پال بھی ان کی قوم پرستی اور سماجی اصلاح کے نظریات سے متاثر تھے۔ وہ ہندوستانی ثقافت اور سماج کے احیاء میں یقین رکھتے تھے اور لوگوں میں حب الوطنی کی تحریک پیدا کرنے کے لیے انتھک محنت کرتے تھے۔ برطانوی حکومت کی طرف سے قید اور ظلم و ستم کا سامنا کرنے کے باوجود، وہ قوم پرستی کے مقصد کے لیے اپنے عزم میں ثابت قدم رہے۔

6.17 کلیدی الفاظ (Keywords)

سوراج	:	سوراج کا مطلب برطانوی تعلق کو منقطع کیے بغیر خود حکمرانی قائم کرنا۔
آزادی	:	آزادی کا مطلب برطانوی تعلق کو مکمل طور پر منقطع کر کے خود مختاری حاصل کرنا۔
بائیکاٹ	:	بائیکاٹ کا مطلب غیر ملکی اشیاء اور غیر ملکی انتظامیہ سے دور رہنا اور اسے چھوڑنا۔
سودیشی	:	دیسی اشیاء کا استعمال۔
قوم پرستی	:	قوم پرستی کا مطلب اتحاد کا ایک روحانی اور نفسیاتی بندھن ہے۔ تلک کے مطابق، علامتیں اس بندھن کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

6.18 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

6.18.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. 1907 میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کس نے کی؟
2. *Unhappy India* کس کی تصنیف ہے؟
3. لالہ لاجپت رائے کی وفات کب ہوئی؟
4. 1907 میں لالہ لاجپت رائے کو کس قلعے میں قید کر دیا گیا؟
5. بال گنگادھر تلک کی وفات کب ہوئی؟
6. ستمبر 1920 میں کلکتہ کے کانگریس اجلاس میں کس کو صدر منتخب کیا گیا تھا؟
7. سائمن کمیشن کی تقرری کب واقع ہوئی؟

8. *The Arctic Home in the Vedas* کس کی تصنیف ہے؟
9. بال گنگادھر تلک کس نام سے مشہور تھے؟
10. بپن چندر پال کی وفات کب ہوئی؟

6.18.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تلک اعتدال پسندوں سے کیسے مختلف تھے؟
2. بپن چندر پال بطور ایک قوم پرست پر ایک مضمون تحریر کیجیے۔
3. ہندوستانی جدوجہد آزادی میں انتہا پسندوں کے کردار پر روشنی ڈالیے۔
4. تلک کے مطابق ہندوستانی صنعت، تجارت اور دستکاری کے زوال کے اسباب کیا تھے؟
5. 'بائیکاٹ' اور 'سودیشی' سے قومی تحریک کو کس طرح مدد ملی؟

6.18.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. تلک نے قومی تحریک میں مذہب اور علامتوں کے استعمال کا جواز کیسے پیش کیا؟ تفصیلی وضاحت کیجیے۔
2. ہندوستانی قومی تحریک میں لال بال پال کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. تلک کے سماجی، سیاسی اور معاشی نظریات کو تفصیلی طور پر بیان کیجیے۔

6.19 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandhopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition: A History of Modern India*, Orient Longman Private Limited, 2004.
2. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, 2014.
3. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin, New Delhi, 2000.
4. Cashman, Richard L., *Myth of Lokmanya Tilak and Mass Politics in Maharashtra*, London, 1975.
5. Donald H. Bishop ed., *Thinkers of Indian Renaissance*, New Delhi, 1983.
6. Grover and Grover, *A New Look at Modern Indian History*, S. Chand & Co. Ltd., New Delhi, 1983.
7. Karunakaran, K.P., Indian *Politics from Dadabhai Naoroji to Gandhi*, New Delhi, 1975.
8. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal*: *A New History of British India*, HarperCollins, Noida, 2021.
9. Pagdi, Gayatri, *Lokmanya Tilak*: *The First National Leader*, HarperCollins, Noida, 2019.

10. Pradhan, G.P., *Lokmanya Tilak*, National Book Trust, India, 2005 (first pub. in 1994).
11. Rai, Lajpat, *Young India*: *An Interpretation and a History of the Nationalist Movement from Within*, K.L. Tuteja ed., National Book Trust, India, 2021 (first pub. in the USA in 1916).
12. Rai, Lajpat, *Unhappy India*, Low Price Publications, Delhi, 2002 (first pub. in 1928).
13. Rao, Parimala V., *Foundations of Tilak's Nationalism*: *Discrimination, Education and Hindutva*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.
14. Shay, Theodore L., *The Legacy of Lokmanya: The Political Philosophy of BaI Gangadhar Tilak*, Oxford Press, Bombay, 1956.
15. Tahmankar, D.V., *Lokmanya Tilak: Father of Indian Unrest and Maker of Modern India*, John Murray Publishers, London, 1956.

اکائی 7۔ مسلم لیگ

(The Muslim League)

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 تاریخی پس منظر

7.3 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی برطانوی پالیسی

7.4 سر سید احمد خان اور علی گڑھ تحریک

7.5 فرقہ واریت کے فرsوغ کے اسباب

7.5.1 تاریخ کی غلط تشریح

7.5.2 انتہا پسندانہ قوم پرستی کا فروغ

7.6 شملہ وفد

7.6.1 علاحدہ انتخابی حلقوں اور اہمیت کے تناسب سے نمائندگی کی منظوری

7.7 آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام

7.7.1 آل انڈیا مسلم لیگ کے مقاصد

7.8 لکھنؤ معاہدے کا سبب بننے والے واقعات

7.9 لکھنؤ معاہدہ

7.10 ہندو مہاسبھا

7.10.1 ہندو مہاسبھا کے مقاصد

7.11 ہندو مسلم تعلقات

7.12 مسلم لیگ کا احیا
7.13 فرقہ ورانہ فسادات
7.14 محمد علی جناح
7.15 اکتسابی نتائج
7.16 کلیدی الفاظ
7.17 نمونہ امتحانی سوالات
7.18 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید (Introduction)

ابتدائی بیسویں صدی میں ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جانب سے اختیار کی جانے والی مختلف پالیسیاں فرقہ ورانہ جماعتوں کے ظہور کا باعث بنیں۔ ان میں سب سے اہم تنظیمیں مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا تھیں۔ ان تنظیموں کی سرگرمیوں کی وجہ سے جدید ہندوستان میں مذہبی فرقہ واریت کا فروغ ہوا جس کا جدید ہندوستان کی سیاست پر راست اثر پڑا اور اس کا حتمی نتیجہ 1947ء میں تقسیم ہندوستان کی شکل میں رونما ہو۔ فرقہ واریت بنیادی طور پر ایک نظریہ (ideology) ہے۔ یہ جدید دور کی پیداوار ہے اور ایک طرح سے برطانوی پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ کسی نظریہ کو اپنے آپ کے، دوسرے کے یا بڑے پیمانے پر سماج کے بارے میں، ادراک، خیالات اور افکار کے ایک مجموعے کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ فرقہ وارانہ نظریہ یہ سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ایک مذہب کے ماننے والے تمام افراد کے سماجی، معاشی اور سیاسی مفادات واحد اور یکساں ہیں یہی فرقہ واریت کا پہلا مرحلہ ہے۔ فرقہ وارانہ نظریہ کے دوسرے مرحلے پر فرد یہ سوچنے لگتا ہے کہ مختلف طبقات کے مفادات مختلف ہیں۔ فرقہ وارانہ نظریے کے تیسرے مرحلے یعنی اس کے انتہائی درجے پر انسان یہ سمجھتا ہے کہ دوسرے طبقات کے مفادات نہ صرف مجھ سے مختلف ہیں بلکہ وہ میرے مفادات کے خلاف اور ان سے ٹکرانے والے بھی ہیں۔ جدید ہندوستان میں فرقہ ورانہ نظریے اور سیاست کے عروج نے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان دوری پیدا کر دی۔ مسلم لیگ، جو تمام مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کا غلط دعویٰ کرتی تھی، اس نے نظریہ کو تشکیل دیا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم دو مختلف قوم ہیں۔ یہ غیر سائنسی تشریح اس ہندو فرقہ ورانہ سوچ سے ملتی جلتی تھی کہ ہندو ہی 'اصل' اور 'قانونی' ہندوستانی قوم تشکیل دیتے ہیں اور دیگر مذاہب کے پیروکار 'غیر ملکی' ہیں۔

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- فرقہ واریت کے نظریہ اور جدید ہندوستان میں اس کے ظہور کے اسباب کو جان سکیں گے۔

- مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا کے رہنماؤں کے افکار اور سرگرمیوں کو سمجھ سکیں گے۔
- لکھنؤ معاہدہ کا سبب بننے والے حالات اور ہندوستانی تاریخ میں اس کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔

7.2 تاریخی پس منظر (The Historical Context)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان پر برطانوی قبضے سے قبل متعدد مسلم حکمرانوں نے اس ملک پر حکومت کی۔ مسلم اعلیٰ طبقے جو اس سے پہلے ااقتدار میں رہ چکے تھے، اقتدار کھونے کا شکوہ کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اس سے سبھی عام مسلمانوں کا نقصان ہوا جو کہ سراسر غلط پروپیگنڈا تھا۔ اپنی حکمرانی کے ابتدائی دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کھلے عام ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرق کرتے ہوئے ہندو طبقے کی حمایت کررہی تھی۔ انگریز یہ سمجھتے تھے کہ ان کے اصل مخالف مسلمان ہیں اسی لیے وہ کمپنی کی اہم اور بڑی ملازمتوں میں انہیں شامل نہیں کرتے تھے۔ کئی عام اور نچلے طبقے کے مسلمان دیسی دست کاریوں سے وابستہ تھے لیکن جب گھریلو صنعتوں کو بھی تباہ کردیا گیا تو عام مسلمان کثیر تعداد میں بے روزگار ہوگئے۔ انگریزوں کے تعصب کی وجہ سے انہیں فوج میں بھی شامل نہیں ہونے دیا گیا۔ اس طرح ہندوستانی مسلمانوں کو منصوبہ بند طریقے سے ایک نسل کو معاشی تباہی سے دوچار کیا گیا۔ تعلیم کے معاملے میں بھی وہ پسماندہ رہے۔ انگریزوں کے تئیں قدامت پرستی اور تعصب کی وجہ سے وہ 1857ء تک نئے انگریزی تعلیمی نظام کے فائدے حاصل کرنے سے بھی محروم رہے۔ یوں تو 1857ء کی بغاوت میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے مگر انگریزوں کو ایسا لگتا تھا کہ یہ مغل سلطنت کی تجدید کے لیے بنیادی طور پر ایک مسلم کوشش تھی۔ اس بغاوت کو انگریزوں نے بڑی بے دردی سے کچل دیا تھا۔ مسلم اعلیٰ طبقے کے لیے 1857 کی بغاوت کے بعد والا دور سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے غالباً تاریک ترین زمانہ تھا۔ اس بغاوت کے بعد چند دہائیوں تک انگریزی حکومت مسلمانوں کے خلاف کینہ پالتی رہی۔ اسی لیے مسلمان انتظامی اور فوجی دونوں شعبوں میں اہم عہدوں سے محروم رکھے گئے اور انہیں حد درجہ کچلا گیا۔ انگریزوں کے اس رویے پر مسلمانوں نے بھی شدید احتجاج کیا۔ یہ صورت حال سرسید احمد خاں کے سیاسی افق پر ابھرنے تک جوں کی توں برقرار رہی۔

7.3 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی برطانوی پالیسی (British Policy of Divide and Rule)

1857ء میں ہندو اور مسلمانوں کی جانب سے مشترکہ بغاوت نے انگریزوں کے ہوش اس حد تک اڑا دیے تھے کہ انگریزوں نے ان میں پھوٹ ڈالنے کا خصوصی منصوبہ بنایا۔ 1859ء میں بمبئی کے برطانوی گورنر ایلفنسٹون (Elphinstone) نے لندن کو مشورہ دیا کہ 'قدیم رومی اصول '*Divide et Impera*' (پھوٹ ڈالو اور راج کرو) پر ہمیں عمل کرنا چاہیے۔' چند دہائیوں بعد جان اسٹریچی (John Strachey) نے محسوس کیا کہ 'ہندوستان میں ہماری سیاسی حیثیت ' کے لیے 'ہندوستانی لوگوں میں باہم دشمن گروہوں کا ہونا ضروری ہے۔' اور یہ پالیسی انگریزوں کی بقا کے لیے ضروری تھی۔ کانگریس کی قیادت میں قومی تحریک کے عروج کے ساتھ ہی برطانوی افسران مسلمانوں کی حمایت کرنے لگے۔ اس طرح نہایت چالاکی سے انگریزوں نے 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی پالیسی پر عمل کیا تاکہ ان کی حکمرانی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ انہوں نے ہندوستانی سیاست میں فرقہ واریت اور علاحدگی پسندی کے رجحانات کو ہوا دینی شروع

کی۔انہوں نے خود کو مسلم اقلیت کا خیر خواہ قرار دیتے ہوئے مسلم زمین داروں اور تعلیم یافتہ متوسط طبقے کا دل جیتنے کی کوشش کی ساتھ ہی ہندوستانی سماج میں دیگر اختلافات کو بھی بڑھاوا دیا۔ بنگالیوں کے غلبے کا ذکر کر کے غیر بنگالیوں کے دل میں ان کے خلاف نفرت پیدا کی اور صوبائی تعصب کو فروغ دیا۔ ذات پات کے ڈھانچے کو غیر برہمن کو برہمن کے خلاف کرنے کے لیے استعمال کیا اور نچلی ذاتوں کو بڑی ذاتوں سے لڑوایا۔ یوپی اور بہار کے علاقوں میں جہاں ہندو مسلم مثالی امن وآشتی کے ساتھ رہا کرتے تھے وہاں برطانوی منتظمین نے اردو زبان کے درباری مقام کو ہندی میں بدلنے کی کوشش کرنے والی تحریک کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے لسانی پھوٹ ڈالنے کی کامیاب کوشش کی۔ ہندوستان کی سماجی رنگا رنگی اور اختلافات کو غیر ملکی حکمرانوں نے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ مثلاً ذات اور مذہب کے امتیاز کو بنیاد بنا کر فوجی تنظیم کی جانے لگی۔ غرض کہ زندگی کے ہر میدان اور ہر شعبے میں برطانوی حکمرانوں نے علاحدگی پسندی کے رجحان کو بڑھاوا دینے کی کوشش کی۔ متحدہ ہندوستانی قوم پرستی کے طوفان سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو انگریزی حکومت کا وفادار بنانا انگریزوں کے لیے ضروری تھا اور کچھ لوگوں کی طرف سے مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے پر بھی زور دیا گیا۔

7.4 سرسید احمد خان اور علی گڑھ تحریک (Sir Syed Ahmed Khan and the Aligarh Movement)

سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک کی شروعات سے قبل ہی بنگالی مسلمانوں نے خود کو منظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ بنگال میں مسلمانوں کی پہلی تنظیم 'انجمن اسلامی' تھی۔ اس کا قیام 1855ء میں دو مقاصد کے تحت عمل میں آیا تھا ایک مسلمان طبقہ کے مفادات کو فروغ دینا اور دوسرے انگریزوں سے وفاداری سکھانا۔ لفٹننٹ گورنر کو عرضداشتیں دیتے ہوئے انجمن نے مطالبہ کیا کہ ہندوؤں کے ساتھ برابری کے مقابلے کے لیے ہمیں 'کوئی خصوصی مراعات کی ضرورت نہیں بلکہ دیانت داری سے کام کیا جائے۔' اس بات کو یقینی بنانے کے لیے انجمن نے تعلیم کے فروغ کے خصوصی اقدامات کی وکالت کی، برطانوی راج سے وفاداری دکھائی اور 1857ء کی بغاوت کی مذمت کی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ تحریک سے بہت پہلے ہی بنگال میں مسلم سیاست کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ نواب لطیف خان کی محمڈن لٹریری سوسائٹی (1863ء) اور سید عامر علی کی سنٹرل نیشنل محمڈن اسوسی ایشن (1877-78) بنگال کی ممتاز مسلم تنظیمیں تھیں۔

سید احمد خان (1817–1898) سب سے ممتاز اصلاحی رہنما تصور کیے جاتے ہیں جنہوں نے انگریزوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان تعلقات قائم کیے۔ سید احمد خان نے جو ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے، انتہائی قریب سے مغل سلطنت کے سیاسی زوال اور اس کے مقابلے انگریزوں کی قوت کا مشاہدہ کیا تھا۔ گھر والوں کی مرضی کے خلاف جا کر انہوں نے انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی۔ انہوں نے قریب سے دیکھا تھا کہ انگریزوں نے کس طرح 1857ء کی بغاوت کو کچل دیا تھا اور وہ مسلمانوں کو کس حد تک شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان عدم اعتماد کی گہری کھائی کو پاٹنے کا فیصلہ کیا۔ *The Causes of Indian Revolt* اور *The Loyal Mohammedans of India* جیسی اپنی کتابوں سے انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمان انگریزوں کے وفادار ہیں اور وہ 1857ء کی بغاوت کے راست ذمہ دار نہیں ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیمی پسماندگی سے لڑنے اور انہیں انگریزی میں اعلیٰ تعلیم سے روشناس کرنے کے لیے انہوں نے دو اسکول اور ایک ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم

کی جس کے بعد انہوں نے 1875ء میں علی گڑھ میں مشہور محمڈن اینگلواورینٹل کالج قائم کیا جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا۔اس کالج نے شمالی ہندوستان کے مسلمان اعلیٰ طبقے کے احیا میں اہم کردار ادا کیا۔ علی گڑھ کالج نے ایک جدید مسلم دانشور اعلیٰ طبقہ کو تخلیق کیا جو انگریزوں کی سیاسی وفاداری کے جذبے سے لبریز تھااور جدید مغربی تعلیم اور سماجی اصلاح کے تئیں پرجوش تھا۔

سرسید احمد خان قوم پرست اور فرقہ پرست دونوں خیالات کے حامل تھے کیونکہ ان کے یہ خیالات ان کی ذات میں بیک وقت موجود ہوتے تھے تو انہیں زمانی ترتیب میں درجہ بند کرنا بے حد مشکل تھا۔ 27 جنوری 1883 کو پٹنہ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''روز مرہ زندگی کے تمام معاملات میں ہندوستانی مسلم ایک قوم ہیں۔ میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں کہ ہندوستان ایک نئی نویلی دلہن کی طرح ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو خوبصورت آنکھیں ہیں۔ اگر دونوں باہم مل کر رہیں تو دلہن ہمیشہ خوبصورت رہے گی، اگر وہ مختلف سمتوں میں دیکھیں گے تو دلہن بھینگی نظر آئے گی اور جزوی طور پر اندھی ہو جائے گی۔'' تاہم وہ کانگریس کے ساتھ جڑ کر اپنی قوم پرستی کو ثابت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے کانگریس کی سخت مخالفت کی اور ہندوستانی مسلمانوں کو اس سے جڑنے سے روکا۔ ان کا ماننا تھا اعتدال پسند قائدین کی ماتحتی میں بھی کانگریس سیاسی طور پر جارحانہ ہے۔ کانگریس کی تشکیل کے ایک سال بعد 1886ء میں انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقد کی جس کا مقصد مسلمانوں کو تعلیمی، سماجی، اور معاشی ترقی کے راستے پر گامزن کرنا تھا اور انہیں کانگریس سے دور رکھنا تھا۔ اس کے ایک سال بعد کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں انہوں نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ وہ ابھی سرگرم سیاست میں شرکت کے لیے تیار نہیں اور نہ ہی ابھی سیاسی طور پر اتنے مضبوط ہیں کہ انگریزوں کے تعاون کے بغیر ابھر سکیں، اس لیے ابھی انگریزوں سے تعاون زیادہ فائدہ مند رہے گا۔

محمڈن اینگلواورینٹل کالج کے پرنسپل تھیوڈر نے سرسید کو اس بات کا قائل کیا کہ 'جہاں اینگلو۔ مسلم تعاون مسلم فرقے کی حالت کو سدھارنے کا سبب بنے گا وہیں قومی جدوجہد میں شامل ہونے سے مسلمانوں کو ایک بار پھر سخت جدوجہد، محنت اور دکھوں میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ مسٹر بیک نے سید احمد کو جتایا کہ انگریزوں کے ساتھ تعاون کرنا ان کے اپنے فرقے کے مفاد میں ہوگا۔ مسلم قوم پرستی کے علمبردار سرسید احمد خاں نے 1883ء میں اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ ہندو مسلم دو باہم متحارب قومیں ہیں جو کسی طرح مشترکہ سیاسی زندگی نہیں گزار سکتیں۔ ان کا یہ ٹھوس یقین تھا کہ کانگریس کی جانب سے جمہوری بنیادوں پر نمائندہ اداروں کا مطالبہ اور ملکی نظم ونسق میں مقامی لوگوں کے لیے بڑا حصہ مسلم مفاد کے لیے تباہ کن ہے۔ انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کو متنبہ کیا کہ برطانوی طرز کی نمائندہ مجلس قانون ساز کے نتیجے میں ہندوستان کے بیش تر علاقوں میں ہمیشہ ہندوؤں کا غلبہ حاصل رہے گا اور مسلمان کبھی بھی اقتدار حاصل نہیں کر سکیں گے۔ 'انتخاب کے ذریعے نمائندگی کے نظام کا مطلب اکثریت کے نظریات کی نمائندگی ہے۔ . . . مجھ پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ انتخاب کے اصول کی شروعات . . . برائیاں لے کر آئے گی۔ بڑا طبقہ (اکثریت) مکمل طور پر چھوٹے طبقے (اقلیت) کے مفادات میں مداخلت کرے گا۔' سرسید کو ڈر تھا کہ انگریزی حکومت کی مدد لیے بغیر مسلمان معاشی برتری اور تعلیم کے اونچے معیار میں، ترقی یافتہ ہندوؤں سے پیچھے رہ جائیں گے۔ اسی لیے انہوں نے انگریزوں کے ساتھ وفاداری اور کانگریس سے علاحدہ رہنے کی پالیسی اپنائی۔ انہوں نے واضح کیا کہ جمہوری حکومت کا مطلب ہے اکثریت کی حکومت اور ہندوستان میں اکثریت کی حکومت کا مطلب ہے ہندو اقتدار۔ اسی سبب سے سرسید احمد خاں اینگلو مسلم تعاون کے حامی اور کانگریس مخالف

رہے۔ مسلمانوں کی بھاری تعداد کو کانگریس سے جُدا رکھنے میں سر سید کو کامیابی ملی۔ وہ حکومت کے مکمل وفادار ہو گئے اور 1888 میں کانگریس کی مخالفت میں بنارس کے راجہ شیو پرساد کے ساتھ مل کر 'United Indian Patriotic Association' قائم کی۔ یہ ایک رجعت پسند تنظیم تھی جس نے کانگریس کے ترقی پسند نظریات کی مخالفت کی اور برطانیہ سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔

7.5 فرقہ واریت کے فروغ کے اسباب (Causes for the Growth of Communalism)

مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ اور علاحدگی پسندی کے رجحانات کا اہم سبب، ان کی تعلیمی پسماندگی تھا۔ مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ زیادہ تر زمیندار اور امراء طبقے پر مشتمل تھا جنھوں نے انگریز مخالف رویہ اپنایا اور اپنی قدامت پرستی کے سبب جدید تعلیم میں بہت کم دلچسپی ظاہر کی۔ اس وجہ سے ہندوستان میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ سائنس، جمہوریت اور قومیت پر زور دینے والے جدید مغربی خیالات مسلمانوں میں عام نہیں ہو سکے جس کی وجہ سے وہ پسماندگی کے ساتھ ساتھ کٹّر قدامت پرستی کا شکار ہو گئے۔ اس کے برخلاف ہندو جنھوں نے مغربی تعلیم حاصل کرنے میں کوئی جھجک نہیں دکھائی، مسلمانوں سے کافی آگے نکل گئے اور نظم و نسق میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے۔ آگے چل کر کافی دیر سے سر سید احمد خاں اور بدرالدین طیب جی کی کوششوں سے مسلمان مغربی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مسلمان میں نیا متوسط طبقہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ تعلیم یافتہ مسلمان تجارت اور صنعت میں زیادہ مواقع نہیں حاصل کر سکے جس کی وجہ سے وہ صرف سرکاری نوکری پر منحصر ہو گئے۔ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو بے حد کم مواقع حاصل تھے جس کے سبب برطانوی افسران اور وفادار مسلم رہنماؤں کے لیے یہ بے حد آسان ہو گیا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو تعلیم یافتہ ہندوؤں کے خلاف بھڑکائیں۔ مسلم قیادت نے اپنے نوجوانوں کو برطانوی حکومت کی وفاداری کا سبق پڑھایا تاکہ انہیں سرکاری نوکریاں اور حکومت کا تعاون حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ پیش آئے۔

7.5.1 تاریخ کی غلط تشریح (The Misuse of History)

ہندوستانی تاریخ کی غلط تشریح نے جدید ہندوستان میں فرقہ ورانہ نظریہ کو مستحکم کیا اور اسے تیزی سے فروغ دیا۔ اس مسخ شدہ تاریخ ہی سے افراد، تنظیموں اور سیاست نے اپنی طاقت حاصل کی۔ ایک ممتاز مورخ بپن چندر کہتے ہیں 'درحقیقت یہ کہنا کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کہ تاریخ کی فرقہ وارانہ تشریح، ہندوستان میں فرقہ واریت کا بنیادی نظریہ رہا ہے۔ اس کے بغیر فرقہ واریت نہیں پنپ سکتی۔ یہ بات خاص طور سے ہندو فرقہ واریت پر صادق آتی ہے۔ جب کہ تاریخ کا استعمال کرتے ہوئے مسلم فرقہ واریت کا انحصار زیادہ تر مذہب اور اقلیتی احساس پر ہوتا ہے تاکہ خوف کی نفسیات یا احساس پیدا کیا جا سکے۔'

برطانوی سامراجی مورخین، جیسے جیمس مل نے ہندوستانی تاریخ کو حکمرانوں کے مذہب کی بنیاد پر ہندو اور مسلم ادوار میں تقسیم کیا۔ انہوں نے قدیم دور کو ہندو اور دورِ وسطیٰ کو مسلم دور سے تعبیر کیا۔ وہ اس بات کو بھول گئے کہ کئی غیر ہندو حکمران جیسے چندر گپت موریہ، اشوک، کنشک اور ہرش وردھن نے بھی قدیم ہندوستان پر راج کیا۔ اسی طرح ترک، افغان اور مغل سلطنتیں جنھوں نے عہد وسطیٰ میں حکمرانی کی ان تمام کو ان کے مذہب سے پہچانا گیا اور اس دور کو 'مسلم دور' کہا گیا اور اس حقیقت کو بھلا دیا گیا کہ بہت سے غیر مسلم راجا جیسے

وجے نگر کے حکمراں اور شیواجی کے تحت مراٹھوں نے بھی عہد وسطیٰ میں حکومت کی۔ایک بد گمانی یہ پیدا کی گئی کہ عہد وسطیٰ میں تمام حکمران مسلم تھے اور تمام رعایا ہندو، ساتھ ہی یہ سمجھا گیا کہ تمام مسلمان، حکمران طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور تمام ہندو زبردستی بے رحم مسلم حکمرانی کے تابع بنائے گئے۔سامراجی مورخین اس بات کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ ایک طبقہ کے طور پر حکمرانوں نے چاہے وہ ہندو ہو یا مسلم، اپنی رعایا کو ایک کمتر مخلوق سمجھ کر ان پر زور زبردستی کی چاہے وہ رعایا ہندو ہو یا مسلم۔اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کو مکمل طور پر بھلا دیا گیا۔

یہ غلط تشریح اور اس کے نتیجے میں ہندوستانی عہد وسطیٰ کی تاریخ کے بارے میں پیدا ہونے والی غلط فہمی نے فرقہ وارانہ نظریے کے فروغ میں بڑا کردار ادا کیا۔دور وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کو ہندو مسلم تصادم کی تاریخ سمجھا گیا۔یہ سمجھا گیا کہ اس عہد کے دوران ہندو مسلم تعلقات کافی خراب تھے۔'مسلم حکمرانی' کو بیرونی قبضہ بتایا گیا جس نے ہر پہلو سے ہندوؤں کی بے حرمتی کی۔ایچ۔ایم۔ایلیٹ (H.M. Elliot)اور جان ڈاؤسن (John Dowson) جیسے سامراجی مورخین نے مندروں کی تباہی، خواتین کی بے حرمتی اور ہندوؤں کے ساتھ دیگر توہین آمیز سلوک کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔دورِ وسطیٰ کے مسلم حکمرانوں کو صرف اس لیے 'بیرونی حکمران' بتایا گیا کیونکہ وہ مسلمان تھے اس حقیقت سے قطع نظر کہ ان میں سے بہت سے ہندوستان کی سرزمین میں ہی پیدا ہوئے تھے۔فرقہ وارانہ تشریح کے تحت جنھوں نے 'بیرونی' مسلم حکمرانوں کے خلاف لڑائی لڑی انہیں 'قومی ہیرو' اور 'مجاہد آزادی' کا درجہ دیا گیا۔اس طرح رانا پرتاپ اور شیواجی قومی ہیرو قرار پائے حالانکہ انہوں نے اپنے علاقے کے لیے اسی طرح لڑائی لڑی جس طرح دوسرے راجا لڑتے ہیں۔بالعموم، تمام مسلمانوں یہاں تک کہ مذہب تبدیل کر کے مسلمان بن جانے والے ہندوؤں کو بھی 'بیرونی' بتایا گیا صرف اس لیے کہ ان کا تعلق اس مذہب سے تھا جو ہندوستان کے باہر پیدا ہوا تھا اور حملہ آوروں کا مذہب تھا۔قدیم ہندوستانی ثقافت پر بہت زیادہ زور دیا گیا اور دورِ وسطیٰ کی ثقافت کو بالکل خارج کر دیا گیا۔ ہندوستانی تاریخ کی منظر کشی میں اس طرح کے رجحانات نے جدید ہندوستان میں فرقہ واریت کو فروغ دیا۔فرقہ پرستوں نے ہندو مسلم اختلافات پر زور دیا اور ان کی زندگی کے مشترکہ پہلوؤں اور باہمی میل جول کو بھول گئے۔ہندو اور مسلم فرقہ پرستوں نے دونوں طبقات کی ملی جلی اقدار پر پردہ ڈال دیا کیوں کہ اس سے ان کی فرقہ وارانہ فکر اور سیاست کا پردہ فاش ہو سکتا تھا۔المیہ یہ تھا کہ ہندوستانی تاریخ کی مسخ شدہ شکل نے کٹر قوم پرستوں کی ذہنیت کو بھی اپنی جکڑ میں لے لیا اور فرقہ وارانہ نظریے کو پھلنے پھولنے کے لیے کھلی فضا میسر آ گئی۔

7.5.2 انتہا پسندانہ قوم پرستی کا فروغ (Growth of Militant Nationalism)

جارحانہ قوم پرستی کا فروغ بھی مسلم فرقہ واریت کو بڑھانے کا ایک سبب بنا۔انتہاء پسند قوم پرست رہنماؤں (پال، بال، لال اور آربندو) کی جانب سے ہندو نظریات اور روایات کو غیر معمولی اہمیت دیے جانے کے سبب مسلمانوں میں ناراضگی پیدا ہوئی۔اسی طرح قومیت کے معاملے میں مسلمانوں کو جو خدشات تھے ان کو دور کرنے کے بجائے چند کٹّر ہندو قوم پرست، مسلم حکمرانوں کو غیر ملکی کہہ کر مسلمانوں کو اپنے سے دور کرنے لگے۔قوم پرستی میں یہ ہندو رنگ خاص طور پر اس لیے بھی مضر ثابت ہوا کہ اس کو عیار برطانوی اور ان کے ہمنوا لوگوں نے مسلم ذہنوں میں زہر بھرنے کے لیے استعمال کیا۔انگریزوں نے مسلمانوں کو یہ کہہ کر ڈرانا شروع کیا کہ اگر ہندوؤں کو غلبہ حاصل ہو جائے تو

ان کی حالت بدتر ہو جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا خاصہ بڑا طبقہ قومی تحریک سے لاتعلق ہو گیا اور ان میں علاحدگی پسندی کے رجحانات پرورش پانے لگے۔ 1905ء میں بنگال کی تقسیم، مسلمانوں اور ہندوؤں میں دراڑ ڈالنے کی جانب ایک اور قدم تھا۔ مسلمانوں کو ان کی وفاداری کے انعام کے سلسلہ میں حکومتِ ہند نے مشرقی بنگال کا علاحدہ مسلم اکثریتی صوبہ قائم کیا۔ مسلم فرقہ پرستوں نے فرقہ وارانہ خطوط پر بنگال کی تقسیم کو سیاسی ترقی یافتہ ہندوؤں کے خلاف پس ماندہ مسلمانوں کی تائید حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا۔

7.6 شملہ وفد (The Shimla Deputation)

1882ء کے ایکٹ کے تحت ہندوستانی مجلس قانون ساز (Indian Legislative Council) کی تشکیل کرتے وقت مسلمانوں کو کوئی خصوصی نمائندگی نہیں دی گئی اور مسلمان عملی وجوہات کی بنا پر ایک بھی نشست نہیں جیت پائے۔ ان حالات نے سرسید کو اپنی 1883ء کی تقریر میں مسلمانوں کے لیے علاحدہ نشستوں کی ضرورت کے مطالبہ پر مجبور کر دیا۔ 1906ء میں گورنر جنرل لارڈ منٹو نے ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کی ضرورت پر غور کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ مسلم رہنماؤں نے محسوس کیا کہ نئی خود مختار باڈیز میں وہ ہندو اکثریت سے شکست کھا جائیں گے۔ سرسید احمد خان کے پیروکاروں بالخصوص محسن الملک نے پانچ ممتاز مسلم رہنماؤں کا گروہ تشکیل دیا جس نے آغا خان کی سرکردگی میں یکم اکتوبر 1906ء کو شملہ میں وائسرائے لارڈ منٹو سے ملاقات کی۔ اس وفد نے دیگر امور کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لیے علاحدہ انتخابی حلقوں کا مطالبہ کیا تاکہ ہندو اکثریت کے خلاف سیاسی تحفظ حاصل ہو سکے۔ ساتھ ہی انہوں نے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی اور تاج برطانیہ کے ساتھ وفاداری کے بدلے مسلمانوں کی حقیقی تعداد سے کہیں زیادہ ملازمتوں کا مطالبہ کیا۔

7.6.1 علاحدہ انتخابی حلقوں اور اہمیت کے تناسب سے نمائندگی کی منظوری

(Grant of Separate Electorates and Weightage Representation)

وائسرائے نے وفد کو مخاطب کر کے ان کے مطالبات سے پوری ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس نے وفد کے اراکین کو یقین دلایا کہ ان کے سیاسی مفادات کا پوری طرح سے تحفظ کیا جائے گا۔ لارڈ منٹو نے کہا "آپ کا یہ مطالبہ بالکل صحیح ہے کہ آپ کی حیثیت کا تعیّن عددی طاقت پر نہیں بلکہ آپ کے فرقہ کی سیاسی اہمیت اور حکومت برطانیہ کے لیے آپ لوگوں کی خدمات کی بنیاد پر کیا جانا چاہیے۔ اس معاملے میں، میں پوری طرح سے آپ کے ساتھ ہوں۔ میں صرف یہ کہ سکتا ہوں کہ مسلم طبقے کو بھروسہ رکھنا چاہیے کہ جس کسی بھی انتظامی تنظیم نو سے میں منسلک ہوں، اس میں ان کے سیاسی حقوق اور مفادات کی حفاظت کی جائے گی۔" لارڈ منٹو کا یہ بیان اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ کس طرح برطانوی حکومت ابتداء ہی سے مسلم فرقہ واریت کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ لارڈ منٹو نے ہندوستان کے سیاسی جسم میں اس زہر کو داخل کرتے ہوئے 1909ء کے مارلے منٹو قانون کی بنیاد رکھی۔ لارڈ منٹو نے مسلمانوں کو ایک خود مختار فرقہ تسلیم کیا اور علاحدہ انتخابی حلقے (Separate Electorate) اور تناسب کے لحاظ سے سیاست میں ان کے علاحدہ مفاد کی توثیق کی۔

علاحدہ انتخابی نشستوں کی منظوری نے اصولی اور عملی طور پر مسلم علاحدگی پسندی کی بنیاد ڈال دی۔ یہ واضح کر دیا گیا کہ مسلمان ایک

علاحدہ، ممتاز اور خدائے واحد کو ماننے والا طبقہ ہیں اور ان کے سیکولر مفادات ہندوؤں سے مختلف ہیں۔ علاحدہ انتخابی حلقے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اور ہندوستانی سیاست میں ایک خلیج پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مسلمان، انگریزوں کو اپنے محافظ کے طور پر دیکھنے لگے اور اس طرح انگریزوں نے مسلم اشرافیہ کی وفاداری حاصل کر لی۔ اس طرح انگریزوں نے مسلم اشرافیہ کے دلوں میں بیٹھی خوف کی نفسیات کا کامیابی سے استعمال کیا اور ان کے فرقہ وارانہ جذبات سے کھلواڑ کیا۔ یہاں سے خلافت تحریک کے مختصر سے عرصہ کو چھوڑ کر مسلم لیگ اور کانگریس شاید ہی کبھی ملے اور ان دونوں کے درمیان کی خلیج کافی گہری ہوتی چلی گئی۔

7.7 آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام (Foundation of the All-India Muslim League)

مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت، مسلم لیگ کا قیام 30 دسمبر 1906ء کو ڈھاکہ (جواب بنگلہ دیش میں ہے) میں عمل میں آیا۔ ہز ہائی نس آغا خان گو کہ اس وقت ڈھاکہ میں نہیں تھے، انہیں لیگ کا مستقل صدر منتخب کیا گیا۔ لیگ کا آغاز کرنے والی چند ممتاز شخصیات میں وقار الملک، ڈھاکہ کے نواب خواجہ سر سلیم اللہ، جن کے محل میں یہ میٹنگ منعقد ہوئی اور محسن الملک شامل تھے۔ لیگ کی قیادت بالخصوص مسلم فرقے کے اعلیٰ اور پیشہ ور طبقہ کے ہاتھ میں تھی اور اس پر نواب، زمینداروں اور قدیم امراء کے مفادات کا غلبہ تھا۔ یہ کسی بھی لحاظ سے عام مسلمانوں کی نمائندہ نہیں تھی۔ چنانچہ 1930ء کے ابتدائی عشرے اور 1940ء کے آخر تک اسے عوامی تائید بھی حاصل نہیں ہوئی جب تک کہ لیگ نے انتہا درجے کے فرقہ وارانہ پروپیگنڈہ کا سہارا نہیں لیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جہاں مولانا آزاد لیگ کی شروعات کے وقت موجود تھے اور جناح غیر حاضر تھے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ جناح نے کھلم کھلا لیگ کے قیام کی مخالفت کی اور مسلم لیگ کے افتتاحی اجلاس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔

7.7.1 آل انڈیا مسلم لیگ کے مقاصد (Objectives of the All-India Muslim League)

1. ہندوستانی مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے تعلق سے جذبہ وفاداری کو فروغ دینا اور حکومتی اقدامات کے خلاف پیدا ہونے والی کسی بھی غلط فہمی کو دور کرنا۔
2. ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی و غیر سیاسی حقوق و مفادات کا تحفظ اور ان کے مطالبوں کو نرم لہجے میں حکومت کے سامنے رکھنا۔
3. مذکورہ بالا نکات کے ساتھ ساتھ جہاں تک ہو سکے مسلمان اور ہندوستان کے دیگر فرقوں کے درمیان ممکنہ حد تک ہم آہنگی پیدا کرنا۔

مسلم لیگ کا قیام ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی ارتقاء میں ایک اہم واقعہ قرار دیا جاتا ہے۔ اپنے قیام کی آغاز سے ہی یہ ایک برطانیہ نواز اور کانگریس مخالف قومی تنظیم ثابت ہوئی۔ جہاں تک طریقہ کار کا تعلق ہے یہ کسی بھی قسم کے احتجاج کے خلاف تھی۔ مسلم لیگ کا پہلا رسمی اجلاس 1907ء میں کراچی میں ہوا اور سر آدم جی پیر بھائی نے اس کی صدارت کی۔ سر سید علی امام جنہوں نے 1908ء میں امرتسر اجلاس کی صدارت کی، انہوں نے طنزیہ طور پر کہا کہ 'کانگریس چاند کا مطالبہ کر رہی ہے'۔ وہ چاہتے تھے کہ کانگریس اس بات کا اعلان کرے کہ عملی سیاست میں برطانوی انتظامیہ سے وفاداری ہی ہندوستان سے وفاداری ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مسلم لیگ کا یہ 'مقدس فرض' ہے کہ وہ اس

وقت تک قوم کے مفادات کا تحفظ کرے جب تک کانگریس کوئی 'قابل عمل پالیسی' نہیں لے آتی۔ اس کانفرنس میں مسلمان رہنماؤں نے قانون ساز کونسلوں اور سیول سروس میں مسلمانوں کے لیے زیادہ نمائندگی کا مطالبہ کیا۔ گورنر جنرل کی مجلس عاملہ (Executive Council) میں بھی لیگ نے اکثریتی فرقہ کے برابر نمائندگی کا مطالبہ کیا۔ 1908ء کے امرتسر اجلاس میں مسلم لیگ کے مطالبات سے اس کی فرقہ وارانہ ذہنیت کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جماعت صرف اعلیٰ اور متوسط طبقوں کی نمائندہ تھی۔ لیگ نے مسلمانوں کے ہنر مند طبقے کے لیے نوکریاں اور عہدے حاصل کرنے کی بھی جدوجہد کی۔ مسلم لیگ کی سیاسی سرگرمیاں غیر ملکی حکمرانوں کی بجائے ہندؤں اور قومی کانگریس کے خلاف تھیں۔ لیگ کے سکریٹری نے اعلانیہ کہا کانگریس سے کسی قسم کا سیاسی اتحاد ممکن نہیں، چوں کہ ان کے اور کانگریس کے درمیان کوئی مشترکہ سیاسی مقاصد نہیں پائے جاتے۔'

مسلم لیگ تمام تعلیم یافتہ مسلم دانشور طبقے کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ قوم پرست مسلمان بھی اس کے فرقہ وارانہ کردار کو ناپسند کرنے لگے۔ حتیٰ کہ مسٹر جناح بھی کئی برس تک لیگ کی فرقہ وارانہ پالیسی کی مخالفت کرتے تھے۔ 1910ء میں ہوئے کانگریس کے الٰہ آباد اجلاس میں جناح نے فرقہ وارانہ نمائندگی کے نظام کی مذمت میں ایک قرارداد پیش کی۔ اس قرارداد کی تائید مولانا مظہر الحق نے کی جو کہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ نواب سید محمد، مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد نے نہ صرف لیگ سے کوئی ربط رکھنے سے انکار کیا بلکہ لیگ کی فرقہ وارانہ پالیسی اور اس کی حکومت سے وفاداری کے رویے پر اعتراض کیا۔ ترقی پسند مسلم لیڈران جیسے کہ سید وزیر حسین، حسن امام اور حکیم اجمل خاں لیگ کے مخالفین میں تھے۔

7.8 لکھنؤ معاہدہ کا سبب بننے والے واقعات (Events Leading to the Lucknow Pact)

مورلے منٹو اصلاحات کے پیش کیے جانے کے بعد کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن کے سبب لیگ کانگریس سے قریب تر ہو گئی۔ تقسیم بنگال کی منسوخی نے انگریزوں پر لیگ کے بھروسہ کو متزلزل کر دیا۔ محمد علی کے بموجب 'ہندوؤں کے احتجاج اور مہم کے زیر اثر تقسیم بنگال کی تنسیخ نے مسلمانوں پر یہ واضح کر دیا کہ برطانوی حکومت سے تعاون کر کے امیدیں باندھنا ٹوٹی ہوئی شاخ پر جھولنے کے برابر ہے۔' مزید یہ کہ مسلم لیگ کا صدر دفتر علی گڑھ سے لکھنو منتقل کر دیا گیا تھا جس نے مسلم لیگ پر علی گڑھ کالج کے پرنسپلوں کے اثرات کم کر دیے۔ نئے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے غیر جانبدارانہ پالیسی اپنائی۔ یوروپ کی مسلم ریاستوں کے تئیں برطانیہ کے رویہ کے سبب مسلمانوں کی وفاداری کو شدید دھچکا لگا۔ محمد علی اس بارے میں لکھتے ہیں 'مسلمانوں کی جانب سے ہندوؤں کی مخالفت میں انگریزوں سے تعاون کرنا ایک فطری تحریک تھی لیکن ترکی، ایران اور مراقش کے دشمنوں کے ساتھ جیسا معاملہ انگریزوں نے رکھا، اس کے سبب 1911ء ہی سے مسلمانوں کی ہمدردیاں برطانیہ کے ساتھ نہیں رہیں۔' مسلم لیگ کو کانگریس کے قریب کرنے کا سب سے اہم سبب ترک اطالوی جنگ اور بلقان جنگوں کے دوران ترکی کے تعلق سے انگلینڈ کی پالیسی تھی۔ ہندوستانی مسلمان توقع رکھتے تھے کہ انگلینڈ، ترکی کی حمایت کرے گا لیکن انہیں مایوسی ہوئی۔ انہیں محسوس ہوا کہ انگریز مسلمانوں کے سچے دوست نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ چند روشن خیال لیڈر جیسے محمد علی، شوکت علی اور جناح یہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ انگریزوں کی خدمت گزاری کی پالیسی ترک کر کے جدوجہد آزادی میں شریک ہو جائے۔ نتیجتاً مسلم

لیگ نے اپنی پالیسی تبدیل کر کے کانگریس سے خوشگوار تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی۔ 1913ء کے لکھنؤ اجلاس میں لیگ کے مقاصد میں واضح تبدیلی نظر آئی۔ حکومت سے وفاداری کی پالیسی کی جگہ تاج برطانیہ کے تحت ہندوستان کی حکومت خود اختیاری کے اصول نے لے لی۔

7.9 لکھنؤ معاہدہ (The Lucknow Pact, 1916)

1913ء کے کانگریس اجلاس نے لیگ کے رویے میں اس خوشگوار تبدیلی کا خیر مقدم کیا اور کانگریسی رہنماؤں نے، مسلم لیگ کے مثالی نظریے 'برطانوی سلطنت کے تحت ہندوستان کی خود مختار حکومت' کو سراہا اور قومی اتحاد کو فروغ دینے اور ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان تعاون اور بھائی چارگی قائم کرنے کے سلسلے میں مسلم لیگ کی کوششوں کی تعریف کی۔ 1915ء میں لیگ کا سالانہ اجلاس بمبئی میں بلایا گیا جس میں کانگریس نے بھی حصہ لیا۔ کانگریسی قائدین کی ایک بڑی تعداد نے مسلم لیگ کے اس اجلاس میں شرکت کی۔ جن میں گاندھی، مالویہ، سروجنی نائیڈو اور کئی دیگر رہنما شامل تھے۔ کانگریس کے صدر ایس۔ پی سنہا اور مسلم لیگ کے صدر مظہر الحق نے تبادلہ خیال کیا۔ 1916ء میں کانگریس اور لیگ نے ایک ہی مقام لکھنؤ میں اپنے اجلاس منعقد کیے۔ اس قربت کے نتیجے میں 1916ء میں لکھنؤ کے مشہور کانگریس لیگ سمجھوتے پر دستخط ہوئے۔ تلک اور جناح نے کانگریس اور مسلم لیگ میں اتحاد قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

لکھنؤ معاہدہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ہندوستان کے مستقبل کے دستور پر ہونے والا پہلا اور واحد مکمل معاہدہ تھا۔ اس معاہدہ کے مطابق کانگریس کو علاحدہ مسلم نشستوں کے لیے راضی ہونا پڑا حالانکہ نشستوں کا تناسب ان کی آبادی کے مقابلے زیادہ تھا۔ کانگریس اس بات پر بھی رضامند ہوئی کہ مسلم طبقے کو متاثر کرنے والا کوئی بھی بل قانون ساز اسمبلی میں منظور نہیں کیا جائے گا اگر اس فرقے کے تین چوتھائی افراد اس کی مخالفت کریں۔ مسلمانوں کو ہندو اکثریت والے صوبوں میں یہ تحفظ دیا گیا۔ گو کہ لکھنؤ معاہدہ کئی معنوں میں آگے کی جانب ایک قدم تھا بالخصوص اس نے مسلم لیگ اور کانگریس کو ایک مقصد کی خاطر جمع کیا۔ پھر بھی بپن چندرا کہتے ہیں کہ 'مسلمانوں کے لیے علاحدہ نشستوں کو قبول کرتے ہوئے کانگریس نے رسمی طور پر فرقہ واریت کو قبول کر لیا۔ سب سے بڑھ کر یہ معاہدہ اس مفروضہ پر مبنی تھا کہ ہندوستان مختلف طبقات پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک کے مفادات مختلف ہیں۔ چنانچہ اس نے ہندوستانی سیاست میں فرقہ واریت کے عروج کا راستہ ہموار کر دیا۔'

لکھنؤ معاہدہ میں فرقہ واریت کے اصول پر راضی ہونے کی بنا پر کانگریس کو تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ درحقیقت اس کا مفہوم یہ تھا کہ کانگریس نے ہندوستانی سماج میں فرقہ واریت کو ایک حقیقت کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ تاہم تاریخی تناظر میں کانگریس نے اسے ایک چھوٹی برائی کے طور پر قبول کیا کیوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان چل رہی رسہ کشی (کیوں کہ دونوں متضاد سمتوں میں جا رہے تھے) آزادی کی جدوجہد کو ناممکن بنا رہی تھی۔ کانگریس کو توقع تھی کہ اس معاہدہ کے طے پانے کے بعد مسلم لیگ جدوجہد آزادی میں کانگریس کے ساتھ شامل ہو جائے گی جس سے ملک میں اتحاد اور بھائی چارے میں اضافہ ہوگا مگر بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ کانگریس کا خیال غلط تھا۔ فرقہ واریت کا مطالبہ جب ایک بار مان لیا گیا تو مستقبل کی ہر دستوری اسکیم میں اسے دہرایا جاتا رہا۔ جیسا کہ 1919ء یا پھر 1935 کی

اصلاحات۔ لکھنؤ معاہدہ کے ذریعے بنایا گیا ہندو مسلم اتحاد نہ صرف مختصر بلکہ ایک سراب ثابت ہوا۔ آنے والے برسوں میں کانگریس فرقہ وارانہ نمائندگی سے انکار یا اس کی مخالفت نہیں کر سکی اور اسی کے سبب ہندوستان تقسیم ہو گیا۔

7.10 ہندو مہاسبھا (The Hindu Mahasabha)

ہندو مہاسبھا تحریک کی جڑیں پنجاب کی غالب تجارتی و مذہبی ثقافت میں پوشیدہ ہیں۔ انگریزوں کی جانب سے اٹھائے گئے کئی اقدامات جیسے مردم شماری کا ڈاٹا اور مسلمانوں کا علاحدہ حلقہ انتخاب منظور کرنا، ہندوؤں کے فرقہ وارانہ خطوط پر متحرک ہونے کا ذریعہ بنی۔ نوآبادیاتی ریاستی مردم شماری جسے 1871ء میں شروع کیا گیا تھا، اس نے ہندوؤں پر ایک خصوصی اثر چھوڑا۔ اس مردم شماری نے پنجاب میں ہندو آبادی میں مستقل کمی کا انکشاف کیا۔ 1891ء میں یہ 43.8 فیصد تھا جو 1911ء میں گھٹ کر 36.3 فیصد ہو گیا تاہم اس عرصہ میں مسلم اور عیسائی آبادی میں اضافہ دکھایا گیا۔ 1911ء کی مردم شماری کے مطابق 1901ء سے 40 ہزار ہندوؤں نے اسلام اور 12 ہزار ہندوؤں نے عیسائیت قبول کر لی۔ اس سے ہندوؤں کے درمیان خطرہ کی گھنٹی بجنے لگی اور ہندو رہنماؤں نے ہندوؤں کے ساتھ کھڑے ہونے اور ہندوستان میں مسلمانوں سے ان کے وجود کو لاحق خطرہ سے مذہبی بنیاد پر ان کے دفاع کا عہد کیا۔

پنجاب میں آریہ سماج نے بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے ہندو شعور کو مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ 1906ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام نے پنجاب کے شہروں میں مختلف ہندو سہایک سبھاؤں کی تشکیل کا کام تیز کر دیا۔ مقامی آریہ سماجی رہنماؤں نے ان کے قیام کا کام اپنے ذمہ لیا۔ رام بھاج دتا، ایک آریہ سماجی نے لاہور میں 1906ء میں حکومت کی جانب سے مسلمانوں کی تائید کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ہندو سہایک سبھا کی بنیاد ڈالی۔ اس نے 'ہندو سیاست' کے فروغ کی اپیل کی۔ 4 اگست 1906ء کو ممتاز آریہ سماجی اور ہندو سنگھی رہنماؤں جیسے لالا لاجپت رائے، شادی لال، لالہ ہنس راج، راج بھاج دتا اور دیگر نے ہندو سبھا قائم کی جس کا مقصد ہندوؤں کی اخلاقی، ذہنی اور مادی حالات میں سدھار لانا تھا۔ تاہم پنجاب میں ہندو سبھا تحریک کے پیچھے سب سے پر زور قوت بہادر لال چند (1852–1912) کی تھی جو کہ ایک اہم آریہ سماجی لیڈر اور لاہور کے جج تھے۔ 1909ء میں لال چند نے لالہ لاجپت رائے کے اخبار 'پنجابی' میں 15 مضامین کی ایک سیریز لکھی۔ ان مضامین کا عنوان تھا 'Self-Abnegation in Politics' (سیاست میں خود کی دستبرداری) جو کہ بعد میں اسی عنوان سے 1938ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ اس کتاب میں دو قومی نظریہ کا ہندو مماثل ملتا ہے۔ وہ کانگریس کے ملی جلی قومیت کے نظریہ کے سخت خلاف تھے۔ ان کے مطابق، 'حب الوطنی فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہونی چاہیے نہ کی صرف جغرافیائی بنیادوں پر۔'

ہندو شعور کی بیداری کے اس پس منظر میں 1909ء میں پنجاب ہندو سبھا کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد 'ہندو طبقات کے مفادات کا تحفظ' تھا۔ ایم ایم مالویہ نے اکتوبر 1909ء میں اس کے پہلے اجلاس کی صدارت کی۔ سبھا نے 21 اور 22 نومبر کو پہلی صوبہ پنجاب ہندو کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں پنجاب، متحدہ صوبجات اور شمالی ہندوستان سے 3 ہزار رہنماؤں نے شرکت کی۔ کانفرنس میں ان رہنماؤں نے ہندوؤں کی گھٹتی تعداد، مسلمانوں کے مقابلے ہندوؤں کو طاقتور بنانے، ہندوؤں ایک علاحدہ قومی اور ممتاز قوم تصور کرنے، مسلم لیگ کے

بڑھتے اثرات سے ہندو مفادات کو لاحق خطرات، برطانوی حکومت کے تقسیمی رویہ وغیرہ پر بات کی۔ کانفرنس نے بالخصوص کانگریس پر تنقید کی اور اس پر ہندو مفادات کے تحفظ میں ناکام ہونے کا الزام عائد کیا۔ اس نے 'ہندو مرکوز سیاست' پر زور دیا۔ 1909ء سے 1914ء تک پنجاب ہندو سبھا نے پنجاب میں پانچ کانفرنسیں کیں۔

1910ء کے بعد سے کل ہند ہندو ایسوسی ایشن بنانے کی کاوشیں شروع ہوئیں۔ پنجاب ہندو سبھا نے 8 دسمبر 1913ء کو امبالا میں منعقدہ اپنے پانچویں اجلاس میں آل انڈیا ہندو سبھا کی تشکیل کی قرارداد منظور کی۔ بالآخر ہندو علاحدگی پسندوں کی مسلسل کاوشوں کی بناپر اپریل 1915ء میں ہردوار میں کمبھ میلے کے موقع پر ہندوؤں کی آل انڈیا کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس ہی میں آل انڈیا ہندو سبھا (سروادیشک ہندو سبھا) کی بنیاد پڑی۔ قاسم بازار کے مہاراجہ منندرا چندرا نندی، نے اس کانفرنس کی صدارت کی۔ 1921 میں اس کا چھٹا اجلاس ہردوار کے مقام ہی پر منعقد ہوا اور اس کا نام بدل کر آل انڈیا ہندو مہا سبھا رکھ دیا گیا۔

7.10.1 ہندو مہاسبھا کے مقاصد (Objectives of the Hindu Mahasabha)

1. ہندوؤں کے درمیان 'اتحاد اور اتفاق' پیدا کرنا۔
2. ہندو کمیونٹی میں تعلیم کو فروغ دینا۔
3. ہندو کمیونٹی کے تمام طبقات کی اصلاح کرنا۔
4. 'جہاں اور جب بھی ضروری ہو' ہندو مفادات کا تحفظ کرنا۔
5. ہندو اور ہندوستان کے دیگر طبقات کے درمیان بہتر تعلقات پیدا کرنا اور ان کے ساتھ دوستانہ انداز میں پیش آنا اور حکومت کے ساتھ 'وفاداری پر مبنی تعاون' کرنا۔
6. بالعموم اپنی کمیونٹی کے 'مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی مفادات' کے فروغ کے لیے اقدامات کرنا۔

ہندو مہاسبھا نے 'ہندو اتحاد و اتفاق' پر زور دیا اور برطانوی حکومت کی وفادار رہی۔ شمالی ہندوستان یعنی یوپی، بہار، دہلی اور پنجاب میں ایک مضبوط قوت بن کر ابھری۔ 1926ء کے آخر تک ہندو مہاسبھا نے پورے ملک میں 362 شاخیں قائم کرلیں۔ جنوبی ہند میں اس کا زیادہ اثر ورسوخ نہیں تھا۔ مدن موہن مالویہ (1861–1948) جو ایک کانگریسی تھے اور دو مرتبہ (1909ء اور 1918ء) کانگریس کے صدر رہے، 24-1922ء میں ہندو مہاسبھا کے پہلے صدر بنے۔ لالہ لاجپت رائے (1965–1928) اور (26–1925) کے دوران ہندو مہاسبھا کے صدر رہے۔ بی ایس مونجے نے 1927–1933 کے درمیان اس کی قیادت کی۔ ان کے بعد بھائی پرمانند (–1948 1947) اس کے صدر بنے۔ وی ڈی ساورکر نے 1937ء میں اس کی قیادت کی۔

'تمام ہندوؤں' کے مفادات کے تحفظ کا دعویٰ کرنے والی ہندو مہاسبھا نے 1909ء کے انڈین کونسل ایکٹ کے تحت مسلمانوں کو دیے گئے علاحدہ انتخابی حلقے کی مخالفت کی۔ ہندو سبھا کے جنرل سکریٹری شادی لال نے اپریل 1909ء میں یہ کہتے ہوئے وائسرائے لارڈ منٹو

کے پاس عرضداشت داخل کی کہ حکومت مسلمانوں کے تئیں نرم رویہ اختیار کر رہی ہے اور انہوں نے اس بات پر احتجاج کیا کہ 'مسلمانوں کی حد سے زیادہ نمائندگی' انصاف و دیانت کے خلاف ہے۔ ہندو سبھا کے رہنماؤں نے ہندو جذبات کا استحصال کرتے ہوئے ہندوؤں کی گھٹتی تعداد اور ہندو نسل کی معدومیت پر تشویش کا اظہار کیا۔ یو این مکھرجی کا اشتعال انگیز پمفلٹ 'ہندو: ایک ختم ہوتی قوم' نے بتایا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی بڑھتی تعداد کی بنا پر ہندو آئندہ 420 سال میں ختم ہو جائیں گے۔ سوامی شردھانند (1857-1926) ایک مشہور ہندو عوامی لیڈر تھے۔ انہوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں پر حملہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ 'تشدد، طاقت اور دھوکہ' سے ہندوؤں کا مذہب بدل رہے ہیں۔ اس طرح کے پروپیگنڈہ نے ہندو اور مسلمانوں میں موجودہ خلیج کو مزید بڑھاوا دیا۔

ہری دوار میں 1921 میں منعقدہ چھٹے اجلاس میں سبھا نے اپنے دستور میں تبدیلی کرتے ہوئے 'متحدہ اور خود کی حکومت' کو آئیڈیل بنا کر پیش کیا اور 'وفاداری' کا لفظ نکال دیا۔ اپنے ایک خصوصی اجلاس میں اس نے عدم تعاون اور سودیشی کو اپنے پروگراموں کا مرکز بنایا۔ تاہم وہ عوامی سیاست میں داخل نہیں ہوئی۔ تحریک عدم تعاون کے دور میں ہندو مہاسبھا سرگرم نہیں رہی۔ مالویہ نے دسمبر 1922ء میں گیا کے اجلاس میں فکری بنیادوں پر تنظیم کو دوبارہ شروع کیا۔ 1923ء میں منعقدہ مہاسبھا کا بنارس اجلاس انتہا پسندانہ قوم پرستی کے ظہور کا اشارہ تھا۔ عدم تعاون کے مختلف پہلو جیسے نئی کونسلوں کا بائیکاٹ، سرکاری نوکریوں سے استعفیٰ وغیرہ پر سبھا کی حیثیت متضاد رہی۔

لاجپت رائے نے عدم تعاون کو 'غیر عملی' بتاتے ہوئے اس کی مخالفت کی۔ انہوں نے کہا کہ کونسلوں کا بائیکاٹ صوبوں کے لیے لازمی نہیں ہے۔ راجا رام پال سنگھ نے یہ کہتے ہوئے تحریک کو رد کر دیا کہ ہندوؤں کے مفادات کا تحفظ 'اعلیٰ قسم کی حب الوطنی' ہے۔ گو کہ مالویہ نے پہلے 1920 کے الیکشن سے دستبرداری اختیار کر لی، انہوں نے اس کے باقی مراحل میں عدم تعاون کی مخالفت کی۔ 1923ء کے بعد ان کا سیاسی کیریر کافی کامیاب ہوا۔ ان کے مطابق عدم تعاون ہندو مفادات کے لیے نقصان دہ تھا۔ انہوں نے اسکول اور کالج کے بائیکاٹ کو 'تعلیمی خودکشی' بتایا۔ مالویہ اس بات پر برہم تھے کہ مسلمانوں کی خاطر ہندو سیاست دانوں کو قانون ساز کونسلوں کے بائیکاٹ کے لیے کہا جا رہا ہے اور 'برسوں کی سیاسی محنت سے حاصل کی گئی کامیابیوں' کو قربان کیا جا رہا ہے۔ مالویہ کے بیشتر ساتھیوں نے عدم تعاون پروگرام کی مخالفت کی اور نومبر و دسمبر 1920ء کے الیکشن میں قانون ساز کونسلوں میں داخل ہوئے۔ بی ایس مونجے اور ایم جئیکر نے کونسلوں کے بائیکاٹ کی گاندھی کی اپیل مسترد کر دی اور مستعفی ہونے سے انکار کر دیا۔ راجا نریندر ناتھ جو پنجاب ہندو سبھا کے سکریٹری تھے نے بائیکاٹ کی پروا کیے بغیر پنجاب قانون ساز کونسل کے انتخابات میں حصہ لیا اور کانگریس پر 'ہندو مفادات' سے پہلو تہی کا الزام لگایا۔ ان کا ماننا تھا کہ عدم تعاون کے درمیان حاصل کیا گیا ہندو مسلم اتفاق غیر عملی تھا۔

ہندو مہاسبھا نے انڈین نیشنل کانگریس کی پیش کردہ متحدہ قومیت کے تصور کی مخالفت کی۔ مہاسبھا نے مسلمانوں کو ہندو قوم سے 'الگ' تصور کیا۔ مالویہ کے مطابق مسلم 'بیرونی حملہ آور' تھے۔ بی ایس مونجے نے کہا کہ صرف برطانوی حکومت کے خلاف ہی آزادی کی تحریک چلانا کافی نہیں ہے بلکہ اسے مسلمانوں کے خلاف بھی چلانا چاہیے۔ انہوں نے ہندوستان کو ہندوؤں کے گھر میں تبدیل کرنے کی بات کی۔ سوامی شردھانند کے خیال میں اسلام 'قتل و غارت گیری، چوری، غلامی اور بے راہ روی و جنسی رویوں' کا مذہب تھا۔ انہوں نے ہندوؤں کو

مسلمانوں سے الگ رہنے، مسلم تہواروں میں شریک نہ ہونے، مسلم مزاروں کا دورہ نہ کرنے اور مسلم علما کی پیروی نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ وی ڈی ساورکر کا ماننا تھا کہ مسلمان ہندوستان کے وفادار نہیں ہو سکتے اور وہ اسے 'مسلم ریاست' میں بدلنے کا ایک خفیہ ایجنڈہ لے کر کام کر رہے ہیں۔ ایم ایس گولوالکر کے مطابق مسلم ہندوستان کے لیے ایک 'اندرونی خطرہ' ہیں اور انہوں نے ہزاروں سال کے لیے ہندوستان کو غلام بنا کر رکھنے کا منصوبہ تیار کیا ہوا ہے اور اسلام ہندوستان میں ایک 'تباہ کن' قوت ہے۔ بھائی پرمانند نے کہا کہ مسلمان، ہندوؤں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے مذہبی فریضہ سے بندھے ہوئے ہیں۔ ہندو مہاسبھا کے جنرل سکریٹری اشوتوش لہری کے مطابق ہندوستان میں رہنے والے تمام مسلمان 'سچے قوم پرست' نہیں ہیں۔ پنڈت آتمارام نے علی گڑھ سے بیان دیا کہ مسلمان 'گوکشی کے ذمہ دار' ہیں اور انہیں 'ہندوستان سے باہر بھگا دینا چاہیے۔' انہوں نے ہندوؤں سے درخواست کی کہ وہ مسلمانوں کی داڑھی اور مونچھ نوچ ڈالیں اور ان کے دکانات و مکانات کو آگ لگا دیں۔ ہندو مبصرین نے یہ کہتے ہوئے ہندوؤں کو خوفزدہ کیا کہ اگر آریہ سماج کام نہیں کرے گی تو ہندوستان سے گائے غائب ہو جائے گی اور گائتری کی جگہ کلمہ لے لے گا۔ بھائی پرمانند کے مطابق مسلمان، انگریزوں سے اپنے تعلقات اور 'اپنے علاحدہ مطالبات و سازشوں' کی بنا پر برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد میں ہندوؤں کی راہ میں حائل ہو چکے ہیں۔ ہندو قوم پرستوں کا احساس تھا کہ مسلمان قوم پرست نہیں ہو سکتے کیوں کہ قوم پرستی ان کی 'بنیادی نوعیت' کی بنا پر 'بیرونی' ہے۔

جب 1915ء میں کمبھ میلہ کانفرنس میں آل انڈیا ہندو سبھا قائم کی گئی تو گاندھی وہاں موجود تھے اور انہوں نے اس کے قیام کی سخت مخالفت کی۔ ہندو مہاسبھا کے کئی ارکان، کانگریس سے بھی وابستہ تھے اور اس طرح دوہری رکنیت کے اصول کو برقرار رکھا گیا لیکن یہ معاملہ مسلم لیگ کے ساتھ نہیں تھا۔ کانگریس پر ہندو مہاسبھا کا اتنا زیادہ اثر تھا کہ ایک کانگریسی سوشلسٹ کے ایم اشرف نے مہاسبھائیوں پر کانگریس میں اہم عہدوں پر قبضہ کرنے اور آگرہ، اودھ، علی گڑھ، بدایوں، بندیل کھنڈ، یوپی میں کانگریس استقبالیہ کمیٹیاں جوائن کرنے کی اجازت پر احتجاج کیا۔ جب فرقہ وارانہ تنظیمیں اپنی شدت پسندی کی علامات دکھانا شروع کر رہی تھیں 16 دسمبر 1938ء کو کانگریس نے ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ کو 'فرقہ وارانہ جماعتیں' قرار دیتے ہوئے بلیک لسٹ کر دیا اور کانگریس ارکان پر اس طرح کی جماعتوں میں 'دوہری رکنیت' لینے پر پابندی عائد کر دی۔

7.11 ہندو مسلم تعلقات (Hindu–Muslim Relations)

1923 میں کاکی ناڈا میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے محمد علی نے مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ متحد ہو جائیں۔ یہ اتحاد پین اسلامک مقاصد کی تکمیل میں ان کا مددگار ثابت ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ برطانوی پالیسی یہ ہے کہ اسلامی مقاصد کی مخالفت کی جائے۔ ان کی اپیل کا فرقہ وارانہ سیاست پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ قدیم فرقہ وارانہ ذہنیت کی تجدید میں دونوں فرقوں کے درمیان آئے دن چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھڑپیں ہونے لگیں۔ 1920ء میں مالابار، آگرہ اور دوسرے کئی مقامات پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان انتہائی افسوسناک واقعات پیش آئے۔ کئی مقامات جیسے لکھنو اور الہ آباد میں شدید نوعیت کا فرقہ وارانہ تصادم ہوا۔ اس طرح کے فرقہ وارانہ فسادات نے باہمی عدم اعتماد میں اضافہ کیا اور ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات مزید خراب ہو گئے اور فرقہ وارانہ جماعتیں

اس فرقہ وارانہ فضا کا فائدہ اٹھانے لگیں۔ ہندو سنگھٹن تحریک نہ صرف ہندوؤں کے مفادات کے تحفظ کے لیے جمع ہوئیں بلکہ چند نام کے مسلم گروہوں کو ہندوؤں میں واپس لینے کا دعویٰ کیا۔اس دعویٰ کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں میں 'تبلیغ' اور 'تنظیم' تحریکات شروع ہوئیں۔ ہر ایک نے دوسرے کے فیصلے کو شک کی نظر سے دیکھنا شروع کیا۔اس طرح ملک میں فرقہ واریت کی فضا قائم ہوتی چلی گئی جس نے ہندو مسلم اتحاد کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔

7.12 مسلم لیگ کا احیا (Revival of the Muslim League)

1922ء میں تحریک عدم تعاون سے اچانک دستبرداری اور 1924ء میں مصطفی کمال پاشاہ کی جانب سے خلافت کو ختم کرنے کے اعلان سے انگریزوں کے خلاف لڑرہے تمام مسلمانوں کو اچانک جھٹکہ لگا۔ان کے سامنے اچانک ایک سیاسی خلا پیدا ہو گیا۔وہ بے تابی سے کسی لیڈر کا انتظار کرنے لگے جو انہیں سر گرم سیاست میں شامل کرے۔اس سے مسلم لیگ کے احیا کی صورت پیدا ہوئی جو پچھلے کچھ عرصہ سے غیر فعال تھی۔اس کی سر گرمیاں جو پچھلے چار سال سے معطل تھیں، صدر محمد علی جناح کی قیادت میں مئی 1924ء میں لاہور میں ہونے والی میٹنگ کے بعد دوبارہ شروع ہوئیں۔اس اجلاس میں مسلم لیگ نے 'سوراج کو تیزی سے حاصل کرنے' کا اعلان کیا۔اس نے ہندوستان میں بننے والی کسی بھی دستور میں شامل کرنے کے لیے چند 'بنیادی اصول' بھی وضع کیے۔ مسلم لیگ نے ہندوستان کے لیے خود مختار صوبوں کے ساتھ وفاقی دستور کا مطالبہ کیا جس میں مرکزی حکومت کے کام کاج۔ عمومی مسائل تک محدود کردیے گئے تھے۔اس نے قانون ساز مجالس اور دیگر میں 'مناسب اور موثر نمائندگی' کی ضمانت اور اس وقت رائج 'علاحدہ انتخابی حلقوں' کے نظام کو جاری رکھنے کا مطالبہ کیا۔فرقہ کو متاثر کرنے والا کوئی بھی بل قانون ساز اسمبلی میں منظور نہیں کیا جائے گا اگر اس کمیونٹی کے تین چوتھائی افراد اس کی مخالفت کریں۔ مسلم لیگ نے تمام عوامی جماعتوں سے فرقہ وارانہ تناؤ کم کرنے کی اپیل کی اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔لیگ کے مطابق سوراج کے حصول کے لیے بین فرقہ جاتی اتحاد ضروری تھا اور اس نے تمام فرقہ وارانہ مسائل کے پرامن حل کے لیے مصالحتی مجالس کے قیام کا مطالبہ کیا۔جناح نے ہندو مسلم اتحاد سے متعلق قرارداد پیش کرنے اور اسے منظور کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔

7.13 فرقہ ورانہ فسادات (Communal Riots)

تحریک عدم تعاون سے دستبرداری کے بعد سے ہندوستان کی سیاسی فضاء شدید نوعیت کے فرقہ وارانہ فسادات کے سبب مکدّر ہو گئی۔ یہ ایک المیہ تھا کہ سات صدیوں سے ہندو مسلمان مل جل کر ساتھ ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود چند گہری سماجی، سیاسی اور مذہبی وجوہات کے سبب ابھی تک یہ دو علاحدہ اکائیوں کی حیثیت برقرار رکھے ہوئے تھے۔دونوں فرقوں کے کئی نمایاں رہنماؤں نے اختلافات کے ان اسباب کو دونوں فرقوں کی آپسی تعلقات اور سمجھوتے کی مدد سے ختم کرنے کی کوشش کی۔1921ء میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی تاکہ انڈین نیشنل ایکٹ تیار کیا جا سکے۔ڈاکٹر انصاری اور لالہ لاجپت رائے نے اس کا مسودہ تیار کیا اور اسے 1923ء میں پیش کیا۔اسی اثنا میں سی۔آر۔داس کی تحریک پر بنگال کانگریس کمیٹی نے بنگال کے لیے ایک ہندو مسلم ایکٹ منظور کیا۔ایکٹ میں علاحدہ حلقہ انتخاب کے ذریعے آبادی کے بنیاد پر

مجلس قانون ساز میں نمائندگی کی گنجائش رکھی گئی۔ مقامی اداروں میں نمائندگی ہر ڈسٹرکٹ میں 60:40 کے تناسب سے رکھی گئی۔ 60 اکثریتی فرقے کے لیے اور 40 اقلیتی فرقہ کے لیے، سرکاری عہدوں کا 55 فیصد مسلمانوں کو دیا جائے، مسجدوں کے سامنے کسی طرح کا گانا بجانا نہ ہو۔ مگر یہ ایکٹ جس پر لمبے مباحث ہوئے کانگریس کے کھلے اجلاس میں شکست سے دوچار ہو گیا۔

مئی 1923ء میں کلکتہ میں بدترین فساد پھوٹ پڑا جب کہ ایک آریہ سماجی جلوس نے مسجد کے سامنے گانا بجانا شروع کیا۔ فسادات کئی دن تک جاری رہے اور دونوں فرقوں کے کئی لوگ مارے گئے۔ 1924ء میں بقر عید کے موقع پر فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جن میں سے بدترین فساد دہلی میں ہوا۔ ناگپور میں سڑکوں پر لڑائی شروع ہو گئی۔ جبل پور اور دوسرے شہروں کا بھی یہی حال رہا۔ فوج کی جانب سے فائرنگ کے بعد ہی امن بحال ہو سکا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں جو کہ نمایاں طور سے ایک مسلم علاقہ ہے کوہاٹ کے مقام پر بدترین فساد ہوا۔ گڑبڑ اس وقت ہوئی جب کہ سناتن دھرم سبھا نے ایک پمفلٹ جاری کیا۔ جس میں ایک مخالف اسلام نظم شامل تھی۔ شہر کے ہندوؤں پر حملے کیے گئے اور پولیس ان حملوں کو روکنے میں ناکام ہو گئی۔ اس المیہ کی دکھ بھری داستان انڈین نیشنل کانگریس ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ کے لیے بحث کا موضوع بن گئے۔ اکتوبر 1924ء میں رام لیلا کے دوران الہ آباد میں ایک فساد پھوٹ پڑا جس میں 12 لوگ ہلاک ہو گئے۔ اسی سال لکھنؤ شہر امین آباد پارک میں نماز کے مسئلہ پر ایک بڑا فساد برپا ہوا۔ 1925ء تا 1926ء میں ہندو مسلم تعلقات میں مزید بگاڑ پیدا ہوتا چلا گیا۔ اس دوران تقریباً 30 فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ جن میں سے زیادہ تر یوپی اور بنگال میں ہوئے۔ فرقہ وارانہ نفرت کی فضا اتنی زیادہ تھی کہ 23 دسمبر 1926ء کو دہلی میں عبدالرشید نے سوامی شردھانند کو قتل کر دیا اور مسلم پریس نے رشید کو غازی قرار دیا۔ 1927ء میں بدری شاہ اور بھیراؤ سنگھ جیسے آریہ سماج کے قائدین بہرائچ اور ماؤنٹ ابو میں قتل کر دیے گئے۔ 1926ء میں موتی لال نہرو، ابوالکلام آزاد نے ایک منشور پیش کیا جس میں تجویز دی گئی کہ انڈین نیشنل یونین کے نام سے ایک غیر فرقہ وارانہ تنظیم قائم کی جائے، مگر یہ تنظیم قائم ہی نہیں کی جا سکی۔ اسی سال بنگال کونسل کے غیر سوراجی مسلم ارکان کو لے کر سر عبدالرحیم نے بنگال مسلم پارٹی قائم کی۔ انہوں نے اپنے اس اقدام کا جواز یہ پیش کیا کہ ہندوستان کی تقریباً تمام سیاسی پارٹیاں کسی نہ کسی طرح فرقہ وارانہ کردار کی حامل ہیں۔ دونوں فرقوں کے درمیان خلیج کو پاٹنے کی کانگریس اور اعتدال پسندوں کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ ان اختلافات کا یقینی اثر ملک کی سیاست اور جدوجہد آزادی پر پڑا۔

7.14 محمد علی جناح (Mohammad Ali Jinnah)

1906ء میں بحیثیت بیرسٹر ہندوستان لوٹنے کے بعد محمد علی جناح (1876-1948) نے انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور 1906ء میں کلکتہ میں منعقدہ کانگریس کے اجلاس میں دادابھائی نوروجی کے سکریٹری کی ذمہ داری نبھائی۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ وہ مسلم لیگ کی تشکیل کے مخالف تھے۔ لیگ کے صدر آغا خان کے الفاظ میں جناح نے کہا تھا کہ 'علاحدہ انتخابی حلقوں کا ہمارا مطالبہ خود ملک کو ہی تقسیم کرنے کا باعث بن رہا ہے۔' جیسا کہ 1906ء سے وہ قومی اتحاد کے درپے تھے، سروجنی نائیڈو نے جناح کو 'ہندو۔ مسلم اتحاد' کا سفیر قرار دیا۔ گو کہ جناح نے 1913ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی انہوں نے علاحدہ حلقہ انتخاب کی مخالفت کی کیوں کہ ان کے خیال میں اس سے ملک کی تقسیم کا اندیشہ تھا۔ تاہم ایک قابل ذکر تبدیلی ہوئی؛ اس کے بعد انہوں نے بھی مسلمانوں کے نمائندے کی

حیثیت سے بات کرنی شروع کردی۔ تاہم وہ اب بھی قوم پرستی اور سیکولر سیاست سے وابستہ تھے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ جناح نے کانگریس اور مسلم لیگ کو ایک جگہ لانے اور لکھنؤ معاہدہ کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ رولٹ بل کی منظوری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے قانون ساز اسمبلی سے مستعفی ہوگئے۔

جناح نے 1924ء میں لیگ کا احیا کیا اور اس سال لاہور میں ہونے والے اس کے اجلاس کی صدارت کی۔ 1927ء میں انہوں نے لیگ کے ایک بڑے حصہ کو علاحدہ انتخابی حلقوں کے خلاف قائل کر لیا اور مسلم مفادات کے تحفظ کے لیے چند اقدامات اٹھائے۔ انہیں 'دہلی پیشکش' کہا جاتا ہے۔ تاہم علاحدہ انتخابی حلقوں کے سوال پر لیگ تقسیم ہوگئی اور سر محمد شفیع کے گروپ نے علاحدہ انتخابی حلقوں سے دستبرداری کی مخالفت کی۔ کچھ عرصہ میں جناح کے زیر اثر گروہ ختم ہوگیا اور دیگر لوگ بھی ان کے ہمنوا بن گئے۔ 1929ء میں دہلی میں منعقدہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی جانب سے جناح نے 'چودہ نکات' وضع کیے جو کئی سال تک لیگ اور دیگر جماعتوں میں مشاورت کی بنیاد بنے رہے۔ اہم مطالبات یہ تھے:

1. مستقبل کا دستور وفاقی طرز کا ہوگا جس میں صوبوں کو ان کے مستحقہ اختیارات دیے جائیں گے۔ تمام صوبوں کو ایک جیسی خود مختاری عطا کی جائے گی۔
2. ملک کی تمام مجالس قانون ساز اور منتخبہ اداروں میں اقلیتوں کو مناسب اور مؤثر نمائندگی دی جائے گی۔
3. علاحدہ حلقہ انتخاب کے ذریعے مسلمانوں کے فرقہ وارانہ گروہ کی حیثیت سے نمائندگی کی جائے گی۔
4. کوئی بھی از سرِ نو علاقائی تقسیم کسی بھی صورت میں شمال مغربی سرحدی صوبے پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کے موقف کو متاثر نہیں کرنی چاہیے۔ سندھ کو بمبئی پریسڈنسی سے علاحدہ کیا جائے۔
5. تمام فرقوں کو مکمل مذہبی آزادی عطاء کی جائے۔ دستور میں مسلم تمدن، تعلیم، زبان اور پرسنل لاء کے تحفظ کے لیے مناسب حفاظتی دفعات فراہم کی جائیں۔
6. چاہے مرکزی ہو یا صوبائی مقننہ اس کے ایک تہائی 3/1 ارکان مسلم اقلیت سے لیے جانے چاہیے۔

جناح، علی برادران، محمد شفیع اور دوسرے مسلم رہنماؤں نے پہلی گول میز کانفرنس کی تجویز کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ کانفرنس میں مسلم نمائندے، صحیح معنوں میں فرقہ کی نمائندگی کرنے والے ہونے چاہیے۔ انہوں نے واضح کیا کہ قوم پرست مسلمانوں کے لیے میٹنگ میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ حکومت نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ چوں کہ یہ ان کی پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی پالیسی سے میل کھاتی تھی۔ پہلی گول میز کانفرنس میں تقریباً سبھی ممتاز مسلم لیڈر شریک ہوئے۔ انہوں نے کھلے الفاظ میں اعلان کیا کہ کوئی ایسا دستور جس میں مسلم مفادات کا مناسب تحفظ مہیانہ کیا گیا ہو وہ ان کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں ہے اور یہ کہ صرف مسلم قائدین ہی اس بات کے اہل ہیں کہ مجوزہ تحفظات کے کارآمد ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں فیصلہ کرسکیں۔ کانفرنس نے اس مطالبہ کو کم و بیش تسلیم کر ہی لیا۔ دوسری گول میز کانفرنس میں مسلم لیگ سے کوئی سمجھوتہ کرنے کی گاندھی کی ہر کوشش ناکام ہوگئی اور آخر کار برطانیہ کے وزیر اعظم میکڈونالڈ کی ثالثی کی

ضرورت آن پڑی۔ 16 اگست 1932 کو اس کی جانب سے دیا گیا کمیونل ایوارڈ، لیگ کی ایک فتح تھی۔ اس نے عملی طور پر اس کو تسلیم کر لیا جسے سائمن کمیشن نے بھی غیر منصفانہ کہا تھا۔ کمیونل ایوارڈ کے ذریعے نہ صرف مسلمانوں بلکہ سکھوں اور اینگلوانڈین کے لیے بھی علاحدہ حلقہ انتخاب مقرر کیے گئے اور پسماندہ فرقوں کے لیے خصوصی نشستیں فراہم کی گئیں۔

پونا معاہدہ کے بعد 1932ء میں ایک یونٹی کانفرنس الہ آباد میں منعقد کی گئی۔ دستوری مسائل پر تمام نمایاں اختلافات پر سمجھوتے کی غرض سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ کمیٹی نے جوائنٹ حلقہ انتخاب پر اتفاق کیا بشرطیکہ یہ دفعہ رکھی جائے کہ ایسا کوئی امیدوار کامیاب نہیں قرار دیا جائے گا جسے اپنے ہی فرقے کے ڈالے گئے ووٹوں کا کم از کم 30 فی صد نہ حاصل ہوا ہو۔ مرکزی مقننہ میں 32 فی صد مسلم نمائندگی منظور کی گئی۔ قبل اس کے کہ کمیٹی اپنی تجاویز کا اعلان کرتی، برطانوی حکومت نے مسلمانوں کے لیے مرکزی مقننہ میں 33 فی صد (3/1) ایک تہائی نشستوں کا اعلان کر دیا اور ایک علاحدہ سندھ صوبے کا بھی فیصلہ کر دیا۔ پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی اس برطانوی پالیسی اور جناح کے رویے سے یہ ظاہر ہو گیا کہ برطانوی حکمرانی میں ہندو مسلم اتحاد ہونا ناممکن ہے۔ اس دور میں فرقہ واریت کے فروغ کے سبب تقسیم ہند ہی ایک منطقی پیش رفت نظر آنے لگا تھا۔ کسی وقت 'ہندو مسلم اتحاد کے سفیر' رہنے والے جناح، 1930ء کے عشرے کے اواخر اور 1940ء کے عشرے کی ابتدا میں اتنے فرقہ پرست ہو گئے کہ ان کے کچھ بیانات غور کرنے کے قابل ہیں۔ 1938ء میں مسلم لیگ سے صدارتی خطاب کرتے ہوئے انہوں کہا کہ 'کانگریس اس ملک میں ہندو راج قائم کرنے کے لیے کوشاں تھی۔' مارچ 1940ء میں انہوں نے علی گڑھ کے طلبا سے کہا کہ 'گاندھی مسلمانوں کو ہندو راج کے تحت غلام بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔' مارچ 1941ء میں علی گڑھ میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ 'پاکستان نہ صرف ایک عملی مقصد ہے بلکہ اگر آپ اس ملک میں اسلام کو مٹنے سے بچانا چاہتے ہیں تو یہی واحد مقصد ہے۔' 1946ء میں مسلمانوں سے لیگ کو ووٹ دینے کی اپیل کرتے ہوئے انہوں نے دھمکی دی کہ 'اگر ہم آج اپنا فرض پہچاننے میں ناکام ہو جاتے ہیں، تو آپ شودر بن کر رہ جائیں گے اور اسلام ہندوستان سے ختم ہو جائے گا۔'

تصویر۔ محمد علی جناح

(Jaswant Singh, Jinnah: India-Partition-Independence, Rupa, New Delhi, 2009.)

تصویر۔ محمد علی جناح (جوانی میں)

(Jaswant Singh, Jinnah: India-Partition-Independence, Rupa, New Delhi, 2009.)

اس طرح مسلم فرقہ پرستوں نے 'اسلام خطرے میں ہے' کا نعرہ لگا کر عام مسلمانوں کو اپنے اطراف جمع کر لیا جس طرح ہندو فرقہ پرستوں نے ہندوؤں کو مشتعل کرنے کے لیے 'ہندو مذہب خطرے میں ہے' کا نعرہ لگایا تھا۔ بالآخر دونوں ہی جانب کے فرقہ پرست، بدترین فرقہ وارانہ فسادات اور ملک کی تقسیم کے ذریعے سب سے بڑے انسانی المیے کا سبب بنے جہاں سرحد کے دونوں جانب موجود آبادیوں کو ہجرت کرنی پڑی۔ اور آج بھی فرقہ واریت ہمارے سامنے ایک چیلنج بن کر کھڑی ہوئی ہے

7.15 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ سمجھ چکے ہونگے کہ فرقہ واریت بنیادی طور پر ایک نظریہ ہے اور یہ جدید دور کی دین ہے۔ نوآبادیاتی دور میں کئی عوامل نے اس کے ابھرنے، پھیلنے اور مضبوط ہونے میں ہاتھ بٹایا۔ اب آپ ان عوامل جیسے مسلمانوں میں تعلیمی پسماندگی، نوآبادیاتی معیشت کے مخصوص اوصاف، نوکریوں کے لیے مقابلہ، ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ سے لڑانے کی انگریزوں کی پالیسی، ہندوستانی تاریخ بطور خاص ہندوستانی عہد وسطیٰ کی غلط سمجھ، انتہا پسند قوم پرستوں میں شدید ہندو رنگ وغیرہ مسلمانوں کے اعلی اور متوسط طبقہ میں علاحدگی پسندی کا سبب بنے۔ جس طرح مسلم لیگ نے تمام مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کا دعویٰ کیا، ٹھیک ویسے ہی ہندو مہاسبھا نے تمام ہندوؤں کے مفادات کی حفاظت کرنے کے بلند بانگ دعوے کیے۔ اس کے رہنما مسلمانوں کے شدید دشمن تھے۔ دونوں طرح کی فرقہ واریت ہولناک فرقہ وارانہ فسادات کا سبب بنی۔ 1920 کے عشرے میں بڑھتا ہوا فرقہ وارانہ تناؤ ملک بھر میں فسادات کے سلسلے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ 1938ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ دونوں کو فرقہ وارانہ جماعتیں قرار دیتے ہوئے پابندی عائد کردی۔ کانگریس ارکان کی ان میں حصہ لینے پر پابندی لگادی گئی۔ جناح جنہیں ایک وقت 'ہندو مسلم اتحاد کا سفیر' کہا جاتا تھا 1930 کے عشرے کے آخر میں شدید فرقہ پرست بن گئے اور پاکستان کے خواب کی تعبیر کے حاصل ہونے تک مسلم لیگ کی قیادت کی۔

7.16 کلیدی الفاظ (Keywords)

فرقہ واریت : فرقہ واریت بنیادی طور پر ایک نظریہ (ideology) ہے۔ یہ ایک جدید نظریہ ہے اور ایک طرح سے برطانوی پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ کسی نظریہ کو اپنے آپ کے، دوسرے کے یا بڑے پیمانے پر سماج کے بارے میں ، ادراک، خیالات اور افکار کے ایک مجموعے کے طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

دوہری رکنیت : ایک ہی وقت میں کانگریس اور کسی دوسری فرقہ پرست تنظیم کا رکن یا ممبر ہونا۔

اشراف مسلمان : مسلمانوں میں اپنے آپ کو حسب و نسب سے اعلیٰ تصور کرنے والا طبقہ جو ہمیشہ اپنے مفاد کے لیے تمام مسلمانوں کی وکالت کا دعویٰ کرتا تھا اور پس پردہ اپنے مفاد کے لیے کام کرتا تھا۔

7.17 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

7.17.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. *The Indian Musalmans* کے مصنف کون ہیں؟
2. مرکزی قومی انجمن محمدی(‘Central National Mohammedan Association’) کس نے قائم کی؟
3. تقسیم بنگال کس سال میں ہوئی؟
4. مسلم لیگ کہاں قائم کی گئی؟
5. سوامی شردھانند کو کس نے قتل کیا؟
6. مسلمانوں کو کس نے ’اندرونی خطرہ‘ تصور کیا؟
7. جناح کب مسلم لیگ میں شامل ہوئے؟
8. جناح کو ’ہندو مسلم اتحاد کا سفیر‘ کس نے بتایا؟
9. علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کس سال میں قائم ہوا؟
10. بااثر پمفلٹ ***Hindus: A Dying Race*** کس نے لکھا؟

7.17.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. جناح کے ’چودہ نکات‘ کے اجزا کیا تھے؟
2. ہندوستانی تاریخ میں لکھنؤ معاہدہ کی اہمیت پر نوٹ لکھیے۔
3. آپ برطانوی حکومت کے تئیں سرسید کے وفادار رویہ کی توجیہہ کس طرح کریں گے؟
4. فرقہ وارانہ تناؤ اور فسادات سے نمٹنے کے لیے قوم پرست لیڈرشپ نے کیا اقدامات کیے؟
5. ہندوستان کی مسخ شدہ تاریخ نے کس طرح فرقہ وارانہ نظریہ کی تخلیق میں مدد دی؟

7.17.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. فرقہ واریت کے پھیلنے میں ہندو مہاسبھا کے کردار کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
2. فرقہ واریت کے فروغ میں مسلم لیگ کے کردار پر ایک تنقیدی نوٹ لکھیے۔
3. آپ کے خیال میں فرقہ واریت اچھی ہے یا بری؟ کیوں؟ آپ نے جو کچھ دیکھا ہے یا دوسروں سے سنا ہے اس کی روشنی میں مثالیں دیجیے۔

7.18 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, Hyderabad, 2004.
2. Bapu, Prabhu, *Hindu Mahasabha in Colonial North India*, *1915–1930*: *Constructing Nation and History*, Routledge, Abingdon, Oxon, 2013.
3. Batabyal, Rakesh, *Communalism in Bengal*: *From Famine to Noakhali, 1943–47*, Sage, New Delhi, 2005.
4. Becker, Mary Louise, *The All-India Muslim League,1906–1947*: *A Study in Leadership in the Evolution of a Nation*, Oxford University Press, Karachi, 2013.
5. Bolitho, Hector, *Jinnah*: *Creator of Pakistan*, Surjeet Publications, Delhi, 2005.
6. Chandra, Bipan, *Communalism in Modern India*, Vikas Publishing House, Ltd., New Delhi, 1996 (First Pub. in 1984).
7. Hasan, Mushirul, *Nationalism and Communal Politics in India 1885–1930*, Manohar, New Delhi, 2000 (first pub. 1991).
8. Ikram, S.M., *Indian Muslims and Partition of India*, Atlantic Publishers, New Delhi, 1992.
9. Jawed, Ajit, *Jinnah*: *Secular and Nationalist*, Kitab Publishing House, New Delhi, 1998.
10. Lelyveld, David, *Aligarh*'*s First Generation: Muslim Solidarity in British India*, Oxford University Press, New Delhi, 2003 (First Pub. in 1978).
11. Mathews, Roderick, *Jinnah Vs. Gandhi*, Hatchet India, 2012.
12. Misra, Salil, *A Narrative of Communal Politics*: *Uttar Pradesh*, *1937–39*, Sage, New Delhi, 2001.
13. Puniyani, Ram, *Communal Politics*: *Facts versus Myths*, Sage, New Delhi, 2003.
14. Renold, Leah, *A Hindu Education*: *Early Years of the Banaras Hindu University*, Oxford University Press, New Delhi, 2005.
15. Sarkar, Sumit, *Modern India* (*1885–1947*), Macmillan, New Delhi, 2005 (first pub. 1983).
16. Singh, Jaswant, *Jinnah*: *India, Partition, Independence, Rupa & Co.,* New Delhi, 2009.
17. Venkat, Dhulipala, *Creating a New Medina*: *State Power, Islam, and the Quest for Pakistan in Late Colonial North India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2015.
18. Wells, Ian Bryant, *Ambassador of Hindu–Muslim Unity*: *Jinnah's Early Politics*, Permanent Black, Delhi, 2005.
19. Wolpert, Stanley, *Jinnah of Pakistan*, Oxford University Press, New Delhi, 1985.

اکائی 8۔ ہندو مہاسبھا

(The Hindu Mahasabha)

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید
8.1 مقاصد
8.2 ہندو مہاسبھا
8.2.1 پس منظر
8.2.2 کل ہند ہندو مہاسبھا کا قیام
8.2.3 سنگٹھن
8.2.4 سوامی شردھانند
8.2.5 وی ڈی ساورکر اور ہندوتوا کا اظہار
8.2.6 ہندو مہاسبھا کے مقاصد
8.2.7 ہندو مہاسبھا کے صدور
8.3 مہاسبھا کی سرگرمیاں
8.3.1 علاحدہ حلقہ انتخاب کی مخالفت
8.3.2 عدم تعاون پر اختلاف
8.3.3 دو قومی نظریے کی حمایت
8.4 ہندو مسلم تعلقات
8.5 فرقہ ورانہ فسادات
8.6 اکتسابی نتائج

8.7 کلیدی الفاظ
8.8 نمونہ امتحانی سوالات
8.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید (Introduction)

ہندو قوم پرستی جدید ہندوستانی سیاست کی ایک جانی پہچانی خصوصیت بن چکی ہے۔ خاص طور پر بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں اور اکیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں کے دوران، اس نے جمہوریہ ہند میں ریاستی اقتدار کی اعلیٰ ترین سیاست میں اپنے آپ کو ایک مرکزی کردار کے طور پر قائم کیا ہے، جو بعض پارٹیوں کے عروج اور سیاسی ترقی کے بعض تصورات کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہندو قوم پرستی ایک سیاسی نظریہ کے طور پر ابھری۔ اس کی سیاسی نمائندگی اس کے ابتدائی دور میں ہندو سبھائیں کرتی تھی جو بعد میں ایک کل ہند ہندو مہاسبھا میں جا کر مل گئیں اور اس طرح 1915 میں 'سرودیشک ہندو سبھا' وجود میں آئی جس کا نام بعد میں بدل کر ہندو مہاسبھا رکھ دیا گیا۔ اس اکائی میں بیسویں صدی کے شروعاتی دور کے نوآبادیاتی شمالی ہندوستان میں ہندو مسلم تنازعہ کے کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندو اتحاد اور تنظیم کی مہم پر بحث کی گئی ہے۔ اس اکائی میں وضاحت کی گئی ہے کہ مہاسبھا نے ملک میں مسلمانوں کے ساتھ تنازعہ کے سلسلے میں ہندو قوم پرست نظریہ کو ہندوؤں کے درمیان ایک علیحدہ ہندو سیاسی شناخت اور اتحاد قائم کرنے کے ایک ذریعہ کے طور پر استعمال کیا۔ انتہائی نظریاتی مخالفت کے سبب انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ مہاسبھا کی ہونے والی کشمکش پر توجہ دینا لازمی ہے جس کا سبب یہ ہے کہ مہاسبھا کی نظریاتی توجہ ہندوستان کی آزادی کے لیے برطانوی مخالف جدوجہد کے بجائے مسلم دشمنی پر تھی، جس سے ملک میں ہندو مسلم نمائندگی پر مذاکرات کے دوران مشکلات میں اضافہ ہوا۔ اس اکائی کے مطالعے سے آپ جانیں گے کہ مہاسبھا کی ایک محدود طبقاتی اور علاقائی بنیاد تھی اور وہ اپنے لیے ایک عوامی تحریک کی راہ میں زیادہ کچھ اضافہ کرنے سے قاصر تھی، لیکن اس نے متعدد مقبول مہموں میں شمولیت کے علاوہ ایک نیم فوجی بازو تیار کیا۔ ہم اس اکائی میں مہاسبھا کے ابتدائی دور میں ہندو قوم پرستی کی نشو ونما اور ارتقاء پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ہندوستانی تاریخ میں اس کے کردار پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

8.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندو مہاسبھا کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ہندو مہاسبھا کے ابھرنے کے اسباب سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہندو مہاسبھا کی سرگرمیوں پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- مہاسبھا اور فرقہ پرستی کی عروج میں اس کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- موجودہ حالات میں مذہبی بنیاد پر ابھرنے والی سیاست کو سمجھ سکیں گے۔

8.2 ہندومہاسبھا (The Hindu Mahasabha)

8.2.1 تاریخی پس منظر (The Historical Context)

ہندومہاسبھا تحریک کی جڑیں پنجاب کی غالب تجارتی و مذہبی ثقافت میں پوشیدہ ہیں۔انگریزوں کی جانب سے اٹھائے گئے کئی اقدامات جیسے مردم شماری کاڈاٹااور مسلمانوں کا علاحدہ حلقہ انتخاب منظور کرنا، ہندوؤں کے فرقہ وارانہ خطوط پر متحرک ہونے کاذریعہ بنے۔ نوآبادیاتی ریاستی مردم شماری جسے 1871ء میں شروع کیا گیا تھا،اس نے ہندوؤں پر ایک خصوصی اثر چھوڑا۔اس مردم شماری نے پنجاب میں ہندوآبادی میں مستقل کمی کا انکشاف کیا۔ 1891ء میں یہ 43.8 فیصد تھی جو 1911ء میں گھٹ کر 36.3 فیصد ہوگئی۔ تاہم اس عرصے میں مسلم اور عیسائی آبادی میں اضافہ دکھایا گیا۔ 1911ء کی مردم شماری کے مطابق 1901ء سے لے کر 1911 تک 40ہزار ہندوؤں نے اسلام اور 12 ہزار ہندوؤں نے عیسائیت قبول کرلی۔اس سے ہندوؤں کے درمیان خطرہ کی گھنٹی بجنے لگی اور ہندو رہنماؤں نے ہندوؤں کے ساتھ کھڑے ہونے اور ہندوستان میں مسلمانوں سے ان کے وجود کو لاحق خطرہ سے مذہبی بنیاد پر ان کے دفاع کا عہد کیا۔

پنجاب میں آریہ سماج نے جو ایک ہندو مذہبی اصلاحی تحریک تھی، بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے شدھی اور سنگھٹن کے ذریعے ہندوشعور (Hindu Consciousness) کو مستحکم کرنا شروع کردیا۔ 1906ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام نے پنجاب کے شہروں میں مختلف ہندو سبھا یک سبھاؤں کی تشکیل کا کام تیز کردیا۔ مقامی آریہ سماجی رہنماؤں نے ان کے قیام کا کام اپنے ذمہ لیا۔ایک آریہ سماجی رام بھاج دتانے 1906ء میں لاہور میں برطانوی حکومت کی جانب سے مسلمانوں کی حمایت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ہندو سبھا یک سبھا کی بنیاد ڈالی۔اس نے 'ہندوسیاست' کے فروغ کی اپیل کی۔ 4اگست 1906ء کو ممتاز آریہ سماجی اور ہندو سبھائی رہنماؤں جیسے لالہ لاجپت رائے، شادی لال، لالہ ہنس راج، راج بھاج دتا اور دیگر نے ہندوسبھا قائم کی جس کا مقصد ہندوؤں کی اخلاقی، ذہنی اور مادی حالات میں سدھار لانا تھا۔تاہم پنجاب میں ہندوسبھا تحریک کے پیچھے سب سے پرزور قوت بہادر راؤ بہادر لال چند(1852–1912) جو کہ ایک اہم آریہ سماجی لیڈر اور لاہور کے جج تھے۔ 1909ء میں لال چندنے لالہ لاجپت رائے کے اخبار 'پنجابی' (*Punjabee*) میں 15 مضامین کی ایک سیریز لکھی۔ان مضامین کا عنوان تھا 'Self-Abnegation in Politics' (سیاست میں خود سے دستبرداری) جو کہ بعد میں اسی عنوان سے 1938ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔اس کتاب میں دو قومی نظریہ کا ہندو مماثل ملتا ہے۔ وہ کانگریس کے ملی جلی قومیت کے نظریہ کے سخت خلاف تھے۔ان کے مطابق، 'حب الوطنی، فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہونی چاہیے نہ کہ صرف جغرافیائی بنیادوں پر۔'

ہندو شعور کی بیداری کے اس پس منظر میں 1909ء میں لال چند اور یواین مکرجی (Upendranath Mukerji) کے ہاتھوں پنجاب ہندوسبھا کا قیام عمل میں آیا۔ سبھا کے مطابق یہ کوئی فرقہ وارانہ تنظیم نہیں تھی بلکہ ایک ہمہ گیر تحریک تھی جس کا مقصد تمام ہندو برادری کے مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔ سبھا نے 21اور22 نومبر کو پہلی 'صوبہ پنجاب ہندو کانفرنس' (Punjab Provincial Hindu Conference) کا انعقاد کیا جس میں پنجاب، متحدہ صوبجات اور شمالی ہندوستان سے تقریباً 3ہزار رہنماؤں نے شرکت کی اور

صدارت سر پرفل چندر چٹرجی (Sir Praful Chandra Chatterji) نے کی۔ کانفرنس میں ان رہنماؤں نے ہندوؤں کی گھٹتی تعداد، مسلمانوں کے مقابلے ہندوؤں کو طاقتور بنانے، ہندوؤں کو ایک علاحدہ اور ممتاز قوم تصور کرنے، مسلم لیگ کے بڑھتے اثرات سے ہندو مفادات کو لاحق خطرات، برطانوی حکومت کے تقسیمی رویہ وغیرہ پر بحث کی۔ پنجاب ہندو کانفرنس نے انڈین نیشنل کانگریس کو ہندو مفادات کا دفاع کرنے میں ناکام ہونے پر تنقید کا نشانہ بنایا اور 'ہندو مرکوز سیاست' کو فروغ دینے پر زور دیا۔ اس کانفرنس میں سبھا کے لیڈروں نے پرزور تجویز پیش کی کہ ہندوؤں کو ایک الگ قومی ریاست (راشٹر) کی ضرورت ہے، اور اس میں مسلمانوں کو کوئی حق نہیں دیا جانا چاہیے۔ 1909ء سے 1914ء تک پنجاب ہندو سبھا نے پنجاب میں پانچ کانفرنسیں کیں۔

8.2.2 کل ہند ہندو مہاسبھا کا قیام (Establishment of the All-India Hindu Mahasabha)

20ویں صدی کے اوائل میں پنجاب میں شروع ہونے والے ہندو اتحاد کے وسیع کام کا ارتقا، کل ہند ہندو سبھا کی تشکیل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اگلے چند سالوں میں پنجاب سے باہر متحدہ صوبجات، بہار، بنگال، مرکزی صوبجات و برار اور بمبئی پریزیڈنسی میں بھی ایسی کئی ہندو سبھائیں قائم ہوئیں۔ 1910 میں کانگریس کے الہ آباد اجلاس میں ایک ہمہ گیر کل ہند ہندو سبھا کے قیام کی باقاعدہ کوشش کی گئی اور اس کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے لالہ بیج ناتھ کی سربراہی میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی، لیکن اس سے زیادہ کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی۔ الہ آباد میں ہندو رہنماؤں کی ایک اور کانفرنس نے بھی 1910 میں کل ہند ہندو سبھا کے قیام کے لیے ابتدائی قدم اٹھایا، لیکن یہ تنظیم باہمی گروہ بندی کی وجہ سے فعال نہ بن سکی۔ 1910ء کے بعد بھی کل ہند ہندو تنظیم بنانے کی کاوشیں ہوتی رہیں۔ آخر کار 8 دسمبر 1913ء کو پنجاب ہندو سبھا نے امبالا میں منعقدہ اپنے پانچویں اجلاس میں کل ہند ہندو سبھا کی تشکیل کی مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی۔

> اس کانفرنس کی پختہ رائے یہ ہے کہ پورے ہندوستان اور دیگر جگہوں پر ہندو برادری کے مفادات کے تحفظ کے اقدامات پر غور و خوض کرنے کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں کی ایک عام کانفرنس ہردوار میں 1915 میں کمبھ کے موقع پر منعقد کی جائے اور یہ مندرجہ ذیل حضرات سے درخواست کرتی ہے کہ اس مقصد کے لیے ضروری انتظامات کریں۔

اس قرارداد کو یاد کرتے ہوئے، مشہور آریہ سماجی رہنما سوامی شردھانند نے نوٹ کیا کہ 'ملک کے تمام حصوں سے ہندو رہنماؤں کو کمیٹی میں نامزد کیا گیا تھا۔ . . . تاہم، پنجاب اور یوپی کے صرف چند کارکنوں نے 1915 کے افتتاحی اجلاس کا اہتمام کیا۔' بہر کیف ہندو علاحدگی پسندوں کی مسلسل کوششوں کی بنا پر اپریل 1915ء میں ہری دوار میں کمبھ میلے کے موقع پر ہندوؤں کی آل انڈیا کانفرنس منعقد کی گئی۔ اسی کانفرنس میں 'سرواد یشک (کل ہند) ہندو سبھا' (Sarvadeshak Hindu Sabha) کی بنیاد رکھی گئی۔

اپنے ابتدائی مرحلے کے دوران اس کل ہند تنظیم کا تصور ایک ایسی انجمن کے طور پر کیا گیا تھا جو تنظیم کی نوآبادیاتی تعریف کے مطابق علامتی انداز میں 'ہندو برادری' کی نمائندگی کرے گی۔ یہ اس برادری کے اسے ہندو برادری کے کسی خاص فرقے یا فرقوں سے شناخت

کیے بغیر 'ایک مکمل عضو' کے طور پر 'اتحاد اور یکجہتی' کے لیے بھی پر عزم تھی۔ یہ وہی نظریاتی ہم آہنگی تھی جو اس وقت پنجاب سبھا میں عیاں تھی، یہاں بھی دکھنے لگی۔ یہ تنظیم 1920 کی دہائی کے اوائل تک نیم غیر فعال رہی، جس کے بعد عدم تعاون تحریک کے پس منظر میں اس نے سیاست میں زیادہ اہم کردار ادا کرنا شروع کیا۔ دو سال کے وقفے کے بعد اپریل 1921 میں ہردوار میں مہاسبھا کا چھٹا اجلاس ہوا جہاں اس نے خود کو قوم پرست طرز کی تنظیم کے طور پر دوبارہ تشکیل دیا۔ سبھا کا نام بدل کر انڈین نیشنل کانگریس کی طرز پر 'اکھل بھارت (کل ہند) ہندو مہاسبھا' (Akhil Bharat Hindu Mahasabha) رکھ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سبھا نے اپنے دستور میں تبدیلی کرتے ہوئے 'متحدہ اور خود کی حکومت' کو مقصد بنا کر پیش کیا اور برطانوی حکومت سے 'وفاداری' کا لفظ نکال دیا۔

1922 میں گیا کے اجلاس، جس کی صدارت مدن موہن مالویہ نے کی، تنظیم کو گاؤں کی سطح تک پھیلانے کے لیے تمام صوبوں میں سبھا کے قیام کے مقصد سے ایک انتظامی کمیٹی بنا کر سبھا کی شبیہ کو مزید واضح کیا گیا۔ اس کے علاوہ، فرقہ وارانہ فسادات میں ہندو مفادات کے تحفظ کے لیے مقامی رضاکار گروپ بنانے کا مطالبہ سامنے رکھا گیا۔ اگرچہ ان قراردادوں کو عام طور پر عملی اقدامات کی حمایت حاصل نہیں تھی، لیکن انہوں نے کم از کم مہاسبھا میں ایک نئی فکری تغیر پسندی کی نشاندہی کی۔ یہی وہ تغیر پسندی تھی جس نے ہندو تنظیم کے نظریے کے ایک مربوط اظہار کے طور پر 'سنگٹھن تحریک' کے ابھرنے کی بنیاد رکھی۔ مہاسبھا نے اس کے اظہار کے لیے ڈھانچہ فراہم کیا اور اگست 1923 میں بنارس میں ہونے والا اس کا اگلا اجلاس، تحریک کی رفتار طے کرنے میں بہت اہم تھا۔

8.2.3 سنگٹھن (Sanghathan)

1920 کی دہائی میں ایک الگ تحریک کے طور پر سنگٹھن کا پہلا شعوری اظہار تلاش کرنا مشکل ہے۔ یقینی طور پر 1923 میں مہاسبھا کے اجلاس کے دوران پریس، خاص طور پر مالویہ کے *Leader* (ایک جریدہ) نے بار بار ہندوؤں کو انتہائی منظم ہونے کی ضرورت کا حوالہ دیا: 'ہندوؤں کے لیے اب اپنے آپ کو منظم کرنے کے سوا کچھ نہیں بچا ہے... انہیں بحیثیت برادری اپنے لیے احترام پیدا کرنا چاہیے اس سے پہلے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ معقول اور مساوی شرائط پر اتحاد کر سکیں۔ ان کا پہلا فرض، اپنے مفاد میں، ملک کے مفاد میں اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے بھی، یہ ہے کہ وہ منظم ہوں، منظم ہوں، منظم ہوں۔' تاہم، فوری ضرورت کا صرف ایک شدید احساس اس بیان کو ہندو تنظیم کے نظریے کی سابقہ مثالوں سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ پہلے ہی واضح کیا جا چکا ہے کہ 1909 کی لاہور کانفرنس پر کس طرح یہ خیال غالب تھا۔ اس کی ایک اور مثال دہلی میں مہاسبھا کے 1918 کے اجلاس میں رام پال سنگھ کے صدارتی خطاب سے ملتی ہے۔ ہندو برادری کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ: 'ہم نے ان اعلیٰ نظریات کو کھو دیا ہے جو ہمارے اسلاف کے دلوں کو دھڑکاتے اور جوش دلاتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم غیر منظم اور منتشر ہیں۔ یہ ہندو سبھا کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہماری برادری کے بکھرے ہوئے اجزا کو منظم اور متحد کرے اور سب کی بہتری کے لیے ذرائع وضع کرے، تاکہ ہم پھر سے اسی شان اور تہذیب کے عروج پر پہنچ سکیں جو ہمارے آباؤاجداد نے حاصل کی تھی۔'

تاہم، تنظیم کی یہ اپیل کب سنگٹھن تحریک کے تصور میں کب بدل گئی، یہ واضح نہیں ہے۔ پرکاش بتاتے ہیں کہ یہ خیال مالویہ نے ستمبر

1922 میں ملتان میں ہونے والے فسادات کی کانگریس کی انکوائری کے دوران پیش کیا تھا۔ دیگر شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا ارتقا صرف 1923 کے اوائل میں شروع ہونے والی اس مہم کے ساتھ مل کر ہوا تھا جس میں یوپی کے آگرہ ضلع میں لکانہ راجپوتوں کے نام سے مشہور برائے نام مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کو شدھی کے ذریعے دوبارہ ہندو مذہب میں لایا گیا تھا۔ یہ اہم شدھی مہم، آریہ سماج اور خاص طور پر گروکل تعلیمی تحریک کے انتہاپسند رہنما، سوامی شردھانند کے اثر و رسوخ کی نشاندہی کرتی ہے۔

8.2.4 سوامی شردھانند (Swami Shraddhanand)

مہاسبھا کے ساتھ شردھانند کی شمولیت نسبتاً حالیہ تھی۔ 1917 میں سنیاس لینے کے بعد سے وہ تیزی سے سیاست میں شامل ہوتے چلے گئے تھے۔ انہوں نے 1919 میں دہلی میں رولٹ ستیہ گرہ اور عدم تعاون کی تحریک میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ اس پورے عرصے میں انہوں نے اچھوتوں کے مسئلے کو قوم پرست ایجنڈے میں شامل کرنے کی کوشش کی، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ بنیادی طور پر عدم تعاون کی تباہ کن مہم کا ایک بہترین تعمیری جواب ہے۔ اس مسئلے کو عملی طور پر حل کرنے میں کانگریس کی واضح جھجک، شردھانند کے آخر کار مرکزی دھارے والی قوم پرست سیاست کو چھوڑنے کا بنیادی سبب بنی۔ انہوں نے 1923 کے اوائل میں کہا، 'میں نے اسے اپنی باقی زندگی کا واحد مشن بنالیا ہے۔'

1923 میں جا کر ہی، شردھانند پورے دل سے ہندو مہاسبھا میں چلے گئے۔ مہاسبھا میں اُن کی شمولیت کی بڑی وجہ چھوا چھوت سے نمٹنے کا اُن کا پختہ عزم تھی، حالانکہ یہ مقصد 1923 کے دوران فروری کے بعد ملکانہ شدھی مہم سے شدید وابستگی کی وجہ سے حاشیے پر چلا گیا۔ 1923 کے موسم گرما کے دوران، جب انہوں نے شدھی مہم کی حمایت حاصل کرنے کے لیے پنجاب اور یوپی کا دورہ کیا، شردھانند نے سنگھٹن کے نظریے اور مہاسبھا کے ذریعے اس کے فروغ پر زور دیا۔ انہوں نے یہاں سنگھٹن کو آریہ تہذیب کی قدیم شان کو دوبارہ زندہ کرنے اور ہندوؤں کے ذریعے مالا بار اور ملتان کے بحرانوں میں دکھائی جانے والی کمزوری کی علامات کا مقابلہ کرنے کی تحریک کے طور پر بیان کیا۔

اس تمام دور میں زیادہ یقینی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ دراصل ہندو مہاسبھا کس مقصد کے لیے کھڑی تھی، سوائے اس بات کے کہ وہ قدیم عظمت و شان حاصل کرنے اور حالیہ مسائل سے پیدا ہونے والی کمزوری کو دور کرنا اپنا مقصد قرار دیتی تھی۔ اس نظریے کا اظہار شردھانند کے پمفلٹ *Hindu Sangathan: Saviour of the Dying Race* میں بخوبی ہوتا ہے، جس میں وہ اس کا واحد حل سنگھٹن بتاتے ہیں۔ اس سنگھٹن کی خصوصیات، ورن آشرم دھرم، برہم چریہ اور گروکل نظام تعلیم بیان کی گئی ہے جس کا حصول اور چھوا چھوت کے خاتمے کا ایک طریقہ 'سماج مندر' یا 'ہندو راشٹر مندر' ہے جسے شردھانند کے مطابق ہر شہر میں بنایا جانا چاہیے۔ ان کے نزدیک یہ اتنا بڑا تو ہونا ہی چاہیے کہ اس میں 25000 افراد ایک ساتھ آسکیں۔

شدھی اور سنگھٹن کی اس تحریک میں شرھانند کا مقابلہ مہاسبھا کے دوسرے دھڑے 'سناتنیوں' سے ہوا جو کہ ذات پات کے نظام کے خاتمے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس طرح مہاسبھا میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ ۱۔ آریہ سماجی۔ ۲۔ سناتنی۔ شرھانند کو اپنی شدھی کی تحریک میں

تعاون حاصل کرنے کے لیے کئی بار سناتنیوں سے سمجھوتہ کرنا پڑا۔ 1923 کے بنارس اجلاس میں انہوں نے مہاسبھا کے سامنے تین تجاویز رکھیں۔ پہلی اچھوتوں کے تعلق سے تھی کہ انہیں کنویں، تالاب استعمال کرنے کی رعایت دی جائے۔ دوسری ملکانہ راجپوتوں کی شدھی کے ذریعے گھر واپسی کو صحیح قرار دینے کی تھی۔ تیسری شدھی کو تبدیلی مذہب کا جائز طریقہ تسلیم کرنے کی تھی یعنی صلاحیت کے حساب سے ورن تسلیم کرنا تھی۔ ان میں سے پہلی تجویز کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ دوسری میں ملکانہ راجپوتوں کی شدھی کو صحیح مان کر انہیں اصلی ورن یعنی راجپوت میں شامل کر لیا گیا۔ تیسری تجویز 75 پنڈتوں کی ایک کمیٹی کے سپرد کی گئی، جنہوں نے 1924 کے ایک مخصوص اجلاس میں کافی غور و خوض کے بعد اسے ماننے سے انکار کر دیا اور اچھوتوں تک شدھی کو لے جانے سے روک دیا گیا۔

یہ سنگھٹن تحریک کے ایک پہلو کے طور پر آریہ سماج کی حالت زار کا اشارہ ہے۔ یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح 1909 کی ہندو کانفرنس کے تناظر میں بھی، پنجابی سماجیوں نے استحکام کے نام پر اصلاح پسندی کو ترک کیا۔ 1920 کی دہائی کے وسط تک، جیسے ہی ملک فرقہ وارانہ فسادات کی ایک بڑی لہر میں الجھ گیا، سماج کسی بھی قیمت پر سنگھٹن کے نظریے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ہندو روایت کی خیالی رواداری پر مبنی کشادہ، افقی اتحاد کا ایسا نظریہ جو تمام فرقوں پر محیط ہو اور ہندو سماج کی تمام سطحوں کے نظریاتی احترام کو ظاہر کرتا ہو، ہندو نمائندگی کا واضح اصول بن گیا۔ اس متعین اصول کی نفی کیے بغیر کسی اختلاف کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بجائے، مہاسبھا نے ہندو مت کی علامات کو فروغ دیا جو اتحاد اور اتفاق رائے کے اس نظریے کی عکاسی کرتا ہے جیسے گائے کا تحفظ، ہندی، سنسکرت اور ناگری کا فروغ، ہندو ثقافت کے ایک پہلو کے طور پر سودیشی کا استعمال، بیواؤں اور نچلی ذات /اچھوت گروہوں کی خدمت (لیکن، ان کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں) وغیرہ۔ اس کے برعکس، منظم ہندو مذہب کی نوعیت سے متعلق متنازعہ مسائل، جیسے شدھی، اور اچھوتوں کا ذات پات والے ہندوؤں سے تعلق وغیرہ کا فیصلہ اس اتحاد کے پیمانوں کے مطابق کیا جاتا تھا۔

اس غالب رویہ کی ایک مثال 1927 میں ہندو سبھا کی مرکزی صوبائی صوبائی کانفرنس نے فراہم کی ہے۔ مرکزی صوبجات کی سبھا نے مہاراشٹر کی غیر برہمن تحریک کو اپنی آغوش میں لینے کی بھرپور کوشش کی اور 1927 میں ایک مضبوط غیر برہمن گروہ نے اجلاس میں شرکت کی۔ ایک ممتاز مہار لیڈر رومن راؤ گھورپڑے نے ذات پات کے خاتمے کا مطالبہ کرتے ہوئے ایک قرارداد پیش کرنے کی کوشش کی۔ مونجے، اجلاس کے صدر لاجپت رائے کی گھورپڑے کو منانے اور قرارداد واپس لینے پر آمادہ کرنے کی کوششوں کا ذکر کرتے ہیں، کہ وہ گھورپڑے کو سمجھاتے ہیں کہ یہ ہندو مہاسبھا کی موجودہ پالیسی کے خلاف ہے جو اپنے اندر ہر طرح کی سوچ اور فکر کو سموئے ہوئے ہے، حالانکہ کانفرنس کو ان کی قرارداد سے پوری ہمدردی ہے۔ گھورپڑے نے ان کی بات مان لی، مونجے نے تبصرہ کیا کہ 'مگر گھورپڑے کے گروپ میں ایک مہار آدمی تھا... جس نے بڑی تعداد میں سامعین کے سامنے اپنی جگہ سے شعلہ بیانی کی لیکن ہم نے ہمدردی جتاتے ہوئے اسے خاموش کرا دیا اور ناخوشگواری سے بچ گئے۔' یہ نچلی ذات کی اصلاح کی طرف مہاسبھا کے نقطہ نظر کی اچھی طرح وضاحت کرتا ہے۔

'بغیر کسی 'ناخوشگواری' کے بھرپور ہمدردی'، یہ ایک ایسا رویہ تھا جس کے ساتھ سوامی شردھانند مطابقت کرنے سے قاصر تھے۔ کچھ مہینے پہلے ہی انہوں نے مہاسبھا سے استعفیٰ دے دیا تھا، اپنے استعفیٰ کے بیان میں تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ 'مہاسبھا، ان سماجی

اصلاحات کے لیے کام کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتی جو ہندو برادری کو مکمل بربادی سے بچانے کے لیے بالکل ضروری ہیں، یہاں تک کہ سبھا اپنے ان اراکین کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتی ہے جو اس فرض کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔' اس وقت تک، شردھانند نے تسلیم کر لیا تھا کہ سنگٹھن کا ان کا تصور مہاسبھا کے ذریعے نافذ نہیں ہو سکتا۔ مہاسبھا کے سنگٹھن کی بنیاد کے طور پر افقی تنظیم کا یہ استحکام علامتی نمائندگی کے ساتھ مسلسل وابستہ تھا۔ 1920 اور 1930 کی دہائیوں کے دوران مہاسبھا نسبتاً غیر منظم تنظیم رہی جس میں مقامی سطح کی بہت کم تنظیم تھی۔ سورت میں 1929 کے اجلاس میں ہر گاؤں اور قصبے میں ہندو سبھاوں کو منظم کرنے کے لیے تیار کردہ قراردادیں منظور کی گئیں، اور تمام ہندو رہنماؤں سے کہا گیا کہ وہ ان جگہوں پر سبھا قائم کریں جہاں اس وقت وہ موجود نہیں ہیں۔ یہ کسی حد تک مبہم اپیلیں تھیں جن کو ابھی تک تنظیمی ترقی کے کسی مخصوص پروگرام کے ذریعے ابھی تک سہارا نہیں دیا گیا۔ اس کے باوجود مہاسبھا نے ہندوستانی سیاسی تناظر میں ہندو تنظیم کو ایک اہم نظریے کے طور پر پھیلانے کے لیے جگہ پیدا کی۔ یہ متوسط طبقے کے ہندوؤں کے لیے فطری محور تھا جو تنظیم کے ان تصورات کو بڑھانا چاہتے ہیں، تاکہ جدید دنیا میں ان کا زیادہ معقول اظہار تلاش کیا جا سکے۔ ہندوتوا کا نظریہ اس اظہار کو سمیٹنے کے لیے تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

8.2.5 وی ڈی ساورکر اور ہندوتوا کا اظہار (V.D. Savarkar and the Articulation of Hindutva)

ونائک دامودر ساورکر (1883-1966) ایک ہندوستانی سیاستدان، کارکن اور مصنف تھے۔ ساورکر نے 1922 میں رتناگیری جیل میں قید رہتے ہوئے ہندوتوا کا ہندو قوم پرست سیاسی نظریہ تیار کیا۔ وہ ہندو مہاسبھا میں ایک سرکردہ شخصیت تھے۔ ان کے پیروکار انہیں ویر یعنی بہادر کے نام سے پکارتے تھے۔ ساورکر نے اپنی سیاسی سرگرمیاں ہائی اسکول کے طالب علم کے طور پر شروع کیں اور پونے کے فرگوسن کالج میں اسے جاری رکھا۔ انہوں نے اور اس کے بھائی نے 'ابھینو بھارت سوسائٹی' کے نام سے ایک خفیہ تنظیم کی بنیاد رکھی۔ جب وہ اپنی قانون کی تعلیم کے لیے برطانیہ گئے تو انہوں نے خود کو انڈیا ہاؤس اور فری انڈیا سوسائٹی جیسی تنظیموں سے منسلک کر لیا اور انقلابی طریقوں سے ہندوستان کی مکمل آزادی کی وکالت کرنے والی کتابیں بھی شائع کیں۔ 1857 کے ہندوستانی بغاوت کے بارے میں انہوں نے جو کتابیں شائع کی تھیں ان میں سے ایک پر برطانوی نوآبادیاتی حکام نے پابندی لگا دی تھی۔

1910 میں، ساورکر کو برطانوی حکومت نے گرفتار کر لیا اور انڈیا ہاؤس کے ساتھ ان کے روابط کی وجہ سے اسے ہندوستان کے حوالے کرنے کا حکم دیا گیا۔ ہندوستان واپسی کے سفر پر، ساورکر نے دخانی جہاز ایس ایس موریا سے فرار ہونے اور فرانس میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کی جب یہ جہاز مارسیلز کی بندرگاہ پر کھڑا تھا۔ تاہم فرانسیسی بندرگاہ کے اہلکاروں نے انہیں پکڑ کر برطانوی حکومت کے حوالے کر دیا۔ ہندوستان واپسی پر، ساورکر کو عمر قید کی سزا سنائی گئی جس کی کل مدت پچاس سال تھی اور انہیں جزائر انڈمان اور نکوبار کی سیلولر جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ 1924 میں ان کی انگریزوں کو معافی کی درخواستوں پر انہیں جیل سے رہا کر دیا گیا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد انہوں نے برطانوی حکومت پر کسی بھی قسم کی تنقید کو عملی طور پر روک دیا۔ 1937 میں رتناگیری ضلع میں اپنی قید سے رہا ہونے کے بعد، ساورکر نے بڑے پیمانے پر سفر کرنا شروع کیا اور ایک زبردست خطیب اور مصنف بن کر ہندو سیاسی اور سماجی اتحاد کی وکالت کی۔ اپنے احمد آباد خطاب میں، انہوں نے دو قومی نظریہ کی حمایت کی۔ ساورکر کی قیادت میں ہندو مہاسبھا نے ہندوستان کے ایک ہندو راشٹر (ہندو قوم) کے تصور کی تائید کی۔

1939 میں، وزارتوں میں بیٹھی انڈین نیشنل کانگریس نے برطانیہ کے ذریعے ہندوستان کو دوسری جنگ عظیم میں بنا پوچھے شامل کرنے پر اجتماعی طور پر استعفیٰ دے دیا۔اس دوران ساورکر کے ماتحت ہندو مہاسبھا نے کئی ریاستوں میں حکومت بنانے کے لیے مسلم لیگ اور دیگر غیر کانگریسی جماعتوں کے ساتھ اتحاد کیا۔ اس کے بعد، گاندھی کی قیادت میں کانگریس نے ہندوستان چھوڑو تحریک کا آغاز کیا جس کا ساورکرنے کا بائیکاٹ کیا۔انہوں نے ایک مراسلہ لکھا جس کا عنوان تھا'stuck to your post'(عہدوں سے چپکے رہو)اور برطانوی جنگی تیاریوں کے لیے ہندوستانیوں کو بھرتی کیا۔ 1948 میں، ساورکر پر مہاتما گاندھی کے قتل میں شریک سازشی کے طور پر الزام لگایا گیا تھا لیکن بعد میں انہیں عدالت نے عدم ثبوت کی بنا پر بری کر دیا تھا۔

حال ہی میں ہندو قوم پرستی کے متعین اصول کے طور پر ہندوتوا (Hindutva) یا ہندو ہونے پر کافی کام کیا گیا ہے۔ یہ تصور، ہندو قوم پرستی کے ثقافتی جواز پر محیط ہے۔اسی وجہ سے ساورکر کی 1923 کی تصنیف *Hindutva: Who is a Hindu?* میں 'ہندو قوم' کے تصور کا مکمل اظہار کیا گیا۔ ایک ہندو قوم پرست 'منشور' کے طور پر 'ہندتوا' کے مکمل اظہار کا یہ پہلا موقع مانا جاتا ہے۔ بلاشبہ، ساورکر کی مختصر کتاب بہت سے ہندو قوم پرستوں کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے، جو ہندو قوم پرستی کے نظریاتی اجزاء کا ایک جامع بیان فراہم کرتی ہے۔اس کے علاوہ،اسے ہندو مہاسبھا کے طویل مدتی مقاصد کو بیان کرنے کے لیے اپنا لیا گیا تھا چونکہ اس کے مصنف کو تقسیم اور آزادی کے دوران سبھا کا سب سے اہم رہنما بننا تھا۔ تاہم موجودہ مطالعہ ہندو قوم پرستی کو ایک بتدریج نظریاتی ترقی کے طور پر پیش کرتا ہے۔ وہ موضوعات جن کی طرف 'ہندوتوا' میں ساورکر بار بار رجوع کرتے ہیں،اب سرحدوں کے مانوس تصور کے گرد گھومتا ہے، جو ہندو مت کی حدود اور بیرونی طاقتوں کے ساتھ اس کے تعلقات کی وضاحت کرتے ہیں۔اس طرح کے تعصبات ہندوتوا کو اس نظریاتی ترقی کی خصوصیت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ہندو قوم کے ساورکر کے تصور سے مسلمان باہر تھے کیونکہ وہ ہندوستان کو مقدس مقام نہیں مانتے تھے اور ان کے سارے مقامات مقدسہ ہندوستان سے باہر تھے۔ان کے مطابق مسلمانوں نے کبھی ہندوستانی سماج میں جذب ہونے کی کوشش نہیں کی،اس کے برعکس ہندو سماج پر اسلامی اثرات ڈالنے کی مہم چلائی۔ ہندو سماج نے ہمیشہ اسلامی جارحیت کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ان کے مطابق ہندوؤں کو انگریزوں سے زیادہ اسلامی خطرے سے پہلے نپٹنے کی ضرورت ہے جو کہ صرف برطانوی حکومت کے تحت رہ کر کیا جا سکتا ہے۔

ہندو قوم کا تصور اس کی ایک مثال ہے۔ ہندو تنظیم کے بیان میں اس کی ترقی کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ پنجاب میں سبھائی تحریک کو پچھلے صفحات میں ایک طرح سے مختلف عقائد کے نمائندوں کو بھرتی کر کے ہندو مذہب کے احاطے میں لانے کی کوشش کے طور پر دیکھا گیا۔ اس خیال کو مہاسبھا نے آگے بڑھایا اور ترقی دی اور شردھانند کی قراردادوں کی مؤثر شکست کے بعد سنگٹھن کا عمومی تصور اس کی علامت قرار دیا گیا۔ ہندو برادری کو منظم ہونے کی دعوت دی گئی۔ اسے کسی نہ کسی لحاظ سے اکٹھا ہونا چاہیے اور جدید دنیا میں ایک زیادہ طاقتور، ایک زیادہ حقیقی اکائی بننا چاہیے۔ اس نظریے کو عملی جامہ پہنانے والے لوگوں کے لیے، یقیناً وحدت کا اظہار ہی مرکزی اہمیت رکھتا تھا۔ جو چیز ابھر کر سامنے آتی ہے وہ متعدد اجزاء پر مشتمل ایک برادری کا آہستہ آہستہ ایک قوم کے جامع تصور کی طرف بڑھنا ہے جو جدید دنیا میں حقیقی معنی والی ایک اکائی اور ایک حلقہ انتخاب ہے۔

یہ پیش رفت بنارس ہندو یونیورسٹی کے قیام کی مہم میں واضح ہوتی ہے۔1906 میں شائع ہونے والے یونیورسٹی کے پہلے نصاب العمل (Prospectus)، میں کہا گیا ہے کہ یونیورسٹی 'شروتیوں، سمریتوں اور پرانوں سے ماخوذ اور ورن اور آشرم کو تسلیم کرنے والے سناتن دھرم کے تحفظ اور فروغ کے لیے، مذہب کے اساتذہ کو تربیت دے گی' اور مزید یہ کہ 'تمام مذہبی کام ایسے ہندوؤں کے کنٹرول میں ہوں گے جو سناتن دھرم کے اصولوں کو قبول کرتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں۔' اس سال کے دوران یونیورسٹی کے بارے میں اپنے بیان میں، مالویہ نے تبصرہ کیا کہ 'ہر قوم اپنے مذہب کو پسند کرتی ہے (اور) ہندو اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔' اس کے بعد وہ اس قوم کے باہمی اتحاد کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ 'اس وقت قوم کے تمام مختلف طبقوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اتحاد اور یکجہتی کی شدید خواہش اور مشترکہ رشتوں کا بڑھتا ہوا شعور نظر آتا ہے، جو انہیں ایک دوسرے کے ساتھ باندھتا ہے اور انہیں خوشی اور غم میں شریک بناتا ہے۔' اس کے بعد مالویہ، قوم کے نظریے میں بیان کردہ جامع یکجہتی کی ایک تحریک کی نشاندہی کرتے ہیں، جو سناتن دھرم کے ساتھ پہلے سے جڑے ہونے کی جارحانہ استثنائی شرط کو ختم کرتی ہے۔

8.2.6 ہندو مہاسبھا کے مقاصد (Objectives of the All-India Hindu Mahasabha)

1. ہندوؤں کے درمیان 'اتحاد اور اتفاق' پیدا کرنا۔
2. ہندو کمیونٹی میں تعلیم کو فروغ دینا۔
3. ہندو کمیونٹی کے تمام طبقات کی اصلاح کرنا۔
4. 'جہاں اور جب بھی ضروری ہو' ہندو مفادات کا تحفظ کرنا۔
5. ہندو اور ہندوستان کے دیگر طبقات کے درمیان بہتر تعلقات پیدا کرنا اور ان کے ساتھ دوستانہ انداز میں پیش آنا اور حکومت کے ساتھ 'وفاداری پر مبنی تعاون' کرنا۔
6. بالعموم اپنی کمیونٹی کے 'مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی مفادات' کے فروغ کے لیے اقدامات کرنا۔

ہندو مہاسبھا نے 'ہندو اتحاد و اتفاق' پر زور دیا اور برطانوی حکومت کی وفادار رہی۔ علاوہ ازیں شمالی ہندوستان یعنی یوپی، بہار، دہلی اور پنجاب میں ایک مضبوط قوت بن کر ابھری۔ 1926ء کے آخر تک ہندو مہاسبھا نے پورے ملک میں 362 شاخیں قائم کر لیں۔ جنوبی ہند میں اس کا زیادہ اثر و رسوخ نہیں تھا۔

8.2.7 ہندو مہاسبھا کے صدور (Presidents of the Hindu Mahasabha)

پنڈت مدن موہن مالویہ (1861–1948) جو ایک کانگریسی تھے اور تین مرتبہ (1909، 1918 اور 1932) کانگریس کے صدر رہے، 1922–24ء میں ہندو مہاسبھا کے پہلے صدر بنے۔ 1925–26 کے دوران مشہور آریہ سماجی اور کانگریسی رہنما لالہ لاجپت رائے (1865–1928)، ہندو مہاسبھا کے صدر منتخب ہوئے۔ 1927–1933 کے درمیان مہاسبھا کی قیادت بی ایس

مونجے(1872–1948) نے کی۔ ان کے بعد بھائی پرمانند(1947–1948) اس کے صدر بنے ۔ ونایک دامودر ساورکر (1883–1966)نے1937ءمیں اس کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لی اور اسے صحیح معنی میں ایک باقاعدہ سیاسی تنظیم میں تبدیل کر دیا۔

8.3 مہاسبھا کی سر گرمیاں (Activities of the Hindu Mahasabha)

8.3.1 علاحدہ حلقہ انتخاب کی مخالفت (Opposition to Separate Electorates)

'تمام ہندوؤں' کے مفادات کے تحفظ کا دعویٰ کرنے والی ہندو مہاسبھا نے 1909ء کے انڈین کونسل ایکٹ کے تحت مسلمانوں کو دیے گئے علاحدہ انتخابی حلقے کی مخالفت کی۔ ہندو سبھا کے جنرل سکریٹری شادی لال نے اپریل 1909ء میں یہ کہتے ہوئے وائسرائے لارڈ منٹو کے پاس عرضداشت داخل کی کہ حکومت مسلمانوں کے تئیں نرم رویہ اختیار کر رہی ہے اور انہوں نے اس بات پر احتجاج کیا کہ 'مسلمانوں کی حد سے زیادہ نمائندگی' انصاف و دیانت کے خلاف ہے۔ ہندو سبھا کے رہنماؤں نے ہندو جذبات کا استحصال کرتے ہوئے ہندوؤں کی گھٹتی تعداد اور ہندو نسل کی معدومیت پر تشویش کا اظہار کیا۔ یو این مکھرجی کے اثر انگیز پمفلٹ Hindus: A Dying Race('ہندو: ایک ختم ہوتی قوم')میں بتایا گیا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی بڑھتی تعداد کی بنا پر ہندو آئندہ 420سال میں ہندو نہ کے برابر رہ جائیں گے ۔سوامی شردھانند(1857–1926)ایک مشہور ہندو عوامی لیڈر تھے ۔انہوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں پر حملہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ 'تشدد، طاقت اور دھوکہ' سے ہندوؤں کا مذہب بدل رہے ہیں۔اس طرح کے پروپیگنڈہ نے ہندو اور مسلمانوں میں موجودہ خلیج کو مزید بڑھاوادیا۔

تصویر۔ مدن موہن مالویہ

1921 میں ہری دوار میں منعقدہ چھٹے اجلاس میں جس کے صدر قاسم بازار کے راجا منندر اچندر انندی تھے ، سبھا نے اپنے دستور میں تبدیلی کرتے ہوئے 'متحدہ اور خود کی حکومت' کو آئیڈیل بنا کر پیش کیا اور برطانوی حکومت سے 'وفاداری' کا لفظ نکال دیا۔ ہندو مہاسبھا ہندوستان میں برطانوی راج کے خلاف ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں کھل کر کبھی شامل نہیں ہوئی۔ درحقیقت یہ کانگریس کے طریقہ کار اور مقصد سے بد ظن ہی رہی۔ تاہم، اس کے بعض رہنما اپنی شرائط پر اور ہندوؤں کے مفادات کے تحفظ کے حوالے سے تحریک کا حصہ بنے۔ اپنے ایک خصوصی اجلاس میں اس نے عدم تعاون اور سودیشی کو اپنے پروگراموں کا مرکز بنایا۔تاہم وہ عوامی سیاست میں داخل نہیں

ہوئی۔ تحریک عدم تعاون کے دور میں ہندو مہاسبھا سر گرم نہیں رہی۔ مالویہ نے دسمبر 1922ء میں گیا کے اجلاس میں فکری بنیادوں پر تنظیم کو دوبارہ شروع کیا۔ 1923ء میں منعقدہ مہاسبھا کا بنارس اجلاس انتہا پسندانہ قوم پرستی کے ظہور کا اشارہ تھا۔ عدم تعاون کے مختلف پہلو جیسے نئی کونسلوں کے بائیکاٹ، سرکاری نوکریوں سے استعفیٰ وغیرہ پر سبھا کی حیثیت متضاد رہی۔

8.3.2 عدم تعاون پر اختلاف (Disagreement over Non-Cooperation)

لاجپت رائے نے عدم تعاون کو 'غیر عملی' بتاتے ہوئے اس کی مخالفت کی۔ انہوں نے کہا کہ کونسلوں کا بائیکاٹ صوبوں کے لیے لازمی نہیں ہے۔ راجا رام پال سنگھ نے یہ کہتے ہوئے تحریک کو رد کر دیا کہ ہندوؤں کے مفادات کا تحفظ 'اعلیٰ قسم کی حب الوطنی' ہے۔ گو کہ مالویہ نے پہلے 1920 کے الیکشن سے دستبرداری اختیار کر لی، لیکن انہوں نے اس کے باقی مراحل میں عدم تعاون کی مخالفت کی۔ 1923ء کے بعد ان کا سیاسی کیریر کافی کامیاب ہوا۔ ان کے مطابق عدم تعاون تحریک، ہندو مفادات کے لیے نقصان دہ تھی۔ انہوں نے اسکول اور کالج کے بائیکاٹ کو 'تعلیمی خودکشی' بتایا۔ مالویہ اس بات پر برہم تھے کہ مسلمانوں کی خاطر ہندو سیاست دانوں کو قانون ساز کونسلوں کے بائیکاٹ کے لیے کہا جا رہا ہے اور 'برسوں کی سیاسی محنت سے حاصل کی گئی کامیابیوں' کو قربان کیا جا رہا ہے۔ مالویہ کے بیشتر ساتھیوں نے عدم تعاون پروگرام کی مخالفت کی اور نومبر و دسمبر 1920ء کے الیکشن میں قانون ساز کونسلوں میں داخل ہوئے۔ بی ایس مونجے اور ایم جئیکر نے کونسلوں کے بائیکاٹ کی گاندھی کی اپیل مسترد کر دی اور مستعفی ہونے سے انکار کر دیا۔ راجا نریندر ناتھ جو پنجاب ہندو سبھا کے سکریٹری تھے، نے بائیکاٹ کی پرواکیے بغیر پنجاب قانون ساز کونسل کے انتخابات میں حصہ لیا اور کانگریس پر 'ہندو مفادات' سے پہلو تہی کا الزام لگایا۔ ان کا ماننا تھا کہ عدم تعاون کے درمیان حاصل کیا گیا ہندو مسلم اتفاق غیر عملی تھا۔

سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے وقت مہاسبھائی رہنما لالہ لاجپت رائے، کانگریس کے شانہ بشانہ رہے اور اسی کے دوران لاٹھی لگنے سے ان کی موت واقع ہوئی۔ مہاسبھا، اس آل پارٹی کمیٹی کا بھی حصہ تھی، جس کے سامنے نہرو رپورٹ پیش کی گئی تھی۔ تاہم، اس نے رپورٹ کو قبول نہیں کیا کیونکہ مہاسبھا کے مطابق اس رپورٹ نے مسلمانوں کو بہت زیادہ رعایتیں دیں تھیں۔ اسی طرح جب مہاتما گاندھی نے فرقہ وارانہ ایوارڈ (Communal Award) کے خلاف برت رکھا تو مہاسبھا نے گاندھی اور دیگر جماعتوں کے ساتھ مل کر اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کام کیا کہ پونا معاہدے پر دستخط کیے جائیں اور پچھڑے طبقات کو منصفانہ نمائندگی دی جائے۔

8.3.3 دو قومی نظریے کی حمایت (Support to the Two-Nation Theory)

ہندو مہاسبھا نے انڈین نیشنل کانگریس کی پیش کردہ متحدہ قومیت کے تصور کی مخالفت کی۔ مہاسبھا نے مسلمانوں کو ہندو قوم سے 'الگ' تصور کیا۔ مالویہ کے مطابق مسلم 'بیرونی حملہ آور' تھے۔ بی ایس مونجے نے کہا کہ صرف برطانوی حکومت کے خلاف ہی آزادی کی تحریک چلانا کافی نہیں ہے بلکہ اسے مسلمانوں کے خلاف بھی چلانا چاہیے۔ انہوں نے ہندوستان کو ہندوؤں کے گھر میں تبدیل کرنے کی بات کی۔ سوامی شردھانند کے خیال میں اسلام 'قتل و غارت گری، چوری، غلامی اور جنسی بے راہ روی' کا مذہب تھا۔ انہوں نے ہندوؤں کو

مسلمانوں سے الگ رہنے، مسلم تہواروں میں شریک نہ ہونے، مسلم مزاروں کا دورہ نہ کرنے اور مسلم علما کی پیروی نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ وی ڈی ساورکر کا ماننا تھا کہ مسلمان ہندوستان کے وفادار نہیں ہو سکتے اور وہ اسے 'مسلم ریاست' میں بدلنے کا ایک خفیہ ایجنڈہ لے کر کام کر رہے ہیں۔ ایم ایس گولوالکر کے مطابق مسلم ہندوستان کے لیے ایک 'اندرونی خطرہ' ہیں اور انہوں نے ہزاروں سال کے لیے ہندوستان کو غلام بنا کر رکھنے کا منصوبہ تیار کیا ہوا ہے اور اسلام ہندوستان میں ایک 'تباہ کن' قوت ہے۔ بھائی پرمانند نے کہا کہ مسلمان، ہندوؤں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے مذہبی فرض سے بندھے ہوئے ہیں۔ ہندو مہاسبھا کے جنرل سکریٹری اشوتوش لہری کے مطابق ہندوستان میں رہنے والے تمام مسلمان 'سچے قوم پرست' نہیں ہیں۔ پنڈت آتمارام نے علی گڑھ سے بیان دیا کہ مسلمان 'گوکشی کے ذمہ دار' ہیں اور انہیں 'ہندوستان سے باہر بھگادینا چاہیے۔' انہوں نے ہندوؤں سے درخواست کی کہ وہ مسلمانوں کی داڑھی اور مونچھ نوچ ڈالیں اور ان کے دکانات و مکانات کو آگ لگادیں۔ ہندو مبصرین نے یہ کہتے ہوئے ہندوؤں کو خوفزدہ کیا کہ اگر آریہ سماج کام نہیں کرے گی تو ہندوستان سے گائے غائب ہو جائے گی اور گائتری کی جگہ کلمہ لے لے گا۔ بھائی پرمانند کے مطابق مسلمان، انگریزوں سے اپنے تعلقات اور 'اپنے علاحدہ مطالبات و سازشوں' کی بناپر برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد میں ہندوؤں کی راہ میں حائل ہو چکے ہیں۔ ہندو قوم پرستوں کا احساس تھا کہ مسلمان قوم پرست نہیں ہو سکتے کیوں کہ قوم پرستی ان کی 'بنیادی نوعیت' کی بناپر 'مقامی' ہے۔

جب 1915ء میں کمبھ میلہ کانفرنس میں آل انڈیا ہندو سبھا قائم کی گئی تو گاندھی وہاں موجود تھے اور انہوں نے اس کے قیام کی سخت مخالفت کی۔ ہندو مہاسبھا کے کئی ارکان، کانگریس سے بھی وابستہ تھے اور اس طرح دوہری رکنیت کے اصول کو برقرار رکھا گیا لیکن یہ معاملہ مسلم لیگ کے ساتھ نہیں تھا۔ کانگریس پر ہندو مہاسبھا کا اتنا زیادہ اثر تھا کہ ایک کانگریسی سوشلسٹ کے ایم اشرف نے مہاسبھائیوں پر کانگریس میں اہم عہدوں پر قبضہ کرنے اور آگرہ، اودھ، علی گڑھ، بدایوں، بندیل کھنڈ، یوپی میں کانگریس استقبالیہ کمیٹیاں جوائن کرنے کی اجازت پر احتجاج کیا۔ جب فرقہ وارانہ تنظیمیں اپنی شدت پسندی کی علامات دکھانا شروع کر رہی تھیں 16 دسمبر 1938ء کو کانگریس نے ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ کو 'فرقہ وارانہ جماعتیں' قرار دیتے ہوئے بلیک لسٹ کر دیا اور کانگریس ارکان پر اس طرح کی جماعتوں میں 'دوہری رکنیت' لینے پر پابندی عائد کر دی۔ ساورکر کی قیادت میں ہندو مہاسبھا نے ہندو ملٹریائزیشن بورڈز کو منظم کیا جس نے دوسری جنگ عظیم میں انگریزوں کی مدد کے لیے مسلح افواج کو بھرتی کیا۔

8.4 ہندو مسلم تعلقات (Hindu–Muslim Relations)

1923 میں کاکی ناڈا میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے محمد علی نے مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ متحد ہو جائیں۔ یہ اتحاد عالمگیر اسلامی مقاصد کی تکمیل میں ان کا مددگار ثابت ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ برطانوی پالیسی یہ ہے کہ اسلامی مقاصد کی مخالفت کی جائے۔ ان کی اپیل کا فرقہ وارانہ سیاست پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ قدیم فرقہ وارانہ ذہنیت کی تجدید میں دونوں فرقوں کے درمیان آئے دن چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھڑپیں ہونے لگیں۔ 1920ء میں مالابار، آگرہ اور دوسرے کئی مقامات پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان انتہائی افسوسناک واقعات پیش آئے۔ کئی مقامات جیسے لکھنو اور الہ آباد میں شدید نوعیت کا فرقہ وارانہ تصادم ہوا۔ اس

طرح کے فرقہ وارانہ فسادات نے باہمی عدم اعتماد میں اضافہ کیا اور ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات مزید خراب ہو گئے اور فرقہ وارانہ جماعتیں اس فرقہ وارانہ فضا کا فائدہ اٹھانے لگیں۔ ہندو سنگھٹن تحریک نہ صرف ہندوؤں کے مفادات کے تحفظ کے لیے جمع ہوئیں بلکہ چند نام کے مسلم گروہوں کو ہندوؤں میں واپس لینے کا دعویٰ کیا۔ اس دعویٰ کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں میں 'تبلیغ' اور 'تنظیم' تحریکات شروع ہوئیں۔ ہر ایک نے دوسرے کے فیصلے کو شک کی نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ اس طرح ملک میں فرقہ واریت کی فضا قائم ہوتی چلی گئی جس نے ہندو مسلم اتحاد کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔

8.5 فرقہ ورانہ فسادات (Communal Riots)

تحریک عدم تعاون سے دستبرداری کے بعد سے ہندوستان کی سیاسی فضاء شدید نوعیت کے فرقہ وارانہ فسادات کے سبب مکدّر ہو گئی۔ یہ ایک المیہ تھا کہ سات صدیوں سے ہندو مسلمان مل جل کر ساتھ ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود چند گہری سماجی، سیاسی اور مذہبی وجوہات کے سبب ابھی تک یہ دو علاحدہ اکائیوں کی حیثیت برقرار رکھے ہوئے تھے۔ دونوں فرقوں کے کئی نمایاں رہنماؤں نے اختلافات کے ان اسباب کو دونوں فرقوں کی آپسی تعلقات اور سمجھوتے کی مدد سے ختم کرنے کی کوشش کی۔ 1921ء میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی تاکہ انڈین نیشنل ایکٹ تیار کیا جاسکے۔ ڈاکٹر انصاری اور لالہ لاجپت رائے نے اس کا مسودہ تیار کیا اور اسے 1923ء میں پیش کیا۔ اسی اثنا میں سی۔ آر۔ داس کی تحریک پر بنگال کانگریس کمیٹی نے بنگال کے لیے ایک ہندو مسلم ایکٹ منظور کیا۔ ایکٹ میں علاحدہ حلقہ انتخاب کے ذریعے آبادی کی بنیاد پر مجلس قانون ساز میں نمائندگی کی گنجائش رکھی گئی۔ مقامی اداروں میں نمائندگی ہر ڈسٹرکٹ میں 60:40 کے تناسب سے رکھی گئی۔ 60 اکثریتی فرقے کے لیے اور 40 اقلیتی فرقہ کے لیے، سرکاری عہدوں کا 55 فیصد مسلمانوں کو دیا جائے، مسجدوں کے سامنے کسی طرح کا گانا بجانا نہ ہو۔ مگر یہ ایکٹ جس پر لمبے مباحث ہوئے کانگریس کے کھلے اجلاس میں شکست سے دوچار ہو گیا۔

مئی 1923ء میں کلکتہ میں بدترین فساد پھوٹ پڑا جب کہ ایک آریہ سماجی جلوس نے مسجد کے سامنے گانا بجانا شروع کیا۔ فسادات کئی دن تک جاری رہے اور دونوں فرقوں کے کئی لوگ مارے گئے۔ 1924ء میں بقر عید کے موقع پر فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جن میں سے بدترین فساد دہلی میں ہوا۔ ناگپور میں سڑکوں پر لڑائی شروع ہو گئی۔ جبل پور اور دوسرے شہروں کا بھی یہی حال رہا۔ فوج کی جانب سے فائرنگ کے بعد ہی امن بحال ہو سکا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں جو کہ نمایاں طور سے ایک مسلم علاقہ ہے کوہاٹ کے مقام پر بدترین فساد ہوا۔ گڑبڑ اس وقت ہوئی جب کہ سناتن دھرم سبھا نے ایک پمفلٹ جاری کیا۔ جس میں ایک اسلام مخالف نظم شامل تھی۔ شہر کے ہندوؤں پر حملے کیے گئے اور پولیس ان حملوں کو روکنے میں ناکام ہو گئی۔ اس المیہ کی دکھ بھری داستان انڈین نیشنل کانگریس ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ کے لیے بحث کا موضوع بن گئے۔ اکتوبر 1924ء میں رام لیلا کے دوران الہ آباد میں ایک فساد پھوٹ پڑا جس میں 12 لوگ ہلاک ہو گئے۔ اسی سال لکھنؤ شہر امین آباد پارک میں نماز کے مسئلہ پر ایک بڑا فساد برپا ہوا۔ 1925ء تا 1926ء میں ہندو مسلم تعلقات میں مزید بگاڑ پیدا ہوتا چلا گیا۔ اس دوران تقریباً 30 فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ جن میں سے زیادہ تر یوپی اور بنگال میں ہوئے۔ فرقہ وارانہ نفرت کی فضا اتنی زیادہ تھی کہ 23 دسمبر 1926ء کو دہلی میں عبدالرشید نے سوامی شردھانند کو قتل کر دیا اور مسلم پریس نے رشید کو غازی قرار دیا۔ 1927ء میں

بدری شاہ اور بھیر وسنگھ جیسے آریہ سماج کے قائدین بہرائچ اور ماؤنٹ آبو میں قتل کر دیے گئے۔1926ء میں موتی لال نہرو اور ابوالکلام آزاد نے ایک منشور پیش کیا جس میں تجویز دی گئی کہ انڈین نیشنل یونین کے نام سے ایک غیر فرقہ وارانہ تنظیم قائم کی جائے، مگر یہ تنظیم قائم ہی نہیں کی جاسکی۔اسی سال بنگال کونسل کے غیر سوراجی مسلم ارکان کو لے کر سر عبدالرحیم نے بنگال مسلم پارٹی قائم کی۔انہوں نے اپنے اس اقدام کا جواز یہ پیش کیا کہ ہندوستان کی تقریباً تمام سیاسی پارٹیاں کسی نہ کسی طرح فرقہ وارانہ کردار کی حامل ہیں۔دونوں فرقوں کے درمیان خلیج کو باٹنے کی کانگریس اور اعتدال پسندوں کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ان اختلافات کا یقینی اثر ملک کی سیاست اور جدوجہد آزادی پر پڑا۔

8.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اکھل بھارت ہندو مہاسبھا (کل ہند ہندو مہاسبھا) ہندوستان کی ایک ہندو قوم پرست سیاسی جماعت تھی جو1915 میں قائم ہوئی۔مہاسبھا نے بنیادی طور پر برطانوی راج کے سامنے اور انڈین نیشنل کانگریس کے اندر ایک دباؤ گروپ کے طور پر کام کیا جو بنیاد پرست ہندوؤں کے مفادات کی وکالت کرتا تھا۔1930 کی دہائی میں، یہ وِنائک دامودر ساورکر کی قیادت میں ایک الگ پارٹی کے طور پر ابھری، جس نے ہندوتوا کو فروغ دیا اور کانگریس پارٹی کی حمایت یافتہ سیکولر قوم پرستی کا شدید مخالف بن گیا۔دوسری جنگ عظیم کے دوران، مہاسبھا نے برطانوی جنگی کوششوں کی حمایت کی اور مختصر طور پر صوبائی اور مرکزی کونسلوں میں مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد کرکے سرکاریں بنائیں۔ہندو مہاسبھا کے کارکن ناتھورام گوڈسے کے ہاتھوں ہندوستانی رہنما مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد ہندوستانی سیاست میں مہاسبھا کی قسمت ماند پڑ گئی اور جلد ہی اسے بھارتیہ جن سنگھ نے اپنے اندر ضم کر لیا۔

8.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

سرواد یشک	:	کل ہند
اکھل بھارت	:	کل ہند
سنگٹھن	؛	تنظیم، نظم واتحاد
شدھی	:	لغوی معنی صفائی، ایک تحریک جو مسلمانوں کو ہندو مذہب میں داخل کرتی تھی۔
ملکانہ راجپوت	:	یوپی کے آگرہ ضلع کے راجپوت جو مغل دور میں مالکانہ زمین رکھتے تھے۔

8.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

8.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. گروکل تعلیمی تحریک کے انتہاپسند رہنما، کون تھے؟
2. پنجاب ہندو سبھا کب قائم ہوئی؟

3. *Hindus: A Dying Race* کس نے لکھی؟
4. سرودیشک ہندومہا سبھا کب قائم ہوئی؟
5. 1921 میں ہندومہا سبھا کا نام بدل کر کیا رکھا گیا؟
6. سروادیشک سے کیا مراد ہے؟
7. اکھل بھارت سے کیا مراد ہے؟
8. سنگٹھن سے کیا مراد ہے؟
9. شدھی سے کیا مراد ہے؟
10. ملکانہ راجپوت کہاں رہتے تھے؟

8.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہندومہا سبھا کے قیام کے پس منظر پر نوٹ لکھیے۔
2. کل ہند ہندومہا سبھا کے قیام پر نوٹ لکھیے۔
3. سنگٹھن پر نوٹ لکھیے۔
4. ہندومہا سبھا کے مقاصد پر نوٹ لکھیے۔
5. فرقہ وارانہ فسادات پر نوٹ لکھیے۔

8.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سوامی شردھانند پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. وی ڈی ساورکر اور ہندوتوا کے اظہار پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. ہندومہا سبھا کے کانگریس کے ساتھ تعلقات پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

8.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

---

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, Hyderabad, 2004.
2. Bapu, Prabhu, *Hindu Mahasabha in Colonial North India, 1915–1930*: *Constructing Nation and History*, Routledge, Abingdon, Oxon, 2013.
3. Batabyal, Rakesh, *Communalism in Bengal*: *From Famine to Noakhali, 1943–47*, Sage, New Delhi, 2005.
4. Chandra, Bipan, *Communalism in Modern India*, Vikas Publishing House, Ltd., New Delhi, 1996 (First Pub. in 1984).

5. Gordon, Richard. “The Hindu Mahasabha and the Indian National Congress, 1915 to 1926.” *Modern Asian Studies*, 9, no. 2, 1975, pp. 145–203.
6. Hasan, Mushirul, *Nationalism and Communal Politics in India, 1885–1930,* Manohar, New Delhi, 2000 (first pub. 1991).
7. Jafferlot, Christophe (ed.), *Hindu Nationalism*: *A Reader*, Princeton University Press, Princeton, 2007.
8. Misra, Salil, *A Narrative of Communal Politics*: *Uttar Pradesh, 1937–39,* Sage, New Delhi, 2001.
9. Renold, Leah, *A Hindu Education*: *Early Years of the Banaras Hindu University*, Oxford University Press, New Delhi, 2005.
10. Zavos, John, *The Emergence of Hindu Nationalism in India*, Oxford University Press, New Delhi, 2000.

اکائی 9۔ پہلی جنگ عظیم

(The First World War)

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید
9.1 مقاصد
9.2 پہلی جنگ عظیم کے اسباب
9.2.1 یورپ کی دو مخالف خیموں میں تقسیم
9.2.2 سامراجی مقابلہ آرائی
9.2.3 ہتھیاروں کی ہوڑ
9.2.4 انتہاپسندانہ قوم پرستی
9.2.5 جنگ کی فوری وجہ
9.3 پہلی جنگ عظیم کی ذمہ داری
9.4 پہلی جنگ عظیم کے اثرات
9.5 ہندوستان اور پہلی جنگ عظیم
9.5.1 ہوم رول تحریک
9.5.2 غدر پارٹی
9.5.3 کانگریس کا لکھنؤ اجلاس
9.5.4 خلافت تحریک
9.6 اکتسابی نتائج
9.7 کلیدی الفاظ
9.8 نمونہ امتحانی سوالات
9.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید (Introduction)

اگست 1914 میں یورپ میں شروع ہونے والی جنگ ایک عالمی جنگ بن گئی کیونکہ یورپ کے ممالک نے اس میں اپنی کالونیاں بھی شامل کیں اور جاپان اور امریکہ جیسے نئے ترقی یافتہ ممالک بھی اس میں شامل ہو گئے۔ اکتوبر 1918 میں ختم ہونے والی اس جنگ نے بے مثال تباہی مچائی۔ کئی برسوں تک جنگ کے لیے کھودی گئی خندقوں میں سپاہی لڑتے رہے اور پہلی بار جنگ میں کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال کیا گیا۔ ہوائی جہازوں سے شہریوں پر بموں کی بارش کی گئی۔ یہ ایک ایسی مکمل جنگ تھی جس میں تمام طبقات کے لوگوں نے حصہ لیا اور تمام قومی وسائل استعمال کیے گئے۔ معاصرین نے بھی اسے عظیم جنگ کہنا شروع کر دیا۔ اس جنگ کے دوران یا اس کے بعد، چار سلطنتوں (جرمنی کی ہوہنزولرن سلطنت، آسٹریا ہنگری کی ہیپس برگ سلطنت، روس کی رومانوف سلطنت اور ترکی کی عثمانی سلطنت) کا خاتمہ ہو گیا۔ سیاسی اور سماجی تبدیلیوں اور یورپ کے نقشے کی وسیع تر ترمیم نے بیسویں صدی کے مستقبل کی سمت کا تعین کیا۔ اس نے ان تمام امیدوں اور اعتماد کو ہمیشہ کے لیے تباہ کر دیا جس کے ساتھ صدی کا آغاز ہوا تھا۔ معاصر تاریخ دانوں نے اسے "تمام جنگوں کو ختم کرنے کی جنگ" قرار دیا۔ پھر بھی، 20 سال بعد ایک اور تباہ کن جنگ لڑی گئی، جو اس سے بھی زیادہ دیر تک جاری رہی۔ پہلی جنگ عظیم کے اسباب اور اس میں شامل ممالک کی ذمہ داریوں سے متعلق مسائل پر صدیوں سے بحث ہوتی رہی ہے لیکن یہ جنگ کیوں لڑی گئی اس پر کوئی اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ 28 جون 1914 میں ایک سربیائی طالب علم نے جو کہ ایک خفیہ تنظیم 'بلیک ہینڈ' کا رکن تھا، 28 جون 1818 کو ہنگری کے تخت کے وارث فرانسس فرڈینینڈ کو قتل کر دیا۔ اس قتل نے واقعات کا ایک ایسا سلسلہ شروع کر دیا جس کی وجہ سے پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ ڈیوک خود آسٹریائی دربار میں زیادہ مقبول نہیں تھا۔ یہ بیان کرنا مشکل ہے کہ اس قتل عام سے پیدا ہونے والے حالات جنگ عظیم میں کیسے بدل گئے۔ مقروضہ قوم پرستی یا سماجی ناانصافی کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے ممتاز شخصیات کا قتل کوئی نئی بات نہیں تھی۔ آسٹریا کی ملکہ، اٹلی کے شہنشاہ اور پرتگال کے شہنشاہ کو بالترتیب 1808، 1900 اور 1908 میں قتل کر دیا گیا تھا۔ 1914 کے وسط میں بین الاقوامی ماحول بظاہر پرسکون نظر آرہا تھا۔ کسی دفتر خارجہ کو کسی قسم کی پریشانی پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔ درحقیقت سفارت کار اور فوجی افسران گرمیوں کی چھٹیوں پر جانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ لیکن آج سو سال بعد بھی تاریخ دانوں میں اس بات پر اتفاق نہیں ہے کہ سراجیو میں ہونے والا یہ قتل، پہلی جنگ عظیم کی وجہ کیوں بنا۔ پھر بھی کچھ ایسے واقعات اس سے قبل وقوع پذیر ہوئے جن کی طرف توجہ دے کر ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

9.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- پہلی جنگ عظیم کے اسباب جان سکیں گے۔
- پہلی جنگ عظیم کے واقعات سے واقف ہو سکیں گے۔
- پہلی جنگ عظیم کے نتائج اور اثرات پر روشنی ڈال سکیں گے۔

- پہلی جنگ عظیم کے ہندوستان پر کیا اثرات مرتب ہوئے، جان سکیں گے۔

9.2 پہلی جنگ عظیم کے اسباب (Causes for the First World War)

9.2.1 یورپ کی دو مخالف خیموں میں تقسیم (The Division of Europe into Two Opposing Camps)

1914 میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز عالمی تاریخ کا ایک بہت اہم واقعہ تھا۔ یورپ میں خفیہ معاہدوں کا سلسلہ اس جنگ کا بنیادی سبب تھا۔ اس عمل کو شروع کرنے والا جرمن سلطنت کا چانسلر بسمارک تھا۔ 1870-71 میں اس نے فرانس کو شکست دے کر اور ذلیل کر کے جرمنی کا اتحاد مکمل کیا اور اس سے دو صنعتی علاقے الساس اور لورین بھی چھین لیے۔ اس کے جواب میں فرانس میں انتقام کا جذبہ پیدا ہوا۔ جرمنی کو فرانسیسی انتقامی کارروائیوں سے بچانے کے لیے، بسمارک نے ایک عملی خارجہ پالیسی اختیار کی، جس کی اہم خصوصیت فرانس کو یورپی سیاست میں الگ تھلگ رکھنا اور جرمنی کے لیے زیادہ سے زیادہ ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنا تھا۔ اسی ہدایتی اصول کی بنیاد پر 1879ء میں اس نے آسٹریا ہنگری کے ساتھ ایک خفیہ باہمی معاہدہ کیا، جس میں 1882ء میں اٹلی بھی شامل ہو گیا۔ اس طرح جرمنی کی سربراہی میں وسطی یورپ کے تین ممالک کا ایک سہ فریقی اتحاد تشکیل دیا گیا جس کا بنیادی مقصد فرانس پر نظر رکھنا تھا۔ بسمارک بھی روس کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس مقصد سے متاثر ہو کر اس نے 1872 میں روس، جرمنی اور آسٹریا کے شہنشاہوں کو ملا کر 'تین شہنشاہوں کا وفاق' تشکیل دیا۔ لیکن، یہ اتحاد بلقان کے علاقے میں روس اور آسٹریا کے درمیان دشمنی کی وجہ سے قائم نہ رہ سکا۔ اس کے باوجود 1887ء میں روس کو اپنا دوست بنائے رکھنے کے مقصد سے اس کے ساتھ ایک دوبارہ یقین دہانی (Re-unification) کا معاہدہ کیا۔ اسی دوران 1890 میں بسمارک کو اپنا عہدہ چھوڑنا پڑا اور جرمنی کی خارجہ پالیسی خود شہنشاہ قیصر ولیم نے سنبھال لی۔ اس نے روس کی دوستی کو کوئی اہمیت نہیں دی اور روس کے خلاف آسٹریا کا ساتھ دیتے ہوئے پچھلے معاہدے کو ترک کر دیا۔ اس صورت حال نے روس اور فرانس کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع فراہم کیا اور 1894 میں ان کے درمیان خفیہ شرائط کی بنیاد پر ایک معاہدہ ہوا اور ایک جرمن مخالف دو فریقی گٹ وجود میں آیا۔ اس طرح یورپ اب واضح طور پر دو مخالف کیمپوں میں بنٹ گیا۔ اسی دوران جرمنی نے برطانیہ کو نوآبادیوں کے معاملات اور بحریہ کے میدان میں چنوتی کی۔ اس وقت برطانیہ یورپی سیاست میں علیحدگی کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ لیکن جب جرمنی نے اسے ہر جگہ چیلنج کرنا شروع کیا تو انگلینڈ کے لیے جرمنی کے مخالف ممالک سے اپنے تعلقات اور روابط بڑھانا ضروری ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں 1904ء میں انگلینڈ اور فرانس کے درمیان اور 1907ء میں انگلینڈ اور روس کے درمیان دو معاہدے ہوئے۔ حالانکہ یہ معاہدے محض نوآبادیاتی تنازعات کے نپٹارے کے لیے کیے گئے تھے اور انگلینڈ کسی بھی طرح فوجی مدد فراہم کرنے کا پابند نہیں تھا، پھر بھی اس معاہدے نے انگلینڈ کو روس اور فرانس کے گٹ کے ساتھ مضبوطی سے جوڑ دیا۔ غیر سرکاری طور پر انگلینڈ بھی فرانس اور روس کے دو فریقی اتحاد کا رکن بن گیا اور اس طرح جرمنی کے خلاف ایک سہ طرفہ اتحاد بھی تشکیل دیا گیا۔ سفارتی نقطہ نظر سے یورپ کی دو مخالف گروہوں میں تقسیم یورپی امن کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوئی۔ اس کی وجہ سے بین الاقوامی کشیدگی پیدا ہوئی، جنگ کا ماحول تیار ہوا، بین الاقوامی تلخیاں نمودار ہوئیں اور بالآخر جنگ بھڑک اٹھی۔

9.2.2 سامراجی مقابلہ آرائی (Imperialist Competition)

یورپی اقوام کے درمیان سامراجی رقابت اور مقابلہ آرائی، پہلی عالمی جنگ کی ایک اور بنیادی وجہ سمجھی جاتی ہے۔1870 کی دہائی میں نئے سامراجی نظام(Neo-Imperialism) کا دور شروع ہوا۔ پہلے کے سامراجی ممالک کے گروپ میں تین نئی ریاستوں، جرمنی، اٹلی اور جاپان کی شمولیت سے سامراجی رقابت میں شدت آگئی، جس کے نتیجے میں سامراجی طاقتوں کے درمیان افریقہ کی تقسیم،، چین کو حلقہ اثر میں بانٹنے اور بحرالکاہل کے متعدد جزیروں پر تسلط قائم کرنے کی خواہش کو لے کر شدید مقابلہ شروع ہوا۔ابتدائی طور پر یورپی ریاستوں نے پرامن طریقے سے افریقہ کو آپس میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایااور اس کے لیے 1884 کی برلن کانفرنس میں کچھ رہنمایانہ اصول طے کیے گئے۔ لیکن، اس منصوبے پر زیادہ دیر تک عمل نہ ہو سکااور یورپی ریاستوں کے درمیان افریقہ کی تقسیم کے حوالے سے شدید کشمکش شروع ہو گئی۔ کم از کم دو سامراجی بحرانوں نے یورپی امن کے مستقبل کو خطرے میں ڈال دیا۔ایک جنوبی افریقہ میں بوئر جنگ (Boer War) تھی جس نے جرمنی اور برطانیہ کے درمیان تناؤ پیدا کیا تھااور دوسرا سوڈان کے حوالے سے فاسودا(Fashoda) کا واقعہ تھا جس کی وجہ سے انگلینڈ اور فرانس میدان جنگ میں ٹکراؤ سے بال بال بچے تھے۔نئے سامراجی نظام کا دوسرا علاقہ چین اور بحرالکاہل کے جزائر تھے۔ یورپی ممالک نے چین کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اثر ورسوخ کے مختلف حلقوں میں تقسیم کیااور بہت سی خصوصی سہولتیں حاصل کر لیں۔اس کے نتیجے میں چین کی آزاد حیثیت تقریباً ختم ہو گئی۔ چین کو جاپانی سامراجیت کا بھی شکار بننا پڑا۔ 1894-95 میں جاپان نے چین کے ساتھ جنگ کی اور اس کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ جاپان کے توسیع پسندانہ عزائم کی وجہ سے روس کے ساتھ اس کی کشمکش ناگزیر ہو گئی اور 1904-5 میں روس اور جاپان کے درمیان جنگ شروع ہو گئی جس میں جاپان نے روس کو شکست دے کر اپنے آپ کو ایک طاقتور صنعتی ترقی یافتہ سامراجی طاقت تسلیم کروایا۔ روس جاپان جنگ کا اثر یورپی سیاست پر بھی پڑااور وہاں کا ماحول کشیدہ ہو گیا۔ سامراجی کشمکش کا تیسرااور سب سے خطرناک علاقہ جزیرہ نما بلقان تھا جہاں ترکی، روس اور آسٹریا کے سامراجی مفادات آپس میں ٹکراتے تھے۔ روس اور آسٹریا دونوں ترکی کے اختیار کو ختم کر کے جزیرہ نما بلقان پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے تھے جس کی وجہ سے آسٹریا اور روس کے درمیان شدید کشیدگی پیدا ہو گئی۔ درحقیقت روس اور آسٹریا کے درمیان مفادات کا یہی ٹکراؤ پہلی جنگ عظیم کا فوری سبب بن گیا۔

9.2.3 ہتھیاروں کی ہوڑ (Arms Race)

یورپی ریاستوں کے درمیان ہتھیاروں اور فوجیوں کی تعداد میں اضافے کی ہوڑ عالمی جنگ کی تیسری بنیادی وجہ بنی۔ حقیقت پسندی کے اس دور میں یورپ کی تمام ریاستیں اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرنا چاہتی تھیں۔ تمام ممالک میں لازمی فوجی خدمت نافذ تھی اور جدید ترین ہتھیاروں سے لیس فوجیوں کی تعداد بتدریج بڑھ رہی تھی۔اس کی وجہ سے پورے یورپ میں فوجی ماحول چھایا ہوا تھا۔ایک طرح سے یہ بین الاقوامی انتشار کا دور تھا۔ قومی ریاستوں کے درمیان اس نقصان دہ مقابلے کو روکنے کے لیے موثر اقدامات نہیں کیے جارہے تھے۔ایسے ماحول میں ملکی سیاست میں فوجی افسروں کا مقام نمایاں ہو گیااور وہ سول افسروں پر حاوی ہو گئے۔ یورپ میں جب بھی کوئی بحران پیدا ہوتا، فوجی حکام سول حکام پر دباؤ ڈالتے کہ انہیں جلد از جلد جنگ شروع کرنے کی اجازت دی جائے، ورنہ اسٹریٹجک صورتحال قابو سے باہر ہو جائے گی۔

جولائی 1914 میں جب جنگ شروع ہوئی تو بالکل ایسی ہی صورتحال پیدا ہوگئی تھی۔ اگر یورپی ریاستوں کے فوجی افسران اس وقت تھوڑا سا بھی تحمل سے کام لیتے تو شاید ایک بڑی جنگ چھڑنے سے روکی جاسکتی تھی۔

9.2.4 انتہا پسندانہ قوم پرستی (Chauvinism)

جب یورپ ان حالات سے گزر رہا تھا، اسی وقت انتہا پسندانہ قوم پرستی نے سر اٹھایا اور عالمی جنگ کی چوتھی بنیادی وجہ بن گئی۔ جرمن قوم پرست فرانس کے خلاف تھے اور فرانسیسی قوم پرست جرمنی کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے پرعزم تھے۔ وہ 1871 کی ذلت آمیز شکست کا بدلہ لینے اور الساس اور لورین کے صوبوں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے۔ آسٹریا اور روس ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ کل سلاف (Pan-Slav) تحریک آسٹریا کی سخت مخالف تھی۔ اخبارات، یورپی اقوام میں انتہا پسندی کے جذبات پھیلانے میں بڑا کردار ادا کررہے تھے۔ اخبارات نے واقعات کو پیش کرنے کا انوکھا انداز اپنایا جس سے عوام میں اشتعال پیدا ہوتا تھا اور کسی بھی مسئلے کو پرامن طریقے سے حل کرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ اس طرح جنگ شروع ہونے سے پہلے یورپ کا سیاسی ماحول بہت پراگندہ تھا۔ ایسے میں جنگ عظیم کا پھوٹ پڑنا کوئی حیران کن واقعہ نہیں تھا۔

9.2.5 جنگ کی فوری وجہ (Immediate Cause of the War)

دریں اثنا، بوسنیا اور ہرزی گوئنا کے صوبوں (جسے آسٹریا نے 1908 میں اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا) کو لے کر آسٹریا اور سربیا میں شدید تنازع شروع ہوگیا۔ دونوں صوبوں کے باشندوں کا تعلق سرب برادری سے تھا اور سربیا انہیں آسٹریا کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ اس منصوبے میں روس کی پوری طاقت سربیا کے حق میں تھی۔ بوسنیا اور ہرزیگوینا میں آسٹریائی حکمرانی کے خلاف دہشت گردانہ تحریکوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا اور سربیا کی ہدایت پر سرب دہشت گرد گروہ بلیک ہینڈ کے ایک رکن نے آسٹریا کے ولی عہد فرانز فرڈیننڈ کو قتل کردیا۔ یہ واقعہ عالمی جنگ کا فوری سبب ثابت ہوا۔ آسٹریا نے سربیا کو کچلنے کا فیصلہ کیا اور ولی عہد کے قتل کے لیے احتساب کا مطالبہ کیا۔ جواب تسلی بخش نہ ہونے یا یہ کہیں پسند نہ آنے پر آسٹریا نے سربیا کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ روس، سربیا کی مدد کے لیے فوراً اپنی پوری فوجی طاقت کے ساتھ میدان میں آگیا۔ پھر جرمنی اور فرانس بھی اپنے اتحادیوں کا ساتھ دیتے ہوئے جنگ میں کود پڑے۔ جب جرمنی نے بیلجیم پر حملہ کیا تو انگلینڈ کو بھی اپنی سلامتی کے لیے خطرہ نظر آیا اور اس نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔

بلقان جنگ کے بعد بلغاریہ، روس کا مخالف بن گیا تھا، اس لیے آسٹریا کا ساتھ دیتے ہوئے وہ بھی جنگ میں شامل ہوگیا۔ ترکی کے ساتھ جرمنی کے قریبی تعلقات برلن کانگریس کے بعد قائم ہوئے۔ اس لیے ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا اور اعلان جنگ کیا۔ اگرچہ اٹلی جرمنی کے اتحاد ثلاثہ کا رکن تھا لیکن اس نے جنگ میں جرمنی کا ساتھ نہیں دیا۔ بعد ازاں اس نے جرمنی کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ جنگ کا دورانیہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے کئی دوسرے ممالک بھی اس میں شامل ہوگئے اور ابتداءً ایک یورپی جنگ نے تباہ کن عالمی جنگ کی شکل اختیار کرلی جو 11 نومبر 1918 کو ختم ہوئی۔

9.3 پہلی جنگ عظیم کی ذمہ داری (Responsibility for the First World War)

جیسے ہی اگست 1914 میں یورپی جنگ شروع ہوئی، تقریباً تمام متحارب ممالک میں جنگی ذمہ داری کے حوالے سے ایک شدید تنازعہ شروع ہو گیا۔ کوئی بھی فریق جنگ کی ذمہ داری قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سب کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے قیام امن کے لیے زیادہ سے زیادہ کوششیں کی ہیں لیکن مخالف قوموں کی پالیسیوں کی وجہ سے جنگ چھڑ گئی۔ اپنے فریق کو جنگی جرائم سے پاک رکھنے اور تمام تر ذمہ داری دشمن ملک پر ڈالنے کے لیے مختلف متحارب ممالک کی حکومتوں نے خفیہ سفارتی دستاویزات کو اس طرح سجا کر شائع کرنا شروع کر دیا کہ عالمی رائے عامہ کے سامنے ان کی اپنی غلطیوں پر پردہ پڑ جائے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جنگ کی ذمہ داری کا تعین ایک بار پھر موضوع بحث بن گیا۔ معاہدہ ورسائی کی دفعہ 231 میں جنگ کی تمام تر ذمہ داری مرکزی طاقتوں پر ڈال دی گئی۔ کہا گیا کہ جنگ چھڑنے کی تمام تر ذمہ داری جرمنی اور اس کے اتحادیوں پر عائد ہوتی ہے۔

معاہدہ ورسائی کے اس یکطرفہ فیصلے کے بعد بھی یہ سوال زیر بحث رہا کہ کیا جرمنی تنہا اس جنگ کا ذمہ دار تھا؟ کیا اس نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر دوسرے ممالک پر جنگ مسلط کی؟ کیا جرمن گروپ کی مخالف قومیں مکمل طور پر بے قصور تھیں یا ان کی بھی کچھ ذمہ داری تھی؟ اس بحث کے تناظر میں جرمنی نے کچھ ریاستی دستاویزات شائع کیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عالمی جنگ شروع ہونے سے پہلے کے نازک دنوں میں جرمنی نے جنگ کو ہونے سے روکنے کی حقیقی کوششیں کی تھیں۔ اس سے یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ جرمنی نے جان بوجھ کر جنگ بھڑکانے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح دیگر ممالک کی حکومتوں نے بھی اپنی سرکاری دستاویزات شائع کیں۔ نئے دستاویزی ثبوتوں اور عظیم غیر جانبدارانہ تاریخی تحریروں کے منظر عام پر آنے کے بعد، اب کوئی بھی غیر جانبدار شخص 1919 کے فاتحین کے اس دعوے کو قبول نہیں کرے گا کہ جرمنی اور اس کے اتحادی جنگ کے شروع ہونے کے لیے مکمل طور پر ذمہ دار تھے۔ اس مواد کا مطالعہ کرنے کے بعد صرف یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہر چھوٹے یا بڑے ملک کی جنگ کی کوئی نہ کوئی ذمہ داری تھی اور اس کے لیے صرف جرمنی کو موردالزام ٹھہرانا سراسر ناانصافی ہے۔

سربیا کی ذمہ داری۔ سب سے پہلے، جنگ شروع ہونے کے لیے سربیا کی حکومت کی ذمہ داری کو دیکھا جانا چاہیے۔ قوم پرستی کے جذبے سے متاثر ہو کر سربیا تمام بکھرے ہوئے لوگوں کو ایک ریاست میں متحد کرنا چاہتا تھا۔ اس وجہ سے اس کا آسٹریا کے ساتھ تنازعہ ناگزیر تھا۔ اس صورتحال میں اسے روس کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ سراجیو (Sarajevo) میں ہونے والا قتل اسی ہمہ گیر قوم پرستی کا نتیجہ تھا۔ سربیا کی حکومت کے کئی اہم اہلکار اس سازش سے پوری طرح باخبر تھے۔ وہ ان آدمیوں کو بھی جانتے تھے جو آسٹریا کے ولی عہد کو قتل کرنے کے لیے سراجیو جا رہے تھے۔ اس کے باوجود ان لوگوں نے سازش کرنے والوں کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ آسٹریا کو کوئی انتباہ یا اطلاع نہیں دی گئی۔ ایک بار پھر، سربیا کی حکومت نے ولی عہد کے قاتلوں یا ان کے ساتھی سازشیوں کو گرفتار کرنے اور انہیں مقدمے کے کٹہرے میں لانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ ان میں سے ایک کو فرار ہونے میں بھی مدد ملی۔ قتل کے بعد جب آسٹریا نے ملزمان کی تلاش میں آسٹریائی حکام

کا تعاون لینے کا مطالبہ کیا تو سربیا کی حکومت نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ ایسا رویہ اختیار کرتے ہوئے سربیا نے جنگ شروع ہونے کی فوری وجہ پیش کی اور اسی بنیاد پر وہ جنگ کا ذمہ دار بنتا ہے۔

آسٹریا کی ذمہ داری: ایل سی ایف ٹرنر یہ دلیل دیتے ہیں کہ جنگ 'ایک غلط اندازے کے خمیازے' کے طور پر ہوا۔ آسٹریا نے غلط اندازہ لگایا کہ روس، سربیا کا ساتھ نہیں دیگا۔ جرمنی نے بنا شرط آسٹریا کو مدد دے کر غلط اندازہ لگایا؛ جرمنی اور روس کے سیاست دانوں نے یہ غلط سوچا کہ ایک جٹ ہونے سے جنگ نہیں ہوگی۔ اس طرح آسٹریا کی ذمہ داری پر غور کرتے ہوئے سربیا کے خلاف اس کی جارحانہ پالیسی، سربیا کی آسٹریا مخالف پالیسی اور آسٹریا کی اس سے ناراضگی اور آسٹریا کی اندرونی کمزوری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے وجود کو عظیم تر سربیا کے منصوبے اور پان سلاو کی تحریکوں سے خطرہ لاحق تھا۔ یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ کوئی بھی قوم اپنے پڑوسیوں کے ہاتھوں اپنے ٹوٹنے کا انتظار کرتی رہے گی۔ جس انداز میں آسٹریا کے مستقبل کے شہنشاہ کو انتہاپسندوں نے قتل کیا، اس کے پیش نظر سربیا کو سزا دینا ضروری تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو آسٹریا کا وقار مکمل طور پر تباہ ہو جاتا۔ لہذا، ورسٹولڈ نے سربیا کو کچلنے کا فیصلہ کیا اور ایک ایسا الٹی میٹم تیار کیا جسے سربیا کو بہر حال مسترد کرنا پڑا۔ اس امکان سے بچنے کے لیے کہ کوئی ثالث مداخلت نہ کر سکے، آسٹریا نے فوری طور پر جنگ کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ جرمنی روس کو روک دے گا اور جنگ مقامی رہے گی۔ لیکن، اس کا منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے سربیا پر حملہ کر کے روس کو اکسایا اور اس سلسلے میں آسٹریا کو جنگ شروع کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

روس کی ذمہ داری: آسٹریا اور سربیا کے تنازعے کے لیے کسی حد تک روس براہ راست ذمہ دار تھا۔ اس نے ہمیشہ آسٹریا کے خلاف سربیا کی حوصلہ افزائی کی۔ سربیا نے آسٹریا کے ساتھ جنگ کی صورت میں روس کے تعاون کی بھی امید ظاہر کی۔ روس عظیم طاقتوں میں پہلا ملک تھا جس نے اپنی فوج کو متحرک کیا۔ ایک طرف وہ سیاسی مذاکرات کر رہا تھا اور دوسری طرف خفیہ طور پر فوجی تیاریاں بھی کر رہا تھا۔ یہ اس کی سب سے بڑی ذمہ داری تھی۔ اس نے جرمنی اور آسٹریا دونوں کو خوفزدہ کر دیا۔ اسی وقت جب جرمنی، آسٹریا پر مسئلے کے پرامن حل کے لیے دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا، اسی وقت روس نے افواج کو سرحدوں پر پہنچنے کا حکم دیا۔ روس کا یہ اعلان جرمنی کی فوجی نقل و حرکت اور اعلان جنگ کی وجہ بن گیا۔ روسی حکام بخوبی جانتے تھے کہ اگر روس نے اپنی فوج کو متحرک کیا تو جرمنی کو نہ صرف روس کے اسٹریٹجک منصوبوں پر بلکہ فرانس کے منصوبوں پر بھی توجہ دینی پڑے گی۔ اس طرح روس کی جلد بازی نے مسئلہ کو سفارتی دائرے سے فوجی میدان میں منتقل کر دیا۔ اگر روس ایسی کارروائی نہ کرتا تو شاید جنگ کے بغیر ہی مسئلہ حل ہو جاتا۔

جرمنی کی ذمہ داری: کچھ مورخین، جن میں ایک جرمن مورخ فرٹز فشر بھی شامل ہیں، یہ مانتے ہیں کہ 'جرمنی نے دنیا میں سب سے اعلیٰ ترین بننے کے ارادے سے جان بوجھ کر انگلینڈ، فرانس اور روس کے ساتھ جنگ کی۔' کچھ دوسروں کا ماننا ہے کہ جرمنی جنگ کا خواہشمند نہیں تھا۔ آسٹریا اس کی دوست ریاست تھی، جس پر وہ مکمل اعتماد کر سکتا تھا۔ نتیجے کے طور پر وہ آسٹریا چھوڑ نہیں سکتا تھا اگر وہ ایسا کرتا تو اس کے لیے بڑی مشکل پیدا ہو جاتی۔ یہ ایک طرف سے روس اور دوسری طرف فرانس سے گھرا ہوا تھا۔ سب سے افسوس ناک بات یہ تھی کہ سہ فریقی

معاہدے کے رکن ممالک نے اس پر بالکل اعتماد نہیں کیا۔ روس، فرانس اور برطانیہ میں ایک عام خیال تھا کہ آسٹریا ہر کام جرمنی سے پوچھ کر اور اس کے تمام مشورے لے کر کرتا ہے۔ لیکن، ایسا نہیں تھا۔ جب جرمن چانسلر بیتھ مین ہالویگ (Bethmann Hollweg) نے سمجھ لیا کہ روس سربیا کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے، برطانیہ غیر جانبدار نہیں رہ سکتا اور یورپی جنگ کا امکان ہے۔ جولائی کے طوفانی دنوں میں بیتھ مین نے آسٹریا کو روکنے اور جنگ کو ٹالنے کی دیانتداری سے کوشش کی لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس صورت حال میں جرمنی اپنی جغرافیائی پوزیشن کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ جب جنگ چھڑ گئی تو اس کے لیے جلدی سے کاروائی کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ پہلے تو اسے فرانسیسی فوج کو مکمل شکست دینی تھی اور پھر روس کی خبر لینی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ بیلجیم کے راستے اپنی فوج فرانس بھیجے۔ روس کے متحرک ہونے کے تناظر میں خاموش رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ عام طور پر تمام ممالک کے فوجی افسران، فوجی نقل و حرکت ہونے کا مطلب اعلان جنگ سمجھتے تھے۔ اس صورت حال میں روس کے متحرک ہونے کی خبر ملتے ہی جرمنی نے بھی روس اور فرانس کو الٹی میٹم دے دیا۔ فرانس سے اپنا رویہ واضح کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور روس کو متنبہ کیا گیا کہ اگر اس نے اپنی فوج کی نقل و حرکت منسوخ نہ کی تو جرمنی کو بھی عام فوجی نقل و حرکت کا حکم دینے پر مجبور کیا جائے گا۔ جب دونوں کی طرف سے جوابات تسلی بخش نہ ہوئے تو جرمنی نے اعلان جنگ کر دیا۔ یوں جرمنی آسٹریا سے دوستی اور اپنی حماقت کا شکار ہو گیا۔

فرانس کی ذمہ داری: فرانس کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس نے روس کی مکمل حمایت کی اور کسی بھی وقت تحمل سے کام لینے کا مشورہ نہیں دیا۔ روس کے اپنے دورے کے دوران، فرانسیسی صدر ریمنڈ پوئنکارے (Raymond Poincaré) نے زار کو یقین دلایا تھا کہ ایک اتحادی کے طور پر فرانس، آسٹریا کو سربیا کو کچلنے سے روکنے کے لیے ہر قیمت پر روس کا ساتھ دے گا۔ اس نے روس کو سخت موقف اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ اس نے روس کو فوجی کارروائی شروع کرنے سے نہیں روکا، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر روس ایسا کرتا ہے تو جرمنی خاموش نہیں بیٹھے گا۔

برطانیہ کی ذمہ داری: برطانوی خارجہ سیکریٹری، سر ایڈورڈ گرے (Edward Grey) نے قیام امن کے لیے بہت سے کام کیے لیکن وہ سب ناکام رہے۔ اس کے لیے جرمنی کا رویہ جزوی طور پر ذمہ دار تھا۔ اس کے باوجود برطانیہ کو الزام سے بری نہیں کیا جا سکتا۔ سر ایڈورڈ گرے کے لیے درج ذیل دو چیزوں میں سے ایک کام کرنا ضروری تھا۔ بحران کے ابتدائی دنوں میں، اسے جرمنی کو واضح انتباہ دینا چاہیے تھا کہ اگر یورپی جنگ چھڑ گئی تو برطانیہ اپنے اتحادیوں (فرانس اور روس) کا ساتھ دے گا۔ اگر ایسا ہوتا تو جرمنی آسٹریا پر مکمل دباؤ ڈالتا اور روس اور آسٹریا کے درمیان مذاکرات کامیاب ہوتے۔ یا فرانس اور روس کو واضح وارننگ دی جاسکتی تھی کہ اگر وہ جنگ میں شامل ہوئے تو وہ غیر جانبدار رہے گا۔ اس صورتحال میں روس نے متحرک ہونے کے فیصلے کے بارے میں سو بار سوچا ہو گا۔ لیکن، سر ایڈورڈ گرے نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ یہ درست ہے کہ کچھ سیاسی اور قانونی رکاوٹیں تھیں۔ انہیں اپنی کابینہ کی مکمل حمایت حاصل نہیں تھی۔ برطانوی رائے عامہ بھی بہت غیر یقینی تھی۔ اس کا یہ تاثر بھی تھا کہ جرمنی اپنے اتحادی آسٹریا کے غلط کاموں کی حمایت کر رہا ہے اور برلن کی صورت حال شہری حکام نہیں بلکہ پرشین عسکریت پسندوں کے کنٹرول میں ہے۔ اس تجزیہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ جنگ کی ذمہ داری کسی ایک ملک پر عائد کرنا مناسب

نہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے ذمہ دار تقریباً تمام ممالک تھے۔اس کے لیے اکیلے جرمنی کو ذمہ دار ٹھہرانا غلط ہے۔

9.4 پہلی جنگ عظیم کے اثرات (Impact of the First World War)

نتائج کے لحاظ سے پہلی جنگ عظیم عالمی تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا۔اس میں جان و مال کا نقصان حیران کن تھا۔اس نے بیک وقت کئی سلطنتوں اور خاندانوں کو تباہ کیا۔ آسٹریا ہنگری سلطنت بکھر گئی اور ہیپسبرگ خاندان کا خاتمہ ہوا۔ 1917 میں ہی، روسی انقلاب نے رومانوف خاندان کا خاتمہ کیا، وہاں ایک جمہوریہ قائم کیا اور مقبوضہ علاقوں کو آزاد کرایا۔ جرمنی اور ترکی کا بھی یہی حشر ہوا۔ان فوری نتائج کے علاوہ پہلی جنگ عظیم کے کچھ تاریخی نتائج بھی نکلے جن کی اہمیت بہت دوررس تھی۔اس جنگ میں مال و دولت کی بے پناہ تباہی ہوئی۔ چالیس سال سے کم عمر کے تقریباً ایک کروڑ افراد ہلاک اور دو کروڑ کے قریب زخمی ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم میں مرنے والے فوجیوں کی تعداد 1790 سے 1913 عیسوی تک دنیا کے مختلف حصوں میں ہونے والی تمام بڑی جنگوں میں مارے جانے والے فوجیوں کی دگنی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ آبادی کے اس بڑے نقصان کا اثر جنس (Sex) اور عمر (Age) پر بھی پڑا۔جنگ میں مرنے والوں میں خواتین کی تعداد بہت کم تھی۔اس لیے جنگ کی وجہ سے مردوں اور عورتوں کے تناسب میں بہت فرق آگیا۔ انگلینڈ میں 1911 میں، ہر 1000 مردوں کے مقابلے میں 1067 خواتین تھیں۔ 1921 میں ہر 1000 مردوں کے لیے 1093 خواتین تھیں۔یہ عدم توازن، جنگ کے بعد 'فاضل خواتین' کے مسئلے پر بحث کا باعث بنا۔یورپ کی شرح پیدائش، جو کہ 1914 سے پہلے ہی گراوٹ کا شکار تھی، جنگ کے دوران تیزی سے گر گئی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگ کے دوران خاندانی زندگی درہم برہم ہو گئی تھی۔ لیکن جنگ کے فوراً بعد آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا۔اس حقیقت کا اندازہ 1930 میں یورپی اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔ 1930 میں اسکولوں میں گیارہ سے پندرہ سال کے بچوں کی تعداد بہت کم تھی جبکہ پانچ سے دس سال کی عمر کے بچوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ عمری ابھار (Age Bulge) کے اس مسئلہ کا اثر 1960ء تک نظر آتا رہا۔

املاک کی تباہی کے حوالے سے بھی یہ جنگ بے مثال تھی۔ جنگ میں شامل تمام فریقوں کو تقریباً 18 کروڑ 60 لاکھ ڈالر خرچ کرنے پڑے۔ مزید برآں، جنگ میں تقریباً 39 ارب ڈالر مالیت کی املاک تباہ ہوئی۔ مجموعی طور پر مختلف ممالک کو جنگ کی وجہ سے تقریباً 337 کروڑ ڈالر کا معاشی بوجھ اٹھانا پڑا۔ تقریباً تمام حکومتوں کو اپنی مالی صورتحال کو کنٹرول کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں نوٹ چھاپنا پڑے، جس کے نتیجے میں مہنگائی کا سنگین مسئلہ پیدا ہوا۔ ہر طبقے کے لوگوں کو مہنگائی کا کڑوا پھل چکھنا پڑا۔ مقررہ آمدنی والے لوگ خاص طور پر تباہ ہوئے۔اس مالی صورتحال کا براہ راست اثر، ان کی سماجی حیثیت، وقار اور معیار زندگی پر پڑا۔ جنگ کے دوران تمام ممالک کی حکومتوں نے خطیر رقم کے قرضے لیے تھے۔ان قرضوں کی ادائیگی کے لیے عوام کو سالوں تک زیادہ سے زیادہ ٹیکس ادا کرنا پڑا۔

پہلی جنگ عظیم نے خواتین کی آزادی کی راہ ہموار کی۔ زیادہ تر صحت مند آدمی فوج میں شامل ہوئے یا فوجی کام کیا۔اس لیے فیکٹریوں اور دکانوں، اسپتالوں اور اسکولوں، دفاتر اور رضاکارانہ تنظیموں میں عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔یہ صورت حال عارضی نہیں بلکہ

مستقل ثابت ہوئی۔ اب عورتیں وہ کام کرنے لگیں جو پہلے صرف مرد کرتے تھے۔ اس طرح معاشرے میں خواتین کے مقام میں انقلابی تبدیلی آئی۔ میاں بیوی کے تعلقات اور شادی کی نوعیت میں بھی بدلاؤ دیکھنے کو ملے۔ لاکھوں خواتین کی سوچ، بیرونی دنیا سے جڑ گئی۔ خواتین اب مردوں کے برابر حقوق کا دعویٰ کرنے لگیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی یورپی ممالک میں خواتین کو ووٹ کا حق ملا۔ 1918 میں پہلی بار برطانیہ میں خواتین کو ووٹ کا حق حاصل ہوا۔ جنگ کے دوران کھائیوں میں ساتھ ساتھ رہنے، مشترکہ قومی خطرے اور محنت کی وجہ سے پیدا ہونے والے سماجی بھائی چارہ نے طبقے اور جائیداد کی بندشوں کو اگر مکمل طور پر نہیں ختم کیا تو کم از کم اسے کمزور ضرور کر دیا۔ سماجی روایات میں نمایاں تبدیلی آئی۔ امیر اور غریب کو یکساں جنگ کے بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ منافع خور اور کالا بازاری کرنے والے نفرت اور حقارت کا نشانہ بن گئے۔ جنگ نے معاشی مساوات کے مثالی نظریے کی نئی حوصلہ افزائی کی۔ 'خطرہ ہم سب کو اشتراکی بناتا ہے۔' یہی وجہ تھی کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد اشتراکیت (Socialism) تیزی سے پھیلی۔

پہلی جنگ عظیم کا سب سے اہم سماجی و اقتصادی نتیجہ سرمایہ داری کی شکل میں بنیادی تبدیلی تھی۔ پرانی یا کلاسیکی سرمایہ داری، آزاد تجارت (*Laissez Faire*) کے اصول پر مبنی تھی۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی حکومتوں نے چنگی (custom duty) عائد کرنا، قومی صنعتوں کی حفاظت، سامراجی توسیع کے ذریعے منڈیوں اور خام مال کی تلاش اور محنت کش طبقے کے مفادات میں حفاظتی سماجی قوانین نافذ کرنا شروع کر دیے تھے۔ جنگ کے دوران تمام متحارب ممالک کی حکومتوں نے معیشت کو زیادہ باریکی سے کنٹرول کیا۔ در حقیقت پہلی جنگ عظیم کے دوران ہی منصوبہ بند معیشت نافذ کی گئی تھی۔ پہلی بار ایک متعین مقصد کے لیے ریاست نے تمام املاک، وسائل اور سماج کے اخلاقی مقاصد کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ کسی کو اتنی طویل جنگ کا اندازہ نہیں تھا، اس لیے جنگ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کسی نے کوئی پیشگی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ اس لیے فوری طور پر ہر چیز کا بندوبست کرنا پڑا۔ 1916 تک، ہر حکومت نے جنگی کوششوں کو مربوط کرنے کے لیے بورڈز، بیورو، کونسلز اور کمیشن قائم کیے تھے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ تمام انسانی وسائل، خام مال اور درآمدی سامان کو جنگ کے لیے موثر طریقے سے استعمال کیا جائے۔ جنگ کی مصیبتوں میں، آزاد مسابقت کا طریقہ مہنگا پایا گیا اور غیر ہدایتی فرداً فرداً کاروبار انتہائی سست اور متلون محسوس ہونے لگا۔ منافع کی نوعیت بدنام ہو گئی۔ جو تاجر مال کی قلت کا فائدہ اٹھا کر منافع کما رہے تھے انہیں 'منافع خور' قرار دیا گیا۔ تاجروں کو ان کی مرضی کے مطابق کارخانے کھولنے اور بند کرنے کا حق نہیں دیا گیا۔ حکومتی اجازت کے بغیر نیا کاروبار شروع کرنا ناممکن ہو گیا، کیونکہ اسٹاک اور بانڈز کے گھٹنے بڑھنے (flotation) کو کنٹرول کیا گیا اور حکومت کی مرضی سے خام مال دستیاب کرایا گیا۔ جنگ سے متعلقہ اشیاء کی پیداوار سے متعلق صنعتوں کو بند کرنا ناممکن ہو گیا۔ اگر ایسے کارخانے گھاٹے میں چل رہے تھے یا چلنے سے قاصر تھے تو حکومت نقصان اٹھا کر یا مالی امداد دے کر انہیں چلاتی تھی۔ یہاں مقابلہ اور منافع کی پرواہ نہیں کی گئی۔ اب نیا مقصد پورے ملک کے مفاد میں پیداوار کو مربوط یا معقول بنانا تھا۔ مزدوروں کو کام کے اوقات یا اجرت پر احتجاج کرنے سے روک دیا گیا اور بڑی مزدور یونینوں نے ہڑتالوں سے پرہیز کرنے پر اتفاق کیا۔ اعلیٰ اور متوسط طبقے کے لیے اپنی مراعات کا اظہار شرمناک بن گیا۔ کم کھانا اور پرانے کپڑے پہننا حب الوطنی کا مظہر تھا۔ جنگ نے مشترکہ خطرے میں امیر اور غریب سبھی کی حمایت حاصل کرنے کے لیے معاشی مساوات کے خیال کو نئی تحریک دی۔

افرادی قوت کے اختصاص (allocation) کی طرف پہلا قدم فوجی بھرتی تھا۔ تمام حکومتوں کے سامنے سوال یہ تھا کہ دستیاب مرد آبادی کو فوجی اور سویلین مقاصد کے لیے کیسے تقسیم کیا جائے، تاکہ کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ فوجی ضروریات کے پیش نظر مرد آبادی سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کے لیے حکومت نے ان صنعتوں کو بند کر دیا یا ان کی تعداد بہت کم کر دی جن کی عسکری نقطہ نظر سے کوئی اہمیت نہیں تھی۔ حکومت نے نہ تو لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور کیا اور نہ ہی انہیں کوئی پیشہ جوائن کرنے یا چھوڑنے پر مجبور کیا۔ لیکن اجرتوں کی شرحیں طے کر کے، کچھ لوگوں کو فوجی بھرتی سے مستثنیٰ قرار دے کر، کچھ صنعتوں کی توسیع کا حکم دے کر اور کچھ کو محدود کر کے اور اس خیال کو پھیلا کر کہ اسلحہ ساز فیکٹریوں میں کام کرنا حب الوطنی ہے، حکومت نے بڑی تعداد میں لوگوں کو اسلحہ سازی کی صنعتوں میں جانے کی تحریک دلائی۔ پہلی جنگ عظیم میں بندھوا مزدوری کا استعمال نہیں ہوا اور نہ ہی جنگی قیدیوں سے مزدوری کرائی گئی۔ البتہ، جرمنی نے اس معاملے میں بعض مقامات پر بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ضرور کی۔

حکومت نے تمام غیر ملکی تجارت کو کنٹرول کیا۔ یہ ناقابل برداشت تھا کہ لوگ اپنی مرضی سے قومی وسائل بیرون ملک برآمد کریں۔ شہریوں کے ذریعے غیر ضروری اشیا درآمد کر کے زر مبادلہ کا غلط استعمال یا مسابقت کے ذریعے قیمتیں بڑھانا حکومت کے لیے اتنا ہی ناقابل برداشت تھا۔ بیرونی تجارت پر ریاستی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ پرائیویٹ فرمیں سخت لائسنس اور کوٹے کے تحت چلائی جانے لگیں۔ غیر جانبدار ممالک بھی اس سے متاثر ہوئے۔ مثال کے طور پر ہالینڈ کی حکومت نے درآمدات اور برآمدات کو کنٹرول کرنے کے لیے 'نیدرلینڈ اوورسیز ٹرسٹ' قائم کیا۔ امریکی حکومت نے بھی 1917 میں قانون کے ذریعے اناج اور صنعتی اشیا کی قیمتوں کو کنٹرول کیا۔ ہر حکومت کو ایک جہاز رانی بورڈ قائم کرنا پڑا، تاکہ فوجوں کی آمد و رفت اور سامان کی ڈھلائی منظم طریقے سے ہو سکے۔ کنٹرول اور اختصاص نے بالآخر بین الاقوامی شکل اختیار کر لی۔ جنگ کے دوران ایک 'انٹر الائیڈ شپنگ کونسل' بنائی گئی جس کا امریکہ بھی ممبر تھا۔ انگلینڈ اور فرانس میں جہاں تمام پیدا کنندگان کا دار و مدار درآمد پر تھا وہ حکومتی کنٹرول میں آ گئے اور اس طرح پوری معیشت پر حکومت کا کنٹرول قائم ہو گیا۔ روس اور مغربی یورپ تک رسائی سے محروم جرمنی کو بھی غیر متوقع طور پر معاشی خود انحصاری کی پالیسی اپنانی پڑی۔ جنگ کے آخری دنوں میں رومانیہ سے حاصل کیا جانے والا تیل اور یوکرین سے حاصل کی جانے والی گندم جرمنی کی ضروریات سے بہت کم پڑ رہی تھی۔ جرمنی دوسرے متحارب ممالک سے زیادہ بھوکا تھا۔ اس لیے جرمنی کو زیادہ مضبوط اور موثر حکومتی کنٹرول قائم کرنا تھا، جسے جنگی اشتراکیت کہا جاتا ہے۔ جرمنی کو والٹر ریتھنو (Walter Rathnau) کی صورت میں ایک باصلاحیت منتظم ملا۔ وہ ایک صنعت کار، جرمن بجلی کے ٹرسٹ کے مالک کا بیٹا، اور ایک جرأت مند اور آگے کی سوچ رکھنے والا آدمی تھا۔ وہ ان چند لوگوں میں سے ایک تھا جنہوں نے ایک طویل جنگ کی توقع کی تھی۔ اسے جنگ کے دوران خام مال کی نقل و حرکت کا انچارج بنایا گیا۔ جنگ کے آغاز میں ایسا لگتا تھا کہ بارود بنانے کے لیے درکار نائٹروجن کی کمی کی وجہ سے جرمنی ہار جائے گا۔ ریتھنو نے تیزی سے ہر مفروضہ قدرتی ذریعہ، یہاں تک کہ کسانوں کے بون یارڈ سے کھاد بھی جمع کر لی۔ جرمن کیمیائی صنعت میں بہت سے متبادل تیار کیے گئے، جیسے مصنوعی ربڑ۔ ریتھنو نے ہر صنعت کے لیے ایک جنگی کمپنی بنا کر جرمن پیداوار کو منظم کیا۔ یہ کمپنیاں ایک قسم کا ٹرسٹ ہوتی تھیں جو صنعت سے متعلق مختلف کاروباری اداروں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ حکومت کے کنٹرول میں، ہر کمپنی

نے پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا، قیمتوں کو کنڑول کیا، ممبر فرموں اور اداروں کو خام مال مختص کیا اور یہ طے کیا کہ ہر کان اور فیکٹری کو کس طرح پیداوار کرنی چاہیے۔ جنگ، کمپنیوں کی مسابقت پر پابندی کی علامت تھی اور 1890 عیسوی سے یورپ اور امریکہ میں ٹرسٹ اور اجارہ داری کے بڑھتے ہوئے رجحان کا موضوع تھی۔

ریتھنو کا خیال تھا کہ اس کی جنگی کمپنیاں، نجی کارپوریشن اور سرکاری بیورو سے الگ ایک درمیانی راستہ ہے اور اس کا خیال تھا کہ جنگ کے بعد ایسا نظام مستقل طور پر تشکیل دیا جائے گا۔ اپنی کتاب *Of Things to Come* میں، اس نے ایک صنعتی معاشرے کی تصویر کشی کی جس میں مسابقت اور منافع خوری ختم کر دی جائے گی اور منتظم اور کارکن مل کر صنعتیں چلائیں گے، منصوبے بنائیں گے، آپس میں ذمہ داریاں بانٹیں گے اور ایمانداری سے منافع بانٹیں گے۔ اس کے خیالات کا اثر جنگ کے بعد جرمنی اور جرمنی سے باہر دوسرے ممالک میں نظر آتا ہے۔ اس میں ہمیں روسی اشتراکیت، جرمن نازیت اور اطالوی فسطائیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ جرمنی میں تو جنگ نے آزادانہ مقابلے پر لوگوں کے بھروسے کو ہی ختم کر دیا۔ دیگر متحارب حکومتوں نے بھی آزاد فرموں اور کارخانوں کے درمیان مقابلے کے بجائے ربط وضبط قائم کیا۔ فرانس میں صنعت کاروں کے گٹھبندھن نے مختلف صنعتوں کے درمیان خام مال الاٹ کیا۔ امریکہ میں برنارڈ برچ (Bernard Bruch) کی سربراہی میں 'وار انڈسٹریز بورڈ' نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ نظام برطانیہ میں بھی بہت کامیاب رہا۔ کوئی بھی حکومت کسی بھی قسم کے ٹیکس لگا کر جنگ کے لیے مطلوبہ اخراجات نہیں بڑھا سکتی تھی۔ لہٰذا، ہر متحارب ملک کو کاغذی کرنسی چھاپنی پڑتی تھی، بھاری بانڈز جاری کرنا پڑے اور بینکوں کو زیادہ سے زیادہ رقم فراہم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اشیا کی قلت اور کرنسی کی ضرورت سے زیادہ گردش کی وجہ سے مہنگائی پیدا ہوئی۔ قیمتوں اور اجرتوں کو منضبط کیا گیا تھا، لیکن 1914 سے پہلے کی قیمت قائم نہیں ہو سکی۔ مہنگائی کا سب سے زیادہ شکار تنخواہ دار طبقہ ہوا جس کی آمدنی میں آسانی سے اضافہ نہیں ہو سکتا تھا۔ تنخواہ دار کارکن اور مقررہ آمدنی والے لوگ جنگ سے پہلے یورپی معاشرے میں ایک مستحکم طبقہ تھے۔ ہر جگہ جنگ نے ان کے وقار، ان کے معیار زندگی اور ان کی اہمیت کو خطرے میں ڈال دیا۔ بڑھتے ہوئے قومی قرض کا مطلب آنے والے سالوں میں زیادہ ٹیکس لگانا تھا۔ دوسرے ممالک سے لیے گئے قرضوں کی وجہ سے قرضوں کا مسئلہ مزید سنگین ہو گیا۔ جنگ کے دوران یورپی ممالک نے برطانیہ سے قرض لیا اور سب نے مل کر امریکہ سے قرض لیا۔ اس طرح اس نے اپنے مستقبل کو یرغمال بنالیا۔ قرض کی ادائیگی کے لیے وہ سالوں سے برآمد (export) سے زیادہ درآمد (import) کرنے پر مجبور تھے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ 1914 میں ہر ترقی یافتہ یورپی ملک عادتاً درآمد سے زیادہ برآمد کرتا تھا۔

تمام متحارب حکومتوں نے معاشی پیداوار کے طور پر نظریات کو کنڑول کرنے کی کوشش کی۔ وہ آزادی فکر، جو تقریباً پچاس سال سے یورپ میں پائی جاتی تھی، اب عملی طور پر سلب کر دی گئی تھی۔ پروپیگنڈا اور سنسر شپ کو مزید موثر بنایا گیا۔ حکومتی کنڑول کو چیلنج کرنے کی عادت ناپسند کی جانے لگی۔ مخالف ممالک کے درمیان الزامات اور جوابی الزامات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ طویل جدوجہد، لاحاصل لڑائی، ناقابل حل جنگی سوالات اور بھاری جانی نقصان سے عوام کے حوصلے ٹوٹ رہے تھے۔ اس کا مقصد عام آزادیوں سے محروم، محنت کرنے، سادہ کھانا کھانے اور فتح کے آثار نہ دیکھنے والے عوام کے حوصلے کو جذباتی انداز میں بلند رکھنا تھا۔ پوسٹرز، اشتہارات، سفید دستاویز، اسکول کی کتابوں،

عوامی تقاریر، رسمی ادارتی مضامین، اخباری رپورٹس وغیرہ کے ذریعے لوگوں کے حوصلے بلند کرنے کی کوشش کی گئی۔ عالمگیر خواندگی، بڑی تعداد میں اخبارات اور متحرک تصاویر کے ذریعے رائے عامہ پر اثرانداز ہونے کی کوششیں کی گئیں۔ دانشوران اور پروفیسرز نے پیچیدہ تاریخی دلائل کے ذریعے مخالف ممالک کی شکست کے ناگزیر ہونے کی پیشین گوئی کی۔ اتحادی ملکوں میں جرمن قیصر کو جلتی آنکھوں اور ضرورت سے زیادہ کھڑی مونچھوں والے ایک عفریت کے طور پر پیش کیا گیا تھا جو ساری دنیا کو فتح کرنے کے لیے جنونی ہو رہا تھا۔ جرمن عوام کو اس دن سے ڈرنے کا کہا گیا جب کوزاک اور سینیگالی حبشی جرمن خواتین کی عصمت دری کریں گے۔ جرمنی میں انگلینڈ کو ایک ایسے کٹر دشمن کے طور پر پیش کیا گیا جو ناکہ بندی کے ذریعے معصوم بچوں کو بھوکا مار رہا تھا۔ ہر ملک نے اپنے آپ کو صحیح اور دوسرے کو غلط، برا اور وحشی قرار دیا۔ اس خوفناک جدوجہد میں مشتعل عوامی رائے نے مردوں اور عورتوں کو ہمت دی۔ لیکن جب امن قائم کرنے کا وقت آیا تو انہیں تعصبات، سخت نظریات، گہری نفرت، خوف اور بے حسی کی وجہ سے پائیدار امن کا قیام مشکل ثابت ہوا۔

لیکن، پہلی جنگ عظیم کا ایک زیادہ اہم اور دوررس نتیجہ عالمی سیاست میں یورپی غلبے کے خاتمے کے دور کا آغاز تھا۔ اب تک پوری دنیا میں یورپ کی طوطی بولتی تھی۔ یورپی ممالک، پوری دنیا کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہے تھے اور کسی میں ان کی مخالفت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ پہلی جنگ عظیم نے وہ عمل شروع کیا جس کی وجہ سے یورپی غلبہ کے اس دور کا خاتمہ ہوا۔ جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد یورپ کے زوال کی تمام علامات ایک ساتھ نظر آنے لگیں۔ عالمی جنگ کے بعد پیرس میں امن کانفرنس کا آغاز ہوا۔ اس کانفرنس میں نہ صرف یورپ کی اقوام بلکہ ایشیا، افریقہ اور امریکہ کی اقوام نے شرکت کی اور کانفرنس میں کیے گئے فیصلوں میں ان کا بڑا کردار تھا۔ پچیس تیس سال پہلے ایسے واقعے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جنگ کے بعد کے دور میں دنیا کا عظیم ترین شخص کوئی یورپی سیاست دان نہیں تھا بلکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا صدر وڈرو ولسن تھا، جس کی خوشامد میں فاتح اور مفتوح دونوں فریق لگے ہوئے تھے۔ پیرس امن کانفرنس میں غیر یورپی براعظموں کے سیاست دانوں نے جو کردار ادا کیا اس سے ثابت ہوا کہ وہ وقت گزر چکا ہے جب یورپی رہنما پوری دنیا کے معاملات آپس میں طے کرتے تھے۔ اس امن کانفرنس نے مجلس اقوام یا لیگ آف نیشنز بھی قائم کی۔ لیگ آف نیشنز کا قیام دنیا کے یورپی اور غیر یورپی حصوں کے درمیان بدلتے تعلقات کی سب سے نمایاں علامت تھی۔ یہ 1815 کے یورپی اجلاس سے مختلف تھا، کیونکہ اس کے رکن ممالک میں نہ صرف یورپ کے ممالک، بلکہ دنیا بھر کے ممالک بھی شامل تھے۔ جنگ سے پہلے یورپی طاقتوں کے فیصلوں کو غیر یورپی دنیا نے کبھی چیلنج نہیں کیا تھا، لیکن اب لیگ آف نیشنز کے قیام سے ان کی پالیسی اور طرز عمل کو بھی منظم اور کنٹرول کیا جا سکتا تھا اور وہ چھوٹی طاقتوں کو جواب دینے پر مجبور کیے جا سکتے تھے۔ بدلی ہوئی معاشی صورتحال نے مؤثر طریقے سے یورپ کو اپنے زوال کا احساس دلایا۔ یہ جنگ بہت مہنگی اور خرچیلی تھی۔ ٹیکس کے ذریعے بے تحاشا اخراجات پورے نہیں کیے جا سکے۔ اس لیے تمام حکومتوں کو قرضہ لینا پڑتا تھا اور یہ قرض اسے صرف امریکہ سے ہی مل سکتا تھا جس کی وجہ سے یورپ کی معاشی حالت میں امریکہ کے مقابلے میں واضح گراوٹ دیکھنے میں آئی۔ یورپی طاقتیں قرض دینے کی طاقتوں کے بجائے قرض لینے کی طاقتوں کے زمرے میں آ گئیں۔ امریکہ سے قرض لے کر یورپی اقوام نے اپنا مستقبل گروی رکھ لیا۔ برسوں تک وہ اپنی برآمد سے زیادہ درآمد کرنے پر مجبور تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں غیر یورپی ممالک میں لگائے گئے سرمائے میں بہت زیادہ کمی آئی اور یورپی ممالک کے لیے دوسرے براعظموں میں اقتصادی ترقی پر اثر انداز ہونے کے مواقع کم ہونے لگے۔ جنگ کے دوران یورپی ممالک نے اپنی صنعتی پیداوار کو جنگ پر مبنی کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کی برآمدی تجارت مکمل طور پر ٹھپ ہوگئی۔ نتیجتاً، غیر یورپی ممالک کو اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنی معاشی زندگی کو دوبارہ ترتیب دینا پڑا۔ یورپ چار سال تک جنگ میں پھنسا رہا۔ دریں اثنا، باقی دنیا نے اپنی صنعت کاری کی رفتار میں اضافہ کیا۔ امریکہ کی پیداواری صلاحیت بہت بڑھ گئی۔ جاپانیوں نے ایشیا اور جنوبی امریکہ کے ممالک کو اپنی منڈی بنالیا جہاں پہلے یورپی ممالک کی اجارہ داری تھی۔ ارجنٹائن اور برازیل، جو انگلینڈ سے ریلوے انجن کے پرزے اور کان کنی کے آلات حاصل کرنے سے قاصر تھے، انہیں اپنے آپ بنانا شروع کر دیا۔ پہلے کے پسماندہ ممالک اب نئی صورت حال میں صنعت کاری کی راہ پر آگے بڑھنے کے لیے تیار تھے اور انہوں نے بھی 1920 کی دہائی میں غیر معمولی ترقی کی۔ اسی طرح کی اقتصادی ترقی ہندوستان میں بھی ہوئی۔ مغربی ایشیا کے میدان جنگ میں سامان کی فراہمی کے لیے ہندوستان کی صنعتی ترقی کی حوصلہ افزائی ضروری ہوگئی۔ جنگ کی ضرورت نے برطانوی حکومت کو ہندوستان کی صنعتی ترقی پر عائد پابندیاں ہٹانے پر مجبور کیا۔ اس وقت مالدار پارسیوں کا ٹاٹا خاندان سامنے آیا۔ اس نے بے شمار صنعتی ادارے بنائے۔ ان میں سے ایک، بہار کی ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی(TISCO) برطانوی سلطنت میں اسٹیل کی سب سے بڑی فیکٹری بن گئی۔ جرمنی کے عالمی منڈی سے مکمل طور پر باہر ہونے کے بعد، برطانیہ اور فرانس بمشکل اپنے لیے پیداوار کر پارہے تھے۔ عالمی جہاز رانی مکمل طور پر جنگ سے متعلق سرگرمیوں میں مصروف ہو جانے کی وجہ سے، عالمی کارخانے کے طور پر مغربی یورپ کا مقام اب ثانوی ہو گیا ہے۔ اقتصادی میدان میں یورپ کے کئی نئے اور مضبوط حریف سامنے آئے۔ یہ واضح تھا کہ یہ دنیا پر یورپی تسلط کے خاتمے کا آغاز تھا۔

سیاسی میدان میں بھی یورپ کو غیر یورپی نوآبادیوں کی طرف سے سخت چنوتیوں ملنی شروع ہویں اور یورپی حکمرانوں اور نوآبادیاتی غلام عوام کے درمیان تعلقات میں ایک نئی تبدیلی جھلکنے لگی۔ جنگ کے دوران دوست اور اتحادی ممالک نے بڑے اور پرکشش نعرے لگائے تھے۔ جمہوریت کے لیے دنیا کو محفوظ بنانے کی باتیں ہوئیں اور خود ارادیت کا اصول پیش کیا گیا۔ اس سے محکوم لوگوں کے ذہنوں میں ایک نئی امید پیدا ہوئی اور وہ امید کرنے لگے کہ جنگ کے بعد انہیں بھی خود مختاری کا حق مل جائے گا۔ لیکن جنگ ختم ہوتے ہی سامراجی ریاستوں کا نوآبادیوں کے ساتھ وہی پرانا رویہ شروع ہو گیا۔ نتیجتاً نوآبادیوں میں شدید مایوسی کی فضاء چھا گئی۔ لہٰذا اب نوآبادیات میں سامراجی حکمرانی کی شدید مخالفت شروع ہوگئی۔ غیر فعال قوم پرستی بیدار ہوئی اور یورپی ممالک کو اپنی نوآبادیوں میں مضبوط قومی تحریکوں کا سامنا کرنا پڑا اور محکوم عوام عالمی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے لگے۔ استعمار بنام قوم پرستی کی جنگ میں قوم پرستوں کو بالشویک روس سے مدد ملنا شروع ہوگئی۔ انقلاب سے پہلے روس خود ایک سامراجی ملک تھا لیکن انقلاب کے بعد اس نے محکوم نسلوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ روس میں کومنٹرن کا قیام عمل میں آیا اور اس انقلابی تنظیم نے نوآبادیاتی عوام کو سامراج کے خلاف اکسانا شروع کیا۔ دنیا پر یورپی تسلط کے خلاف تمام تحریکوں کو روس کی حمایت کی وجہ سے دنیا پر یورپی تسلط کے دور کا خاتمہ نظر آنے لگا۔ اس طرح پہلی 'عالمی جنگ' اپنے نتائج کے ساتھ ایک عہد ساز واقعہ ثابت ہوئی، کیونکہ اس نے دنیا کے نقشے پر یورپی تسلط کے خاتمے کا آغاز کیا۔

9.5 ہندوستان اور پہلی جنگ عظیم (India and the First World War)

جنگ کے آغاز میں ہندستانی قوم پرستوں نے حکومت کی جنگی کوششوں کی حمایت کی۔ حمایت کرنے والوں میں لوکمانیہ تلک بھی شامل تھے، جو جون 1914ء میں رہا ہوئے تھے لیکن یہ طرز عمل برطانیہ کے ساتھ وفاداری یا اس کی ہمدردی میں اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ جواہر لال نہرو نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ 'وفاداری کے بلند بانگ دعوی کے باوجود برطانیہ کے ساتھ لوگوں کو بہت کم ہمدردی تھی۔ جرمنی کی کامیابیوں کی خبریں سن کر معتدلین اور انتہا پسند دونوں یکساں طور پر خوش ہوتے تھے۔ جرمنی کے ساتھ لوگوں کو کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی، بلکہ اپنے حکمرانوں کی ذلت سے انہیں مسرت ہوتی تھی۔ قوم پرستوں نے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر برطانیہ دوست طرز عمل اختیار کیا تھا کہ احسان مند برطانیہ ہندستان کی وفاداری کا بہتر صلہ دے گا اور ہندستان کو حکومت خوداختیاری کی شاہراہ پر گامزن کر دے گا۔ انہوں نے یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ مختلف عالمی طاقتیں تو جنگ ہی اسی لیے کر رہی تھیں کہ ان کی موجودہ نوآبادیاں بدستور ان ہی کے قبضے میں رہیں۔

9.5.1 ہوم رول تحریک (The Home Rule Movement)

بہت سے ہندستانی لیڈروں نے یہ بات واضح طور پر سمجھ تھی کہ جب تک عوامی دباؤ نہ ڈالا جائے گا، اس وقت تک حکومت کوئی مراعات نہ دے گی، اس لیے ایک حقیقی عوامی تحریک شروع کرنا ضروری ہے۔ بعض دوسرے عوامل بھی قومی تحریک کی اسی جانب رہنمائی کر رہے تھے۔ اس عالمی جنگ نے، جس میں یورپ کی سامراجی طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھیں، ایشیائی قوموں پر مغربی قوموں کی نسلی برتری کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ مزید براں جنگ نے ہندستان کے غریب تر طبقوں کی مشکلات میں اضافہ کیا تھا۔ ٹیکسوں میں اضافہ ہوا اور ضروریات زندگی کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ چنانچہ عوام کسی بھی انتہا پسند احتجاجی تحریک میں شامل ہونے کے لیے تیار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کا زمانہ ہندستان میں شدید قوم پرست سیاسی اضطراب کا زمانہ بن گیا۔ لیکن یہ سیاسی ہلچل انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت میں شروع نہیں ہوئی تھی، کیونکہ اس وقت کانگرس کی باگ ڈور معتدلین کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ ایک مجہول سیاسی جماعت بن گئی تھی۔ اس نے عوام میں کوئی ایسا سیاسی کام نہیں کیا تھا، جس پر وہ فخر کر سکتی۔ چنانچہ 1915-16ء میں دو ہوم رول تحریکیں قائم کی گئیں۔ ایک کی قیادت لوک مانیہ تلک کے ہاتھ میں تھی۔ اور دوسری کی مسز اینی بسنٹ اور سوبرامینیا ایر کے ہاتھ میں۔ ان دونوں لیگوں نے ملک بھر میں اس مطالبے کا عوام میں پروپیگنڈا کیا کہ جنگ کے خاتمے پر ہندستان کو خوداختیاری ملنی چاہئے۔ اس تحریک کے دوران میں تلک نے یہ نعرہ لگایا تھا کہ 'سوراج (حکومت خوداختیاری) میرا پیدائشی حق ہے، اور میں اسے لے کر رہوں گا۔' دونوں لیگوں نے تیزی سے ترقی کی اور ملک کے طول و عرض میں حکومت خوداختیاری کے مطالبے کی صدائیں گونجنے لگیں۔

9.5.2 غدر پارٹی (Ghadar Party)

جنگ کے دوران میں انقلابی تحریک نے بھی ترقی کی منزلیں طے کیں۔ دہشت پسند تحریک بنگال اور مہاراشٹر سے نکل کر شمالی ہند تک پھیل گئی۔ مزید براں بہت سے ہندستانی بغاوت کے ذریعے برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کے منصوبے بنانے لگے۔ 1913ء میں ہندستانی

انقلابیوں نے امریکا اور کناڈا میں غدر پارٹی قائم کی۔ اس کے اکثر ممبر سکھ کسان اور فوجی تھے، لیکن اس کے بیشتر لیڈر تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان تھے۔ میکسیکو، جاپان، چین، فلیپائن، ملایا، سنگاپور، تھائی لینڈ، ہند چین اور مشرقی و جنوبی افریقہ میں بھی غدر پارٹی کے سرگرم ممبران موجود تھے۔ غدر پارٹی کا نصب العین ہندستان کی برطانوی حکومت کے خلاف انقلابی جنگ شروع کرنا تھا۔ 1914ء میں جنگ شروع ہوتے ہی اس پارٹی کے لیڈروں نے طے کیا کہ اسلحہ اور آدمی ہندستان بھیجے جائیں تاکہ مقامی انقلابیوں اور سپاہیوں کی مدد سے بغاوت شروع کی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دسیوں لاکھ ڈالر جمع کیے گئے۔ بہتوں نے اپنی زندگی بھر کی کمائی دے ڈالی اور بہتوں نے چندہ دینے کے لیے اپنی جائیدادیں بیچ ڈالیں۔

غدر پارٹی کے لیڈروں نے مشرق بعید، جنوب مشرقی ایشیا اور ہندستان بھر میں پھیلی ہوئی ہندستانی فوج کی رجمنٹوں سے بھی رابطہ پیدا کیا اور انہیں بھی بغاوت میں شریک ہونے کی ترغیب دی۔ بالآخر پنجاب سے بغاوت کا آغاز کرنے کے لیے 21 فروری 1915ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ بدقسمتی سے حکومت کو اس منصوبے کی خبر لگ گئی اور اس نے فوری اقدام کیا۔ بغاوت پر آمادہ رجمنٹوں کو فوراً توڑ دیا گیا اور ان کے لیڈروں کو جلاوطن کیا گیا یا پھانسی دے دی گئی۔ مثلاً پنجاب میں 23 کیولری کے بارہ آدمیوں کو پھانسی دی گئی، پنجاب غدر پارٹی کے لیڈروں اور ممبروں کو وسیع پیمانے پر گرفتار کیا گیا، جن میں سے 42 کو پھانسی دی گئی، 114 کو کالا پانی بھیجا گیا اور 93 کو لمبی قید کی سزائیں سنائی گئیں۔ ان ہی میں سے بعض نے رہا ہونے کے بعد کرتی یا کمیونسٹ پارٹی قائم کی۔ گرمکھ سنگھ، کرتار سنگھ سرابا، سوہن سنگھ بھکنا، رحمت علی شاہ، بھائی پرمانند اور محمد برکت اللہ غدر پارٹی کے ممتاز لیڈر تھے۔ غدر پارٹی سے متاثر ہو کر سنگاپور کی پانچویں لائٹ انفنٹری کے سات سو سپاہیوں نے جمعدار چشتی خاں اور صوبیدار ڈنڈے خاں کی قیادت میں بغاوت کر دی اور ایک سخت لڑائی کے بعد ہی اس بغاوت کو کچلا جا سکا۔ بہت سے سپاہی کام آئے۔ 37 سپاہیوں کو سرعام پھانسی دی گئی اور 41 کو عمر قید کی سزائیں دی گئیں۔ غدر پارٹی کے علاوہ دوسرے انقلابی بھی ہندستان میں سرگرم تھے۔ 1915ء کی ایک ناکام انقلابی کوشش میں بالاسور کے مقام پر پولیس کا مقابلہ کرتے ہوئے جتن مکرجی نے جان دی، جو باگھ جتن کے نام سے معروف تھے۔ راس بہاری بوس، راجا مہندر پرتاپ، لالہ ہردیال، عبدالرحیم، مولانا عبیداللہ سندھی، چمپاک رمن پلے، سردار سنگھ رانا، میڈم کاما اور دوسرے ممتاز ہندستانیوں نے ملک اور بیرون ملک میں انقلابی سرگرمیوں کی قیادت اور تبلیغ و اشاعت کی خدمت انجام دی۔

9.5.3 کانگریس کا لکھنؤ اجلاس (Lucknow Session of the Congress, 1916)

قوم پرستوں نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ نااتفاقی سے انہیں نقصان پہنچ رہا ہے اور حکومت کے مقابلے کے لیے انہیں متحدہ محاذ بنانا چاہیے۔ 1916ء میں کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر ملک میں قومی جذبات کے فروغ اور قومی اتحاد کی ضرورت کے احساس سے دو تاریخی نتائج برآمد ہوئے۔ ایک تو یہ ہوا کہ کانگریس کے دونوں بازو متحد ہو گئے، کیوں کہ پرانے جھگڑے اب بے معنی ہو چکے تھے اور علاحدگی سے کسی گروہ کا بھی بھلا نہ ہوا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ قوم پرستی کی بڑھتی ہوئی لہر نے بوڑھے رہنماؤں کو مجبور کیا کہ لوکمانیہ تلک اور دوسرے انتہا پسند قوم پرستوں کو خوش آمدید کہیں۔ 1907 کے بعد لکھنؤ کانگریس کا اجلاس متحدہ کانگریس کا پہلا اجلاس تھا۔ دوسرا تاریخی نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس اور مسلم لیگ نے اپنے دیرینہ اختلافات کو ختم کر کے حکومت کے سامنے متفقہ قومی مطالبات پیش کرنے کا

فیصلہ کیا۔ جنگ کے دوران میں دونوں ہوم رول تحریکوں نے ملک میں نئے جذبات پیدا کیے اور کانگریس کا کردار بھی بدل ڈالا۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا نوجوان طبقہ، جرأت مندانہ قومی سیاست کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ جنگ سے پیدا ہونے والے حالات نے اس عمل کی رفتار تیز تر کر دی۔ مولانا آزاد کا اخبار 'الہلال' اور مولانا محمد علی کا 'کامریڈ' حکومت نے بند کر دیا کیونکہ الہلال اور کامریڈ مسلسل حکومت کی پالیسیوں اور جنگ کی مخالفت اور تنقید کر رہے تھے۔ جن سے تنگ آکر کاروائی کی گئی اور مولانا آزاد، مولانا محمد علی، شوکت علی اور حسرت موہانی کو نظر بند کر دیا گیا۔ مسلم لیگ میں بھی آہستہ آہستہ تبدیلی آ رہی تھی۔ کم از کم مسلم لیگ کے نوجوان ممبروں نے کچھ حد تک سیاسی انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا۔ علی گڑھ کے محدود سیاسی نقطہ نظر سے دامن چھڑا کر مسلم لیگ بتدریج کانگریس کی سیاسی پالیسیوں کے قریب آنے لگی۔

کانگریس اور مسلم لیگ کا اتحاد ایک معاہدے پر دستخط کے ساتھ شروع ہوا، جو معاہدہ اتحاد کے نام سے مشہور ہے۔ دونوں جماعتوں کو متحد کرنے میں لوکمانیہ تلک اور محمد علی جناح نے نمایاں حصہ لیا۔ جناح 1913 میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے اور اس وقت تک متحدہ قومیت کے بہت بڑے حامی تھے۔ اپنے علاحدہ اجلاسوں میں دونوں پارٹیوں نے ایک ہی طرح کی قرار دادیں منظور کیں، جن میں جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر سیاسی اصلاحات کی اسکیم پیش کی گئی تھی اور حکومت برطانیہ سے یہ اعلان کرنے کا مطالبہ کیا گیا کہ جلد ہی کسی قریبی تاریخ میں ہندستان کو حکومت خود اختیاری دے دی جائے۔ معاہدہ لکھنؤ، ہندو مسلم اتحاد کی سمت ایک اہم قدم تھا۔ بدقسمتی سے یہ معاہدہ اس تصور پر مبنی تھا کہ تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمانوں کو دو جداگانہ اجزا کی طرح یک جا کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں ان کے سیاسی نقطہ نظر کو سیکولر نہیں بنایا گیا تھا، جس سے انہیں اس امر کا احساس ہوتا کہ سیاست میں ہندو اور مسلمانوں کے مفاد جداگانہ نہیں ہیں۔ اس طرح سے معاہدہ لکھنو نے آگے چل کر ہندستانی سیاست میں فرقہ پرستی کے سر اٹھانے کی گنجائش باقی رکھی تھی۔

لکھنؤ میں رونما ہونے والے واقعات نے فوری طور پر ملکی سیاست پر بڑے دوررس اثرات ڈالے۔ نیشنل کانگریس کے معتدل اور انتہا پسند گروہوں میں اتفاق نے نیز کانگریس اور مسلم لیگ کے اتحاد نے ملک میں بڑا سیاسی جوش خروش پیدا کیا۔ برطانوی حکومت نے بھی قوم پرستوں کو تسلی و تشفی دینا ضروری سمجھا۔ اگرچہ اس وقت تک قومی تحریک کو حکومت نے سختی سے کچلا تھا۔ رسوائے زمانہ ڈفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت بڑی تعداد میں انتہا پسند قوم پرستوں اور انقلابیوں کو جیلوں میں ڈالا گیا تھا یا نظر بند کیا گیا تھا۔ اب قوم پرستوں کو تسلی دینے کے لیے حکومت نے 20 اگست 1917 کو اعلان کیا کہ ہندستان کے لیے اس کی پالیسی یہ ہے کہ حکومت خود اختیاری کو اس طرح روشناس کیا جائے کہ تدریجی طور پر ہندستان میں ایک ایسی ذمہ دار حکومت کا قیام عمل میں آسکے جو حکومت برطانیہ کا ایک لانیفک جزو ہو۔ جولائی 1918ء میں مانٹیگیو چیمسفورڈ اصلاحات کا اعلان کیا گیا لیکن ہندستانی قوم پرستوں کی اس سے تشفی نہ ہو سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی قومی تحریک اب اپنی تیسری اور آخری منزل میں داخل ہونے والی تھی، جو جدوجہد کا آخری یا گاندھیائی دور تھا۔

9.5.4 خلافت تحریک (The Khilafat Movement)

جنگ عظیم اول میں چونکہ ترکی، جرمنی گروپ کے ساتھ تھا، اس لیے اسے بھی شکست خوردہ تسلیم کیا گیا۔ حالانکہ ترکی نے گالی

پولی، بغداد اور شام کے محاذ پر اتحادیوں کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔تاہم عربوں کی غداری اور بغاوت کی وجہ سے اسے اپنے اکثر ایشیائی مقبوضات سے ہاتھ دھونے پڑے۔جنگ کے بعد اتحادیوں کے ترکی کی خلافت کے خاتمے اور اس کے مقبوضات کے حصے بخرے کرنے کا منصوبہ کو لے کر تمام عالم اسلام اور مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی اور انہوں نے اس کے خلاف احتجاج شروع کر دیے۔پہلی جنگ عظیم میں ہندوستانی مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے انگریزی حکومت نے ان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ترکی کے ساتھ فیاضانہ رویہ اختیار کیا جائے گا مگر اب وہ اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے نہیں معلوم پڑتے تھے۔ہندستانی مسلمان ترکی کے خلیفہ کو اپنا مذہبی پیشوا مانتے تھے۔اس لیے جب ان کو یہ معلوم پڑا کہ ان کی مقدس جگہوں پر ترکی کا تسلط نہیں رہ جائے گا تو فطرتاً وہ بہت بے چین ہوئے۔20 مئی کو ترکی کے ساتھ معاہدہ سیورے (Treaty of Severs) میں یہ بات صاف ہوگئی تھی کہ ترکی کے حصے بخرے کیے جانا طے پاگیا ہے۔مجبوراً مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد اور دیگر مسلم رہنماؤں نے گاندھی جی اور کانگریس کے ساتھ مل کر خلافت اور عدم تعاون تحریک شروع کی۔

9.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

جون 1914ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی، جس میں ایک طرف برطانیہ، فرانس، اٹلی، روس، جاپان اور امریکا اور دوسری طرف جرمنی، آسٹریا ہنگری اور ترکی تھے۔ہم دیکھ چکے ہیں کہ دنیا کے صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں میں بلا شرکت غیرے، منڈیاں اور نوآبادیاں حاصل کرنے کی جدوجہد، بلکہ مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے دنیا کا فتح کیا جانے والا حصہ بہت کم باقی بچا تھا، اس لیے مقابلہ شدید تر ہو گیا تھا۔جرمنی اور اٹلی جیسے ملک جو عالمی منظر پر دیر سے نمودار ہوئے تھے ان کے حصے میں دنیا کا اتنا علاقہ نہیں آسکا تھا جتنا کہ برطانیہ اور فرانس جیسے پہلے سے صنعت یافتہ ملکوں کے قبضے میں آگیا تھا۔اب وہ طاقتیں نوآبادیوں کی تقسیم نو کا مطالبہ کر رہی تھیں اور اس مطالبے کو طاقت کے زور سے پورا کرانے پر تلی تھیں۔دنیا کا ہر بڑا ملک اپنی نوآبادیات پر قابض رہنے کے لیے، یا نئی نو آبادیاں حاصل کرنے کے لیے جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں عالمی طاقتیں اسلحہ اندوزی کے شدید مقابلے میں مبتلا تھیں۔نوآبادیوں کے حصول کی جدوجہد میں ان ملکوں کے عوام بھی جذباتی طور پر بے طرح مبتلا ہو گئے تھے، کیوں کہ حکمرانوں نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ کسی بھی ملک کے وقار اور اس کی قوت و شہرت کا انحصار اس پر ہے کہ کتنی نوآبادیاں اس کے قبضے میں ہیں۔ اس نوع کے پروپیگنڈے میں جنگ نواز اخبارات بھی پیش پیش تھے۔اس طرح سے برطانیہ کو اس پر غرور تھا کہ اس کی سلطنت میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا، جرمنی بھی اسی غرور کا متلاشی تھا۔حریف طاقتیں زیادہ سے زیادہ ملکوں کو حلیف بنانے کی کوشش میں لگی تھیں تاکہ سیاسی و عسکری اعتبار سے وہ یکہ و تنہا نہ رہ جائیں۔جلد ہی دنیا کے تمام ملک دو حریف کیمپوں میں بٹ گئے۔بالآخر اگست 1914ء میں جنگ نے عالم گیر شکل اختیار کر لی، اور اس کے ساتھ ہی عالمی سیاست بھی تیزی سے بدلنے لگی۔اس جنگ کے دوران میں ہندستانی قوم پرستی نے بھی پختگی کی منزلیں طے کیں۔جنگ کے دوران ہندوستان پر برطانوی دباؤ کم ہو گیا اگرچہ ہندوستانی سپاہیوں کو بڑے پیمانے پر جنگ میں استعمال کیا گیا۔ہندوستانی صنعتوں کو پھلنے پھولنے اور گھریلو منڈی پر قبضہ جمانے کا موقع مل گیا کیونکہ برطانوی صنعتیں جنگی سامان بنانے میں مصروف رہیں۔سیاسی اعتبار سے بھی ہوم رول تحریک، غدر تحریک وغیرہ چلائی گئیں اور حکومت خود اختیاری کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔سیاسی رہنماؤں

نے بھی جنگ میں انگریزوں کے بدلے ہندوستانیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات کا مطالبہ کیا اور وہ اس کی توقع رکھتے تھے۔ توقعات کے پورا نہ ہونے اور ترکی کے خلاف ظالمانہ اقدامات کی وجہ سے ملک میں خلافت اور عدم تعاون تحریکیں وجود میں آئیں جو کہ جدوجہد آزادی کی پہلی عوامی ہمہ گیر تحریکیں تھیں۔

9.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

متحارب	:	ایک دوسرے سے لڑنے والے
عمری ابھار	:	(Age Bulge) 1930 میں اسکولوں میں گیارہ سے پندرہ سال کے بچوں کی تعداد بہت کم تھی جب کہ پانچ سے دس سال کی عمر کے بچوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اسے ہی عمری ابھار (Age Bulge) کہا جاتا ہے جس کا اثر 1960 تک نظر آتا رہا۔
سوراج	:	حکومت خود اختیاری، اپنے اوپر خود حکمرانی کرنے کا کسی ملک یا قوم کا حق

9.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

9.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. پہلی جنگ عظیم کے وقت جرمنی پر کس خاندان کی حکومت تھی؟
2. پہلی جنگ عظیم کس سال شروع ہوئی؟
3. یورپ میں خفیہ معاہدوں کا سلسلہ کس نے شروع کیا؟
4. ابتدائی طور پر یورپی سامراجی طاقتوں نے پرامن طریقے سے کس براعظم کو آپس میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا؟
5. 1904 میں کس ایشیائی ملک نے روس کو شکست دی؟
6. سامراجی کشمکش کا تیسرا اور سب سے خطرناک علاقہ کون سا تھا؟
7. جنگ کا فوری سبب کس کا قتل تھا؟
8. جنگ کے دوران تمام ترغیر ملکی تجارت کو کس نے کنٹرول کیا؟
9. کون سی ہندوستانی کمپنی برطانوی سلطنت میں سب سے بڑی اسٹیل کی فیکٹری بن گئی؟
10. خلافت تحریک کے دو رہنماؤں کے نام بتائیے۔

9.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. یورپ کی دو مخالف خیموں میں تقسیم پر ایک نوٹ لکھیے۔

2. سامراجی کشمکش پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. پہلی جنگ عظیم میں فرانس اور برطانیہ کی ذمے داروی پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. جنگ کے فوری سبب پر روشنی ڈالیے۔
5. کانگریس کے لکھنؤ اجلاس پر ایک نوٹ لکھیے۔

9.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پہلی جنگ عظیم کی ذمہ داری کے تعلق سے ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. پہلی جنگ عظیم کے اثرات پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
3. ہندوستان پر پہلی جنگ عظیم کے کیا اہم اثرات مرتب ہوئے؟ تفصیلی وضاحت کیجیے۔

9.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar (ed.), *Nationalist Movement in India: A Reader*, Oxford University Press, New Delhi, 2009.
2. Brown, Judith M., *Modern India*: *The Origins of an Asian Democracy*, Oxford University Press, Oxford and New York, 1994.
3. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2019.
4. Ferguson, Niall, *The War of the World*: *Twentieth-Century Conflict and the Descent of the West*, Penguin Press, New York, 2006.
5. Gardner, Hall, *The Failure to Prevent World War I*: *The Unexpected Armageddon*, Routledge, 2015.
6. Khan, Yasmin, *The Raj at War*: *A People's History of India's Second World War*, Penguin, Gurgaon, 2015.
7. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal*: *A New History of British India*, HarperCollins, Noida, 2021.
8. Pati, Budheswar, *India and the First World War*, Atlantic Publishers & Distributors, 1996.
9. Stevenson, David, *The First World War and International Politics*, Oxford University Press, 1988.
10. Winter, Jay ed., *The Cambridge History of the First World War* (2016 ed.), Cambridge University Press, 2014.

اکائی 10۔ہوم رول تحریک

(The Home Rule Movement)

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 ہوم رول تحریک کا پس منظر

10.3 ہوم رول تحریک کے مقاصد

10.4 دو تحریکیں

10.5 تلک کی ہوم رول تحریک

10.6 اینی بیسنٹ اور ہندوستانی قومی تحریک

10.7 اینی بیسنٹ کے مقاصد

10.8 طریقہ کار

10.9 اینی بیسنٹ کی ہوم رول تحریک

10.10 لکھنؤ سمجھوتہ 1916

10.11 ہوم رول تحریک کی طرف حکومت کا رد عمل

10.12 برطانوی رویہ میں تبدیلی

10.13 ہوم رول تحریک کی ناکامی کی وجوہات

10.14 ہوم رول تحریک کی اہمیت

10.15 ہوم رول سے متعلق ٹیگور کے بیانات

10.16 اکتسابی نتائج

10.17 کلیدی الفاظ

10.18 نمونہ امتحانی سوالات

10.19 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید (Introduction)

پہلی جنگ عظیم کا ہندوستانی قومی تحریک پر گہرا اثر پڑا۔اس دوران کہیں زیادہ جارحانہ قومی جزبہ نظر آیا۔ قوم پرستوں نے انگریز حکمرانوں پر تنقید کی اور اپنے مطالبات کو واضح کیا،اور ساتھ ہی نئے خطوں کو قوم پرست سرگرمیوں کی طرف متوجہ کیا اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کیا۔ان تمام پیش رفتوں نے 1919 میں قومی تحریک کی قیادت میں گاندھی کے عروج کا راستہ تیار کیا۔ یہ تبدیلیاں براہ راست جنگ کی وجہ سے نہیں ہوئیں، بلکہ اینی بیسنٹ اور بال گنگادھر تلک کی طرف سے 1915 میں شروع کی گئی تحریک سے ہوئیں۔اس باب کا مقصد یہ ہے کہ کس طرح ان دونوں رہنماؤں نے انڈین نیشنل کانگریس کو اپنے کنٹرول میں لیا اور اس تحریک کے لیے اس کا ارتکاب کیا اور ملک بھر میں اس تحریک کو پھیلانے کی کوشش کی۔ برطانیہ نے ظاہری طور پر جمہوریت کو بچانے کی یہ جنگ لڑی اور اس جنگ عظیم میں ہندوستانی سپاہی انکی مدد کے لیے اپنا خون بہا رہے تھے۔ہندوستان کے کچھ قوم پرست رہنماؤں نے بھی برطانیہ سے جمہوریت کا مطالبہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بالآخر انہوں نے اپنے ہم وطنوں کی سیاسی غلامی کے خلاف تحریک شروع کردی۔ یہ تحریک، جسے "ہوم رول تحریک" کے نام سے جانا جاتا ہے، نے آنے والی سیاسی تحریکوں میں جرات مندانہ سرگرمیوں کا مظاہرہ کیا۔

10.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- قومی شعور پیدا کرنے میں ہوم رول تحریک کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- ہندوستان میں خود مختار حکومت حاصل کرنے کے لیے تلک اور بیسنٹ کے کوششوں پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- فرقہ وارانہ اور سماجی ہم آہنگی میں ان دونوں قومی رہنماوں کے کردار پر بحث کر سکیں گے۔
- اس تحریک کا مطالعہ کرتے وقت عالمی تناظر کو سمجھ سکیں گے۔
- ہوم رول تحریک کے خلاف حکومت کے رد عمل کو واضح کر سکیں گے۔

10.2 ہوم رول تحریک کا پس منظر (The Context of the Home Rule Movement)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1909 سے ہندوستانیوں کو کافی امیدیں تھی، لیکن انہیں کچھ زیادہ نہیں ملا۔ جب 1907 میں کانگریس پارٹی ٹوٹ گئی اور 1908 سے 1914 تک شعلہ بیان رہنما بال گنگادھر تلک کو قید کیا گیا تو قومی تحریک سست پڑ گئی۔ تاہم، قومی تحریک نے ایک بار پھر تلک کی رہائی اور اینی بیسنٹ کی آمد کے ساتھ نیا زور پکڑا۔ جلاوطنی کے بعد، تلک نے ہندوستان میں قوم پرست جدوجہد کے احیاء کی ضرورت کو سمجھا۔انہوں نے ہندوستان کے سیاسی منظر نامے میں کانگریس پارٹی کی بڑھتی ہوئی مطابقت کو بھی تسلیم کیا۔ان کا ابتدائی مقصد پارٹی میں دوبارہ شامل ہونا تھا۔ دسمبر 1915 کے کانگریس اجلاس میں اینی بیسنٹ کے اثر ورسوخ کی بدولت انتہا پسندوں کو پارٹی میں دوبارہ شامل ہونے کی اجازت دی گئی۔ آئرستانی سوشلسٹ اینی بیسنٹ ایک مصنف، مقرر، اور ہندوستانی اور آئرستانی آزادی کی حامی تھی۔ وہ 1893

میں ہندوستان میں آگئی اور جنگ میں بنیاد پرستوں کی شمولیت کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ ہندوستانی رہنما اس بات پر بضد تھے کہ عالمی جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دیا جائے یا نہیں، لیکن اینی بیسنٹ نے ہندوستان میں برطانوی پالیسیوں اور ہندوستانی خود حکمرانی کی حمایت کی۔

دسمبر 1915 کے کانگریس اجلاس میں، اینی بیسنٹ کے قائل کرنے پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ انتہا پسندوں کو دوبارہ پارٹی میں فعال طور پر شامل کیا جائے۔ دوسری طرف، بیسنٹ اور تلک کانگریس سے ہوم رول تحریک شروع کرنے کی اپنی تجویز کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ بیسنٹ نے کانگریس کو علاقائی تنظیموں کے قیام اور تعلیمی پروپیگنڈے کی حمایت کرنے پر آمادہ کیا۔ یہ بھی طے پایا کہ اگر ستمبر 1916 تک یہ شرائط پوری نہ ہوئیں تو انہیں ہوم رول تحریک شروع کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ اس کے نتیجے میں، انہوں نے ستمبر 1916 میں ہوم رول تحریک شروع کی۔ دوسری طرف تلک نے اپریل 1916ء میں ہی ہوم رول تحریک شروع کر دی تھی۔

10.3 ہوم رول تحریک کے مقاصد (Objectives of the Home Rule Movement)

- ملک کے اندر قومیت کا احساس پیدا کرنا، مظاہرے، تحریک اور باقاعدہ جلسے منعقد کرکے انگریزوں کو مشکل میں ڈالنا۔
- ہندوستان میں خود مختار حکومت حاصل کرنے کے لیے آئینی طریقوں کا استعمال کرنا۔
- خود مختار حکومت کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے گئے، جن میں سیاسی تعلیم، عوامی مجلس، لائبریریاں، کانفرنس، میڈیا کے ذریعے پروپیگنڈہ، سماجی خدمات، اور مقامی حکومت کی سرگرمیوں میں شرکت شامل ہیں۔
- حکومت کے ظلم و جبر کے خلاف بولنے کے لیے ہندوستانیوں میں اعتماد پیدا کرنا۔
- برطانوی حکومت سے ہندوستانیوں کے لیے وسیع تر سیاسی نمائندگی کا مطالبہ کرنا۔
- کانگریس پارٹی کے اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے ہندوستان میں سیاسی سرگرمیوں کو بحال کرنا۔
- لسانی ریاستوں کی تشکیل اور مقامی زبان کی تعلیم کا مطالبہ کرنا۔

10.4 دو تحریکیں (The Two Movements)

تلک اور بیسنٹ نے تسلیم کیا کہ اعتدال پسندوں کی حمایت اور انتہا پسندوں کا تعاون ہوم رول تحریک کی کامیابی کے لیے اہم ہے۔ دسمبر 1914 میں کانگریس کے اجلاس میں انتہا پسندوں کو دوبارہ داخلے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اینی بیسنٹ اور تلک کی طرف سے اخبارات اور مقامی انجمنوں کے ذریعے الگ الگ شروع کی گئی مہموں نے دسمبر 1915 میں ان کا دوبارہ داخلہ یقینی بنالیا۔ فیروز شاہ مہتا کی وفات سے انتہا پسندوں کی مخالفت کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔ کانگریس، جس پر اب بھی اعتدال پسندوں کا غلبہ تھا، مقامی سطح کی کانگریس کمیٹیوں کو بحال کرنے اور ستمبر 1916 تک تعلیمی پروپیگنڈے کا پروگرام شروع کرنے میں ناکام رہی۔ اس لیے اینی بیسنٹ اور تلک نے اپنی اپنی ہوم رول تحریکوں کا آغاز کیا۔ 1916 میں دونوں لیگوں نے اپنے علاقوں کی حد بندی کی۔ تلک کی لیگ مہاراشٹر، کرناٹک کے وسطی صوبوں اور بیرار میں اور اینی بیسنٹ کو باقی ہندوستان میں کام کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔

10.5 تلک کی ہوم رول تحریک (The Home Rule Movement of Tilak)

تلک کی ہوم رول تحریک اپریل 1916 میں بیلگام میں منعقدہ بمبئی صوبائی کانفرنس میں شروع ہوئی تھی۔ تلک لیگ کی چھ شاخیں تھیں، جیسے وسطی مہاراشٹر، بمبئی شہر، کرناٹک اور وسطی صوبے میں، اور دو بیرار میں۔ انہوں نے چھ رسالے مراٹھی میں اور دو انگریزی میں شائع کیے جن کی 47,000 کاپیاں فروخت ہوئیں۔ انہوں نے کنڑ اور گجراتی میں بھی رسالے شائع کیے۔ ان کے علاوہ سب سے اہم کردار تلک کے مہاراشٹر کے دوروں نے ادا کیا جس کے دوران انہوں نے ہوم رول کے مطالبے کی وضاحت کی۔ انہوں نے مہاراشٹر کے مختلف حصوں کا دورہ کیا اور سوراج کا مسئلہ بڑی طاقت کے ساتھ اٹھایا، اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں لسانی ریاستوں اور مقامی زبان کی تعلیم کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے سیکولر بنیادوں پر ہوم رول کا مطالبہ کیا۔ ہوم رول تحریک نے دیہی لوگوں کو راغب کرنے کے لیے شراب اور نمک پر عائد ٹیکس اور زرعی محصول کے مسائل بھی اٹھائے۔ اس عرصے کے دوران ان کی تقریروں میں مذہبی کشش کا کوئی نشان نظر نہیں آرہا تھا اور انہوں نے واضح طور پر کہا: 'اجنبیت کا تعلق مذہب، تجارت یا پیشے سے نہیں ہے بلکہ یہ مفادات کا سوال ہے۔ جو اس ملک کے لوگوں کے لیے فائدہ مند کام کرتا ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا انگریز، وہ اجنبی نہیں ہے۔' وہ اپنی حکومت پر یقین رکھتے تھے ان کا ایک مشہور نعرہ ہے "سوراج میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔ ان کے خیالات میں کسی تنگ علاقائی لسانی یا ذات پات کے تعصب کی عکاسی نہیں ہوتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ تمام علاقائی زبانیں اور ثقافتیں ترقی کریں، اور انہوں نے مقامی زبانوں میں تعلیم فراہم کرنے کی دلیل پیش کی۔ انہوں نے اچھوت کی مخالفت کرتے ہوئے اعلان کیا: "اگر کوئی خدا اچھوت کو برداشت نہیں کرتا تو میں اسے خدا کے طور پر ہر گز تسلیم نہیں کرتا ہوں"۔ انہوں نے برہمنوں پر بھی زور دیا کہ وہ غیر برہمن مطالبات کو برداشت کریں اور ان کی مخالفت نہ کریں، اور ساتھ ہی غیر برہمن پر زور دیا کہ وہ اپنی ملازمتوں کی کمی کے مسائل کو برہمن بمقابلہ غیر برہمن کے لحاظ سے نہ دیکھیں، بلکہ سمجھیں کہ برہمنوں میں تعلیم کی فراوانی تھی جس نے انہیں ملازمتوں تک زیادہ رسائی عطا کی۔

تلک نے انڈین ہوم رول تحریک کی کارروائی کو مہاراشٹرا اور کرناٹک تک محدود رکھا، جہاں ان کی پیروی کے امکانات نمایاں تھے۔ انہوں نے اپنے تقریری دوروں کا اہتمام کیا، اپنے ہی قصبوں کے مندروں اور کھلی جگہوں پر جلسے منعقد کیے اور اخبارات اور رسالے چھاپنے کی ذمہ داریاں انجام دیں۔ لیگ کی سالانہ سبسکرپشن ہر فرد کے لیے ایک روپیہ لازمی رکھی گئی اور داخلہ فیس دو روپے مختص کر دی گئی تھی۔ رکنیت کی تعداد نومبر 1916 میں 1,000، اپریل 1917 میں 14700 اور 1918 کے اوائل میں 32,000 تک پہنچ گئی۔ نئے اراکین کی بھرتی کے علاوہ، اس مہم نے واضح طور پر بہت سے لوگوں تک ہوم رول کا مطالبہ پہنچایا جو حقیقت میں لیگ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ جیسے ہی تلک کی تحریک زور پکڑنے لگی، حکومت نے یہ مطالبہ کیا کہ وہ 60,000 روپے کی ضمانت ادا کرے۔ اور انہیں ایک سال کی مدت کے لیے پابندیوں کا سامنا کرنے کی دھمکی دی گئی۔ تلک نچلی عدالت میں مقدمہ ہار گئے لیکن نومبر 1916 میں ہائی کورٹ نے انہیں بری کر دیا۔ حکومت کی جانب سے انہیں خاموش کرنے کی کوشش کی گئی لیکن تلک نے یہ کہہ کر تحریک کے لیے اپنی کوشش جاری رکھی کہ ہوم رول ایک قانونی عمل ہے۔

10.6 اینی بیسنٹ اور ہندوستانی قومی تحریک (Annie Besant and the Indian National Movement)

1914 سے 1917 تک اینی بیسنٹ نے ہندوستانی قومی تحریک کے لیے جگہ متعین کی تھی۔ وہ ایک غیر معمولی اور طاقتور خاتون تھی جس میں ایک بااثر' بارعب اور مقناطیسی شخصیت موجود تھی۔ انہوں نے اپنی تقریری اور صحافتی صلاحیتوں کو انگلینڈ میں آزاد خیال، بنیاد پرستی، فابیانزم اور تھیوسفی کے حامی کے طور پر تیار کیا تھا۔ وہ ہندو مابعد الطبیعیات سے بہت متاثر تھی اور تھیوسوفیکل سوسائٹی میں شامل ہونے کے لیے 1893 میں ہندوستان آئی۔ 1907 تک ان کا ہیڈ کوارٹر بنارس میں تھا۔ اس کے بعد، تھیوسوفیکل سوسائٹی کی عالمی صدر بنائے جانے کے بعد وہ ادیار (مدراس) چلی گئی۔ اگرچہ وہ کوئی بھی ہندوستانی زبان اتنی روانی سے نہیں بولتی تھی کہ اسے عوامی طور پر استعمال کر سکے، لیکن انہوں نے لیکچر دے کر، سکولوں کی بنیاد رکھ کر اور ہندو مقدس کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کر کے ہندو احیاء میں اہم کردار ادا کیا۔ برطانوی حکومت بیسنٹ کی مقبولیت اور بنیاد پرستی سے ناخوش تھی۔ بیسنٹ کانگریس کو از سر نو زندہ کر کے اسے ہوم رول تحریک سے جوڑنا چاہتی تھی۔ قومی مقصد کو بیسنٹ کی خدمات کو قبول کر کے انہیں 1917 میں کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔

(Source: https://www.ts-adyar.org/content/annie-besant-1847-1933)

10.7 اینی بیسنٹ کے مقاصد (Objectives of Annie Besant)

ہندوستانی سیاست میں داخل ہونے کے اینی بیسنٹ کے مقاصد میں سے، غالباً سب سے بنیادی مقصد ہند- برطانوی دوستی کو بڑھاوا دینا تھا۔ وہ پختہ یقین رکھتی تھی کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنے ملک پر حکومت کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن سب سے بڑھ کر وہ اپنی حکومت کی جانب خاطر خواہ پیش رفت حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ وہ نوجوان ہندوستانیوں کو تشدد سے دور رکھنا چاہتی تھی، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کے طریقے دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کو بگاڑ دیں گے۔ انہوں نے تلک کی ابتدائی فعال مزاحمت کی مذمت کی، لیکن اب اس کا مقصد انہیں اور انتہا پسندوں کو کانگریس میں واپس لانا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ فعال مزاحمت کے سوال پر تلک کا دل واقعی بدل گیا ہے۔ انہوں نے امید ظاہر کی تھی کہ وہ کانگریس کو تمام عقائد کے قوم پرستوں کے 'متحدہ فرنٹ' میں تبدیل کرے گی، اور ساتھ ہی ساتھ ایک نئی زندگی کو جنم دے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریس میں اعتدال پسندوں کی آمد ہندوستانی قومی تحریک کی حقیقتوں کے بارے میں کچھ آگاہی اور ذاتی عزائم کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ہندوستانی سیاست میں نووارد ہونے کے ناطے، انہوں نے اس تنظیم میں اختیارات کا ذخیرہ حاصل

کرنے کی کوشش کی۔ بالآخر انہوں نے متحدہ کانگریس کی قیادت حاصل کرنے اور خود حکومتی کی طرف بڑھنے کی امید ظاہر کی۔

10.8 طریقہ کار (Methods)

اینی بیسنٹ کا خیال تھا کہ اس تحریک کے ذریعے یہ مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے انیسویں صدی کے دوران بنیاد پرستوں کی طرف سے چلائی گئی مہم کو ذہن میں رکھ کر غلامی کے خاتمے اور آئرستانی ہوم رول کے لیے جدوجہد کی۔ 1880 کی دہائی میں بریڈلا اور فیبینز کی صحبت میں میٹنگ منعقد ہوئی اور اخبارات اور رسالوں کے ذریعے لوگوں تک پیغام پہنچایا گیا۔ پھر (جیسا کہ بریڈلا نے انہیں سکھایا تھا) اگر حکومت نے احتجاج کو خاموش کرنے کی کوشش کی تو عدالتوں میں اپیل کرکے مزید تشہیر حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان مطالبات کو بڑے پیمانے پر ملک تک پہنچانے اور ان کے لیے وسیع حمایت حاصل کرنے کے لیے مقامی کمیٹیاں قائم کی جائیں گی۔ اس طرح احتجاج کے ذریعے برطانیہ خود مختار حکومت دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ 1914 کے آخر میں اینی بیسنٹ نے کانگریس کے اعتدال پسند رہنماؤں کو سیاسی سرگرمی میں شامل کرنا شروع کیا۔ انہوں نے اعتدال پسندوں پر زور دیا کہ وہ ہر ضلع میں کانگریس کمیٹیاں قائم کریں، جنہیں تعلیم دینے کے لیے متواتر نشستوں کا انعقاد کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے تلک کی اس درخواست کی حمایت کی کہ انہیں اور دیگر انتہا پسندوں کو دوبارہ کانگریس میں شامل کیا جائے۔ فیروز شاہ مہتا اور بمبئی شہر میں ان کے اعتدال پسند ساتھیوں نے ان تجاویز کی مخالفت کی، کیونکہ وہ نہ صرف اینی بیسنٹ اور تلک کے ساتھ کانگریس کی قیادت کا اشتراک کرنے کے مخالف تھے، بلکہ انہیں یقین تھا کہ اگر تلک کو دوبارہ شامل کیا گیا تو وہ کانگریس کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاہم بعد میں بیسنٹ اور تلک کی کوششوں سے دونوں یعنی اعتدال اور انتہا پسند ایک پلیٹ فارم جمع ہونے میں کامیاب ہوئے۔

10.9 اینی بیسنٹ کی ہوم رول تحریک (The Home Rule Movement of Annie Besant)

اینی بیسنٹ نے ہندوستان میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کی بنیاد ڈال کر ایک بہترین سماجی پلیٹ فارم قائم کیا۔ اس سے ہندوستانی نوجوانوں میں شعور پیدا ہوا۔ انہوں نے ہندوستان کی 'بڑھتی ہوئی غربت' پر توجہ مرکوز کرنے کی تجویز پیش کی۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستان کی ایک خود مختار حکومت ہونی چاہئے جو کہ ان کا حق ہے۔ اس کے علاوہ، انہوں نے اعتدال اور انتہا پسندوں کو مکمل طور پر الگ ہونے سے روکنے کی کوشش کی۔ جہاں تک بیسنٹ کی کل ہند ہوم رول تحریک کا تعلق ہے، اسکی بنیاد ستمبر 1916 میں رکھی گئی، جس میں جارج اروندیل کو سکریٹری، سی۔ سی۔ راما سوامی ایئر جنرل سکریٹری، بی پی واڈیا کو خزانچی اور بیسنٹ کو صدر منتخب کیا گیا۔ بیسنٹ اور تلک کے مقاصد ایک جیسے تھے پھر بھی انفرادی طور پر انہوں نے دو الگ الگ ہوم رول تحریکیں قائم کیے جیسا کہ انہوں نے خود واضح کیا، ایک کے پیروکار دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے پختگی کا مظاہرہ کیا اور اپنے ذی اختیار علاقوں کو تقسیم کیا۔ تلک لیگ مہاراشٹرا، کرناٹک، وسطی صوبوں اور بیرار میں قائم تھی، اور اینی بیسنٹ کی لیگ باقی ہندوستان میں سرگرم تھی۔ ہوم رول کی وجہ بتاتے ہوئے، اینی بیسنٹ نے کہا کہ میں ہندوستان میں ہوم رول کا مطالبہ اس لیے کرتی ہوں، کیونکہ آزادی ہر قوم کا پیدائشی حق ہے۔

اینی بیسنٹ کے ہوم رول نے عوام بالخصوص نوجوان نسل کو متحرک کرنے کے لیے بحث ومباحثہ شروع کیا۔ شہروں میں ریڈنگ روم کا قیام، رسالوں کی فروخنگی، طلبہ کے لیے سیاست کے کلاسوں کا اہتمام، سماجی کاموں کو عمل میں لایا گیا۔ بیسنٹ نے 1915 کے اوائل میں، دواخبارات 'نیوانڈیا' (*New India*) اور 'کامن ویل' (*The Commonweal*) کے ذریعے ایک مہم شروع کی اور ہندوستان کو خود مختار حکومت دینے کا مطالبہ کرنے کے لیے عوامی اجلاسوں اور کانفرنسوں کا انعقاد کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مقامی حکومت میں حصہ لیا اور فنڈز جمع کیے، اور ادیار کو اپنی تحریک کا ہیڈ کوارٹر (مدراس کے قریب) بنایا۔ اگرچہ ان کی ہوم رول تحریک کی 200 مقامی شاخیں تھیں لیکن انہیں ان شاخوں پر بہت کم کنٹرول حاصل تھا۔ اس کے علاوہ تلک کے 32000 اراکین کے مقابلے میں بیسنٹ کی تحریک میں 27000 لوگوں کو رکنیت حاصل تھی۔

ہوم رول تحریک کی تشکیل میں انہوں نے زیادہ تر تھیوسوفیکل سوسائٹی کے ممبران کی وفاداری پر توجہ دی۔ کچھ تھیوسوفسٹوں نے سیاست کے اختلاط پر اعتراض کیا، لیکن زیادہ لوگ اس بات سے متاثر تھے کہ ہوم رول تحریک کا آغاز کرکے وہ دنیا کے معاملات کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یقینی طور پر ان کی لیگ کو دسمبر 1917 میں بہت سے غیر تھیوسوفسٹوں کی حمایت حاصل تھی۔ مدراس کے رامسوامی ایئر جیسے غیر تھیوسوفسٹ تھے لیکن الہ آباد کے جواہر لال نہرو، بمبئی کے شنکر لال بنکر اور کلکتہ کے بی چکرورتی اور جتیندر لال بنرجی تھیوسوفسٹ تھے۔ تلک لیگ کی شاخوں کی تشکیل کے لیے ابتدائی مدد فراہم کرتے تھے، اور ہر علاقے میں لیگ کی طاقت عام طور پر تھیوسوفیکل سوسائٹی کی مقامی طاقت کی عکاسی کرتی تھی۔ ستمبر 1917ء میں مدراس پریزیڈنسی میں ہوم رول تحریک کی رکنیت وسیع ہو چکی تھی، اور شاخوں کی کل تعداد 132 ہو گئی تھی۔

10.10 لکھنؤ سمجھوتہ (The Lucknow Pact, 1916)

دسمبر 1916 میں لکھنؤ میں ہونے والے کانگریس کے تاریخی سالانہ اجلاس نے ہوم رول تحریک کو اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کا موقع فراہم کیا اور لیگ کے کارکنان بڑی تعداد میں اس اجلاس میں شامل میں ہوئے۔ تلک اور اینی بیسنٹ نے کانگریس لیگ سمجھوتے کے نفاذ میں اہم کردار ادا کیا۔ بیسنٹ اور تلک نے اس اجلاس کے اختتام پر ایک مشترکہ مجلس منعقد کی جس میں ایک ہزار سے زیادہ مندوبین نے شرکت کی۔ مجلس میں دونوں رہنماؤں نے ہوم رول تحریک کے موضوع پر خطاب کیا، اور لکھنؤ کانگریس کے بعد اس تحریک کو نئے جوش کے ساتھ جاری رکھا گیا۔ تلک اور بیسنٹ نے پورے شمالی، مشرقی اور وسطی ہندوستان میں فاتحانہ دورے کیے اور مجلسوں سے خطاب کیا۔ اس کے فوراً بعد بیرونی دنیا میں ہونے والے واقعات جیسے روسی انقلاب کی وجہ سے خود مختاری کے مطالبے کو تقویت مل گئی۔

ہوم رول تحریک نے بہت سے اعتدال پسند کانگریسیوں کی حمایت حاصل کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی جو انتہا پسندوں کی سرگرمی سے ناخوش تھے۔ گوکھلے کی سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی (Servants of India Society) کے اراکین نے ہوم رول کے مطالبے کی حمایت کرنے والے رسالے شائع کئے۔ یوپی میں، اعتدال پسند کانگریسیوں نے قصبوں اور دیہاتوں کا دورہ کرتے ہوئے ہوم

رول تحریک کے ساتھ شمولیت اختیار کی۔

10.11 ہوم رول تحریک کی طرف حکومت کا ردعمل

(Government's Response to the Home Rule Movement)

جون 1917 میں اس تحریک میں شدت آئی، جب مدراس حکومت نے اینی بیسنٹ کو حراست میں لے لیا۔ موتی لال نہرو، تیج بہادر سپرو، اور منشی نارائن پرساد جیسے رہنماؤں نے اس تحریک کی حمایت کی۔ چتامنی اور استھانہ نے بیسنٹ کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کے لیے ہوم رول تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ برطانوی حکومت نے تلک کی ہوم رول تحریک کو روکنے کی کوشش کی۔ جولائی 1916 میں حکومت نے ان سے 60,000 روپے اس بنیاد پر مانگے کیونکہ ان کی تقریریں بغاوت پر مبنی ہوتی ہے۔ مقامی حکام نے لوگوں کو ہوم رول تحریک کی حمایت کرنے سے خبردار کرنے کے لیے اقدامات اٹھائے۔ تلک نے عدالتوں میں اپیل درج کی، اور نومبر میں بمبئی ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ ہوم رول کا مطالبہ غداری نہیں ہے۔ بمبئی، مدراس اور وسطی صوبوں کی حکومتوں نے طلباء کے اجلاسوں میں شرکت پر پابندی لگادی۔ اپریل اور مئی 1917 میں پنجاب، بمبئی اور مدراس کی حکومتوں نے عوامی طور پر اس تحریک کی مذمت کی۔ بیسنٹ نے حکومت کی مذمت اور تحریک کو روکنے کی کسی بھی کوشش کی مزاحمت کی، لیکن ان کی بات نہیں سنی گئی۔ جون 1917 میں، حکومت مدراس نے اروندلے اور واڈیا کے ساتھ بیسنٹ کو حراست میں لے لیا۔ اس طرح پورے ملک میں چیخ وپکار شروع ہوئی اور لیگ کی رکنیت دوگنی ہوگئی۔ یہاں تک کہ اعتدال پسند جو لیگ میں شامل نہیں تھے (بنرجی، واچا اور ساستری) نے حکومت کی کارروائی کی مذمت کی۔ نوجوانوں نے، خاص طور پر بمبئی میں، غیر فعال مزاحمت کی مہم کے لیے تلک اور گاندھی کی رہنمائی حاصل کی۔ فوری طور پر، بہت سے قومی رہنماوں نے احتجاج کا اظہار کیا اور تحریک میں شامل ہوگئے۔ جناح، سریندر ناتھ بنرجی اور مدن موہن مالویہ ان میں سب سے مشہور تھے۔ تلک نے جولائی 1917 میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں غیر فعال مزاحمت کی وکالت کی، گاندھی کے ایک ہزار آدمیوں کے دستخط اکٹھا کرنے کی تجویز پر عمل کیا گیا جو کہ نظربندی کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے اور بیسنٹ کی نظربندی کی جگہ پر مارچ کرنے کے لیے تیار تھے۔ دیہاتی علاقوں کے دورے اور ملاقاتیں تیز ہوئیں اور تحریک نے ایک نئے عزم کا مظاہرہ کیا۔

10.12 برطانوی رویہ میں تبدیلی (Change in British Attitude)

اس بڑھتے ہوئے احتجاج کا سامنا کرنے کے لیے برطانوی حکومت نے نرم رویہ اپنانے کا فیصلہ کیا۔ پالیسی کی تبدیلی کا اشارہ برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ مون ٹیگ کے اعلان سے پتا چلتا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ "برطانوی حکومت کی پالیسی ہندوستان کے ہر کونے میں انتظامیہ اور خود مختار حکومت قائم کرنا ہے۔ چونکہ ہندوستان برطانوی سلطنت کا اٹوٹ انگ ہے اس لیے خود مختار اداروں کی ترقی کو یقینی بنایا جائے"۔ مون ٹیگ کے اعلان کے بعد، خود مختار حکومت یا ہوم رول کے مطالبے کو مزید بغاوت نہیں سمجھا جاسکتا تھا جو ایک اہم کامیابی تھی۔ تاہم، اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ برطانیہ ہندوستان کو خود مختاری دینے والا تھا۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ

اصلاحات کی نوعیت اور وقت کا فیصلہ صرف حکومت ہی کرے گی۔ اس سے ہندوستانیوں کی طرف حقیقی اقتدار کی منتقلی کو مسلسل ملتوی کرنے کی گنجائش مل گئی۔ قومی تحریک اور انگریزوں کے درمیان تصادم ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ ایڈون مون ٹیگ کے اس اعلان سے ٹل گیا کہ ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کی طرف پیش قدمی کی جانی ہے اور وہ ہندوستان کا دورہ کرنے والے ہیں۔ ستمبر میں، سیاسی درجہ حرارت کو کم کرنے کی مزید کوشش میں، انہوں نے اینی بیسنٹ کو رہا کر دیا۔ دسمبر 1917 میں اینی بیسنٹ کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدر منتخب ہوئیں۔ اس وقت ان کی مقبولیت اپنے عروج پر تھی جس کی وجہ سے تحریک کو مزید پیش قدمی اور سرفرازی نصیب ہوئی۔

10.13 ہوم رول تحریک کی ناکامی کے وجوہات

(Causes for the Failure of the Home Rule Movement)

1917 کے دوران فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے جس سے ہوم رول تحریک متاثر ہوئی۔ اینی بیسنٹ کی گرفتاری کے بعد کانگریس میں شامل ہونے والے اعتدال پسندوں کو مون ٹیگ چمسفوڑ (1918) اصلاحات سے مطمئن کیا گیا، جس میں کہا گیا تھا کہ خود مختاری ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کا طویل مدتی مقصد ہے اور وہ بیسنٹ کی رہائی کے بعد خاموش ہوئے۔ جولائی 1918 میں مشہور مون ٹیگ چمسفوڑ اصلاحات نے قوم پرست صفوں کو مزید تقسیم کر دیا۔ ان اصلاحات اور غیر فعال مزاحمتی تکنیک کے بارے میں خود اینی بیسنٹ نے بھی متضاد خیالات کا اظہار کیا۔ تلک کو ستمبر 1918 میں ویلنٹائن چیرول کے خلاف مقدمے کی وجہ سے برطانیہ روانہ ہونا پڑا۔ انہوں نے *Indian Unrest* کتاب لکھنے پر چیرول کے خلاف مقدمہ درج کیا تھا۔ ادھر بیسنٹ ایک واضح قیادت فراہم کرنے سے قاصر رہی اور تلک کی غیر حاضری کی وجہ سے ہوم رول تحریک بہت متاثر ہو گئی۔ آزادی کی جدوجہد کے بارے میں گاندھی کے تازہ نقطہ نظر نے لوگوں کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا، اور عوامی تحریک کی بڑھتی ہوئی رفتار نے ہوم رول تحریک کو ایک طرف دھکیل دیا یہاں تک کہ یہ ختم ہو گئی۔

10.14 ہوم رول تحریک کی اہمیت (Significance of the Home Rule Movement)

ہوم رول تحریک کا مقصد قوم پرست کارکنوں کو سیاسی طور پر باشعور اور پر عزم بنانا تھا جو آنے والی عوامی جدوجہد میں قائدانہ کردار ادا کر سکیں۔ انہوں نے اجلاس کے دوران شہروں اور دیہاتوں میں جو رابطے قائم کیے تھے وہ آنے والے سالوں میں بھی انمول ثابت ہونے والے تھے۔ یہ ہوم رول کے تصور کی وسیع پیمانے پر مقبولیت اور قومی احساس کی بیداری دکھاتی ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ ہوم رول تحریک کے کچھ قائدین خود آگے کا راستہ دکھانے اور اس شعور کو عوامی جدوجہد میں تبدیل کرنے میں ناکام رہے۔ لیکن انہوں نے تحریک کے اگلے مرحلے کے لیے زمین تیار کر لی۔ یہ ایک ایسا مرحلہ تھا جسے مہاتما گاندھی کی شخصیت کے ذریعے ایک منفرد کردار کی شکل دی جانی تھی۔ عوام کے زیر انتظام حکومت قائم کرنا ہوم رول تحریک کا بنیادی مقصد تھا۔ اس کے ذریعے لوگوں میں خود مختار حکومت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، جس نے ہندوستانی جدوجہد کو تیز کرنے اور ہندوستانیوں کے درمیان فاصلوں کو ختم کرنے کے بیج بوئے۔ صرف غیر متشدد احتجاجی حربوں کو قبول کیا گیا، میڈیا اور ریلیوں کے ذریعے لوگوں کو اس سے آگاہ کیا گیا۔ اس تحریک کے دوران، اعتدال پسند، انتہا پسند، اور مسلم لیگ اکٹھے ہوئے، جو

انتہائی کارآمد رہا۔

تاہم، اس مہم نے بالآخر لارڈ مونٹیگیو کو اگست اعلانیہ شائع کرنے پر آمادہ کیا، جس میں بیان گیا تھا کہ ہندوستانیوں کو اپنے دیش کی حکمرانی اور خود مختار ادارے کی تشکیل میں آزادی دی جائے گی۔ حکومت نے زیادہ ہندوستانیوں کی شمولیت اور خود مختار اداروں کی ترقی کو تسلیم کیا، جو بالآخر ہندوستان میں ذمہ دار حکومتوں کا باعث بن گیا۔ کانگریس پارٹی کے برعکس، ہوم رول تحریک سال بھر کام کرتی تھی، اور فعال سرگرمیوں میں شامل رہتی تھی۔ تحریک کو پڑھے لکھے ہندوستانیوں کی طرف سے نمایاں حمایت حاصل ہوئی تھی۔ 1917 تک دونوں لیگوں میں تقریباً 40,000 اراکین موجود تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے بہت سے اراکین نے ہوم رول تحریک میں شمولیت اختیار کی، جن میں ممتاز رہنما جیسے محمد علی جناح، جوزف بپٹستا، جی۔ ایس۔ کھاپرڈے، اور سر ایس۔ سبرامنیا ایئر شامل تھے۔

10.15 ہوم رول سے متعلق ٹیگور کے بیانات (Rabindranath Tagore on Home Rule)

رابندر ناتھ نے ہوم رول تحریک سے پیدا ہونے والی سیاسی صورتحال اور اس کے تئیں حکومت کے رویہ کا جائزہ لیا۔ انہوں نے سامعین کو متاثر کیا کہ بنگال کے لوگوں کو خود مختار حکومت کے لیے رونا نہیں پڑے گا اگر وہ معاشرے، مذہب اور اخلاقیات کے نظریات کے ساتھ پابند اور رہنمائی کرتے رہے اور سچائی اور حق کی قربانی دیتے رہے۔

10.16 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس تحریک کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ اس نے نئی نسل میں متعدد رہنماؤں کو جنم دیا۔ یہ تحریک مختلف طبقوں اور علاقوں میں قومی تحریک پھیلانے میں کامیاب ہوئی جیسے مدراس کے تامل برہمن، متحدہ صوبوں کے شہری پیشہ ور افراد، بمبئی اور گجرات کے تاجر، وکلاء وغیرہ۔ اس وقت تحریک میں شامل ہونے والے کئی رہنما گاندھی کے اہم سپاہی بن گئے، جیسے جواہر لال نہرو، خلیق الزمان، مدراس کے ستیہ مورتی، بنگال کے جتیندر لال بنرجی، جمنا داس دوارکاداس، عمر سوبھانی، شنکر لال بنکر اور گجرات کے اندولال یاگنگ۔ اگرچہ ہوم رول تحریک اپنا مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہی، لیکن اس نے ہندوستانی سیاست میں ایک نیا ماحول پیدا کیا، جہاں احتجاج، جلسے اور مذمت معمول بن گئے۔ اس کا فوری فائدہ مون ٹیگ چمسفورڈ اصلاحات کی شکل میں سامنے آگیا۔

10.17 کلیدی الفاظ (Key Words)

متعصب	:	تعصب برتنے والا، دوسرے کے عقیدے سے دُشمنی کرنے والا۔
سوراج	:	ہندوستان کو آزاد بنانا اور اپنے معاملات کو اپنے طریقے سے چلانا ہے۔
لسانی	:	زبان (بولی) سے متعلق علم زبان سے منسوب۔
سیکولرزم	:	دنیاوی امور سے مذہب اور مذہبی تصورات کا اخراج یا بے دخلی۔

فابیانزم	:	وہ تصور جو پرامن طریقوں سے سوشلزم کے بتدریج پھیلاؤ کی حمایت کرتا ہے۔
بنیاد پرستی	:	وہ عقیدہ جو انقلابی ذرائع سے معاشرے کی تبدیلی پر زور دیتا ہے۔
مابعد الطبیعات	:	فلسفہ کی وہ شاخ جو وجو، سچائی اور علم کی نوعیت سے متعلق ہو۔

10.18 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

10.18.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ہوم رول تحریک کیوں شروع کی گئی؟
2. مون ٹیگ چمسفوڑ اصلاحات کا اعلان کس سال کیا گیا تھا۔
3. ہوم رول تحریک کس سال شروع ہوئی؟
4. ہوم رول کی اصطلاح کہاں سے لی گئی؟
5. کل ہند ہوم رول تحریک کا نام بدل کر سوراجیہ سبھا کس نے رکھا؟
6. ہندوستان میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کے بانی کا نام بتائیں۔
7. اینی بیسنٹ کے دو اخبارات کے نام بتائیں۔
8. ہندوستان میں ہوم رول تحریک کا آغاز کس نے کیا؟
9. تلک کس اخبار سے وابستہ تھے؟
10. چھ سال جیل میں رہنے کے بعد تِلک کس سال میں رہا ہوئے؟

10.18.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہوم رول تحریک کی کیا اہمیت تھی؟
2. تلک اور اینی بیسنٹ نے ہندوستانی قومی تحریک میں انتہا پسندوں کو دوبارہ داخل کرنے کی کوشش کیوں کی؟
3. ہوم رول تحریک کے مقاصد پر بحث کریں۔
4. ہوم رول تحریک کے سیاسی اثرات کیا تھے؟
5. مون ٹیگ چمسفوڑ اصلاحات پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

10.18.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوستانی قومی تحریک میں اینی بیسنٹ کی شراکت پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔
2. ہندوستانی قومی بیداری کے عروج میں بال گنگادھر تلک کے کردار کی وضاحت کیجیے۔

3. کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہوم رول تحریک نے گاندھی کی عوامی تحریک کے لیے بنیاد فراہم کی تھی؟ بحث کریں۔

10.19 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Books for Further Reading)

1. Agarwal, C.V. and Pedro Oliveria comp., *Annie Besant in India*, The Theosophical Publishing House, Chennai, 2023.
2. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
3. Bandyopadhyay, Sekhar (ed.), *Nationalist Movement in India: A Reader*, Oxford University Press, New Delhi, 2009.
4. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2014.
5. Chandra, Bipan, et al. *India's Struggle for Independence*, *1857–1947*, Penguin, New Delhi, 1989.
6. Pradhan, G.P., *Lokmanya Tilak*, National Book Trust, India, 2005 (first pub. in 1994).
7. Ranjan Ray, Nisith, et al., *Concise History of the Indian National Congress*, *1885–1947*, Vikas Publishing House, 2019.
8. Rao, Parimala V., *Foundations of Tilak's Nationalism*: *Discrimination, Education and Hindutva*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.
9. Sarkar, Sumit, *Modern India*, *1885–1947*, MacMillan, New Delhi, 1982.
10. Tripathi, Amales, *Indian National Congress and the Struggle for Freedom*, *1885–1947*, Oxford University Press, New Delhi, 2014.

اکائی 11۔انڈین کونسلس ایکٹ 1909

(The Indian Councils Act of 1909)

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 آئینی تبدیلیوں کی ضرورت

11.3 انڈین کونسل ایکٹ 1909 کی دفعات

11.4 صوبائی مجلس قانون ساز/مقننہ

11.5 اہلیت

11.6 امتیازی حق شہریت

11.7 افعال میں تبدیلیاں

11.8 تنقید

11.9 ایکٹ کی خوبیاں

11.10 ایکٹ کی خامیاں

11.11 اہمیت

11.12 اکتسابی نتائج

11.13 کلیدی الفاظ

11.14 نمونہ امتحانی سوالات

11.15 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید (Introduction)

1858 میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر، کنگ ایڈورڈ (King Edward) نے شہزادی اور ہندوستان کے لوگوں کو ایک شاہی پیغام بھیجا جس میں سیاسی اصلاحات کی نشاندہی کی گئی۔ دسمبر 1908 میں لارڈ مورلے نے برطانوی پارلیمنٹ میں اصلاحات کی تفصیلات کا اعلان کیا۔ اعتدال پسندوں کی طرف سے ان کے اعلان کا خیر مقدم کیا گیا۔ خاصکر کانگریس نے مدراس اجلاس میں اصلاحات کی تعریف کرتے ہوئے ایک قرارداد منظور کی۔ کانگریس نے لارڈ مورلے اور لارڈ منٹو کو ان کی اصلاحی تجاویز کے لیے انتہائی مخلصانہ شکریہ ادا کیا اور شملہ میں کچھ مسلمانوں کے وفد نے حکومت کو یقین دلایا کہ وہ صحیح سمت میں سوچ رہی ہے۔ اس طرح، مورلے، سکریٹری آف اسٹیٹ، اور منٹو وائسرائے کی طرف سے یہ اصلاحاتی تجاویز 1909 کے انڈین کونسل ایکٹ میں شامل تھیں، جو منٹو-مورلے ریفارمز کے نام سے مشہور ہیں۔

11.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- یہ اصلاحات کن عوامل کی وجہ سے متعارف کرائی گئیں؟، جان سکیں گے۔
- ایکٹ کی دفعات اور اہمیت سے واقف ہو سکیں گے۔
- اس مدت کے دوران قانون ساز اداروں کے سائز اور افعال میں اضافے کا پتا لگا سکیں گے۔
- ہندوستانی سماج اور سیاست پر ایکٹ کے اثرات کا تجزیہ کر سکیں گے۔

11.2 آئینی تبدیلیوں کی ضرورت (Need for Constitutional Reforms)

دراصل 1909 کی مورلے-منٹو اصلاحات کے نفاذ کو 1892 کے انڈین کونسل ایکٹ کے بعد ہنگامہ آرائی اور عسکریت پسندانہ سرگرمیوں کے پس منظر میں دیکھا جانا لازمی ہے۔ ہندوستانی 1892 کے ایکٹ کے ذریعے متعارف کرائی گئی اصلاحات سے مطمئن نہیں تھے۔ یہ ایکٹ آل انڈیا کانگریس کے درمیان اعتدال پسندوں کو بھی مطمئن کرنے میں ناکام رہا تھا۔ کانگریس کے اندر انتہا پسندی کا عروج ان اصلاحات کے خلاف مزید عدم اطمینان کا باعث بنا۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی غیر مطمئن تھے، کیونکہ انہیں انتظامیہ اور سرکاری خدمات میں مناسب حصہ نہیں دیا گیا تھا۔ 1885–1906 کے دوران ہندوستان میں میٹرک پاس کرنے والے طلباء کی تعداد 1286 سے بڑھ کر 8211 ہوگئی تھی۔ اگرچہ آج کے وقت کے مطابق یہ تعداد مضحکہ خیز حد تک چھوٹی نظر آتی ہے، لیکن تعداد کے لحاظ سے یہ تقریباً سات گنا بڑھ گئی۔ اس دور میں شائع ہونے والے اخبارات اور جرائد کی تعداد اور ان کی گردش بھی اسی طرح کے رجحان کو ظاہر کرتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی ممکنہ طور پر اپنے حقوق اور حکومت کے فرائض سے آگاہ تھے، اور ان لوگوں نے اجنبی حکمرانی کے تحت ہونے والے نقصانات کو سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اس دوران ہندوستانی قومی تحریک کے اُن 'انتہا پسند' گروہ کا آغاز بھی ہو چکا تھا جن کا قومی تحریک میں اہم

کردار رہا تھا۔ 1904 میں جاپان کے ہاتھوں روس کی شکست نے ہندوستانیوں سمیت ایشیائی ممالکوں کے حوصلے بلند کر دیے۔ انگریزوں کے نسلی تکبر اور ہندوستان اور اس سے باہر ہندوستانیوں کی تذلیل بالخصوص جنوبی افریقہ میں ہندوستانی قوم پرستوں کو بھی اشتعال دلایا۔ اس کا نتیجہ 1907 میں آل انڈیا کانگریس کی تقسیم کی صورت میں نکلا۔ لہٰذا، برطانوی حکومت نے انتہا پسندوں کے مقابلے میں ہندوستانی رائے عامہ کو مطمئن کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

اس کے علاوہ لارڈ کرزن گورنر جنرل (1898–1905) کی پالیسیوں اور رویے سے ہندوستانیوں کو بہت مایوسی ہوئی، کیونکہ انہوں نے ہندوستانیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے انگریزوں کی تمام اچھی ملازمتوں کی حمایت کی۔۔ ان کی مرکزیت کی پالیسی، تعلیم یافتہ ہندوستانیوں، انڈین نیشنل کانگریس اور ہندوستانی قومیت کی اک پوشیدہ توہین تھی اور سب سے بڑھ کر اُن کی تقسیم بنگال کی پالیسی نے لوگوں کی ناراضگی کی انتہا کر دی۔ جب سے دسمبر 1903 میں تقسیم کے منصوبے کا اعلان ہوا، بنگال کے لوگوں نے واضح اور غیر واضح الفاظ میں اپنے عدم اطمینان کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ مختلف متبادل منصوبے بھی تجویز کیے گئے، پھر بھی تقسیم کے منصوبے پر عمل کیا گیا۔ یہ غیر مقبولانہ فیصلہ حکمرانوں کی خواہشات کی مکمل نمائندگی کرتا تھا۔ کانگریس قائدین نے اپنی تنظیم کے حتمی مقصد اور خاص طور پر انگریزوں پر دباؤ ڈالنے کے طریقہ کار پر نظر ثانی کرنے کے حوالے سے سوچنا شروع کیا۔ تقسیم کے اقدام سے پیدا ہونے والی برطانوی حکمرانی کے خلاف سخت مخالفت کا اظہار کلکتہ اور دیگر مقامات پر ہونے والے مظاہروں میں ہوا، جس دوران سودیشی، بائیکاٹ اور قومی تعلیم کے نعرے لگائے گئے۔

کچھ اعتدال پسند رہنما، خاص طور پر بنگال میں، انتہا پسندوں کے بائیکاٹ اور سودیشی پروگرام کی حمایت میں کھل کر سامنے آئے۔ لیکن وہ جلد ہی پیچھے ہٹ گئے اور اپیلوں اور درخواستوں کے طریقہ کار پر واپس آ گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ حکومت کوئی آزادانہ اشارہ کرے۔ 1905 میں بنارس میں منعقدہ کانگریس کے اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں اعتدال پسند رہنما جی۔ کے۔ گوکھلے نے کہا" کانگریس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان پر خود ہندوستانیوں کے مفادات کے مطابق حکومت کی جائے۔ فوری مطالبات میں انہوں نے قانون ساز کونسلوں میں اصلاحات اور ریاستی کونسل کے سکریٹری میں کم از کم تین ہندوستانیوں کی تقرری پر زور دیا۔ 1905 کے آخر جب برطانیہ میں لبرل گروہ برسر اقتدار میں آیا اور جان مورلے، جو اپنے آزاد خیالات کے لیے مشہور تھے، ہندوستان کے سیکریٹری آف اسٹیٹ بنے۔ کچھ مدت پہلے ایک قدامت پسند، لارڈ منٹو کرزن کی جگہ گورنر بنے تھے۔ —جنرل مورلے اور منٹو کے نام 1909 کے انڈین کونسل ایکٹ کے تحت اصلاحات متعارف کرائی گئی۔ یہ کچھ تبدیلیوں کے ساتھ منسلک ہو گئے جو کچھ دیگر تبدیلیوں کے ساتھ مل کر مورلے - منٹو ریفارمز کے نام سے مشہور ہوئے۔ مورلے اور منٹو اپنے پس منظر، شہرت اور عملی تجربات میں بہت مختلف تھے۔ لیکن ہندوستان کی پالیسی کے حوالے سے ان کے خیالات تقریباً ایک جیسے تھے۔ دونوں نے تسلیم کیا کہ بنگال کی تقسیم ایک سنگین غلطی تھی اور اس نے ملک میں حکومت مخالف جذبات کو جنم دے دیا۔ انہوں نے یہ خوف بھی ظاہر کیا کہ یہ احساس مسلمانوں میں پھیل رہا ہے۔ ان جذبات کا کھل کر سرکاری اور غیر سرکاری خط و کتابت میں اظہار کیا گیا۔ مثال کے طور پر، حکومت ہند نے ایک عوامی پیغام میں لکھا:

ایسا لگتا ہے کہ ہم انگریزی بولنے والی طبقات پر آہستہ آہستہ اپنی گرفت کھو رہے ہیں اور ایسے اشارے مل رہے ہیں کہ ان

طبقات کے ایک قابل ذکر حصے کی طرف سے محسوس کی جانے والی پس پردہ دشمنی آبادی کے نچلے حصے تک جاری ہے، جو کام کی وجوہات کو نہیں سمجھتے ہیں۔ لیکن کون دیکھتا ہے کہ انگریز اہلکار اب کمانڈنگ کے عہدے پر نہیں ہے جو اس نے کیا تھا۔ ایک نئی روانگی کی سخت ضرورت ہے۔

انہوں نے جس نئی روانگی کے بارے میں سوچا وہ قانون ساز اداروں کی ساخت اور افعال میں تبدیلیوں کا تعارف تھا۔ اس طرح وہ اعتدال پسندوں کو سلطنت تک پہنچا سکتے تھے کیونکہ یہ ان بنیادی مطالبات میں سے ایک تھا جو وہ کر رہے تھے۔ تاہم، برطانوی حکمران اس بات سے واقف تھے کہ اعتدال پسندوں کا بنیادی مطالبہ 'ہندوستان پر ہندوستانیوں کے فائدے کے لیے حکومت' کی جائے جو کہ سامراجی ڈھانچے میں شامل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ قومی شعور کو بیدار کرنے کے لیے کام کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ برطانوی راج کو وفاداری سے قبول کرنا حتمی طور پر ناممکن تھا۔ لہذا اصلاحات کے ذریعے سے عوام کو جیتنے کے علاوہ، انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت کے لیے حمایت کے دوسرے اقدامات اٹھائے۔ ان کی آمد کے فوراً بعد لارڈ منٹو نے لکھا تھا: 'میں حال ہی میں کانگریس کے مقاصد کے ممکنہ جواب کے بارے میں کافی سوچ رہا ہوں۔' سب سے پہلے حکام نے ایک 'قابل ذکر' علیحدہ کونسل قائم کرنے کا سوچا جو ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں پر مشتمل ہو۔ زمیندار وغیرہ جو انگریزوں کے وفادار تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں ہی زمینداروں کو نمائندگی دینے کا فیصلہ کیا۔

اسی دوران، اکتوبر 1906 میں کچھ مسلم رہنماؤں کا ایک وفد وائسرائے سے شملہ میں ملا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کی نمائندگی اُن کے اعداد طاقت کے مطابق ہونا چاہیے جو کہ انگریزوں نے ایک امید افزا متبادل کے طور پر دیکھا جس سے وہ کانگریس لیڈروں کے بڑھتے ہوئے مطالبات کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری سمجھنے لگے۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ مسلمانوں کو ترجیح کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے اُن کو الگ نشستیں دینے کا ٹھان لیا۔ قوم پرست رہنماؤں نے دلیل دی کہ اس ڈیپوٹیشن کا انتظام انگریزوں نے کیا تھا۔ محمد علی نے اسے 'کمانڈ پرفارمنس' قرار دیا۔ مسلم لیگ کے مداحوں نے اس الزام کی تردید کی اور دلیل دی ہے کہ سر سید احمد خان کے پیروکار 1880 کی دہائی سے ہی مسلمانوں کے مفادات کی نمائندگی کے لیے مسلمانوں کی نامزدگی کا مطالبہ کر رہے تھے اور جب انتخابات کے آغاز کا امکان پیدا ہوا تو مزید نشستوں کا مطالبہ کیا گیا۔ اور الگ الگ انتخابی حلقوں کی ہدایت واقعات کی منطق سے کی گئی تھی۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزوں نے اپنی حکمرانی کو جاری رکھنے کے لیے فرقہ وارانہ علیحدگی پسندی کی حوصلہ افزائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ نسبتاً جو کانگریس دو دہائیوں سے زیادہ عرصے سے کوشش کر رہی تھی، لیگ نے اپنی بنیاد کے کچھ ہی عرصے میں قابل ذکر کامیابی حاصل کی۔ آئینی تبدیلیوں کو متعارف کرانے کی پہلی تجویز 1906 کے موسم گرما میں کی گئی تھی اور انڈین کونسل ایکٹ مئی 1909 میں طویل اور محنتی غور و خوض کے بعد منظور کیا گیا تھا۔ حکومت نے ان لوگوں کے لیے جبر کی پالیسی اپنائی جو حکومت کی مخالفت اور مذمت کرتے رہے۔ 1907–1908 کے دوران پریوینشن آف سیڈیشیئس میٹنگز ایکٹ (The Prevention of Seditious Meetings Act) مخصوص علاقوں میں میٹنگ پر پابندی لگائی گئی تھی۔

1906 میں مسلم لیگ کے قیام نے حکومت کو ہندوستانی قوم پرستی کے خلاف مسلم فرقہ واریت کی حمایت کا موقع فراہم کیا۔ مسلم فرقہ واریت کو یقینی بنانے کے لیے اصلاحات کی ایک نئی اسکیم کو یقینی طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح، ہندوستانی سیاست میں انتہا پسندی کے عروج کو روکنے، کانگریس میں اعتدال پسندوں کو حکومت کی طرف سے جیتنے اور مسلم فرقہ واریت کو دبانے کے لیے مزید اصلاحات کی ضرورت پیش آئی۔ اس لیے حکومت ہند کی طرف سے اصلاحات کی ایک اسکیم تجویز کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ لارڈ منٹو، گورنر جنرل اصلاحات کی ضرورت کے قائل تھے، لارڈ مورلے، سیکرٹری آف اسٹیٹ نے بھی اتفاق کیا۔ لہٰذا، 1909 کا ایکٹ جسے منٹو مورلے ریفارمز کے نام سے جانا جاتا ہے، برطانوی پارلیمنٹ نے 25 مئی 1909 کو منظور کیا۔ 1892 انڈین کونسل ایکٹ کی طرح، 1909 کا ایکٹ بھی ایک ترمیمی ایکٹ تھا۔ اپنے پیشرو کی طرح، اس نے قانون اور ضوابط بنانے کے مقصد سے گورنر جنرل اور ان کی کونسلوں کے سائز اور افعال میں تبدیلیاں بھی متعارف کروائیں۔

John Morley Viceroy Lord Minto

Source: https://civilaspirant.in/minto-morley-reforms

11.3 انڈین کونسل ایکٹ 1909 کی دفعات (Provisions of the Indian Councils Act -1909)

اس ایکٹ نے مرکزی اور صوبائی کونسلوں کی طاقت میں اضافہ کیا۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی کی رکنیت 16 سے بڑھا کر 69 کر دی گئی۔

- 69 میں سے 37 اراکین سرکاری افسران کے لیے جبکہ 32 غیر سرکاری اراکین کے لیے مخصوص کی گئی۔
- 32 غیر سرکاری اراکین میں سے 5 کو نامزد کیا گیا اور باقی 27 منتخب ہوئے۔
- 27 منتخب اراکین میں سے 6 ہندو زمینداروں سے، 5 مسلم کمیونٹی سے، اور 1 مسلم زمینداروں سے، 1 ایوان تجارت بمبئی سے، 1 ایوان تجارت بنگال سے اور باقی 13 منتخب ہوئے صوبائی قانون ساز اسمبلی سے تھے۔
- صوبائی قانون ساز اسمبلی سے منتخب ہونے والے 13 اراکین میں سے، بنگال، مدراس، بمبئی اور متحدہ صوبے سے دو دو، اور پنجاب، بہار، آسام، وسطی صوبے اور برما (میانمار) سے ایک ایک۔

- ایک ہندوستانی کو گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل میں شامل کیا گا۔ ستیندر سنہا پہلے ہندوستانی تھے جو گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بنے تھے۔
- دو ہندوستانیوں کو انڈین کونسل آف سیکریٹری آف اسٹیٹ میں شامل کیا گیا، وہ تھے - کے - سی گپتا اور سید حسین بلگرامی۔
- قانون ساز ادارہ اقتصادی ضابطے پر بحث کر سکتا تھا، ترمیمی بل پیش کر سکتا تھا، کچھ مسائل پر ووٹ دے سکتا تھا اور اضافی سوالات پوچھ سکتا تھا۔ قرارداد پیش کرنے سے پہلے اسپیکر کو پندرہ دن کا نوٹس دینا ضروری تھا۔

11.4 صوبائی مجلس قانون ساز/مقننہ (Provincial Legislature)

صوبائی قانون ساز کونسلوں کی رکنیت کو 1909 کے ایکٹ کے تحت درج ذیل طریقے سے بڑھایا گیا تھا۔

صوبہ کا نام	کل رکنیت
بنگال	52
بمبئی	47
مدراس	47
متحدہ صوبہ (یو-پی)	47
مشرقی بنگال اور آسام	41
پنجاب	25
برما	16

ایکٹ میں صوبوں میں غیر سرکاری اکثریت کا دعویٰ کیا گیا تھا لیکن کچھ غیر عہدیداروں کو گورنر کے ذریعے نامزد کیا جانا تھا تاکہ کونسل پر سرکاری کنٹرول برقرار رکھا جا سکتا تھا۔ اسے مدراس کے نمونے سے درج ذیل طریقے سے آسان بنایا گیا۔

- غیر سرکاری ممبران 26 تھے، جس میں سے 21 منتخب اور 5 نامزد۔
- سرکاری ممبران 21 تھے، جس میں سے 5 منتخب اور 16 نامزد۔

واضح رہے کہ نامزد ارکان کی کل تعداد منتخب سے زیادہ تھی اور ظاہر ہے کہ نامزد ارکان حکومت کے وفادار تھے۔

11.5 اہلیت (Eligibility)

صرف وہی ذات ووٹ دینے کے اہل تھے جن کی سالانہ آمدنی 15,000 سے زیادہ روپے تھی یا جنھوں نے کم از کم 10,000 روپے کی سالانہ آمدنی پر محصول ادا کیا۔ بنگال میں صرف وہی لوگ ووٹ ڈالنے کے اہل تھے جن کے پاس راجہ اور نواب کا خطاب تھا۔ مسلم ووٹروں کے لیے آمدنی کی اہلیت ہندوؤں سے کم رکھی گئی۔ حالانکہ حکومت اور مسلم لیڈران نے ہمیشہ پوری کمیونٹی کی بات کی لیکن حقیقت

میں مسلمانوں میں سے صرف مخصوص اشرافیہ کو ہی ترجیح دی گئی۔

11.6 امتیازی حق شہریت (Discriminatory Franchise)

یہ انتہائی امتیازی قسم کی اصلاحات تھی، کیونکہ جائیداد کے اصولوں پر مبنی تھیں۔ ووٹنگ کی اہلیت غیر مسلموں کے معاملے میں زیادہ تھی۔ مثال کے طور پر 5 سال کا مسلمان گریجویٹ ووٹ دے سکتا تھا، جبکہ غیر مسلم گریجویٹس کی مدت مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہوئی۔ زمینداروں اور مسلمانوں کے نمائندے براہ راست مرکزی قانون سازاداروں کے لیے منتخب کیے جانے تھے۔ اس نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تفریق کو مزید گھمبیر اور غیر منصفانہ بنادیا۔ جب کہ مسلم زمینداروں، امیر تاجروں، گریجویٹوں اور پیشہ ور مردوں کو صوبائی اور حتیٰ کہ مرکزی قانون سازاداروں کے انتخابات کے لیے براہ راست ووٹ ڈالنے کا حق حاصل تھا، لیکن غیر مسلموں کو، خواہ وہ کتنا ہی امیر یا اہل کیوں نہ ہو، ایسا کوئی حق نہیں تھا۔ اگرچہ یہ میونسپل کمیٹیوں یا ڈسٹرکٹ بورڈز کے ممبران پر لاگو نہیں تھا۔

مزید برآں، مسلمانوں کو الگ الگ ووٹرز کے ذریعے منتخب کیا جاتا تھا، یعنی صرف مسلمانوں پر مشتمل الگ الگ ووٹر لسٹ تیار کیا گیا۔ مسلمانوں کو مقامی آبادی میں ان کی تعداد کے لحاظ سے ان کو زیادہ سیٹیں دی گئیں۔ انہیں عام رائے دہندگان میں دوسری کمیونٹیز کے ساتھ مساوی شرائط پر مقابلہ کرنے کا حق بھی دیا گیا تھا۔ انتخابات میں سن 1909 میں ہونے والی مرکزی قانون ساز کونسل میں مسلمان چار جنرل سیٹیں جیتنے میں کامیاب ہوئے اور اسی طرح 30 میں سے تمام 11 غیر سرکاری سیٹیں تھیں (دو سیٹیں چیمبر آف کامرس کے لیے مختص تھیں جو غیر ہندوستانیوں کے لیے مخصوص تھی۔ تاہم، یہ واضح رہے کہ اگرچہ عہدیداروں اور مسلم قائدین دونوں نے ہمیشہ پوری مسلم برادری کے حوالے سے بات کی، لیکن عملی طور پر صرف چند مخصوص اشرافیہ کے گروہوں جیسے زمیندار، سرکاری ملازمین وغیرہ کو ترجیح دی گئی۔

مسلمانوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کرنے کا حکومت کا مقصد ہندوستانی معاشرے میں عدم توازن کو درست کرنا نہیں تھا بلکہ کچھ مسلم رہنماؤں کو حکومت کے ساتھ غلامی کی زنجیروں سے باندھنا تھا۔ اس دور کے ممتاز سیاسی رہنما، جو آئینی تحریک کے طریقہ کار پر یقین رکھتے تھے۔ قانون سازاداروں میں داخل ہونے کے قابل تھے اور مرکزی قانون ساز کونسل کے ارکان میں شامل تھے۔ ان میں سے چندیوں ہیں نواب سید محمد بہادر، سری نواسا شاستری، جی کے۔ گوکھلے، ڈی ای واچا، بھوپندر ناتھ باسو، سریندر ناتھ بنرجی، مدن موہن مالویہ، تیج بہادر سپرو، محمد علی جناح، محمود آباد کے راجہ اور مظہر الحق۔

11.7 افعال میں تبدیلیاں (Changes in Functions)

ایکٹ نے اراکین کو بجٹ، ترامیم اور ضمنی سوالات اٹھانے سے متعلق سوالات اٹھانے کا موقع فراہم کیا۔ مفاد عامہ کے امور پر تبادلہ خیال کیا جاسکتا تھا، لیکن قرضہ، کلیسیائی اخراجات یا ریاستی ریلوے کے اخراجات پر بحث نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایکٹ نے ان کونسلوں کے قانون سازی کے اختیارات میں کوئی ردوبدل نہیں کیا۔ اس نے صرف ان کے افعال کو بڑھادیا۔ قانون ساز کونسلوں کے اراکین کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ

بعض حدود کے ساتھ مفاد عامہ کے معاملات پر قرار دادیں پیش کریں۔ یہ قرار دادیں حکومت کو سفارشات کی شکل میں ہوتی تھیں جنہیں بعد میں اختیار انکار دیا جا سکتا تھا۔ وزیر خزانہ کی طرف سے ایوان میں پیش کیے گئے مالیاتی بیان پر بحث کے لیے وسیع قواعد ترتیب دئے گئے تھے۔ بجٹ کو حتمی شکل دینے سے قبل بیان پر بحث اور قرار دادوں کو منتقل کرنے کا موقع دیا گیا۔ اصل سوال کرنے والے ممبر کو ضمنی سوالات کرنے کا حق دے کر سوالات پوچھنے کا حق بڑھا دیا گیا۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حکومت کے یہ آئینی اصلاحات متعارف کرانے کے دو مقاصد تھے:

- اعتدال پسندوں کو اپنا کر راج کو مضبوط کرنا تھا۔
- سیاسی طور پر سرگرم ہندوؤں اور مسلمانوں 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی حکمت عملی سے تقسیم کرنا تھا۔

یہ جلد ہی واضح ہو گیا کہ حکومت ہندان دونوں مقاصد کو حاصل کرنے میں ناکامیاب ہو گئی۔ ابتدا میں اعتدال پسند رہنما مطمئن تھے اور جوش و خروش سے کام کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس سے پہلے انہوں نے 1907 میں سورت میں کانگریس پر قبضہ کر لیا تھا۔ پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کے اندر ان کا کردار مسلسل کم اہم ہوتا چلا گیا۔ کانگریس کی کارروائی سنسان ہو گئی۔ 1916 میں اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے درمیان ہونے والے معاہدے کے بعد، اعتدال پسند مسلسل آزادی کی جدوجہد کے کنارے پر چلے گئے اور مرکزی کردار ادا کرنا چھوڑ دیا۔

حکومت سیاسی طور پر سرگرم ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ رکھنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئی حالانکہ اس پر مورخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے ترجیح اور الگ انتخابی حلقے کے اصول کو متعارف کرانے کے فوری نتائج نے حکومت کی توقعات کو جھٹلایا۔ جو ایک فطری تھا۔ حکومت کو یقین تھا کہ کچھ اراکین حکومت کی حمایت کریں گے۔ لیکن سارے ممبران ایکٹ بنانے والوں کے مقاصد کے مطابق موقف اختیار نہیں کیا۔ وہ خاص طور پر ان مسائل پر ایک ساتھ ووٹ دینے کا رجحان رکھتے تھے جن پر کچھ عرصے سے قومی بحث چل رہی تھی۔ یہ ہندوستان کے لیے مالیاتی خود مختاری، ریلوے پر ریاستی کنٹرول، ہجرت کے خاتمے اور تعلیم پر مزید اخراجات کے مطالبے جیسے معاملات میں ہوا ہے۔ درحقیقت ان مسائل پر ہونے والی بحثوں نے غیر ملکی حکومت کے مقابلے میں لوگوں کے مفادات کی شناخت کو جنم دیا۔ یہ درست ہے کہ حکومت ان تجاویز کو ٹھکرا سکتی تھی کیونکہ مرکز میں اس کے پاس سرکاری اکثریت تھی اور یہاں تک کہ صوبوں میں بھی وہ کچھ نامزد غیر سرکاری ارکان کی حمایت پر اعتماد کر سکتی تھی۔ پھر بھی قانون ساز اداروں میں ہونے والی بحثوں نے ایک اہم مقصد پورا کیا۔ بلوں اور قرار دادوں پر ہونے والی بحثوں میں اراکین نے منطقی طور پر ناقابل تردید دلائل پیش کیے جو اکثر سرکاری اراکین کو شرمناک صورتحال میں ڈال دیتے تھے۔ یہ دلائل ملک کے طول و عرض میں صحافت میں گونجتے رہے۔ اس طرح بحثوں نے راج کی اخلاقی بنیادوں کو ختم کرنے میں مدد کی۔ تاہم، طویل عرصے میں مسلمانوں کے لیے ترجیح اور علیحدہ انتخابی حلقوں کا تعارف سامراجی حکمت عملی کا ماہرانہ عمل ثابت ہوا۔ ایک بار جب مذہب کو ایک سیاسی عنصر کے طور پر داخل کیا گیا تو، مذہبی خطوط پر مفادات کی پیروی ایک قبول شدہ معمول بن گیا جس کے لیے نشستیں حاصل کرنے اور انہیں برقرار رکھنے کے لیے مذہبی جذبات کی اپیل کی ضرورت پڑی

11.8 تنقید (Criticism)

ایکٹ میں کچھ خامیاں تھی۔ کانگریس کو بہت جلد ان خامیاں کا احساس ہوا اور انہوں نے تنقید شروع کر دی۔ ایکٹ کی سب سے بڑی خامی مسلمانوں کے لیے فرقہ وارانہ انتخابی حلقوں کا تعارف تھا۔ جس کے نتیجے میں قومی یکجہتی کو شدید دھچکا لگا۔ مہاتما گاندھی نے کہا: ''منٹو مورلے کی اصلاحات ہماری ناکامی رہی ہیں''۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کھائی کو وسیع کرنے کے لیے الگ الگ حلقے بنائے گئے۔ اس نظام نے ہندوستانی سیاست میں فرقہ واریت کا ایک دور شروع کیا۔ اس ایکٹ نے دوسری چھوٹی برادریوں جیسے ہریجنوں، سکھوں، عیسائیوں، اینگلو انڈین اور یورپیوں کو بھی اس حق کا دعویٰ کرنے کا اشارہ دیا۔ ایکٹ نے ہندوستانی قوم پرستی کے تابوت میں پہلا کیل ٹھونک دیا۔ قانون سازی کے مقصد کے لیے ان اضافی ارکان کی ایک بڑی تعداد کو بالواسطہ انتخابات کی بنیاد پر واپس کیا جانا تھا جو احساس ذمہ داری کی حوصلہ افزائی کرنے میں ناکام رہے۔

11.9 ایکٹ کی خوبیاں (Merits of the Act)

یہ ایکٹ 1892 کے انڈین کونسل ایکٹ پر ایک بہت بڑی پیش رفت تھی۔ گوپالا کرشنا گوکھلے نے اسے 'انتہائی اہم قدم' سمجھا اور سوچا کہ اس کی دفعات 'موجودہ انتظامیہ کے بیوروکریٹک کردار کو بہت حد تک تبدیل کر دیں گی۔ ایکٹ نے حکومت کی پارلیمانی شکل کا ڈھانچہ متعارف کرایا۔ صوبوں میں غیر سرکاری اکثریت کا دعویٰ کیا گیا۔ دو ہندوستانیوں کے۔ جی گپتا، ایک ہندو شہری اور سید حسین بلگرامی، نظام حیدر آباد کے چیف ایڈوائزر کو ہندوستان کے سکریٹری نے اپنی کونسل میں مقرر کیا تھا۔ بنگال کے ایڈوکیٹ جنرل ایس پی سنہا کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ ایکٹ آئینی خود مختاری پیدا کرنے کی ایک بلواسطہ کوشش تھی اور ضمنی سوالات پوچھنے کا حق بھی اس ایکٹ کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔

11.10 ایکٹ کی خامیاں (Demerits of the Act)

اس ایکٹ کی مندرجہ ذیل خامیاں تھیں:

- اس ایکٹ نے مسلم لیگ کو علیحدہ انتخابی حلقہ دیکر ہندوستانی قوم پرستی میں فرقہ واریت کو جنم دیا۔
- مرکزی قانون ساز اسمبلی میں سرکاری اکثریت کا غلبہ تھا جبکہ صوبائی قانون ساز اداروں میں سرکاری اور نامزد غیر عہدیداروں کا پاور بلاک تھا۔ نامزد غیر عہدیداروں نے ہمیشہ سرکاری اقدام کے حق میں ووٹ دیا جبکہ منتخب اراکین اپنے مختلف طبقات، برادریوں اور مفادات کی وجہ سے ایک نہیں ہو سکے۔
- قانون سازی کے مقصد کے لیے بالواسطہ انتخابات کی بنیاد پر اضافی اراکین کی ایک بڑی تعداد کو واپس کیا جانا تھا جو احساس ذمہ داری کو فروغ دینے میں ناکام رہا۔
- کونسلوں کا حجم بڑھا دیا گیا لیکن ان کے افعال اور اختیارات میں اضافہ نہیں کیا گیا۔ جب کہ اراکین کو بجٹ پر بحث کی اجازت تھی لیکن وہ

اس میں کچھ بھی تبدیلی نہیں لا سکتے تھے۔

- ہندوستانیوں کو حقیقی اختیارات نہیں دیئے گئے جو سوالات وہ پوچھتے تھے ان کا جواب بھی نہ ملتا تھا۔

11.11 ایکٹ کی اہمیت (Significance of the Act)

انڈین کونسل ایکٹ 1909 درحقیقت 1892 کے کونسل ایکٹ پر ایک یقینی بہتری تھی۔ منتخب اراکین نے عوامی رائے کو حکومت کے سامنے رکھنے کے مواقع حاصل کیے، جب کہ مؤخرالذکر اراکین حکمرانوں کو زیادہ یقین دہانی کے ساتھ قائل کر سکتے تھے۔ بحث کرنے کا حق، ضمنی سوالات پوچھنے کا حق اور قرار دادیں منتقل کرنے کا حق کوئی معمولی کامیابیاں نہیں تھیں۔ کے۔ جی گپتا، ایک ہندو شہری اور سید حسین بلگرامی، حیدرآباد کے نوزم کے چیف ایڈوائزر، کو مورلی نے اپنی کونسل میں مقرر کیا تھا۔ اسی طرح بنگال کے ایڈوکیٹ جنرل ایس پی سنہا کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں مقرر کیا گیا تھا۔ اور اس کے باوجود حکومت بے لگام رہی حالانکہ وہ "اس کی آئین پسندی کے ذریعے اپنے خود مختار پہلو کو تلاش کرنے کی پابند تھی، اور اس چیلنج کا جواب تلاش کرنا تھا۔ غالب امکان تھا کہ خود مختاری ختم ہو جائے گی۔" ماحول شاید مکمل طور پر پارلیمانی نہ رہا ہو لیکن 1909 سے پہلے کے دور کے مقابلے میں تبدیلی کافی نمایاں تھی۔" درحقیقت، مورلے منٹو اصلاحات بیوروکریسی اور جمہوریت کے درمیان ایک قابل تعریف سمجھوتہ تھا۔

11.12 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

1909 کی منٹو مورلی اصلاحات نے جمہوریت کے اصول کو اپنایا۔ ایک منتخب ہندوستانی کونسل آف انڈیا اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں شامل تھے۔ تاہم اس ایکٹ میں فرقہ وارانہ نمائندگی جمہوریت کے خلاف تھی اور یہ اصلاحات ہندوستان کی سیاسی بھوک کو پورا کرنے میں ناکام رہیں۔ ایکٹ کسی بھی سیاسی جماعت کو مطمئن کرنے میں ناکام رہا۔ 1909 میں اپنے لاہور اجلاس میں، کانگریس نے علیحدہ رائے دہندگان کے قیام پر اپنی سخت ناپسندیدگی درج کی۔ حکومت کو بھی اپنی ناکامی کا احساس ہوا اور 1918 کی مونٹیگ۔ چیمسفورڈ رپورٹ کے ذریعے نو سالوں میں مکمل طور پر نظر ثانی کر لی گئی۔

11.13 کلیدی الفاظ (Key Words)

علیحدہ انتخابی حلقے	:	الگ الگ (فرقہ وارانہ) انتخابی حلقوں میں، صرف ایک مخصوص کمیونٹی کی نمائندگی۔
قواعد و ضوابط	:	ہدایات قانونی پابندی کے ساتھ۔
مفاد عامہ	:	عام عوام کی فلاح و بہبود۔
بیوروکریسی	:	حکومت کا ایک نظام جس میں زیادہ تر اہم فیصلے ریاستی اہلکار کرتے تھے۔
خود مختاری	:	حکومت کا ایک ایسا نظام جس میں ریاست پر اعلیٰ طاقت ایک شخص کے ہاتھ میں مرکوز ہوتی ہے۔

آئین پرستی : یہ نظریہ کہ حکومت کے اختیارات کا تعین قوانین یا آئین کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

سیکولرازم : دنیاوی امور سے مذہب اور مذہبی تصورات کا اخراج یا بے دخلی ہے۔

سامراجیت : ایک طاقتور ملک کو کمزور ملک پر مسخر کرنا۔

ساخت : کسی پیچیدہ چیز کے حصوں یا عناصر کے درمیان ترتیب اور تعلقات۔

امپیریل لیجسلیٹو کونسل : برطانوی ہندوستان نے 1853 کے چارٹر ایکٹ کے تحت قانون ساز کونسل قائم کی۔

شکر کی ریشمی زنجیروں : غلامی کی زنجیروں۔

11.14 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

11.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. منٹو مورلے نے شاہی منظوری کب دی؟
2. منٹو مورلے کی اصلاحات کیا تھیں؟
3. 'علیحدہ انتخابی حلقہ' کا ذکر کس ایکٹ میں کیا گیا ہے؟
4. سامراجیت اصطلاح کی وضاحت کریں۔
5. انڈین کونسل ایکٹ 1909 کس کے نام کے ساتھ جڑا ہے؟
6. وائسرائے ایگزیکٹو کونسل کا رکن بننے والا پہلا ہندوستانی کون تھا؟
7. مورلے منٹو ایکٹ سے کس سیاسی تنظیم کو فائدہ ہوا؟
8. دو ہندوستانیوں کا نام بتائے جو انڈین کونسل آف سیکریٹری آف اسٹیٹ میں شامل ہوئے تھے۔
9. مورلے منٹو اصلاحات کا بنیادی مقصد کیا تھا؟
10. کیا یہ سچ ہے کی مورلے-منٹو اصلاحات نے تقسیم ہند کی بنیاد رکھی؟

11.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. منٹو-مورلے کی اصلاحات سے مسلم لیگ کو حاصل ہونے والے فوائد پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
2. انڈین کونسل ایکٹ کی اصلاحات کے کیا اثرات پڑے؟
3. 1909 کی آئینی اصلاحات متعارف کرانے میں حکومت کے مقاصد کیا تھے؟
4. 1909 کی آئینی اصلاحات پر مختصر تنقیدی جائزہ لیں۔
5. ووٹنگ کی اہمیت کیا تھی جیسا کہ مورلے منٹو ایکٹ میں ذکر کیا گیا ہے؟

11.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. 1909 کے انڈین کونسل ایکٹ اور اس کی اہم دفعات کے پاس ہونے والے حالات پر تفصیلی گفتگو کریں۔
2. منٹو مورلے اصلاحات کی بنیادی دفعات کیا تھیں؟ ان کی خوبیوں اور خامیوں کا تنقیدی جائزہ لیں۔
3. مورلے منٹو اصلاحات کی ناکامی کے اسباب کا تنقیدی جائزہ لیں۔

11.15 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Austin, Granville, *The Indian Constitution*: *Cornerstone of a Nation*, Oxford University Press, New Delhi, 2018 (first pub. in 1966).
2. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
3. Bandyopadhyay, Sekhar (ed.), *Nationalist Movement in India: A Reader*, Oxford University Press, New Delhi, 2009.
4. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2014.
5. Basu, Durga Das, *Introduction to the Constitution of India*, Prentice-Hall of India, New Delhi, 1997 (eighteenth edition).
6. Bose, Sugata and Ayesha Jalal, *Modern South Asia*: *History, Culture, Political Economy*, Oxford University Press, New Delhi, 2004.
7. Chandra, Bipan, et al. *India's Struggle for Independence*, *1857–1947*, Penguin, New Delhi, 1989.
8. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal*: *A New History of British India*, HarperCollins, Noida, 2021.
9. Mishra, B.B., *The Administrative History of India*, Oxford University Press, London, 1970.
10. Mukherjee, Mithi, *India in the Shadows of Empire*: *A Legal and Political History*, *1774–1950*, Oxford University Press, New Delhi, 2012 (first pub. in 2010).
11. Ranjan Ray, Nisith, et al., *Concise History of the Indian National Congress*, *1885– 1947*, Vikas Publishing House, 2019.
12. Sarkar, Sumit, *Modern India*, *1885–1947*, MacMillan, New Delhi, 1982.
13. Tripathi, Amales, *Indian National Congress and the Struggle for Freedom*, *1885– 1947*, Oxford University Press, New Delhi, 2014.

اکائی 12۔انڈین کونسل ایکٹ1919

(The Indian Councils Act – 1919)

اکائی کے اجزا

12.0	تمہید
12.1	مقاصد
12.2	مونٹیگ۔چیمسفورڈ اصلاحات کا تاریخی پس منظر
12.3	گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ،1919
12.4	ہوم گورنمنٹ میں تبدیلیاں ایکٹ کی اہم دفعات
12.5	مرکز میں دوایوانی مقننہ
12.6	حق شہریت
12.7	مرکزی مقننہ کے اختیارات
12.8	صوبائی حکومت میں تبدیلیاں
12.9	صوبائی مقننہ
12.10	گورنر
12.11	مونٹیگ۔چیمسفورڈ اصلاحات پر مشاہدات
12.12	1919کے ایکٹ پر تنقیدی جائزہ
12.13	اکتسابی نتائج
12.14	کلیدی الفاظ
12.15	نمونہ امتحانی سوالات
12.16	تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید (Introduction)

بیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ ساتھ برطانوی حکومت یہ سوچنے لگی کہ حکومت کے ڈھانچے میں کچھ تبدیلیاں ضروری ہیں۔ جنگ کے دوران ہندوستان میں سیاسی دباؤ کی وجہ سے اور ہندوستانیوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے انگریزوں نے مونٹیگو-چیمسفورڈ اصلاحات متعارف کروائی تھی۔20 اگست 1917 کو، مونٹیگ، سکریٹری آف اسٹیٹ نے ہاؤس آف کامنز میں اعلان کیا کہ ہندوستان میں برطانوی پالیسی، خود مختار اداروں کی بتدریج ترقی کی طرف مرکوز ہونی چاہیئے تاکہ ہندوستان میں ذمہدار حکومت کے ایک اٹوٹ انگ کے طور پر ترقی پسندانہ احساس پیدا ہو سکے۔ یہ برطانوی پالیسی میں ایک واضح تبدیلی تھی۔ مونٹیگ نے وائسرائے چیمسفورڈ کے ساتھ آئینی اصلاحات کے معاملے پر تبادلہ خیال کیا۔ انہوں نے 1918 میں اپنی رپورٹ پیش کی جسے مونٹیگ-چیمسفورڈ ریفارم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مونٹیگ-چیمسفورڈ رپورٹ پر مبنی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 پیش کیا گیا۔ یہ ایکٹ ہندوستان کی آئینی تاریخ میں ایک اہم پیش رفت تھی۔ خود مختار حکومت دینے کے مقصد سے، ایکٹ نے 1921 میں آٹھ صوبوں بنگال، بہار، آسام، مدراس، بمبئی، پنجاب، یوپی اور سی پی میں دو عملی حکومتی نمونے متعارف کیے جو کہ 1937 تک جاری رہے۔

12.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- 1919 ایکٹ کو ایک سیاسی پس منظر میں دیکھ سکیں گے۔
- ایکٹ کی دفعات کو صحیح انداز سے سمجھ پائیں گے۔
- ایکٹ کی خوبیوں اور خامیوں کا صحیح احاطہ کر سکتے ہیں۔

12.2 مونٹیگ-چیمسفورڈ اصلاحات کا تاریخی پس منظر
(Historical Context of the Montagu-Chelmsford Reforms)

مورلے اور منٹو نے شاید ہی سوچا ہوگا کہ 1909 آئینی 'اصلاحات' جو انہوں نے محنتی مشاورت کے بعد تیار کی تھی بمشکل سات سال تک ہی ہندوستانیوں کو مطمئن کر پائے گی۔ 1916 میں ہوم رول تحریک شروع ہونے کے بعد ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے بھی یہ سوچنا شروع کیا کہ حکومت ہند کے ڈھانچے میں کچھ تبدیلیاں ضروری ہیں۔ یہ بڑی حد تک اگست 1914 میں ہوئی عالمی جنگ کا نتیجہ تھا۔ جنگ سے ہندوستان کو کوئی فوری خطرہ نہیں تھا۔ لیکن برطانوی سلطنت کا حصہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان خود بخود اس میں شامل ہو گیا۔ اس کے بعد، ہندوستان نے جنگی کوششوں میں بے دریغ تعاون کیا اور افرادی قوت، رقم اور مواد فراہم کیا۔ ایک اہم موقع پر دی گئی مدد کی وجہ سے ہندوستانیوں کی امیدیں بڑھ گئیں۔ وہ حکمرانوں کی خدمت کا صلہ چاہتے تھے۔ در حقیقت یورپی فوجیوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر لڑنے سے ہندوستانیوں کو خود اعتمادی حاصل ہوئی۔ وہ اپنے آپ پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت کی

پہچان چاہتے تھے۔اس خواہش کو جنگ کے دوران پیدا ہونے والے خیالات سے تقویت ملی۔امریکی صدر ووڈرو ولسن (President Woodrow Wilson) نے کہا تھا کہ جنگ دنیا کو جمہوریت کے لیے محفوظ بنانے کے لیے لڑی جارہی ہے۔ایک امید ابھری کہ اس کا کم از کم مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان کو خود مختاری کے راستے پر ڈال دیا جائے گا۔بڑھتی ہوئی توقعات کے اس پس منظر میں آئینی تبدیلیوں کی بہت سی تجاویز پیش کی گئی۔خود ہندوستانیوں نے کئی تجاویز سامنے رکھی تھی۔تاہم اسی دوران اینی بیسنٹ، نے ہوم رول تحریک شروع کی تھی اوران کے ساتھ تلک جو1914 میں جیل سے رہا ہو گئے تھے۔انہوں نے پونے میں ایک اور ہوم رول تحریک شروع کی تھی۔ان لوگوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ کام کیااور جنگ کے بعد ہندوستان کے لیے ہوم رول یا خود مختار حکومت کے حق میں بحث ومباحثہ، لیکچر، سیر اور رسالے کی بڑے پیمانے پر فروخت کے ذریعے پروپیگنڈا کیا۔لیگ کی سرگرمیوں سے سرکاری حلقوں میں تشویش بڑھی۔یہ بات دلچسپ ہے کہ جس ٹیلی گرام میں گورنر جنرل چیمس فورڈ نے سیکرٹری آف سٹیٹ سے پالیسی کا عمومی بیان دینے کو کہا،اس میں انہوں نے ہوم رول تحریک کے ساتھ ساتھ زار شاہی(Tsarist Regime) کے خاتمے کے ہندوستان پر ممکنہ اثرات کا بھی حوالہ دیا۔روس میں آمریت اور یہاں اسی دوران، لکھنؤ میں،اعتدال پسند،انتہا پسند اور مسلم لیگ اکٹھے ہوئے اور متفقہ طور پر لکھنؤ معاہدہ(دسمبر 1916) کا انعقاد کیا۔انہوں نے مشترکہ طور پر آئینی اصلاحات کی تجویز بھی تیار کی۔انگریزوں کے درمیان،ایک بااثر گروپ جو خود کو 'گول میز' کہتا تھا،نے حکومت کے ڈھانچے پر بحث کی۔اس کے اراکین (لیونل کرٹس، ولیمز ڈیوک اور دیگر) نے محسوس کیا کہ قانون ساز اداروں میں مستقل طور پر مخالفت پیدا ہوسکتی ہے۔لہٰذاوہ صوبوں میں دوعملی حکومت (ڈایارکی) متعارف کرانے کا خیال لے کر آگئے۔اس پس منظر میں جب حکومت ہند سے جنگی فنڈ میں 10 لاکھ پاؤنڈ کا حصہ ڈالنے کو کہا گیا تو یہ محسوس ہوا کہ رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے کچھ اقدامات کرنے ہونگے۔حکومت کو اپنے استعمال کے لیے اضافی محصولات کی اشد ضرورت تھی۔بالآخر اسے درآمدات پر ٹیرف ڈیوٹی لگانے کی اجازت دی گئی۔روئی پر 7.1 فیصد درآمدی ڈیوٹی عائد کی گئی جبکہ ایکسائز ڈیوٹی 3.1 فیصد پر برقرار رکھی گئی۔اس ڈیوٹی کے پیچھے بنیادی خیال خالصتاً مالی تھا۔لیکن اس نے ہندوستانی کپاس کی صنعت کو کچھ تحفظ بھی فراہم کیااور اس طرح ہندوستانی لیڈروں کا یہ دیرینہ مطالبہ کسی حد تک پورا ہوا۔

یہ طے پایا گیاکہ برطانوی حکومت ہندوستان میں اپنے حتمی مقصد کے بارے میں بھی بیان دے۔ہندوستانیوں پر بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت اور ذمہ داری کی منتقلی ہندوستان میں سیاسی دباؤ کا محض ایک ردعمل تھا۔یہ ہندوستانیوں کی حمایت خریدنے کا ایک آلہ تھا۔انہی حالات میں 20 اگست 1917 کو ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ مونٹیگ نے برطانوی پارلیمنٹ میں درج ذیل بیان دیا۔'برطانوی سلطنت کی پالیسی یہ ہے کہ انتظامیہ کی ہر شاخ میں ہندوستانیوں کی بڑھتی ہوئی وابستگی،اور خود مختار اداروں کی بتدریج ترقی، ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کے ایک اٹوٹ حصہ کے طور پر ترقی پسند احساس کے ساتھ۔۔۔'اس اعلانیہ میں یہ بات بھی تھی کہ اس مقصد کے حصول میں پیش رفت کو ایک کے بعد ایک مرحلہ طے کرنا ہے اور اس سمت میں فوری طور پر مطلوب اقدامات اٹھائے جانے ہیں۔جن کا وقت اور طریقہ برطانوی پارلیمنٹ کو طے کرنا تھا۔ایسے معاملات میں پارلیمنٹ کی کارروائی کا تعین ہندوستانیوں کی کارکردگی کی روشنی میں کیا جائے گا۔مونٹیگ نے خود ہندوستان کا دورہ کرنے اور آئینی تبدیلیوں کی اصلاحات تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

نومبر 1917 میں لارڈ مونٹیگ نے ہندوستان کا دورہ کیا اور وائسرائے لارڈ چیمس فورڈ کے ساتھ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے عہدیداروں اور ہندوستانی رہنماؤں سے ملاقات کی۔ غور و خوض کرنے کے بعد ہندوستانی آئینی اصلاحات پر رپورٹ پیش کیا جسے مونٹیگ - چیمسفورڈ رپورٹ کے نام سے جانا جاتا ہے جو کہ جولائی 1918 میں شائع ہوا تھا۔ اگست 1917 کے اعلانیہ کا ہندوستان میں مجموعی طور پر خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن اس رپورٹ میں جو اصطلاحات پیش کی گئی وہ ہندوستانی رہنماؤں کی توقعات سے کم رہی سوائے کچھ اعتدال پسند رہنماؤں کے۔ عینی بیسنٹ نے اقتدار کی بتدریج منتقلی سے متعلق اس کی فراہمی کو 'انگلینڈ کی طرف سے پیش کش کرنے یا ہندوستان کی طرف سے قبول کرنے کے لائق نہیں' قرار دیا۔ اگست 1918 میں اس رپورٹ پر غور کرنے کے لیے کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس بمبئی میں بلایا گیا۔ اس سیشن میں کانگریس کی طرف سے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں اصطلاحات کو ناکافی، غیر تسلی بخش اور مایوس کن قرار دیا گیا۔' دوسری طرف، کچھ اعتدال پسند رہنما اس بات پر قائل تھے کہ یہ تجاویز اِس وقت کے موجودہ حالات میں کافی پیش رفت کی نشاندہی کرتی ہیں اور ان میں ظاہر کی گئی نیک نیتی کی مخلصانہ تعریف کی جانی چاہیے۔ بالآخر مونٹیگ - چیمسفورڈ رپورٹ کی بنیاد پر حکومتِ ہند بل کا مسودہ تیار کیا گیا اور برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔ یہ دسمبر 1919 میں ایک ایکٹ بنا گیا۔ جس کی تمہید اگست 1917 کے اعلامیہ پر مبنی تھی۔

12.3 گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1919 (Main Provisions of the Act of 1919)

تمہید (Preamble)

- ہندوستان میں آہستہ آہستہ ذمہ دار حکومت بنانا برطانوی حکومت کا مقصد ہے۔
- ہندوستان برطانوی سلطنت کا اٹوٹ حصہ رہے گا۔
- خود مختار اداروں کو ترقی دینے کے لیے، انتظامیہ میں ہندوستانیوں کی شمولیت کو بڑھانا۔
- برطانوی پارلیمنٹ خود حکومت کی ترقی اور وقت کا فیصلہ کرے گی۔

12.4 ہوم گورنمنٹ میں تبدیلیاں ایکٹ کی اہم دفعات (Changes in the Home Government)

ایکٹ 1919 نے ہوم گورنمنٹ میں تبدیلیاں کیں۔ ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ کو تنخواہ ہندوستانی محصولات سے ادا ہوا۔ اس ایکٹ نے یہ تبدیلی فراہم کی کہ اسے برطانوی محصولات سے ادائیگی ہونے لگی۔ اس کی مجلس کم از کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ بارہ مقرر کی گئی۔ ان میں سے تین لازمی طور پر ہندوستانی تھے اور اس کے کل ارکان میں سے نصف کا انتخاب ان لوگوں میں سے کیا گیا۔ جنہوں نے ہندوستان میں کم از کم دس سال کی خدمات انجام دی ہو۔ ایک نیا دفتر، ہندوستان کے لیے ہائی کمشنر کا دفتر پہلی بار بنایا گیا۔ لیکن یہ دفتر لندن میں تھا۔ ہندوستان کے لیے ایک ہائی کمشنر آفیسر کا تقرر ہندوستان میں ہوا۔ اور ان کی تنخواہ ہندوستانی محصولات سے ہونے لگی۔ انہوں نے گورنر جنرل کے کونسل کے ایجنٹ کے طور پر کام کیا۔ وہ بیرونی ممالک میں مضامین خریدنے اور بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے والے ہندوستانی طلباء کی دیکھ بھال کے لیے انچارج محکمہ اسٹور تھا۔ ان کی مدت ملازمت چھ سال تھی۔

مرکزی عاملہ (Central Executive Council)اور قانون ساز کونسل کی تشکیل اور کاموں میں کچھ اہم تبدیلیاں لائی گئیں۔ گورنر جنرل، ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کو نامزد کرتا تھا۔ ارکانِ کونسل کو کم از کم دس سال تک ہندوستان میں خدمات انجام دینے تھے۔ گورنر جنرل کو ایوانوں کو طلب کرنے، معطل کرنے اور تحلیل کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ وہ برطانیہ کے بادشاہ کے نمائندے بھی تھے اور ہندوستان کے سیکرٹری آف اسٹیٹ کے ساتھ مسلسل خط و کتابت کرتے تھے۔ اگرچہ حکومت ہند کا انتظامی اختیار گورنر جنرل کے کونسل کے پاس تھا، نہ کہ اکیلے گورنر جنرل کے پاس۔ قانون کے مطابق گورنر جنرل کو اپنی ایگزیکٹو کونسل کے مشورے اور رضامندی سے اپنے کام انجام دینے کی ضرورت تھی۔ گورنر جنرل، ایگزیکٹو کا سب سے اہم اور طاقتور رکن بن گیا تھا۔ کئی وجوہات نے گورنر جنرل کی بالادستی میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سب سے اہم بادشاہ کے نمائندے کے طور پر ان کا بلند مقام، ان کا اعلیٰ سماجی رتبہ، ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ کے ساتھ تقریباً مسلسل اور براہ راست رابطہ، طریقہ کار کے وہ اصول جنہوں نے اسے ایگزیکٹو کے نام پر کام کرنے کے قابل بنایا۔ سب سے بڑھ کر یہ حقیقت کہ کونسل کے ممبر عام طور پر گورنر جنرل کی سفارش پر اپنی تقرری کو یقینی بنا سکتے تھے اور صوبائی گورنر کے طور پر مزید ترقی کے لیے ان کی طرف دیکھتے تھے۔

دنیا کے بہت کم عہدے اس دفتر سے وابستہ وقار، سرپرستی کی طاقت اور اعزازات کے حامل تھے۔ ان کی مدتِ ملازمت عموماً پانچ سال تھی۔ اس کی تنخواہ 2,56,000 روپے سالانہ تھی، اور ملک کو اس پر سالانہ تقریباً چودہ لاکھ روپے خرچ کرنے کی ضرورت تھی۔ ان کے پاس مختلف اختیارات تھے، انتظامی، قانونی اور مالی۔ اسے حکومت ہند کے سول اور فوجی امور اور ملک میں امن و امان کو برقرار رکھنا تھا۔ انہیں یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ کسی بل کی کسی بھی شق پر کسی ایوان کی کارروائی کو روک سکتا تھا، اگر وہ سمجھتا ہے کہ اس پر بحث سے سلطنت کے امن و سکون پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ وہ قانون ساز کونسل میں پوچھے جانے والے کچھ سوالات کو مسترد کر سکتا تھا۔ مالیاتی شعبے میں عطیہ کے تمام مطالبات اور ٹیکس لگانے کی تمام تجاویز قانون ساز کونسل کے سامنے صرف ان کی سفارش کے ساتھ رکھی جا سکتی تھی، اور وہ قانون ساز کونسل کی طرف سے انکار یا کم کی گئی ٹیکس کی عطیہ کو بھی بحال کر سکتا تھا۔ انہیں ملک کے امن اور اچھی حکومت کے لیے فرمان جاری کرنے کا اختیار بھی دیا گیا تھا۔ مزید برآں، وائسرائے کی حیثیت سے انہیں عدالتوں سے سزا یافتہ افراد کو معافی دینے اور افراد کو اعزازات دینے کا اختیار حاصل تھا۔ ہوم گورنمنٹ میں ایک اہم تبدیلی یہ بھی تھی کہ صوبائی فہرست میں درج معاملات سے متعلق کوئی بھی بل پیش کرنے سے پہلے گورنر جنرل کی سابقہ منظوری ضروری تھی۔ گورنر جنرل کے اختیارات میں توسیع کر دی گئی۔ کسی بھی بل کو نامنظور (Veto) کرنے کے اختیار کے علاوہ، گورنر جنرل کو تصدیق کا اختیار بھی دیا گیا، یعنی وہ کسی ایسے بل کو نافذ کرنے کو محفوظ بنا سکتے تھے جس کی منظوری کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ وہ اس بات کی تصدیق کر کے یہ کر سکتا تھا کہ یہ بل برطانوی ہندوستان یا اس کے کسی بھی حصے کی حفاظت، سکون یا مفادات کے لیے ضروری ہے۔ تاہم، تمام اراکین کو ضمنی سوالات کرنے کے حق کو بڑھا کر تفتیشی کاموں کا دائرہ بڑھا دیا گیا۔

مونٹیگ - چیمسفورڈ رپورٹ کے تحت صوبوں میں جزوی ذمہ دار حکومت متعارف کرائی گئی۔ جس کی وجہ سے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان حد بندی ضروری ہو گئی۔ اس لیے دو فہرستیں تیار کی گئیں۔ یہ تقسیم اس اصول پر کی گئی تھی کہ پورے ہندوستان یا ایک

سے زیادہ صوبوں سے متعلق معاملات کو مرکزی فہرست میں رکھا جائے جبکہ صوبوں سے متعلق معاملات کو صوبائی فہرست میں رکھا جائے۔ مرکزی مضامین میں 'غیر ملکی اور سیاسی تعلقات، عوامی قرضہ، فرد محاصل اور کسٹم، پیٹنٹ، کرنسی، مواصلات وغیرہ شامل تھے۔ صوبائی فہرست میں شامل مضامین مقامی خود مختار حکومت، صحت، صفائی، تعلیم، عوامی کام، زراعت، جنگلات، امن وامان وغیرہ۔ بقایا اختیارات گورنر جنرل کے کونسل کے پاس تھے۔ یہ محسوس کیا گیا کہ ہندوستانیوں کو اقتدار کی جزوی منتقلی بھی اسی صورت میں معنی خیز ہوسکتی ہے جب صوبے، صوبائی ترقی کے ذرائع کے لیے ہندوستانی حکومت پر منحصر نہ ہوں۔ اس لیے اس ایکٹ میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان محصول کے ذرائع کو مکمل طور پر الگ کرنے کی سہولت فراہم کی گئی۔

12.5 مرکز میں دوایوانی مقننہ (Bicameral Legislature at the Centre)

ایکٹ نے مرکز میں دوایوانی مقننہ متعارف کرایا جس میں مرکزی قانون ساز اسمبلی اور ریاستوں کی کونسل شامل تھی۔

ریاستوں کی کونسل (Council of States)

یہ ایوان بالا تھا اور 60 ارکان پر مشتمل تھا۔ ان میں سے 33 کو منتخب کیا گیا اور 27 کو گورنر جنرل نے نامزد کیا۔ اس کا صدر گورنر جنرل کے ذریعے نامزد کیا جاتا تھا۔ ممبران براہ راست منتخب ہوتے لیکن ووٹروں کی اہلیت کو بلند رکھا گیا۔ ہر صوبے کو اس کی اہمیت کے تناسب سے کونسل آف سٹیٹ میں نمائندوں کی ایک مقررہ تعداد دی گئی تھی۔ اور اس کی مدت پانچ سال تھی۔

قانون ساز اسمبلی (Legislative Assembly)

قانون ساز اسمبلی 145 ارکان پر مشتمل تھی جن میں سے 104 ارکان کو منتخب کیا جاتا تھا۔ ان میں سے 52 کو عام حلقوں کی طرف سے، 30 مسلمانوں کے لیے، 2 سکھوں کے لیے، 7 زمینداروں کے لیے، 9 یورپی اور 4 انڈین کمرشل کمیونٹی کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ فرقہ وارانہ انتخابی حلقوں کو بڑھا کر سکھوں کو بھی شامل کیا گیا۔ واضح رہے کہ یہ نشستیں صوبوں میں ان کی آبادی کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان کی نام نہاد اہمیت کی بنیاد پر تقسیم کی گئی تھیں۔ اسمبلی کی زندگی تین سال ہونی تھی۔ لیکن گورنر جنرل اس میں توسیع کر سکتے تھے۔ اس مقننہ کے اختیارات اور کام کم و بیش پہلے کی طرح جاری رہے۔

نمایاں خصوصیات (Salient Features)

- ہر رکن کے لیے مدت 5 سال۔
- ایوان کا صدر وائسرائے سے نامزد ہوتا تھا۔
- خواتین کو اس کا رکن بننے کا حق نہیں تھا۔
- گورنر جنرل ایوان سے خطاب کر سکتا تھا، یا ایوان کو طلب یا تحلیل کر سکتا تھا۔ؤ

جن لوگوں کی سالانہ آمدنی 10,000 روپیے تھی، اور وہ اسی کے تناسب سے انکم ٹیکس ادا کرتے تھے۔ یا اُن لوگوں کی جو کم از کم 750 روپیے زرعی ٹیکس ادا کرتے تھے، وہ ووٹ دینے کے حقدار تھے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ بھی ووٹ کے حقدار تھے، جنہوں نے کسی یونیورسٹی کے سینیٹ میں یا کسی قانون ساز کونسل میں بحیثیت ممبر کام کیا ہو۔ قدرتی طور پر، مندرجہ بالا زمرے میں ہندوستانیوں کا صرف ایک مخصوص طبقہ ووٹ دے سکتا تھا۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ 1920 میں 24 کروڑ ہندوستانیوں میں سے صرف 17,364 افراد ہی ووٹ دینے کے اہل تھے۔

12.6 حق رائے دہی (Franchise)

ووٹ دینے کے لیے، ایک شخص کو:

- گھر کا مالک ہونا ضروری تھا یا 180 روپے سالانہ بطور کرایہ ادا کرنا ضروری تھا یا 15 سال کا میونسپل ٹیکس ادا کرنا چاہیے تھا۔
- کم از کم روپے 50 سالانہ زمینی محصول ادا کرنا چاہیے تھا۔
- سالانہ 2,000 سے کم آمدنی پر انکم ٹیکس ادا کرنا ضروری تھا۔

12.7 مرکزی مقننہ کے اختیارات (Powers of the Central Legislature)

مرکزی مقننہ کو وسیع اختیارات دیے گئے تھے۔ یہ پورے برطانوی ہندوستان کے لیے، ہندوستانی رعایا اور حکومت کے ملازمین کے لیے قانون سازی کر سکتا تھا۔ یہ ملک میں پہلے سے موجود کسی بھی قانون کو منسوخ یا ترمیم کر سکتا تھا۔ مقننہ کے ارکان کو قواعد کے مطابق قانون سازی شروع کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ وہ ایک قرارداد پیش کر سکتے تھے۔ انہیں سوالات اور ضمنی سوالات پوچھنے کا حق تھا۔ اُن کو اظہار رائے کا حق اور آزادی دی گئی۔ بجٹ مرکزی مقننہ میں پیش کیا جاتا تھا۔ بجٹ کا بڑا حصہ نا قابل ووٹر ہونے والی اشیاء پر مشتمل تھا۔

اسکے علاوہ مرکزی مقننہ کی طاقت یوں تھیں:

- یہ ہندوستانی رعایا، سرکاری ملازمین اور پورے برطانوی ہندوستان کے لیے قانون سازی کر سکتا تھا۔
- یہ ملک میں پہلے سے موجود کسی بھی قانون کو منسوخ یا ترمیم کر سکتا تھا۔
- اراکین کو عوامی اہمیت اور اضافی شعبوں کے سوالات پوچھنے کی اجازت تھی۔ ان ہی کو اظہار رائے کا حق اور آزادی بھی حاصل تھا۔
- بعض امور جیسے کسی قانون میں ترمیم یا منسوخی، خارجہ تعلقات، ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ تعلقات، دفاع اور مذہب، ایک بل پیش کرنے کے لیے گورنر جنرل کی سابقہ منظوری کی ضرورت تھی۔
- مقننہ کے منظور کردہ قانون کے نفاذ کے لیے گورنر جنرل کی منظوری ضروری تھی۔ وہ فرمان بھی جاری کر سکتا تھا جو چھ ماہ تک چل سکتا تھا۔
- بجٹ کے کچھ اشیاء اسمبلی کی ووٹنگ سے مشروط تھیں، باقی بحث کے لیے کھلے تھے، اور کچھ پر بحث بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

مقننہ ایگزیکٹیو کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش نہ کر سکتی، پھر بھی ایگزیکٹو کو مقننہ کی خواہشات کا پورا خیال تھا۔ ایوان کے کچھ ارکان کو پبلک اکاؤنٹس اینڈ فنانس کمیٹی کا ممبر بنایا گیا تھا۔ جہاں انہیں حکومتی پالیسی پر اثر انداز ہونے کا موقع ملتا تھا۔ اس طرح، یہ سچ ہے کہ 1919 کے ایکٹ نے اگر مرکز میں ذمہ دار حکومت نہیں تو جوابدہی متعارف کرائی۔

12.8 صوبائی حکومت میں تبدیلیاں (Changes in the Provincial Government)

صوبائی حکومت میں ایک نیا نظام متعارف کرایا گیا اور اسے 'Diarchy' (دو عملی حکومت) کہا گیا۔ یہ دو یونانی الفاظ کا مرکب ہے۔ 'Di' کا مطلب ہے 'دو'، اور 'Archy' کا مطلب ہے 'قاعدہ'۔ اس طرح یہ دو الفاظ دو عملی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ صوبوں میں 1919 کے ایکٹ کے ذریعے اس نظام کو متعارف کیا گیا۔ اس کا مطلب صوبائی حکومت کے دائرے کو دو الگ الگ اور منفرد حصوں میں تقسیم کرنا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کے تحت صوبوں میں حکومت کے بعض کاموں کی ذمہ داری کو منتقل کر دیا گیا تھا جبکہ دوسروں پر برطانوی حکومت کا مکمل کنٹرول تھا۔ اس تقسیم کے تحت مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا جنہیں 'محفوظ' اور 'منتقل' کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق صوبائی حکومت بھی دو حصوں پر مشتمل تھی۔ گورنر اور ان کی کونسل کے اراکین کو مخصوص مضامین کا انتظام کرنا تھا۔ منتقل شدہ مضامین کا انتظام گورنر کے ذریعہ کرنا تھا جو وزراء کے ساتھ کام کرتے تھے۔ صوبوں میں انتظامی اختیارات کی اس نئی تقسیم کو دو عملی حکومت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ حکومت کا ہر فریق اپنی ساخت، گورنر اور قانون ساز کونسل کے ساتھ اس کے آئینی تعلقات میں واضح طور پر دوسرے سے مختلف تھا۔ موٹے طور پر چار سربراہان یعنی مقامی حکومت، صحت، تعلیم اور زراعت سے متعلق کچھ محکمے "منتقلی" کے دائرے میں لائے گئے تھے۔ باقی تمام مضامین 'محفوظ' تھے۔ ان میں پولیس، انصاف، پرنٹنگ پریس، آبپاشی، لینڈ ریونیو، کارخانے وغیرہ شامل تھے۔

12.9 صوبائی مقننہ (Provincial Legislature)

ایکٹ نے صوبائی مقننہ میں کچھ تبدیلیاں متعارف کرائی ہیں۔ صوبائی کونسل کے ارکان کی کل تعداد میں سے، کم از کم 70 فیصد کو منتخب کیا جانا تھا، جب کہ 20 فیصد سے زیادہ کو سرکاری، باقی کو غیر سرکاری کے طور پر نامزد کیا جانا تھا۔ کونسلوں کے لیے متعارف کرایا گیا انتخابات کا نظام براہ راست تھا، بنیادی ووٹر اراکین کا انتخاب کرتے تھے۔ لیکن اعلیٰ جائیداد کی اہلیت، فرقہ وارانہ اور طبقاتی رائے دہندگان اور بعض برادریوں کو خصوصی اہمیت دی گئی تھی۔ قانون ساز اداروں کا حجم کافی بڑھ گیا تھا۔ اور ان کی کل رکنیت ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں مختلف ہوتی تھی۔ بنگال کے لیے زیادہ سے زیادہ 140 اور آسام کے لیے کم سے کم 53 اراکین تھے۔ منتخب اراکین کو براہ راست انتخاب کے ذریعے منتخب کیا جانا تھا، یعنی بنیادی ووٹرس نے ممبر کا انتخاب کرنا تھا۔ حق شہریت بنیادی طور پر جائیداد کی اہلیت پر مبنی تھا۔ 1920 میں 241.7 ملین کی کل آبادی میں سے صرف 5.3 ملین کو ووٹ کا حق تھا جو کہ پانچ فیصد سے بھی کم تھا۔ خواتین کو ووٹ دینے یا الیکشن میں کھڑے ہونے کا حق نہیں دیا گیا۔ برطانیہ میں خواتین کو صرف 1928 میں ووٹ ڈالنے کا حق ملا۔ علیحدہ رائے دہندوں کے سوال کا جائزہ لینے کے بعد مونٹیگ چیمسفورڈ رپورٹ کے مصنفین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ 'خود مختاری کے اصول کی ترقی میں بہت سنگین رکاوٹ' ہیں۔ انہوں

نے اسے تاریخ کی تعلیمات کے خلاف بھی قرار دیا اور مزید کہا کہ یہ طبقاتی تقسیم اور دقیانوسی خیالات کی عکاسی کرتا ہے۔ پھر بھی انہوں نے سفارش نہیں کی کہ ان کو چھوڑ دیا جائے۔ انہوں نے اسے پنجاب میں سکھوں تک پہنچا دیا۔ بعد ازاں جسٹس پارٹی کی جانب سے غیر برہمنوں کے لیے سیٹیں محفوظ کرنے کا مطالبہ مان لیا گیا۔ ہندوستانی عیسائیوں، اینگلوانڈین اور یورپیوں کے لیے الگ الگ انتخابی حلقے بھی فراہم کیے گئے۔

12.10 گورنر (The Governor)

گورنر اور ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کا تقرر برطانوی حکومت نے کیا تھا اور وہ مشترکہ طور پر گورنر جنرل اور سیکرٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان کے ذمہ دار تھے۔ ایگزیکٹو کونسل کی تعداد چار سے زیادہ نہیں تھی۔ جن وزراء کو منتقلی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی ان کا تقرر گورنر نے کرنا تھا۔ وہ عام طور پر مقننہ کے سرکردہ منتخب اراکین میں سے وزراء کا انتخاب کرتے تھے۔ عملی طور پر ہر صوبے میں دو یا تین وزیر تھے۔ قانون کے خط کے مطابق وزراء گورنر کی خوشنودی کے دوران عہدے پر فائز ہوتے تھے۔ لیکن، عملی طور پر، انہیں اس وقت تک جاری رکھنے کی اجازت دی گئی تھی جب تک کہ وہ مقننہ کا اعتماد برقرار رکھتے۔ گورنر صوبائی انتظامیہ کا ایگزیکٹو سربراہ تھا۔ انتظامیہ کے مضامین کو پہلے ہی دو فہرستوں میں تقسیم کیا گیا تھا: مرکزی اور صوبائی۔ لیکن اب صوبائی فہرستوں کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا گیا: محفوظ اور منتقل شدہ مضامین۔ گورنر ذمہ دار وزراء اور ایگزیکٹو کونسل کے درمیان، مقبول یا خود مختار حکومت کے درمیان مربوط رابطے کے طور پر کام کرتا تھا۔ وہ 'متضاد پالیسیوں اور مختلف نظریات کے درمیان توازن برقرار رکھتا تھا، اور اختلاف کو رگڑ سے روکتا تھا۔ اس کی مالی طاقت بہت زیادہ تھی۔ قانون ساز کونسل کے سامنے ان کی سفارش کے علاوہ کسی بھی چیز پر اخراجات کی کوئی تجویز پیش نہیں کی جاسکتی تھی۔ محفوظ مضامین کا انتظام گورنر اپنے ایگزیکٹو کونسل کی مدد سے چلاتا تھا جبکہ وہ اپنے ہندوستانی وزراء کی مدد سے منتقل شدہ مضامین کا انتظام کرتا تھا۔ محفوظ مضامین وہ تھے جن کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی، جس میں ایک صوبے میں امن و امان شامل تھا جس کا تعلق عوام کی فلاح و بہبود سے تھا۔ صوبائی ایگزیکٹو کونسل کو ان فرائض کو انجام دینا تھا۔ یہ موضوعات پولیس، انصاف کی انتظامیہ، نہروں کی آبپاشی، پانی کا ذخیرہ اور پانی کی بجلی وغیرہ پر شامل تھے۔ منتقل شدہ مضامین ہندوستانی وزراء کو منتقل کیے جانے تھے جنہیں مقننہ کے منتخب اراکین میں سے گورنر کو مقرر کرنا تھا۔ وہ یوں تھے: ہندوستانیوں کی تعلیم، عوامی کام، زراعت اور ماہی پروری۔

12.11 مونٹیگ-چیمسفورڈ اصلاحات پر مشاہدات

(Observations on the Montagu-Chelmsford Reforms)

اِس حکومت نے ریاست کے کاموں کو دو حصوں میں یعنی 'محفوظ' (Reserved) اور 'منتقل شدہ' (Transferred) میں تقسیم کیا، لیکن اس میں صحیح سے وضاحت نہیں کی گئی جس کی وجہ سے دو عملی حکومت کا تصور ایک غلط اصول پر مبنی رہا۔ ریاست کے کاموں کو تقسیم کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ زراعت ایک منتقل شدہ موضوع تھا، جبکہ زمینی محصول اور، آبپاشی محفوظ مضامین تھے۔ سی وی۔ چنتامنی نے جو متحدہ صوبوں میں وزیر تھے ایک دلچسپ کیس کا حوالہ دیا۔ 1921 میں محکمہ زراعت میں زمین کے تقسیم کے معاملے پر تحقیقات شروع کی۔

جب 1922 میں رپورٹ پیش کی گئی تو محسوس ہوا کہ یہ سوال 'محکمہ محصول' کو اٹھانا چاہیے تھا اس لیے گورنر نے اس محفوظ محکمے کو اس کیس کو اٹھانے کو کہا۔ 1924 میں پھر پتہ چلا کہ کام کا کچھ حصے 'کوآپریٹو ڈیپارٹمنٹ' (Co-operative Department) میں ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح یورپی اور اینگلوانڈین تعلیم، شعبہ تعلیم کے دائرہ کار سے باہر تھی۔ یہ نظام تب ہی کام کر سکتا تھا، جب دونوں حصوں کے درمیان بنیادی اعتماد ہوتا۔ اس کے علاوہ 'منتقل شدہ' محکموں میں سرکاری ملازمین پر وزراء کا کوئی کنڑول نہیں تھا۔ محکموں کے سیکرٹریوں کو گورنر تک براہ راست رسائی حاصل تھی جس نے ممبران کو اختلافی پوزیشن میں رکھا۔ مزید، وزیر کو دو آقاؤں کی خدمت کرنی تھی۔ ان کا تقرر گورنر نے کرنا تھا اور وہ اسے برخاست کر سکتے تھے۔ لیکن وہ مقننہ کے سامنے جوابدہ تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نام نہاد قوم سازی کے محکمے ایسے وزراء کے سپرد کیے گئے جو پیسے ملنے پر ہی نتائج دکھا سکتے تھے۔ وزراء نے شکایت کی کہ منتقل شدہ محکموں کی ضروریات پر غور کرنے سے قبل محفوظ محکموں کو وہ تمام رقم مل گئی جو وہ چاہتے تھے۔

1919 میں متعارف کرائی گئی آئینی تبدیلیوں کی اسکیم اتنی غیر مقبول ہو گئی کہ اِس کا مذاق اڑانا رسم بن گیا۔ اس کے باوجود ہندوستان میں پارلیمانی جمہوریت کے ارتقا میں اس کی اپنی اہمیت ہے۔ واضح رہے کہ 1919 میں متعارف کرائی گئی تبدیلیاں 1916 میں تجویز کردہ اسکیموں پر مبنی تھی۔ مزید یہ کہ حکومت نے آئینی تبدیلیوں کے مقصد کا اعلان کیا تھا۔ اس کے بعد اس وعدے سے پیچھے ہٹنا غیر اخلاقی ہو جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں، اس اعلان نے مزید رعایتیں ناگزیر بنا دیا۔ اس ایکٹ نے مرکز اور صوبوں میں منتخب قانون ساز ادارے بنائے۔ ان اداروں میں ہندوستانی رائے کا مسلسل اور واضح طور پر اظہار کیا گیا۔ یہ بحثیں راج کے نظریاتی دفاع کو مزید کمزور کرنے اور تیزی سے بڑھتے ہوئے سامراج مخالف جذبات کو تیز کرنے کا رجحان رکھتی تھیں۔ ایک ہی وقت میں انتخابات اور مباحثوں کے انعقاد نے ہندوستانیوں کو 'پارلیمانی محاورات اور اداروں سے آشنا کیا اور اس طرح یہاں پارلیمانی جمہوریت کے کامیاب کام میں حصہ ڈالا ہے۔ اس کے بعد کے سالوں میں قومی تحریک کی توسیع اور کسانوں، کاروباری گروپوں اور صنعتی مزدوروں کے کافی بڑے حصوں کی شمولیت دیکھنے میں آئی۔ یہ جزوی طور پر جنگ کے بعد کے معاشی دباؤ کا نتیجہ تھا اور جزوی طور پر عالمی سطح پر اٹھنے والے اُبھار کا ایک اظہار تھا، جس کا کردار ترقی یافتہ ممالک میں سرمایہ داری مخالف تھا اور کالونیوں میں سامراج مخالف زور تھا۔ اس سے شکایات اور توقعات کا امتزاج پیدا ہوا تھا جسے اگر صحیح طریقے سے ترتیب دیا جاتا تو قومی تحریک کو ایک نئی تحریک مل سکتی تھی اور اسے ترقی کی بلندیوں پر لے جایا جا سکتا تھا۔ خلافت اور پنجاب کے مسائل سے پیدا ہونے والے جذبات اور غصے کے عناصر نے اس رجحان کو تیز تر کر دیا۔ کچھ مورخین نے 1919 کی اصلاحات کا تعلق مالی انحراف کے دو سامراجی تقاضوں اور ہندوستانی ساتھیوں کے وسیع حلقے کی ضرورت سے کیا ہے۔ تاہم، بہت زیادہ اختلافات کی وجہ سے بعض مورخین ان اصلاحات کی مخالفت کیے۔ 1919 کے ایکٹ نے رائے دہندگان کو وسیع کیا جس کی دلیل دی جاتی ہے اور اسی وجہ سے سیاست دانوں کو زیادہ جمہوری انداز اپنانے پر مجبور کیا گیا۔ سومیت سرکار تاہم اس نظریے سے متفق نہیں ہے۔ ان کے بقول یہ سیاست اور سیاست دانوں کی اچھی طرح وضاحت کر سکتا تھا لیکن شاید ہی جنگ کے بعد کی زبردست عوامی بیداری کی بنیادی حقیقت، انتخابات کے بائیکاٹ اور 2019-2022 کے زبردست سامراج مخالف کی وجہ سے اُس نے اصلاحات کی کسی حد تک تعریف کی۔

12.12 1919 کے ایکٹ کا تنقیدی جائزہ (A Critical Review of the Act of 1919)

ایکٹ میں دی گئی رعایتیں ایک طرح سے معمولی تھیں اور دوسری طرف محدود تھیں۔ جنھوں نے جزوی ذمہ دار حکومت کو متعارف کرانے اور ہندوستانیوں کو ہندوستان کی انتظامیہ کے ساتھ جوڑنے کے مقصد کو ناکام بنادیا۔ مرکز میں دو ایوانوں والی مقننہ کو متعارف کرایا گیا تھا۔ اراکین کو قانون سازی پر بحث کرنے اور ایگزیکٹو کے اراکین سے سوال کرنے کے کچھ حقوق دیے گئے تھے۔ لیکن ان کے پاس طاقت کم تھی، مالیات کو کنٹرول کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ایگزیکٹیو کونسل میں تین ہندوستانی شامل تھے۔ لیکن انہیں گورنر جنرل نے نامزد کیا تھا۔ اس لیے وہ گورنر جنرل کے صرف آدمی تھے۔ مرکز اور صوبے کے درمیان مضامین کی تقسیم واضح نہیں تھی۔ صوبوں میں دو عملی حکومت اپریل 1921 کو متعارف ہوئی اور اپریل 1937 تک نافذ رہی۔ بنگال میں 1924 سے 1927 تک اور وسطی صوبوں میں 1924 سے 1926 تک نافذ تھی، کیونکہ رائج نظام پر کڑوی تنقید ہوئی ہے۔ اس میں کئی نقائص تھے جو اس کی ناکامی کا سبب ثابت ہوئیں۔ لیکن اس نے تین سال تک اچھا کام کیا۔ انتظامیہ کی دو حصوں میں تقسیم حکومت کے عمل کے لیے ناقص تھی۔ یہ غیر منطقی اور غیر معقول تھی۔ کئی بار انتظامیہ کی دو شاخوں کے درمیان مقصد کا کوئی اتحاد نہیں تھا۔ یہ واضح نہیں تھا کہ کون سا مضمون کس شعبے تعلق رکھتا تھا۔ بعض وقت ایگزیکٹو کونسل کے ارکان اور وزراء کے درمیان ہاتھا پائی ہوتی تھی۔ اگرچہ اس ایکٹ میں خامیاں تھی، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں کچھ خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے اسے صحیح معنوں میں ہندوستان کی آئینی تاریخ کا اہم موڑ کہا جاسکتا ہے۔ سرکاری اور خفیہ کاغذات ہندوستانیوں کے سامنے آئے اور ان پر بحث ہوئی۔ منتقل شدہ محکموں میں اعلیٰ سرکاری خدمات میں ہندوستانیوں کی بھرتی کے لیے زیادہ مواقع پیدا ہو گئے۔ ہندوستانی لیڈروں کو ملک میں سماجی اصلاحات متعارف کرانے کے بہتر مواقع ملے۔

12.13 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

کچھ خصوصیات جو 1919 کے اس ایکٹ میں فراہم کی گئی تھیں وہ یقیناً بہت اہم تھیں۔ یہ اگست اعلانیہ پر مبنی تھا۔ اگرچہ ایکٹ کئی سنگین خرابیوں کا شکار تھا، پھر بھی اس کی اہمیت تھی۔ اس نے احسان مند استبداد کے دور کے خاتمے اور ذمہ دار حکومت کے لیے راستہ کھولا۔ 1885-1906 کے درمیان مختلف عوامل نے برطانوی حکومت کے خلاف عدم اطمینان کے احساس کو بڑھاوادیا۔ اس پس منظر میں مورلے منٹو 'اصلاحات' متعارف کرائے گئے جس کے ذریعے کونسلوں کے بالواسطہ طور پر منتخب اراکین کی تعداد میں اضافہ کیا گیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے الگ الگ انتخابی حلقے کا نظام متعارف کرایا گیا جس نے طویل عرصے میں علیحدگی پسند رجحانات کی حوصلہ افزائی کی۔ پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے سے پیدا ہونے والے حالات نے 1919 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی منظوری کا پس منظر فراہم کیا جسے مونٹیگ- چیمسفورڈ 'اصلاحات' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس نے جو سب سے اہم تبدیلی متعارف کرائی وہ "دو عملی حکومت" کا نظام تھا جس کے تحت صوبائی حکومتوں کو زیادہ اختیارات دیئے گئے لیکن گورنر نے مالیات پر مکمل کنٹرول برقرار رکھا جبکہ صحت عامہ، تعلیم وغیرہ کے انچارج وزراء مقننہ کے ذمہ دار تھے۔ مرکزی حکومت کا صوبائی حکومتوں پر غیر محدود کنٹرول تھا اور ووٹ کے حق پر سخت پابندی تھی۔ یہ متواتر اصلاحاتی

اسکیمیں سامراج مخالف تحریک کو مفاہمت اور دبانے کا محض ایک اظہار تھیں جو ہندوستان کی ایک بار ہماسی خصوصیت بن چکی تھی۔ مختصراً 1919 کے ایکٹ نے قوم پرستوں کے لیے بحث کرنے اور حکومت پر حملہ کرنے کے لیے تین اہم مسائل چھوڑے تھے: ایک ذمہ دار حکومت کی عدم موجودگی، دو عملی حکومت کا تعارف، علیحدہ رائے دہندگان کی توسیع اور استحکام۔

12.14 کلیدی الفاظ (Key Words)

ایگزیکٹو	:	حکومت کا ادارہ جو فیصلوں یا احکامات کو نافذ کرنے سے متعلق ہے۔
مجلس قانون ساز	:	(Legislature) مقننہ یا حکومت کا ادارہ جو قوانین بنانے اور پاس کرنے سے متعلق ہے۔
قواعد وضوابط	:	قانونی پابندی کے ساتھ ہدایات۔
ڈایارکی	:	(Diarchy) دو عملی حکومت کا نظام۔
جمہوریت	:	عوامی حکومت اور ایک مثالی خوش حال معاشرہ۔
مفاد عامہ	:	عام عوام کی فلاح و بہبود۔
خود مختاری	:	حکومت کا ایک ایسا نظام جس میں ریاست پر اعلیٰ طاقت ایک شخص کے ہاتھ میں مرکوز ہوتا ہے۔
سامراجیت	:	ایک طاقتور ملک کو کمزور ملک پر مسخر کرنا۔
پارلیمانی جمہوریت	:	ایک سیاسی نظام جس میں پارلیمنٹ میں بیٹھے منتخب نمائندے قانون سازی کے اعلیٰ ترین اتھارٹی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ نمائندے بڑے پیمانے پر بالغ رائے دہی سے منتخب ہوتے ہیں۔ الگ الگ انتخابی حلقے: ایک ایسا نظام جس میں حق رائے دہی والے شہریوں کو نمائندگی کے مقاصد کے لیے برادری یا مذہب کی بنیاد پر تقسیم کیا جاتا ہے۔

12.15 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

12.15.1 مختصر جوابات کے حامل معروضی سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مونٹیگو-چیمسفورڈ اعلانیہ کی منظوری کب ہوئی؟
2. 'محفوظ مضامین' کون کون سے تھے؟
3. گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کے تحت ہندوستانی آبادی کے کس حصے کو ووٹ کا حق دیا گیا تھا؟
4. گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کے تحت کتنے صوبے بنائے گئے؟
5. انڈین کونسل ایکٹ 1919 کس گورنر جنرل کے دور میں پاس ہوا تھا؟
6. سکھ اقلیت کا ذکر کس ایکٹ میں ہوا؟

7. 'زراعت' کس مضمون کے تحت آتا ہے محفوظ یا قابل منتقلی؟

8. 'تعلیم' کس مضمون کے تحت آتی ہے محفوظ یا قابل منتقلی؟

9. مونٹیگو-چیمسفورڈ اعلانیہ کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

10. گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کا مسودہ تیار کرنے کا ذمہ دار کون تھا؟

12.15.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. 1919 انڈین کونسل ایکٹ کی اصلاحات کے اثرات مختصراً بیان کریں۔
2. گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کی خصوصیات بیان کریں۔
3. ووٹنگ کی اہلیت کیا تھی جیسا کہ 1919 انڈین کونسل ایکٹ ذکر کیا گیا ہے؟
4. مونٹیگو-چیمسفورڈ اعلانیہ کی بنیادی خصوصیات کیا تھیں؟
5. اگست اعلانیہ 1917 کے سیاسی پس منظر کو بیان کریں۔

12.15.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. 1919 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی بنیادی دفعات کیا تھیں؟ ان کی خوبیوں اور خامیوں کا تنقیدی جائزہ لیں۔
2. 1919 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو پاس کرنے کے لیے کیا حالات تھے؟ اس کی دفعات کا جائزہ لیں۔
3. گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1919 کے ذریعے صوبوں میں قائم کیے گئے نظام حکومت اور اس کی ناکامی کا اسباب بتائیں۔

12.16 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Austin, Granville, *The Indian Constitution*: *Cornerstone of a Nation*, Oxford University Press, New Delhi, 2018 (first pub. in 1966).
2. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
3. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2014.
4. Chandra, Bipan, et al., *India's Struggle for Independence*, *1857–1947*, Penguin, New Delhi, 1989.
5. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal*: *A New History of British India*, HarperCollins, Noida, 2021.
6. Mishra, B.B., *The Administrative History of India*, Oxford University Press, London, 1970.
7. Mukherjee, Mithi, *India in the Shadows of Empire*: *A Legal and Political History*, *1774–1950*, Oxford University Press, New Delhi, 2012 (first pub. in 2010).
8. Sarkar, Sumit, *Modern India*, *1885–1947*, MacMillan, New Delhi, 1982.

اکائی 13۔ گاندھی جی کا جنوبی افریقہ میں ابتدائی مشغلہ

(Gandhi's Early Career in South Africa)

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید
13.1 مقاصد
13.2 گاندھی کے ابتدائی حالات زندگی اور تعلیم
13.3 جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی آمد
13.4 گاندھی جنوبی افریقہ میں
13.4.1 نسلی تعصب کے تجربات
13.4.2 پریٹوریا کا دیوانی مقدمہ
13.4.3 نٹال انڈین کانگریس کا قیام
13.4.4 نٹال اسمبلی کا متنازعہ بل
13.5 گاندھی کی سیاسی تحریک
13.5.1 پہلا دور
13.5.2 دوسرا دور
13.5.3 تیسرا اور آخری دور
13.6 جنوبی افریقہ میں گاندھی کی سیاسی رہنمائی کے فوائد
13.7 اکتسابی نتائج
13.8 کلیدی الفاظ
13.9 نمونہ امتحانی سوالات
13.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید (Introduction)

پہلی بار جب موہن داس کرم چند گاندھی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف کل ہند سطح پر مارچ 1919 میں ستیہ گرہ کا نعرہ بلند کیا اس وقت ان کی عمر پچاس سال تھی۔ یہی وہ شخص تھا جو ہندوستان کی جنگ آزادی کی کمان سنبھالنے والا تھا اور جس کی رہنمائی میں جنگ آزادی کو اہم ادوار سے گذرنا تھا۔ موہن داس کرم چند گاندھی (اکتوبر 1869–30 جنوری 1948) ایک ہندوستانی وکیل، نوآبادیاتی مخالف قوم پرست اور سیاسی اخلاقیات دان تھے جنہوں نے ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کے خلاف مہم کی قیادت کرنے کے لیے عدم تشدد پر مبنی مزاحمت کا راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے دنیا بھر میں شہری حقوق اور آزادی کے لیے تحریکوں کو متاثر کیا۔ انہیں 'مہاتما' (عظیم روح والا، قابل احترام)، کا اعزازی لقب پہلی بار 1914 میں جنوبی افریقہ میں دیا گیا۔ ساحلی گجرات کے ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے اور پرورش پانے والے، گاندھی نے لندن کے انر ٹمپل میں قانون کی تعلیم حاصل کی اور انہیں جون 1891 میں 22 سال کی عمر میں قانون کی ڈگری دی گئی۔ ہندوستان میں دو غیر یقینی سالوں کے بعد، جس دوران وہ ناکام رہے تھے، ایک کامیاب قانونی سفر شروع کرنے کے لیے، وہ 1893 میں جنوبی افریقہ چلے گئے تاکہ ایک دیوانی مقدمہ میں ایک ہندوستانی تاجر کی نمائندگی کریں۔ وہ 21 سال تک جنوبی افریقہ میں مقیم رہے۔ وہاں، گاندھی نے ایک قوم کی پرورش کی اور سب سے پہلے شہری حقوق کے لیے مہم میں عدم تشدد کے ساتھ مزاحمت کی۔ 1915 میں، 45 سال کی عمر میں وہ ہندوستان واپس آئے اور جلد ہی کسانوں، کاشتکاروں اور شہری مزدوروں کو امتیازی سلوک اور ضرورت سے زیادہ زمینی ٹیکس کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے منظم کرنے کا آغاز کیا۔ اس اکائی میں ہم گاندھی کے ابتدائی حالات اور جنوبی افریقہ میں ان کے مشغلہ حیات پر بات کریں گے اور جاننے کی کوشش کریں گے کیسے ایک نوجوان بیرسٹر کچھ ہی عرصے میں ایک مہاتما اور ایک مقبول عوامی رہنما بن گیا۔

13.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مہاتما گاندھی کے ابتدائی حالات زندگی اور تعلیمی سفر سے واقف ہو سکیں گے۔
- جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی آمد پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی کے تجربات، حالات اور سیاسی مہم جوئی سے واقف ہو سکیں گے۔
- جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی کی سیاسی تحریک اور سیاسی کردار کا تجزیہ کر سکیں گے۔

13.2 گاندھی کے ابتدائی حالات زندگی اور تعلیم (Gadhi's Early Life and Education)

گاندھی خاندان والے گجراتی ہندو مودھ بنیا برادری سے تعلق رکھتے تھے اور کرانے کا کاروبار کرتے تھے۔ وہ لوگ جوناگڑھ ریاست میں واقع کٹیانہ (Kutiana) کے رہنے والے تھے۔ گاندھیوں میں ایک مہم پسند شخصیت ہرجیون گاندھی نے 1977 میں پوربندر میں ایک مکان خریدا تھا اور ان کے بچے کاروباریوں کی طرح رہنے لگے تھے۔ لیکن یہ خاندان نمایاں اس وقت ہوا جب ہرجیون گاندھی کے ایک

بیٹے اتم چند نے پور بندر کے والی رانا کھیماجی کو کچھ ایسا متاثر کیا کہ وہ ریاست کے دیوان بنا دیے گئے۔ کاٹھیاواڑ (گجرات) کی لگ بھگ 300 ریاستوں میں پور بندر بھی ایک تھی۔ ان ریاستوں پر وہ راج کرتے تھے جو اتفاق سے حکمران خاندانوں میں پیدا ہو گئے تھے اور جن کے تخت و تاج انگریزوں کا اقتدار اعلی برقرار رکھے ہوئے تھے۔ کاٹھیاواڑ کا نظام جاگیردارانہ تھا اور سیاسی اعتبار سے بھی یہ علاقہ پچھڑا ہوا تھا۔

ان دنوں کسی دیسی ریاست کا دیوان ہونا چین آرام کا عہدہ نہیں تھا۔ متلون مزاج ہندوستانی راجاؤں، فرعون صفت برطانوی سیاسی ایجنٹوں اور مظلوم رعایا کے درمیان اپنی راہ نکال کر بحفاظت گزر جانے کے لیے اعلی درجے کی سوجھ بوجھ اور حکمت عملی کی ضرورت پڑتی تھی۔ اتم چند بے انتہا ذہین وزیر ثابت ہوئے اور انہوں نے پور بندر کو اس بد نظمی اور دیوالیہ پن کی دلدل سے باہر نکالا جس میں یہ ریاست پھنس گئی تھی۔ بد قسمتی سے رانا کھیماجی کی جوانی میں ہی وفات کے بعد قائم مقام رانی ان کی عدالت پسندی اور جذبہ حریت کی قدر نہ کر سکی اور انہیں برطرف کر دیا گیا۔ اتم چند پور بندر کو چھوڑ کر جونا گڑھ ریاست میں واقع اپنے آبائی گاؤں چلے گئے۔ قائم مقام رانی کے دور حکومت کے خاتمے کے بعد جب رانا وکرم جیت تخت پر بیٹھے تو اتم چند کو پور بندر کے دیوان کی حیثیت سے واپس لانے کی کوشش کی گئی۔ ان کے انکار کرنے پر 1847 میں یہ عہدہ ان کے 25 سالہ بیٹے کرم چند کو تفویض ہوا۔ کرم چند نے دیوان کی حیثیت سے 28 سال کام کیا۔ اپنے والد ہی کی طرح کرم چند بھی کھرے سچے اور بے خوف وزیر تھے، اس لیے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ والی ریاست ان سے ناراض ہو گئے۔ کرم چند نے وزارت اپنے بھائی تلسی داس کو سونپی اور خود راج کوٹ جا کر وہاں دیوان بن گئے۔ کرم چند نے چار شادیاں کی۔ تین بیویوں کی موت یکے بعد دیگر ہوئی۔ چوتھی بیوی پتلی بائی اپنے شوہر سے 20 سال چھوٹی تھیں۔ ان سے تین بیٹے، لکشمی داس، کرسن داس اور موہن داس اور ایک بیٹی رلیتا پیدا ہوئے۔

سب سے چھوٹے بیٹے موہن داس یعنی مستقبل کے مہاتما گاندھی کی ولادت 2 اکتوبر 1869 کو پور بندر میں ہوئی۔ جب ان کے والد پور بندر کے وزیر اعظم تھے، تب بھی وہ اپنے سہ منزلہ آبائی مکان میں اپنے پانچوں بھائیوں اور ان کے بال بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ مکان کا جو حصہ انہیں ملا تھا وہ نچلی منزل کا تھا۔ اسی مکان میں اپنے بھائیوں بہنوں اور بہت سے چچاؤں اور چچیرے بھائیوں کے درمیان موہن داس گاندھی پلے اور بڑھے۔ جب موہن سات سال کے ہوئے تو ان کے ماں باپ راجکوٹ سے 120 میل دور پورب میں چلے گئے۔ اگرچہ پور بندر سے خاندانی تعلقات قائم رہے لیکن اب راج کوٹ ہی گاندھیوں کا دوسرا وطن ہو گیا۔ راجکوٹ میں ریتیلا ساحل نہیں تھا جہاں جا کر بچے کھیل سکتے اور یہ شہر پور بندر جتنا خوبصورت بھی نہیں تھا لیکن سیاسی اور سماجی اعتبار سے یہ کم پچھڑا ہوا تھا اور یہاں تعلیم کی سہولتیں بھی زیادہ تھیں۔ موہن نے پور بندر کے ایسے پرائمری اسکول میں تعلیم پائی تھی جہاں بچے اپنی انگلیوں سے زمین پر حروف تہجی لکھنے کی مشق کرتے تھے۔ راجکوٹ کو یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ وہاں ایک ہائی سکول بھی تھا۔

موہن کی ماں پتلی بائی ایک لائق خاتون تھیں۔ راجہ کے محل سرا کی خواتین سے دوستی کی بنا پر درباری حلقوں میں ان کی اہمیت تسلیم کی جاتی تھی۔ ان کی دلچسپیوں کا اصلی محور ان کا گھر تھا۔ ان کی زندگی منتوں اور برتوں کا ایک اٹوٹ سلسلہ تھی۔ انہیں مذہبی کتابوں کا زیادہ علم نہیں تھا۔ ٹوٹی پھوٹی گجراتی جاننے کے سوا وہ تقریبا انپڑھ تھیں۔ مذہبی معلومات یا تو انہیں گھر سے حاصل ہوئی تھیں یا مذہبی جلسوں میں

تقریریں سن سن کر۔ وہ مذہبی خیالات میں کٹر بلکہ توہم پرست تھیں۔ بچوں کا اچھوتوں کو چھونا یا چندر گرہن دیکھنا انہیں گوارانہ تھا۔ دوسرے بچوں کے مقابلے میں موہن میں ذوق تجسس زیادہ تھا۔ وہ جرحی سوالات کرتے رہتے جیسے گھر کے بھنگی اوکا کو چھونے سے کوئی کیسے نجس ہو جاتا ہے ؟ دیکھنے والے کو چند گرہن کیا نقصان پہنچا سکتا ہے ؟ وغیرہ وغیرہ

ابھی موہن عمر کی دوسری دہائی میں ہی تھے اور بے حد شرمیلے اور مریضانہ حد تک خاموش مزاج تھے۔ کہ 13 برس کی عمر میں ہی ان کی شادی کردی گئی۔ موہن کی بیوی کستوربائی، پوربندر کے ایک تاجر اور گاندھی خاندان کے دوست گوکل داست ماکن جی کی بیٹی تھیں۔ عنفوان شواب میں ان سے بہت ساری لغزشیں اور کوتاہیاں سرزد ہوئیں جیسے گوشت خوری، تمباکو نوشی وغیرہ، لیکن انہوں نے اپنے آپ پر قابو کرتے ہوئے توبہ کی اور آئیندہ سے ان چیزوں سے بیزار رہنے کا عہد لیا۔ ایک بار بھائی کا قرض ادا کرنے کے لیے انہوں نے سونے کا ایک ٹکڑا چرایا لیکن احساس جرم ایسا ذہن پر غالب آیا کہ انہوں نے سب کچھ سچ سچ اپنے والد کو بتا دیا۔ موہن نے 1887 میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ اس سے ایک سال پہلے ہی باپ کی موت سے خاندان کے آمدنی کے وسائل پر ایک طرح کا دباؤ محسوس ہونے لگا تھا۔ خاندان میں یہی بچہ تعلیم میں لگا ہوا تھا اور تمام امیدیں اسی سے وابستہ تھیں اس لیے انہیں 1888 میں قریب ترین شامل داس کالج، بھاؤ نگر بھیجا گیا۔ موہن کی بد قسمتی سے کالج میں انگریزی ذریعہ تعلیم تھی، جس کے لیکچر ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آتے تھے اور وہ آگے پڑھنے سے مایوس ہو چکے تھے۔

اسی دوران میں خاندان کے ایک دوست ماوجی دوے نے یہ مشورہ دیا کہ بیرسٹری کی تعلیم کے لیے موہن کو انگلینڈ جانا چاہیے۔ بیرسٹری نسبتاً آسان تھی۔ اس کے مقابلے میں ہندوستانی یونیورسٹیوں کی ڈگری حاصل کرنے میں وقت بھی زیادہ لگتا تھا، محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی تھی اور خرچ بھی زیادہ ہوتا تھا اور اس ڈگری کی بازار میں قدروقیمت بھی کم تھی۔ بمبئی کی ڈگری سے زیادہ سے زیادہ کلرکی کی کوئی جگہ حاصل کی جاسکتی تھی۔ ماؤجی دوے نے یہ بھی سمجھایا کہ اگر موہن نے اپنے دادا اور باپ کی طرح کاٹھیاواڑ کی کسی ریاست میں دیوان ہونے کا حوصلہ کیا تو غیر ملکی ڈگری کی حاجت ہوگی۔ کرم چندر اور اتم چند گاندھی اعلیٰ عہدوں پر فائض رہے اور انہوں نے بہت معمولی تعلیم سے کام چلایا تھا لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا۔ اب یونیورسٹیوں سے ہزاروں کی تعداد میں بی اے اور ایل ایل بی نکل رہے تھے۔ یہ اس انگریزی تعلیم کی پیداوار تھے جس کا منصوبہ میکالے نے بنایا تھا۔ اس مقابلے کے دور میں ایک غیر ملکی ڈگری پاس میں ہونا پبلک سروسز میں زیادہ مفید ثابت ہوسکتی تھی۔

بیرونی ممالک میں جانے کے خیال ہی سے موہن اچھل پڑے۔ برطانیہ دیکھنے کا اس لیے بھی شوق تھا کہ فلسفیوں اور شاعروں کی سرزمین اور تہذیب کا مرکز تھی اور اس لیے بھی کہ انہیں بھاؤ نگر کالج سے نکل بھاگنے کا موقع ملے گا۔ بڑے بھائی کو بھی یہ تجویز بے شبہ دلکش معلوم ہوئی لیکن یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اتنا خرچ کہاں سے آئے گا۔ ماں پتلی بھائی انہیں دور بھیجنے سے کترا رہی تھی انہوں نے موہن کو اپنے چچا کی رائے لینے کا مشورہ دیا کیونکہ وہی خاندان کے بزرگ تھے۔ جب وہ چچا کا مشورہ لینے پوربندر پہنچے تو بظاہر تو وہ اخلاق سے ملے لیکن سمندر پار کے ناپاک سفر کے لیے وہ بھی ہچکچا رہے تھے پوربندر کے برطانوی ایجنٹ نے بھی ان کی وظیفے کی گزارش پر کوئی خوشگوار جواب نہیں دیا۔ ان

حالات میں ان کے بھائی نے ہی آخر کار یہ ذمہ داری اٹھائی اور ماں کو بھی انہوں نے کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لیا۔ 4 ستمبر 1888 کو وہ بمبئی سے لندن کے لیے روانہ ہوگئے جہاں انہوں نے انگریزی ادب کے لیے یونیورسٹی کالج، لندن اور قانون کی پڑھائی کے لیے ان آف کورٹ اسکول آف لا جوائن کیا۔ تین سال تعلیم حاصل کرنے اور سبزی خوری کی مہم سے جڑے رہنے کے بعد 22 سال کی عمر میں گاندھی کو جون 1891 میں قانون کی تعلیم مکمل کی اور پھر وہ لندن سے ہندوستان چلے آئے۔ ابتدائی ناکامیوں اور ہندوستان میں اپنے پیشہ ورانہ مستقبل سے ناامید ہو کر انہوں جنوبی افریقہ سے آئی ہوئی پیشکش کو ٹھکرانا مناسب نہ سمجھا۔ اپریل 1893 میں، گاندھی، جن کی عمر 23 سال تھی، سیٹھ عبداللہ کے وکیل بننے کے لیے جنوبی افریقہ کے لیے روانہ ہوئے۔ انہوں نے 21 سال جنوبی افریقہ میں گزارے جہاں انہوں نے اپنے سیاسی نظریات، اخلاقیات اور سیاست کو فروغ دیا۔

13.3 جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی آمد (Arrival of Indians in South Africa)

نٹال انڈین کانگریس اور گاندھی تاریک براعظم میں جو رول ادا کرنے والے تھے، اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ اسی منزل پر رک کر ہم ماضی پر ایک نظر دوڑائیں تاکہ مسئلے کا تاریخی پس منظر بخوبی واضح ہو جائے۔ الفریڈ ملنر (Alfred Milner) نے لکھا ہے کہ 'ایشیائی لوگ، اجنبی ہیں اور وہ خود کو ایک ایسی برادری پر عائد کرنا چاہتے ہیں جو ان کو خوش آمدید کہنے سے کترا رہی ہے۔' حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ یورپی نو آبادکاروں کے کہنے پر انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کا داخلہ شروع ہوا۔ ان یورپی آبادکاروں کے قبضے میں غیر مزروعہ زمین کے بڑے بڑے رقبے تھے جو چائے، کافی اور گنے کی کاشت کے لیے بہت موزوں تھے لیکن ان کے پاس آدمیوں کی کمی تھی۔ غلامی کے خاتمے کے بعد سیاہ فام آبادی کو کام پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان حالات میں نٹال کے یورپیوں نے حکومت ہند سے درخواست کی کہ ہندوستانی مزدوروں کو اس ملک میں جانے کی اجازت دی جائے۔ زمین مالکوں کے بھرتی کرنے والے ایجنٹوں نے مدراس اور بنگال کے سب سے زیادہ گنجان آبادی والے اور غربت زدہ ضلعوں کا دورہ کر کے نٹال میں کام کے مواقع کی بڑی خوش آیند تصویر پیش کی۔ سفر خرچ اور مفت کھانا پینا، پہلے سال دس شلنگ ماہانہ اجرت جس میں ہر سال ایک شلنگ کا اضافہ ہوگا اور پانچ سال کے معاہدے کے خاتمے پر ہندوستان واپسی کا کرایہ مفت یا اس کے بدلے میں جس زمین پر کام کرتے رہے ہیں اس پر آباد ہونے کا حق وغیرہ۔ ان شرائط پر ہزاروں غریب اور ان پڑھ ہندوستانی، دور دراز نٹال میں کھنچے آئے۔

معاہدہ بند (contractual) مزدوروں سے بھرا پہلا جہاز نومبر 1860 میں ڈربن پہنچا۔ 1890ء تک تقریباً چالیس ہزار معاہدہ بند مزدور جنوبی افریقہ پہنچ چکے تھے۔ سر ڈبلو ڈبلو ہنٹر (Sir W.W. Hunter) کے لفظوں میں ان کی حالت نیم غلاموں کی سی تھی۔ سبھی مالک ظالم نہیں تھے لیکن بد سلوکی کی صورت میں مالکوں کو بدلنا ناممکن سا تھا۔ اگر پانچ سال کے بعد کوئی مزدور اپنے معاہدے کی تجدید نہ کرتا تو اس پر طرح طرح کی پابندیاں لگائی جاتیں۔ بہرحال بہت سے ہندوستانی جنہوں نے ہندوستان سے اپنے رشتے مکمل توڑ لیے تھے، انہوں نے نٹال میں بس جانے کو ترجیح دی۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹی زمینیں خریدیں، ترکاریاں اپجائیں اور شریفانہ طور پر رہنے لگے۔ انہوں نے

اپنے بچوں کو تعلیم بھی دلوائی۔اس سے یورپی تاجروں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور انھوں نے شور مچانا شروع کیا کہ ہر ہندوستانی مزدور جو اپنی میعاد میں توسیع نہیں کراتا، زبردستی اپنے ملک کو واپس بھیج دیا جائے۔دوسرے لفظوں میں نٹال میں ہندوستانی کی ضرورت یا تو غلام کی حیثیت سے تھی یا بالکل نہیں تھی۔ 1885ء میں ہندوستانیوں کے داخلے کے بارے میں ایک کمیشن بٹھایا گیا۔اس کی تحقیقات کے بموجب یورپی رائے عامہ، تجارت ہو یا زراعت، دونوں ہی میدانوں میں آزاد ہندوستانیوں کی موجودگی کے سخت خلاف تھی۔ کمیشن کے خیال میں سابقہ معاہدہ بند ہندوستانیوں کی وطن واپسی نہ صرف ان کے حق میں غیر منصفانہ تھی بلکہ نوآبادی کی معیشت کے لیے بھی تباہ کن تھی۔اس کے باوجود یہ دلیل کہ ذاتی مفاد کو روشن خیالی پر مبنی ہونا چاہیے،ان حضرات کے حلق کے نیچے نہیں اتر رہی تھی جن کو یہ خوف کھائے جارہا تھا کہ یوروپی کے مقابلے میں ہندوستانی کم حیثیت طور پر زندگی گزارے گا اور ان سے کم داموں پر چیزیں بیچے گا۔

1893ء میں نٹال کو ذمہ دار حکومت(Representative Government) مل جانے کے بعد نسلی امتیاز کی پالیسی کے خلاف لندن کے نوآبادیاتی آفس کی جانب سے کی جانے والی رہی سہی روک ٹوک بھی ختم ہو گئی۔ نٹال سے ایک وفد یہ تجویز لے کر ہندوستان پہنچا کہ جبری معاہدہ ہو یا زبردستی تمام ہندوستانی مزدور وطن کو لوٹا دیے جائیں۔وفد کی متبادل تجویز یہ تھی کہ فی کس 25 پونڈ سالانہ شخصی محصول(Poll Tax) دیا جائے۔ برطانوی ہند کے افسران نٹال کے حالات سے جتنے ناواقف تھے اتنے ہی وہ وہاں کے یورپی زمین مالکوں کی کسی نہ کسی طرح مدد کرنے کو بیتاب تھے۔ حکومت ہند اس بات پر راضی ہو گئی کہ ہر ایک سابقہ معاہدہ بند مزدور صرف نٹال میں بسنے کے حق کو استعمال کرنے کے عوض تین پونڈ کا ٹیکس ادا کرے۔غریب ان پڑھ اور غیر منظم ہونے کی وجہ سے مزدور بے دست و پا تھے اور اگر کسی حلقے سے انہیں مدد کی کوئی توقع تھی تو وہ ہندوستانی تاجر تھے۔ہندوستانی تاجر جن میں زیادہ تر میمن مسلمان تھے، ہندوستانی مزدوروں کے پیچھے پیچھے جنوبی افریقہ پہنچے تھے اور ان کے مال کی سیاہ فاموں اور ہندوستانیوں کے درمیان اچھی کھپت تھی کیونکہ سیاہ فاموں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستانی تاجر، یورپی تاجروں سے زیادہ خوش اخلاق اور کچھ کم لالچی ہیں اور ہندوستانیوں کے ساتھ تو ان کا علاقائی رشتہ بھی تھا۔اور اس طرح ہندوستانی تاجروں کی خوشحالی، یورپی تاجروں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔اقرار نامہ کے ختم ہونے کے بعد وہ لوگ وہیں آباد ہو گئے۔اس طرح وہ اور ان کے بچے جو وہیں پیدا ہوئے تھے جنوبی افریقہ میں آباد ہندوستانیوں کا تیسرا طبقہ تھا۔ان میں زیادہ تر لوگ ان پڑھ تھے اور جو تھوڑا پڑھے لکھے تھے ان کو انگریزی بہت کم آتی تھی۔دولت مند تجار بھی صرف اتنی انگریزی لکھ پڑھ لیتے تھے جتنی ان کو کاروبار کرنے کے لیے ضروری تھی۔ہندوستانیوں کے ساتھ یورپی بہت برا برتاؤ کرتے تھے۔ان کے ظلم ستم کو برداشت کرنا ہندوستانیوں کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔اگر وہ برا بھی مانتے، تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کے خلاف کس طرح آواز اٹھائی جائے۔

ہندوستانیوں کی قانونی محرومیاں ہی کچھ کم نہ تھیں کہ انہیں روز مرہ کی زندگی میں اس سے بھی زیادہ بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کسی امتیاز کے بغیر ہر ہندوستانی کو 'قلی' (Coolie) کہا جاتا تھا۔ قلی، مزدور کا حقارت آمیز نام تھا۔ہندوستانی اساتذہ کو قلی اسکول ماسٹر کہہ کر پکارا جاتا تھا اور ہندوستانی اسٹور کیپر، قلی اسٹور کیپر کہلاتا تھا۔گاندھی بھی قلی بیرسٹر کہلاتے تھے۔جو اسٹیمر ہندوستانیوں کی ملکیت میں تھے ان تک کو قلی جہاز کہا جاتا تھا۔عام طور سے ہندوستانیوں کا تذکرہ کچھ یوں کیا جاتا تھا 'ایشیائی گندگی جن کو جی بھر کے کوسنا چاہیے، جو عیوب سے لبالب

ہیں اور جو چاول اور کالے کیڑے مکوڑوں پر گزارا کرتے ہیں۔' قانون کی کتاب میں ان کی تعریف یوں کی گئی تھی۔'نیم وحشی ایشیائی یا ایشیا کی غیر مہذب نسلوں سے تعلق رکھنے والے افراد۔' ہندوستانیوں کو فٹ پاتھ پر چلنے یا رات کو اجازت نامہ (permit) لیے بغیر باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ان کو پہلے اور دوسرے درجے کے ٹکٹ نہیں دیے جاتے تھے۔کسی بھی یورپی مسافر کے اعتراض پر انہیں ریل کے ڈبے سے نکال باہر کر دیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی انہیں ٹرین کے پائیدان تک پر سفر کرنا پڑتا تھا۔یورپی ہوٹلوں میں وہ داخل ہی نہیں ہو سکتے تھے۔کیپ ٹائمز(*Cape Times*) نے ایک بار لکھا تھا کہ:

> نٹال میں یہ عجیب وغریب منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ملک انہیں لوگوں کے لیے بے پناہ حقارت کا مظاہرہ کرتا ہے جن کے بغیر اس کا ذرہ برابر کام نہیں چل سکتا۔ ہمارے تصور میں یہی آتا ہے کہ اگر تمام ہندوستانی آبادی، اس نو آبادی سے کنارہ کش ہو جائے تو اس ملک کی تجارت مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔اس کے باوجود (یہاں) ہندوستانی سب سے زیادہ قابل نفرت مخلوق تصور کیا جاتا ہے۔

ٹرانسوال میں ان مخصوص علاقوں کے علاوہ جسے لندن ٹائمز نے گھیٹو(ghetto)، کے نام سے یاد کیا ہے، ہندوستانی کہیں اور نہ رہ سکتے تھے نہ ہی تجارت کر سکتے تھے۔آرینج فری اسٹیٹ میں ایک قانون کی رو سے اہل ایشیا اور گہرے رنگ والے افراد کو ہر قسم کی تجارت کرنے یا بسنے کی ممانعت تھی۔کیپ ٹائمز نے ایک دوسری مرتبہ لکھا تھا:

> جہاں بھی کوئی ہندوستانی جاتا ہے وہ ہمیشہ مفید اور نکو کار ثابت ہوتا ہے اور کیسی ہی حکومت سے اس کا سابقہ کیوں نہ پڑے وہ قانون کی پابندی کرتا ہے۔اس کی ضروریات محدود ہیں اور وہ فطرتاً محنتی ہے۔ لیکن انہیں اوصاف کی وجہ سے وہ جس مزدوری کے بازار میں جاتا ہے وہاں نا قابل شکست حریف بن جاتا ہے۔

لائنل کرٹس(Lionel Curtis) نے بھی کئی برس بعد گاندھی سے یہی بات کہی تھی کہ ہندوستانیوں کی برائیوں سے کہیں زیادہ ان کی خوبیوں کی وجہ سے یورپینوں میں حسد کا جذبہ بیدار ہوتا تھا اور بچارے ہندوستانیوں کو سیاسی ظلم کا شکار بننا پڑتا تھا۔

13.4 گاندھی جنوبی افریقہ میں (Gandhi in South Africa)

ہم اپنی کہانی 1893 سے شروع کرتے ہیں جب چوبیس سال کے ایک نوجوان بیرسٹر نے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے شہری حقوق کے تحفظ کے لیے نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد کرنا شروع کیا تھا۔یہی بیرسٹر جو 1893 میں، ایک گجراتی تاجر دادا عبداللہ کے مقدمہ کی پیروی میں ایک سال کے معاہدہ پر ڈربن پہنچا تھا، یہی روزی روٹی کمانے والا ایک معمولی سا آدمی اس وقت کا سب سے زیادہ تعلیم یافتہ پہلا ہندوستانی بیرسٹر تھا۔وکالت پڑھنے میں ان کے تین سال لندن میں گذرے تھے، مگر نسلی تفریق کا جو مظاہرہ اس نے جنوبی افریقہ میں کیا ویسا انہوں نے انگلینڈ یا ہندوستان میں کہیں نہیں دیکھا تھا۔

مئی 1893ء میں گاندھی جی جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن (Durban) پہنچے۔ان کے موکل عبداللہ جو نٹال کے ہندوستانی تاجروں میں سب سے زیادہ مالدار تھے، ان کے استقبال کو آئے۔نوجوان بیرسٹر کا مغربی لباس اور شہری اطوار دیکھ کر تاجر سوچ میں پڑ گیا۔ کہیں اس نے

سفید ہاتھی کو تو اجرت پر نہیں بلا لیا تھا؟ فریق مخالف کی طرف سے پریٹوریا (Pretoria) میں جہاں مقدمہ چل رہا تھا، ان کی راہ میں جو چارہ پھینکا جائے گا، کیا یہ اس کے لالچ سے بچ پائیں گے؟ جیسے ہی نوجوان بیرسٹر اور بوڑھے تاجر کو یہ پتہ چلا کہ وہ دونوں ہی مذہبی رجحان رکھتے ہیں تو یہ سب خدشات مٹ گئے۔ ڈربن میں ایک ہفتہ رہنے کے بعد، گاندھی جی پریٹوریا کو روانہ ہو گئے تاکہ جس کام کے لیے جنوبی افریقہ آئے تھے وہ شروع کر سکیں۔

13.4.1 نسلی تعصب کے تجربات (Experiencing Racial Discrimination)

ڈربن کے مختصر قیام کے دوران ان کو نسلی تعصب کے پریشان کن ثبوت ملے۔ تاجر عبداللہ انہیں ڈربن کی عدالت دکھانے لے گئے جہاں یوروپی مجسٹریٹ نے انہیں پگڑی اتارنے کا حکم دیا۔ گاندھی جی نے انکار کر دیا اور عدالت کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے ایک مقامی اخبار میں احتجاجی خط لکھا۔ اخبار میں ان کا ذکر 'ناخوش گوار مہمان' کے لفظوں میں کیا گیا۔ ان کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے انہیں اس طرح کے کھلم کھلا نسلی تعصب سے سابقہ نہیں پڑا تھا اور انگلینڈ میں تو انہیں بہت سے انگریزوں سے ملنے کا موقع ملا تھا جن کی خوش اخلاقی اور خیر خواہی کی یادیں ان کے ذہن میں محفوظ تھیں۔

ڈربن سے پریٹوریا کے سفر کے دوران میں ان کو جو کچھ پیش آیا، اس کے مقابلے میں ڈربن کا تجربہ ہیچ تھا۔ انہوں نے ٹرین کے فرسٹ کلاس ڈبے کا ٹکٹ لیا اور اس میں جا کر بیٹھ گئے۔ جب ان کی ٹرین رات گئے میریٹزبرگ (Maritzburg) پہنچی تو ایک یورپی نے آ کر ان سے کہا کہ وہ اس ڈبے سے اتر جائیں۔ جب انہوں نے انکار کیا تو انہیں جبراً فرسٹ کلاس ڈبے سے اتار دیا گیا۔ کڑکڑاتے جاڑے کی رات انہوں نے اندھیرے ویٹنگ روم میں گزاری۔ اسی کمرے میں ٹھنڈ سے کانپتے ہوئے اور سکڑے ہوئے وہ پورے واقعے پر دیر تک سوچتے رہے۔ ان کے موکل نے انہیں اس بات سے بالکل آگاہ نہیں کیا تھا کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کو کیسی ذلت کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ کیا وہ اس معاہدے کو توڑ کر ہندوستان واپس چلے جائیں یا وہ ان بد سلوکیوں کو سودے کا حصہ مان کر سر تسلیم خم کر دیں؟ حال ہی میں انہیں ہندوستان اسی لیے چھوڑنا پڑا تھا کہ وہاں کے انگریز ریزیڈنٹ کی ناراضگی مول لے کر راج کوٹ میں ان کے لیے رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اب کیا وہ اسی لیے ہندوستان جائیں کہ جنوبی افریقہ کے حالات ان کے لیے بے حد ناقابل برداشت ہیں؟ انہوں نے محسوس کیا کہ انہیں کہیں نہ کہیں تو خط فاصل کھینچنا ہی ہوگا۔ اب جو ہونا ہے وہ ہو جائے، کہ کر انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔

اس زمانے میں چارلس ٹاؤن (Charlestown) ریلوے کا آخری اسٹیشن تھا۔ وہاں سے اسٹینڈرٹن (Standerton) کے لیے انہیں گھوڑا گاڑی لینا تھی۔ انہیں بتایا گیا کہ وہ گاڑی میں یورپی مسافروں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ انہیں کوچوان کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان سے پائدان (Foot-Board) پر سوار ہو کر چلنے کو کہا گیا۔ انہوں نے انکار کیا اور کہا کہ انہیں گاڑی کے اندر کی وہی سیٹ دی جائے جس کے وہ قانوناً حقدار ہیں۔ گاڑی کے سفید فام افسر کے لیے یہ گستاخی ناقابل برداشت تھی۔ وہ گاندھی جی پر ٹوٹ پڑا اور انہیں بڑی بے رحمی سے مارنے لگا۔ آخر کار بعض یورپی مسافروں نے بیچ بچاؤ کرایا۔ گاندھی جی نے مار برداشت کر لی لیکن اپنی نشست سے سر مو

جنبش نہ کی۔ یہ کلاسیکی منظر کسی عظیم فنکار کے لیے موضوع فن ہو سکتا تھا۔ خاموشی، ہمت اور انسانی تمکنت، نسلی تکبر اور وحشیانہ طاقت سے نبرد آزما تھی۔ اسٹینڈرٹن پہنچ کر گاندھی بعض ہندوستانی تاجروں سے ملے۔ انہوں نے بتایا کہ ان پر آج جو کچھ بیتی ہے وہ ٹرانسوال کے ہندوستانیوں پر آئے دن بیتتی رہتی ہے۔ انہوں نے کسی کمپنی کے ایجنٹ سے معاملے کی رپورٹ کی لیکن انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ حملہ آوروں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا ارادہ نہیں رکھتے۔ اس کے بعد وہ جانسبرگ (Johannesburg) میں گرانڈ ہوٹل پہنچے وہاں ان سے کہا گیا کہ وہاں ہندوستانی قیام نہیں کر سکتے۔ جانسبرگ کے ریلوے اسٹیشن پر بھی انہیں اسٹیشن ماسٹر کو ریلوے قواعد کے طویل اقتباسات سنانا اور اس کو خاص طور سے قائل کرنا پڑا، تب جا کر وہ انہیں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ دینے پر راضی ہوا۔ ڈبے میں بھی اگر ایک یورپی مسافر آڑے نہ آیا ہوتا تو شاید وہ دوبارہ فرسٹ کلاس ڈبے سے باہر نکال دیے جاتے۔

ڈربن سے پریٹوریا کا پانچ دن کا سفر ایک طویل المدت سوہان روح بن گیا لیکن اس کی بدولت گاندھی کی نظروں کے سامنے جنوبی افریقہ میں آنے والے ہندوستانیوں کی حالت کا نہایت ہی ڈرامائی منظر پیش ہو گیا۔ ہندوستانی تاجر جس طرح روزانہ کی آمدنی اپنی جیبوں میں ڈال لیا کرتے تھے، اسی طرح گاندھی نے بھی اس طرح کی ذلت کو بھول جانا سیکھ لیا تھا۔ ان کا یہ تجربہ نیا نہیں تھا لیکن اس کا رد عمل ضرور نیا تھا۔ گاندھی نے ابھی تک اپنی بات پر اڑ جانے کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ اس کے برعکس وہ مریضانہ حد تک شرمیلے اور تنہائی پسند تھے لیکن جب میرٹز برگ ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں سرد ترین ہواؤں کے مایوس کن ماحول میں وہ اپنی بے عزتی کے احساس سے سخت اذیت میں مبتلا ہوئے تو ان پر نہ جانے کیا گزری کہ یہ احساس شدت کے ساتھ ان کی روح میں پیوست ہو گیا۔ ان کے ماضی کے تصور میں یہ واقعہ ان کی زندگی کا سب سے اہم تخلیقی تجربہ ثابت ہوا۔ اس لمحے سے انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ناانصافی کو جنوبی افریقہ کا فطری یا غیر فطری دستور تسلیم نہیں کریں گے۔ وہ بحث کرتے، استدلال کرتے، مقاومت کرتے اور حکمراں قوم کی بہتر قوت فیصلہ اور دل میں چھپی ہوئی انسانیت سے اپیل کرتے، لیکن کسی حال میں بھی نسلی تکبر کا بخوشی نشانہ بننے کو تیار نہ ہوتے یہ اپنی عزت سے زیادہ اپنی قوم، وطن بلکہ انسانیت کی عزت کی بازیابی کا سوال تھا۔ ہندوستانی باشندوں کی کثیر آبادی کا بے چارگی سے حالات پر صبر کرنا، ان کا علم سے محروم ہونا، حقوق کا فقدان اور اپنے حقوق پر اصرار نہ کرنا، ان سب نے مل کر ان پر جادو کا اثر کیا اور ان کی ہچکچاہٹ ختم ہو گئی۔ جو احساس کمتری انگلینڈ میں تعلیم کے دوران اور ہندوستان میں بیرسٹری کے زمانے میں ان کا مسلسل تعاقب کرتا رہا تھا، وہ بالکل غائب ہو گیا۔ بمبئی میں معمولی عدالت کا سامنا کرنے میں وہ ناکام ہو گئے تھے لیکن پریٹوریا آنے کے بعد انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ انہوں نے وہاں کے ہندوستانی باشندوں کا ایک جلسہ طلب کیا تاکہ ان کے روبرو ٹرانسوال میں ان کی حالت زار کی تصویر کشی کر سکیں۔ جلسہ بہت کامیاب رہا۔ گاندھی نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستانی برادری کی شکایات کے اظہار کے لیے ایک ادارے کی تشکیل کی جائے۔ اس عملی قیادت کا ایک علامتی مظاہرہ یہ تھا کہ انہوں نے جو ہندوستانی تاجر انگریزی سیکھنا چاہتے تھے انہیں انگریزی سکھانے کی پیش کش کی۔ ان کے پہلے تین شاگردوں میں ایک نائی، ایک کلرک اور ایک چھوٹا دکاندار تھا۔ ان کو ان کی رہائش پر وہ مفت پڑھانے جاتے تھے۔

پریس کے ذریعے بھی انہوں نے اپنے غصہ کا اظہار کیا۔ نیٹال ایڈورٹائزر (*Natal Advertiser*) کو انہوں نے غصہ بھرا

خط لکھا۔ انہوں نے تحریر کیا کہ کیا یہی عیسائیت ہے ؟ کیا یہی انسانیت ہے ؟ کیا یہی انصاف ہے ؟ کیا اسی کو تہذیب کہتے ہیں ؟ میں جواب کے لیے ٹھہر ہوا ہوں۔ گاندھی جی کا پروگرام جنوبی افریقہ میں زیادہ دن ٹھہرنے کا نہیں تھا۔ پھر بھی انہوں نے پریٹوریا میں ہندوستانیوں کے اندر خودداری کے جذبات ابھارنے کی کوشش کی اور نسلی امتیاز سے پیدا شدہ بھی برائیوں سے چھٹکارا پانے کے لیے جدوجہد کی اپیل کی۔ وہ شہر کے ہر ہندوستانی سے واقف ہو گئے۔ انہوں نے ہندوستانی برادری کی مجبوریوں اور مشکلوں کی طرف پریٹوریا کے برطانوی ایجنٹ کی توجہ مبذول کرائی۔ اس کا رویہ ہمدردانہ تھا لیکن ٹرانسوال کے بوئر ریاست (Boer Republic) میں واقع ہونے اور برطانوی سلطنت میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے، اس نے معذوری ظاہر کی۔ بوئر حکومت پہلے ہی بہت سے ہندوستانی آبادکاروں کو اورینج فری اسٹیٹ (Orange Free State) سے بھگا چکی تھی۔ جنوبی افریقہ میں عزت نفس کا خیال رکھنے والے کسی ہندوستانی کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس ذہنی بے چینی کے عالم میں گاندھی نے اور شدت سے یہ سوچنا شروع کیا کہ صورت حال کو کیسے درست کیا جائے۔

13.4.2 پریٹوریا کا دیوانی مقدمہ (Civil Litigation of Pretoria)

اسی دوران میں انہیں اس مقدمے کی طرف متوجہ ہو جانا پڑا جس کی بدولت ان کا جنوبی افریقہ میں آنا ہوا تھا۔ اس مقدمے میں چالیس ہزار پونڈ کی کثیر رقم کے علاوہ، یہ مقدمہ جنوبی افریقہ کے دو سب سے بڑے ہندوستانی تاجروں، نٹال کے عبداللہ اور ٹرانسوال کے طیب سیٹھ، کی تجارتی رقابت اور خاندانی جھگڑوں کا معاملہ تھا۔ اپنے وطن کے مقدمہ بازوں کی روایت کے مطابق ان دونوں تاجروں نے طے کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو لیکن اس کا آخری فیصلہ کرا کے ہی دم لیں گے۔ گاندھی کو یہ معمولی خدمت سپرد ہوئی تھی کہ وہ عبداللہ کی فرم کے حساب کتاب کی جانچ کریں گے اور وکیل و موکل میں رابطے کی کڑی بنے رہیں گے۔ نوجوان بیرسٹر کو اکاؤنٹنٹ اور کلرک کے فرائض برے نہیں لگے۔ جو دوسروں کی نظر میں ذلت کا کام تھا اسے گاندھی نے زریں موقع سمجھا۔ انہوں نے مقدمے کی تہ میں جا کر تمام تفصیلات کو دیکھا، بہی کھاتوں اور کاروباری طریقوں کا علم حاصل کیا اور گجراتی زبان سے جس میں حسابات لکھے جاتے تھے، لمبے لمبے ترجمے کر کے اپنی انگریزی مشق بھی بڑھائی۔ انہوں نے بڑے غور سے دیکھا کہ انہوں نے جو مواد تیار کیا تھا، اس کو وکیل کس طرح ترتیب دیتا تھا اور کس طرح مقدمے کی فائل تیار کرتا تھا۔

اس زمانے میں وہ یہ سمجھتے تھے کہ وکالت کے پیشے میں قوت استدلال، خطابت کی بازی گری اور قانون کی کتابوں سے اقتباسات پر اقتباسات پیش کرنا ہی نقطہ عروج ہے۔ اس مقدمے پر سال بھر محنت کرنے کے بعد انہوں نے یہ سیکھا کہ وکیل کا اصلی کام واقعات کی ترتیب اور حقیقت کی دریافت ہے۔ انہیں اس کا احساس تھا کہ نہ وہ شعلہ بیان مقرر ہیں نہ عالم لیکن کامیابی کے لیے وہ اپنی ایمانداری اور محنت پر بھروسہ کر سکتے تھے۔ اس مقدمے نے انہیں وہ باتیں سکھائیں جو ایک ناتجربہ کار وکیل کسی تجربہ کار بیرسٹر کے چیمبر میں سیکھتا ہے۔ اس سے ان میں یہ اعتماد بھی پیدا ہوا کہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ بیرسٹر کی حیثیت سے ناکام رہیں اور یہ بھی کہ قانون کا تین چوتھائی واقعات ہیں اور اگر ہم سچائی کا دامن تھامے رہیں تو قانون فطری طور سے ہماری مدد کرتا ہے۔ واقعات کے قریبی مطالعے سے انہیں معلوم ہوا کہ عبداللہ کا مقدمہ حقیقت اور قانون کے اعتبار سے مضبوط ہے لیکن انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مقدمہ بازی میں وکیلوں کی چڑھتی ہوئی فیس، روزمرہ کے کاروبار میں لازمی

خلل اور طرفین میں دشمنی کی وجہ سے فریقین کی تباہی ہوگی۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے یہ کہیں بہتر تھا کہ عدالت کے باہر مقدمہ طے کر لیا جائے۔ طرفین نے بادل ناخواستہ ثالثی کو منظوری دی۔ ثالثوں نے عبداللہ کے حق میں فیصلہ دیا۔ اگر یہ فیصلہ جوں کا توں فوراً لاگو کر دیا جاتا تو طیب سیٹھ کا دیوالہ نکل جاتا۔ گاندھی نے اپنے موکل کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ لمحۂ فتح کے وقت فیاضی کا مظاہرہ کریں اور قسطوں میں ادائیگی پر رضامند ہو جائیں۔ وہ اپنے پہلے اہم مقدمے کو یاد کر کے اطمینان محسوس کرتے تھے: ''میں نے مقدمے کی پیروی سیکھ لی تھی مجھے یہ پتہ چل گیا یا تھا کہ انسانی مزاج کا بہتر پہلو کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے اور انسانوں کے دلوں میں کیسے جگہ بنائی جا سکتی ہے۔ میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ وکیل کا اصلی کام یہ ہے کہ جو ایک دوسرے سے کٹ گئے ہیں انہیں پھر سے کیسے متحد کیا جائے۔'' اس کے بعد مسلسل طور سے ان کی یہی کوشش رہتی کہ مقدمہ بازی کے بجائے عدالت کے باہر صلح کرا دی جائے۔ اس طریق کار سے صرف مقدمہ بازوں ہی کو فائدہ نہیں ہوتا تھا بلکہ 'میرا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ روپے بھی ہاتھ سے نہیں گئے اور روح تو یقیناً نہیں گئی۔' انہوں نے یہ تاثر کئی برس بعد قلمبند کیا تھا۔

پریٹوریا کا دیوانی مقدمہ بخیر و خوبی ختم ہو چکا تھا اور گاندھی کا معاہدہ بھی۔ وہ ہندوستان کے لیے جہاز پکڑنے ڈربن آئے۔ ان کے احسان مند موکل عبداللہ نے انہیں ایک وداعی پارٹی دی۔ وہاں اتفاق سے گاندھی کی نظر نٹال مرکزی، نامی ایک انگریزی اخبار پر پڑی۔ انہوں نے ایک خبر پڑھی جس کا عنوان تھا 'ہندوستانیوں کا حق رائے دہندگی۔' نٹال کی مقننہ میں ایک قانون کا مسودہ اس نظر سے پیش کیا گیا تھا کہ ہندوستانی باشندوں کو حق رائے دہندگی سے محروم کر دیا جائے۔ لیکن گاندھی کے میزبان اور دوسرے تاجر جو اس پارٹی میں شامل تھے اس قانون پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکے۔ وہ صرف اتنی انگریزی ضرور جانتے تھے کہ گوری نسل کے گاہکوں سے انگریزی میں بات چیت کر سکیں لیکن ان میں سے گنے چنے لوگ ہی اخبار پڑھ سکتے تھے۔ نٹال کی مقننہ کی کارروائی تو خیر سے ان کی سمجھ میں کیا آئی۔ وہ نٹال میں تجارت کی غرض سے آئے تھے اور سیاست سے انہیں بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں اس کا احساس بھی نہیں تھا کہ سیاست کا اثر ان کے کاروبار پر بھی پڑ سکتا ہے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے کہ آرینج فری اسٹیٹ سے ہندوستانی تاجروں کو نکال باہر کیا گیا تھا اور اب نٹال میں بھی ایک نسلی قانون پیش ہونے جا رہا تھا۔ 'ہمارے تابوت میں یہ پہلی کیل ہے' گاندھی نے تبصرہ کیا۔ نٹال کے ہندوستانی تاجروں نے گاندھی سے استدعا کی کہ وہ نٹال میں رک کر ان کے حقوق کے لیے جنگ کریں۔ ابھی تک وہ یورپی بیرسٹروں پر بھروسہ کرتے آئے تھے۔ اب انہیں یہ خوشی تھی کہ ان کے پاس ایک ہندوستانی بیرسٹر موجود ہے۔ گاندھی بھی اس بات پر راضی ہو گئے کہ ایک مہینے تک ہندوستان کی واپسی ملتوی کر دیں۔ امید تھی کہ اس عرصے میں ہندوستانیوں کے حق رائے دہندگی کا فیصلہ ہو جائے گا۔ گاندھی نے کام شروع کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں کی۔ وداعی پارٹی ایک سیاسی پارٹی میں تبدیل ہو گئی۔ مقصد تھا کہ بل کے خلاف ہندوستانیوں کی مخالفت کو منظم کیا جائے۔ یقیناً کسی سچے اندرونی وجدان نے اس پچیس سالہ بیرسٹر کی رہنمائی کی ہوگی۔ تبھی وہ اپنی پہلی سیاسی تحریک کی تنظیم کر سکے۔

13.4.3 نٹال انڈین کانگریس کا قیام (Foundation of the Natal Indian Congress)

گاندھی نے محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کو ایک ایسے مستقل ادارے کی ضرورت ہے جو ان کے مفادات کی نگرانی کر سکے۔ دادا بھائی نوروجی نے 1893ء کے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کی تھی۔ ان کی شمولیت کو مد نظر رکھتے ہوئے گاندھی نے اپنے ادارے

کا نام نٹال انڈین کانگرس (Natal Indian Congress) تجویز کیا۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے دستور العمل اور اغراض و مقاصد سے واقف نہ تھے۔ حالانکہ یہ لاعلمی فائدہ بخش ہی ثابت ہوئی کیونکہ انہوں نے اپنے تصورات کے مطابق نٹال کے ہندوستانیوں کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے نٹال انڈین کانگریس کی تشکیل کی۔ دوسری طرف اس زمانے کی انڈین نیشنل کانگرس صرف دانشوروں کی ایک مجلس مباحثہ تھی اور اس کی سالانہ تقریب میں تقریروں، عرضداشتوں اور احتجاجوں کے بعد درمیانی وقفے میں اس کا نام بھی سنائی نہ دیتا تھا۔ نٹال ہندوستانی کانگریس کی تشکیل اس طور پر ہوئی تھی کہ ایک فعال ادارے کی حیثیت سے سال بھر کام کرتی رہے اس کا مقصد صرف سیاست نہیں بلکہ اس کے اراکین کی اخلاقی اور سماجی برتری کے لیے بھی کام کرنا تھا۔ اگرچہ یہ ایسی برادری کی خدمت میں مصروف تھی جس کا سیاسی تجربہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ لیکن یہ کسی شخص واحد کا تماشا نہیں تھی۔ اگرچہ گاندھی نہ تھکنے والے سیکریڑی تھے، لیکن انہوں نے ہر قدم پر عام دلچسپی اور ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ممبر سازی اور چندے کی وصولی کو انہوں نے روزمرہ کا معمول بننے سے زیادہ اہمیت دی۔ انہوں نے بادل ناخواستہ موافقت کرنے والوں پر اخلاقی دباؤ ڈالنے کا ایک ایسا طریقہ اپنایا جو نرم تو تھا مگر جس سے بھاگنا تقریباً ناممکن تھا۔ ایک دن ایک چھوٹے سے گاؤں میں وہ رات بھر بیٹھے رہے اور انہوں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا جب تک کہ صبح کو ان کا میزبان، ایک ہندوستانی تاجر، اپنا چندہ تین پونڈ سے بڑھا کر چھ پونڈ کرنے پر راضی نہ ہوا۔

لندن میں زمانہ طالب علمی سے ہی گاندھی باقاعدگی سے اپنے روزانہ اخراجات کا حساب رکھتے تھے۔ انہوں نے نٹال انڈین کانگریس کے حسابات کے سلسلے میں بھی وہی احتساب برتا۔ اس کے حسابات اس خوش اسلوبی سے رکھے جاتے تھے کہ 30 سال بعد انہوں نے یہ لکھا تھا؛ 'میں یہ دعوی کر سکتا ہوں کہ 1894ء کے حسابات آج بھی نٹال انڈین کانگریس کے ریکارڈ میں محفوظ ملیں گے۔' عوامی فنڈ سے انہوں نے اپنی ذات کے لیے ایک پائی بھی لینا منظور نہیں کیا۔ انہیں یہ احساس تھا کہ اگر وہ ہندوستانی برادری کے بامعاوضہ ترجمان بن گئے تو اس کے بے خوف خادم نہیں رہ سکتے۔ اس اعتبار سے اعزازی خدمت، ارباب وطن کے سلسلے میں ان کا فرض ہی نہیں تھی بلکہ خود ان کی آزادئ نفس کی محافظ بھی تھی۔ سیاسی تربیت کے اس ابتدائی دور میں انہوں نے اپنے کام کرنے کے اصول خود بنائے۔ انہوں نے اس عام پسند نظریے کو کبھی قبول نہیں کیا کہ اپنی پارٹی غلط ہو یا صحیح، اسی کے لیے ہی لڑنا چاہیے۔ واقعات اور حقائق کی تلاش کا جو حد درجہ شوق انہیں حال ہی میں قانون کی پریکٹس کے سلسلے میں حاصل ہوا تھا، اس سے انہوں نے سیاست میں بھی کام لیا۔ ان کے نزدیک اگر واقعات موافق ہوں تو ان پر حاشیہ آرائی کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ مبالغہ سے احتراز کرتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ نٹال انڈین کانگریس، ہندوستانی اقلیت کے سیاسی اور اقتصادی حقوق کے تحفظ کی ہی آلہ کار نہیں تھی بلکہ اندرونی اصلاح اور اتحاد کا وسیلہ بھی تھی۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو بھی نہیں بخشتے تھے اور گھما پھرا کر ان کی کمزوریوں کو بھی عیاں کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنا معیار زندگی بڑھائیں اور کاروبار میں دیانت داری سے کام لیں۔ وہ نٹالی ہندوستانیوں کے سب سے زیادہ مضبوط وکیل ہی نہیں تھے بلکہ ان کے شدید ترین نقاد بھی تھے۔

13.4.4 نٹال اسمبلی کا متنازعہ بل (Controversial Bill of the Natal Assembly)

ہندوستانیوں کو حق رائے دہندگی سے محروم کرنے کا قانون جس کے باعث گاندھی نے نٹال میں اپنے قیام کو طول دیا تھا، ہندوستانی

تاجروں کو ہی دھیان میں رکھ کر پیش کیا گیا تھا۔ حق رائے دہندگی کے لیے پچاس پونڈ مالیت کی غیر منقولہ جائیداد یا دس پونڈ سالانہ محصول کی جو شرط لگائی گئی تھی، اس کے مطابق دس ہزار یورپینوں کے مقابلے میں صرف ڈھائی سو ہندوستانی ہی ووٹروں کی فہرست میں جگہ حاصل کر سکے تھے۔ چند ہندوستانی ووٹروں کا بھی درج فہرست ہونا، یورپینوں کو خطرے کا نشان نظر آرہا تھا۔ یہ یوروپی کسی بھی گہرے رنگ والے کو خواہ وہ سیاہ فام ہو، سانولا ہو یا پیلا، نٹال کی دولت یا حکومت میں شریک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ نٹال کے سیاستداں، اپنے مقصد کو راز رکھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ انہیں میں سے ایک نے یہ مقصد ان لفظوں میں بیان کیا کہ 'ہندوستانیوں کو کافر کی سطح تک پست کر دیا جائے اور مستقبل میں جو جنوبی افریقی قوم (Nation) بننے جارہی ہے، اس کا حصہ بننے سے روکا جائے۔ ایک اور سیاستداں نے اعلان کیا کہ قانون کا مقصد یہ تھا کہ 'ہندوستانیوں کی زندگی نٹال کے مقابلے میں خود ان کے ملک میں زیادہ آرام دہ بنادی جائے۔'

ہندوستانیوں کو حق رائے دہندگی سے محروم کرنے کا مسودہ قانون (Bill)، نٹال کی مجلس قانون ساز نے پاس کر دیا اور گورنر نے اس کو منظوری بھی دے دی۔ لندن کے نو آبادیاتی آفس نے بڑی حد تک گاندھی کی احتجاجی تحریک سے متاثر ہو کر مسودہ قانون کی منظوری دینے سے اس بنیاد پر انکار کر دیا کہ اس میں برطانوی سلطنت کے دوسرے حلقے کے باشندوں کے ساتھ امتیازی سلوک برتا گیا تھا۔ اس نامنظوری (Veto) سے نٹال کے یورپیوں نے ہار نہیں مانی۔ انہوں نے نسل و رنگ کے امتیاز کا واضح لفظوں میں اظہار کیے بغیر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اب ایک ترمیم شدہ قانون پاس کیا گیا جس کے مطابق 'اصلی یورپین ملکوں کو چھوڑ کر' کسی ایسے ملک جہاں ایسے نمائندہ انتخابی ادارے نہ ہوں جو پارلیمانی حق رائے دہندگی پر مبنی ہوں، کے باشندوں کا نام رائے دہندوں کی فہرست (Voter List) میں گورنر جنرل سے استثنائی حکم حاصل کیے بغیر درج نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ اس ترمیم شدہ بل میں پہلے والے بل ہی کی طرح جسے برطانوی حکومت نے ویٹو کر دیا تھا، ہندوستانیوں کے حق رائے دہندگی پر موثر روک لگادی گئی تھی لیکن ایک طرح کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ قانون میں نسلی امتیاز کا ذکر صراحتاً نہیں آیا تھا۔

ہندوستانیوں کی تجارت اور ان کے ملک میں داخلے پر بھی بے پناہ پابندیاں لگادی گئیں۔ آئندہ سے نٹال میں کوئی بھی لائسنس حاصل کیے بغیر تجارت نہیں کر سکتا تھا۔ یورپیوں کو یہ لائسنس منہ مانگے مل جاتا تھا لیکن ہندوستانیوں کو اگر ملتا بھی تھا تو کافی خرچ اور بیحد دوڑ دھوپ کے بعد۔ چونکہ اب ملک میں آنے والے ہر شخص کے لیے کسی یورپی زبان میں تعلیمی امتحان لازمی قرار دے دیا گیا تھا، اس لیے زیادہ تر ہندوستانیوں کے لیے داخلے کا دروازہ بند ہو گیا۔ بس وہی نیم غلام معاہدہ بند مزدور ہی آسکتے تھے اور ان کی درآمد جاری رکھی گئی۔ اس ہندوستان مخالف تحریک میں نٹال کے یوروپی، ٹرانسوال اور آرینج فری اسٹیٹ کے بوئر پڑوسیوں کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ ٹرانسوال ریپبلک کے بلند بانگ صدر کروگر نے ایک ہندوستانی وفد سے کہا تھا 'تمہارا سلسلہ نسب اسماعیل سے ملتا ہے اس لیے تمہیں پیدائشی طور پر عیسی کے وارثوں کی غلامی کرنا ہے۔' برطانوی حکومت کا ایک نمائندہ پریٹوریا میں مقیم تھا لیکن اس نے اپنے بے دست و پا ہونے کا اظہار کیا۔ جب جنگ بوئر (Boer War) چھڑی تو بوئروں پر جو فرد جرم عائد ہوئی اس میں ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی بھی شامل تھی۔ آگے چل کر ہندوستانیوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ انہیں نہ برطانوی باشندوں سے انصاف مل سکتا تھا نہ بوئروں سے۔

13.5 گاندھی کی سیاسی تحریک (The Political Movement of Gandhi)

گاندھی جی کے بارے میں ایک انوکھی بات یہ بھی تھی کہ جنوبی افریقہ میں وہ اکیلے انگریزی تعلیم یافتہ ماہر قانون ہندوستانی تھے۔ اسی لیے انہی کے کندھوں پر نسلی امتیاز کے خلاف تحریک چلانے کی ذمہ داری آن پڑی تھی۔ ان کی عمر سے کہیں بڑے تجربہ کار اور امیر تاجروں نے ان کو اپنا نیتا چنا تھا۔ وہی ایسے واحد ہندوستانی تھے جو حکمرانوں سے انہیں کی زبان میں بات کر سکتے تھے، وہی قانون اور حکومت کی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے، ان کی درخواستوں کے مسودے تیار کر سکتے تھے، تنظیمیں بنانے کی مہارت رکھتے تھے اور حکمرانوں کے سامنے ہندوستانیوں کی نمائندگی کر سکتے تھے۔ بہر کیف گاندھی نے نٹال اسمبلی بل کے خلاف پہلی سیاسی مہم کا آغاز کیا۔ پریٹوریا میں انہیں ہندوستانی تاجروں کے مسائل کا جو علم حاصل ہوا تھا، وہ یہاں بڑے کام آیا۔ انہوں نے ایک تین طرفہ طریق کار اپنایا۔

- پہلے تو ہندوستانی آبادی کے مختلف النوع عناصر کے درمیان یک جہتی کا جذبہ بیدار کرنا تھا۔ مسلمان تاجروں، پارسی منشیوں، نیم غلام مدراسیوں، معاہدہ بند مزدوروں اور نٹال نژاد ہندوستانی عیسائیوں، وغیرہ سبھی لوگوں کو یہ احساس دلاتا تھا کہ ان کی اصل ایک ہے۔ ہندوستانی عیسائیوں کو یہ ذہن نشین کرانا تھا کہ عیسائی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی ہندوستانیت ختم ہو گئی۔ تاجروں کو یہ تسلیم کرانا تھا کہ ان غریب معاہدہ بند مزدوروں سے بھی ان کا رشتہ تھا جنہیں اتھاہ غریبی نٹال جیسے دور افتادہ مقام پر کھینچ لائی تھی۔
- دوسرے حقوق رائے دہندگی سے محروم کرنے والے قانون کے اثرات اور عوارض سے ہندوستانی برادری کو بھی آگاہ کرنا تھا۔ اور یورپی رائے عامہ کے سمجھدار حلقے کو بھی۔ سب سے بڑھ کر، ہندوستانیوں کے معاملے کی وسیع پیمانے پر نشرواشاعت کرنا تھی تاکہ ہندوستان اور برطانیہ عظمیٰ کی حکومتوں اور عوام کے ضمیر کو جھنجھوڑا جاسکے۔ حکومت ہند خود مختار نہ تھی لیکن اس پر کچھ نہ کچھ اخلاقی ذمہ داری اس لیے عائد ہوتی تھی کہ نٹال کے یورپیوں کو زیادہ خوش حال بنانے کی غرض سے اسی نے مقامی لوگوں کو ملک سے باہر جانے کی اجازت دی تھی۔
- تیسرے یہ کہ لندن میں تاج برطانیہ کو اس کا اختیار حاصل تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو وہ نٹال کی اسمبلی کے پاس کیے ہوئے بلوں کو منظوری نہ دے اور گاندھی کو یہ امید تھی کہ شاید حکومت کو اسی پر آمادہ کیا جاسکے کہ وہ مداخلت کر کے جنوبی افریقہ میں اس نسلی امتیاز کا انسداد کرے جو ملکہ معظمہ کی ہندوستانی رعایا کے خلاف برتا جا رہا تھا۔

رائے عامہ کے ایک معمار کی حیثیت سے گاندھی کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ دسمبر 1894ء کے سالانہ اجلاس میں انڈین نیشنل کانگرس نے نٹال میں رائے دہندگی سے محروم کرنے والے قانون کے خلاف احتجاج کیا اور آنے والے تین برسوں میں لندن ٹائمز نے جنوبی افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کے مسئلے پر آٹھ اداریے لکھے۔ ایک عرضداشت، جس کا مسودہ گاندھی نے تیار کیا تھا اور جس پر 400 ہندوستانیوں کے دستخط تھے، نٹال کی مجلس قانون ساز میں پیش کی گئی۔ عرضداشت سے نٹال کی مجلس قانون ساز اور حکومت میں ہلچل پڑ گئی لیکن قانون بہر حال پاس کر دیا گیا۔ ناکامی سے ہندوستانیوں کے جوش معطل نہیں ہوئے۔ کم سے کم وہ اپنی سیاسی کاہلی چھوڑ کر خواب غفلت سے بیدار ہو گئے تھے۔ جہاں تک گاندھی کا تعلق ہے تو اپنی پہلی سیاسی تحریک کی بدولت جس میں حالات نے انہیں ڈالا تھا، وہ اپنے احساس

کمتری سے چھٹکارا پا گئے جو نا قابل علاج نظر آتا تھا۔ایسا نہیں ہے کہ ان پر خود پسندی غالب آگئی ہو کیونکہ انہوں نے دادابھائی نوروجی کو جو انڈین نیشنل کانگریس کے نمایاں لیڈر اور اسی کے ساتھ برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے، 5 جولائی 1894ء کے خط میں لکھا:

> اپنے بارے میں ایک بات کہ کر گفتگو ختم کروں گا کہ میں ناتجربہ کار اور نوجوان ہوں، اسی لیے اس کا امکان ہے کہ میں غلطیاں کروں۔ جو ذمہ داری میں نے اپنے سر لی ہے، اس کو میری صلاحیتوں سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ اس لیے آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ میں نے یہ مسئلہ جو میری صلاحیتوں سے باہر ہے اس لیے ہاتھ میں نہیں لیا ہے کہ ہندوستانیوں کو نقصان پہنچا کے خود دولت مند بن جاؤں (بلکہ) یہاں میرے سوا کوئی اور ہے ہی نہیں جو اس مسئلے کو ہاتھ لگائے۔ ان حالات میں آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہو گا اگر آپ مہربانی کر کے مجھے راہ بتائیں، حکم دیں اور مجھے ضروری مشوروں سے نوازیں۔ میں ان کا اسی طرح خیر مقدم کروں گا جیسے کہ یہ مشورے باپ نے بیٹے کو دیے ہوں۔

کمتری کا تصور اضافی ہے۔ ایسی برادری میں جو رہنمائی کے لیے گاندھی کی محتاج ہو۔ گاندھی اپنی کوتاہیاں بھول گئے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جس کے سوا وہاں اور کوئی تھا ہی نہیں برتری کا احساس پالنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بہرکیف گاندھی نے وہ کام سنبھال لیا جس سے کسی دوسری جگہ وہ پیچھے ہٹ گئے ہوتے۔ اب ایک ہی موقع اور باقی رہ گیا تھا۔ نٹال کی مقننہ نے جو بل پاس کیا تھا اس کے قانون بننے سے پہلے اس کے لیے ملکہ برطانیہ کی منظوری ضروری تھی۔ گاندھی نے لندن میں نو آبادیاتی سیکریٹری کے پاس ایک دیو قامت عرضداشت بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ عرضداشت پر دس ہزار افراد کے دستخط تھے۔ نٹال کے آزاد ہندوستانیوں کی تقریباً پوری آبادی اس کے دائرے میں آگئی تھی۔ گاندھی کا طریقہ کار یہ تھا کہ اس تحریک میں ہر قدم اس طرح اٹھایا جائے کہ قوم کی سیاسی تعلیم بھی ہوتی چلے۔ مثال کے طور پر عرضداشت پر اس وقت تک کسی کو بھی دستخط نہیں کرنے دیا گیا جب تک کہ اس نے اندراجات کو سمجھ کر کلیتہً قبول نہ کر لیا۔ اس کی ایک ہزار کاپیاں چھاپی گئیں اور نمایاں سیاست دانوں اور اخباروں کو ڈاک کے ذریعے بھیج دی گئیں۔ ہندوستان اور برطانیہ دونوں ہی جگہ نٹال کے ہندوستانیوں کے معاملات کو وہاں کے اخبارات نے نمایاں طور چھاپا۔

اسی دوران میں وہ مہینہ گزر گیا جس میں گاندھی نے اپنا جانا ملتوی کیا تھا۔ نٹال کے ہندوستانیوں نے ان سے رکنے کی استدعا کی۔ انہیں ابھی یقین نہیں تھا کہ برطانوی حکومت اس شر انگیز قانون کو نامنظور کر دے گی۔ اس کے علاوہ کیا خود گاندھی نے ہندوستانیوں کو متنبہ نہیں کیا تھا کہ یہ ان کے تابوت میں پہلی کیل ہے؟ کیا اب وہ انہیں منجدھار میں چھوڑ دیں گے اور سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیں گے۔ گاندھی اپنے قیام کی مدت بڑھانے پر رضامند ہو گئے۔ سوال یہ تھا کہ ان کا خرچہ پانی کیسے چلے گا۔ عوامی خدمات کا معاوضہ لینے پر وہ کسی طرح تیار نہیں تھے، اس لیے 20 تاجروں نے انہیں وکالت کا پیشگی محنتانہ دینے کی پیش کش کی تاکہ کم از کم تین سو پونڈ سالانہ پورے ہو جائیں۔ ڈربن میں ان کے اخراجات کے لیے یہ رقم کافی تھی۔ نٹال کی بار سوسائٹی نے ایک ایڈوکیٹ کی حیثیت سے وہاں کے سپریم کورٹ میں گاندھی کے داخلے کی مخالفت کی۔ چیف جسٹس نے انہیں داخل کر لیا لیکن پریکٹس کرنے والے بیرسٹروں کے آداب و رسوم کے مطابق انہیں پگڑی اتارنے کا حکم دیا۔ سال بھر پہلے ڈربن کی ایک نچلی عدالت سے جہاں وہ صرف دیکھنے کے لیے گئے تھے، باہر تو چلے آئے تھے مگر یہ ذلت گوارہ نہ کی تھی۔ اب سپریم کورٹ کے ایک ایڈوکیٹ کی حیثیت سے انہوں نے یہ سوچ کر یہ کڑوا گھونٹ پی لیا کہ اگر انہیں نسلی امتیاز کے خلاف جنگ کرنا ہے تو

انہیں اس سے بڑے مسائل سے نپٹنا اور دوسرے مواقع کا انتظار کرنا ہوگا۔

13.5.1 پہلا دور (The First Phase)

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کافی عرصے تک مقیم رہے۔ یہاں ہم ان کے اس دور کو بہت مختصر تحریر کرتے ہوئے ان کے وسیع تجربات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ 1894 سے 1906 کے دوران گاندھی جی کی سیاسی سرگرمیوں کو ہم جنوبی افریقہ میں آباد ہندوستانیوں کی اعتدال پسند (Moderate) تحریک کہہ سکتے ہیں۔ اس دوران گاندھی جی نے زیادہ تر اپنی توجہ جنوبی افریقہ کی اسمبلیوں، نوآبادیات کا کام دیکھنے والے سکریٹری اور انگلینڈ کی پارلیمنٹ کو درخواست اور اپیلیں بھیجنے پر مرکوز کی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اس طرح کی کارروائیوں سے برطانوی حکومت کو حقیقت کا پتہ چل جائے گا، اس کا جذبۂ حق وانصاف بیدار ہوگا، اس کا دل پگھلے گا اور وہ ہندوستانیوں کی بھلائی میں ضرور کچھ نہ کچھ کرے گی کیونکہ بہر حال ہندوستانی، اسی کی سلطنت کے ہی تو شہری ہیں۔ گاندھی جی ہندوستانیوں کے مختلف فرقوں کو متحد کرنے اور ان کے مطالبات کے پرچار کی برابر کوشش کرتے رہے۔ اس کے لیے انہوں نے انڈین اوپنین (Indian Opinion) نام کا اخبار نکالنا شروع کیا۔ اس دوران گاندھی جی کی ساری خوبیاں ایک کامیاب ناظم، صحافی، مشتہر اور فنڈ اکٹھا کرنے کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آگئیں۔ لیکن 1906 کے آتے آتے ان کو یہ یقین ہو گیا کہ جدوجہد کے معتدل طریقے بالکل ناکافی ہیں۔ ان سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔

13.5.2 دوسرا دور (The Second Phase)

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کی جدوجہد کا دوسرا دور 1906 میں عام نافرمانی (Civil Disobedience) کی تحریک سے شروع ہوا جس کو انہوں نے ستیہ گرہ کے نام سے موسوم کیا۔ سب سے پہلے اس کا استعمال اس قانون کے خلاف کیا گیا جس کے تحت ہر ایک ہندوستانی کو رجسٹریشن سرٹیفکیٹ لینا ضروری تھا۔ اس سرٹیفکیٹ میں اس کے انگوٹھے کے نشانات ہوتے تھے۔ اس کو اسے ہر وقت ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ 11 ستمبر 1906 میں جوہانس برگ کے ایمپائر تھیٹر (Empire Theatre) میں ہندوستانیوں کا ایک عام جلسہ ہوا۔ انجام کی پرواہ کیے بغیر لوگوں نے ایک آواز سے اس قانون کی خلاف ورزی کرنے کا فیصلہ کیا۔ حکومت اور ہندوستانی دونوں اپنے فیصلے پر اٹل تھے۔ گاندھی جی نے اس قانون کی مخالفت کرنے کے لیے غیر متشدد مزاحمتی تنظیم (Passive Resistance Association) بنائی۔ رجسٹریشن کی جو آخری تاریخ حکومت نے بتائی تھی، اس کے گذر جانے پر اس نے گاندھی جی اور دوسرے 26 لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی شروع کی۔ ان کو مجرم ٹھہرایا گیا اور ملک چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ حکم نہ ماننے پر ان سب کو جیل بھیج دیا گیا۔ اس سے اس کالے قانون کی مخالفت اور تیز ہوگئی اور جیل جانے کی والوں کی تعداد 155 تک پہنچ گئی۔ جیل کا خوف لوگوں کے دلوں سے بالکل نکل گیا اور لوگ جیل کو کنگ ایڈورڈ (King Edward) کا ہوٹل کہنے لگے۔

جنرل اسمٹس (General Smuts) نے گاندھی جی کو بات چیت کرنے کے لیے بلایا اور وعدہ کیا کہ اگر ہندوستانی خود سے اپنا رجسٹریشن کرالیں تو یہ قانون واپس لے لیا جائے گا۔ وہ اس پر راضی ہو گئے اور سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنا رجسٹریشن کرایا۔ یہی جنرل

اسمٹس کی چال تھی۔اس نے یہ حکم جاری کیا کہ خود سے رجسٹریشن کرانے والوں کی قانوناً تصدیق کردی جائے۔اس کے جواب میں گاندھی جی کی قیادت ورہنمائی میں رجسٹریشن کرائے ہوئے سبھی لوگوں نے اپنے اپنے سرٹیفکیٹ بر سرعام جلا ڈالے۔اسی دوران حکومت نے ایک دوسرا بل باہر کے لوگوں کی آمد کو روکنے کے لیے اسمبلی میں پیش کیا۔اس کی مخالفت میں زوردار مہم چلائی گئی۔اگست 1908 میں نئے قانون کی خلاف ورزی کرنے کی غرض سے نامور ہندوستانی لیڈران سرحد (Frontier) پار کرکے نٹال سے ٹرانسوال چلے آئے۔ان سب کو گرفتار کرلیا گیا۔ٹرانسوال کے تمام ہندوستانیوں نے اس قانون کی مخالفت کی اور لائسنس حاصل کیے بغیر کھوچے لگانے لگے اور جن کے پاس لائسنس تھے انہوں نے دکھانے سے انکار کردیا۔ایسے سبھی لوگوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔اکتوبر 1908 میں گاندھی جی کو بھی جیل ہوگئی۔جیل میں ان کو دوسرے اور ہندوستانیوں کے ساتھ طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں۔ان کو سخت مشقت کرنے پر مجبور کیا گیا۔مگر قید خانے کی تکلیفیں بھی ان کے حوصلے کو پست نہ کرسکیں۔بےبس ہوکر حکومت نے لوگوں کو خصوصاً غریب ہندوستانیوں کو ملک کے باہر نکالنا شروع کیا۔تاجروں کو بھی مالی اعتبار سے نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دی گئیں۔

اب تحریک پر مصیبت کے بادل منڈلانے لگے۔پکے ارادہ والے ستیہ گرہی تو برابر جیل آتے جاتے رہے مگر عام طور سے ستیہ گرہی تھکنے سے لگنے لگے۔جدوجہد بھی کھنچتی معلوم ہوتی تھی اور حکومت کے جھکنے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے تھے۔1909 میں گاندھی جی انگریز افسروں سے ملنے لندن گئے، مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ستیہ گرہ کرنے والے لوگوں کے بال بچوں کے کھانے پینے کے لیے جمع کی گئی رقم بھی دھیرے دھیرے ختم ہورہی تھی۔گاندھی کی وکالت بھی تحریک میں مکمل مصروف رہنے کے باعث بری طرح متاثر تھی۔ایسے حالات میں گاندھی جی نے اپنے جرمن معمار دوست کالین باک (Kallen Back) کی فیاضانہ امداد سے ٹالسٹائے فارم قائم کیا،اس طرح ستیہ گرہ میں لگے لوگوں کے بال بچوں کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا مسئلہ انہوں نے حل کیا۔یہی ٹالسٹائے فارم، گاندھی جی کے ان آشرموں کے قیام کا پیش رو (Precursor) تھا جو بعد میں قومی تحریک کے اہم مراکز بنے تھے۔اس فارم کے انتظام کے لیے ہندوستان سے امدادی رقمیں بھیجی گئیں۔سر رتن ٹاٹا نے پچیس ہزار روپے بھیجے تھے۔کانگریس، مسلم لیگ اور حیدرآباد کے نظام نے بھی مالی امداد دی تھی۔1911 میں شہنشاہ جارج (King George) کی تاج پوشی کے موقع پر ہندوستانیوں اور جنوبی افریقہ کی حکومت کے درمیان سمجھوتہ ہوگیا جو صرف 1912 کے آخر تک ہی چل سکا۔انہیں دنوں بال کرشن گوکھلے جنوبی افریقہ کے دورے پر گئے۔ان کے ساتھ سرکاری مہمان کا سا سلوک کیا گیا۔حکومت نے ان سے وعدہ کیا کہ امتیاز برتنے والے سارے قوانین ختم کردیے جائیں گے، مگر یہ وعدہ پورا نہ ہوسکا۔اس لیے 1913 میں ستیہ گرہ پھر سے شروع کردیا گیا۔

13.5.3 تیسرا اور آخری دور (The Third and the Last Phase)

اس بار ستیہ گرہ کا دائرہ کافی بڑا تھا۔حکومت نے اقرار ناموں سے الگ مزدوروں پر بھی تین پونڈ کا ٹیکس تھوپ دیا تھا۔ہندوستانی مزدوروں میں زیادہ تر لوگ غریب تھے۔وہ بمشکل ایک ماہ میں دس شلنگ کما پاتے تھے۔تین پونڈ ٹیکس ان کے لیے بہت زیادہ تھا۔اس کے خلاف ستیہ گرہ شروع ہوگیا۔قریب قریب سبھی ہندوستانی اس میں شامل ہوگئے اور اس طرح اس نے صحیح معنی میں عوامی تحریک کی شکل

اختیار کرلی تھی۔اسی درمیان سپریم کورٹ کے فیصلہ نے آگ میں گھی کا کام کر دیا۔عدالت نے ان ساری شادیوں کو جو عیسائی رسم ورواج سے نہیں ہوئی تھیں اور جن کا رجسٹریشن نہیں ہوا تھا، غیر قانونی قرار دیا اور ان سے پیدا ہوئی اولادیں ناجائز قرار پائیں۔اس فیصلے سے ہندوستانی عورتوں کی بڑی بے آبروئی ہوئی اور بہت ساری عورتیں ستیہ گرہ میں شامل ہو گئیں۔

گاندھی جی نے محسوس کیا کہ جدوجہد کا آخری وقت اب آن پہنچا ہے،اس لیے اس میں ساری توانائی جھونک دینی چاہیے۔16 ستیہ گرہی جن میں کستور با گاندھی بھی شامل تھیں، قانون کی خلاف ورزی کر کے نٹال کے فونیکس سیٹلمنٹ (Phoenix Settlement) سے ٹرانسوال پہنچ گئے۔ان سب کو گرفتار کر لیا گیا۔گیارہ عورتوں کا ایک جتھہ بغیر پرمٹ کے ٹالسٹائے فارم سے چل کر نٹال سرحد کو پار کر کے نیو کیسٹل(New Castle) پہنچ گیا جو کہ ایک کھدان قصبہ تھا۔یہاں اس جتھے نے کھدان مزدوروں سے بات چیت کی، جن میں زیادہ تر تمل تھے اور ان کو ہڑتال کے لیے آمادہ کیا۔بعد میں ان سب کو گرفتار کر لیا گیا۔گاندھی جی فوراً نیو کیسٹل پہنچ گئے اور تحریک کی کمان سنبھال لی۔کان مالکوں نے مزدوروں کے کوارٹر کی بجلی اور پانی کا کنکشن کاٹ دیا۔اس طرح ان کو کوارٹر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔گاندھی جی دو ہزار سے زائد لوگوں کے ایک جتھہ کو لے کر جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے،ٹرانسوال کی جیل بھرنے کے ارادہ سے سرحد پار کر کے چل پڑے۔راستے میں ان کو دو بار گرفتار کر کے چھوڑ دیا گیا، مگر تیسری بار گرفتار کر کے ان کو ٹرین میں بٹھا کر نٹال واپس بھیج دیا گیا۔ان پر مقدمے چلے اور وہ جیل بھیج دیے گئے۔ جیل میں ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ان کو بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ان پر کوڑے برسائے جاتے اور پولیس کے گھیرے میں رکھ کر ان سے کھدانوں میں کام لیا جاتا۔گاندھی جی سے پتھر کھدوایا گیا اور ان کو جھاڑو لگانے پر مجبور کیا گیا۔ ان کو اندھیری کوٹھری میں رکھا جاتا اور ہتھکڑی اور بیڑی پہنا کر عدالت میں لایا جاتا۔حکومت کے اس ظلم کو سن کر ہندوستانی سماج تلملا اٹھا۔کان اور باغان مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ گوکھلے نے پورے ہندوستان کا دورہ کر کے اس ظلم کے خلاف رائے عامہ ہموار کی۔ہندوستانی وائسرائے لارڈ ہارڈنگ(Lord Harding) تک نے اس کی مذمت کی۔اس نے کہا'ایسا کوئی ملک جو خود کو مہذب کہتا ہے،اس طرح کے مظالم برداشت نہیں کرے گا۔'انہوں نے ان مظالم کی غیر جانبدارانہ جانچ کرانے کی اپیل بھی کی۔پورے ملک نے نہتھوں پر ہوئے ایسے مظالم پر غم وغصہ کا اظہار کیا۔

لارڈ ہارڈنگ، گاندھی جی، سی۔ایف۔اینڈریوز (C.F. Andrews) اور جنرل اسمٹس کے درمیان کئی بار ہوئی لمبی بات چیت کے بعد آخر کار جنوبی افریقہ کی سرکار نے ہندوستانیوں کی خاص خاص مانگوں کو منظور کر لیا۔ تین پونڈ کی چنگی اور رجسٹریشن سرٹیفکیٹ کی پابندی ختم کر دی گئی۔ہندوستانیوں کو اپنے رسم ورواج کے مطابق شادی کرنے کے اختیار کو بحال کر دیا گیا نیز ہندوستانی آبادی کی دوسری پریشانیوں کو دور کرنے کا اطمینان دلایا گیا۔اس طرح پر امن سول نافرمانی تحریک، بات چیت کے ذریعے دشمن سے اپنی مانگ منوانے میں کامیاب ہوئی۔

13.6 جنوبی افریقہ میں گاندھی کی سیاسی رہنمائی کے فوائد

(Advantages of Gandhi's Political Leadership in South Africa)

جد وجہد کے گاندھیائی طریقہ کا ارتقا ہو چکا تھا۔ گاندھی جی وطن واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ اب ان کو اپنے طریقہ کی آزمائش بڑے پیمانہ پر وہیں جا کر کرنی تھی۔ جنوبی افریقہ کی جد وجہد نے ان کو کئی معنوں میں قومی تحریک کی قیادت کے لیے تیار کیا۔ غریب مزدوروں کی قیادت کرنے سے ان کو بڑے قیمتی تجربات ہوئے۔ ان غریبوں کی ہمت اور جانفروشی کے جذبات کو دیکھ کر ان کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندوستانی کسی بڑے مقصد کے لیے ظلم کے خلاف سینہ سپر ہو کر ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کو ہر طبقہ اور مذہب وملت کے لوگوں کی قیادت کرنے کا موقع ملا تھا۔ ہندو، مسلم، عیسائی اور پارسی سبھی لوگوں کی حمایت اور مدد ان کو حاصل تھی۔ وہ لوگ ہندوستان کے مختلف حصوں اور علاقوں خصوصاً تمل ناڈو اور گجرات کے باشندے تھے۔ سماج کے مختلف طبقوں سے ان کا تعلق تھا۔ ان کے ساتھ امیر تاجر غریب مزدور، مرد عورت سبھی تھے۔ جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کے تجربات کی اور بھی اہمیت تھی۔ وہاں انہوں نے اچھی طرح سمجھا کہ کسی تحریک کے لیڈر کو دوست ودشمن دونوں کی مخالفت جھیلنی پڑتی ہے۔ جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کو دو بار جان کی بازی لگانی پڑی تھی۔ 1896 میں ڈربن میں ان کے خون کی پیاسی گوروں کی ایک بھیڑ نے سڑک پر ان کا پیچھا کیا۔ رہائش گاہ میں پناہ لینے پر بھیڑ نے ان کا گھر گھیر لیا۔ جلدی جلدی بھیس بدل کر بڑی مشکل سے انہوں نے اپنی جان بچائی۔ دوسری بار ایک ہندوستانی پٹھان نے ان پر جان لیوا حملہ کیا۔ وہ ان سے اس لیے ناراض تھا کیونکہ انہوں نے گورنمنٹ سے ایک سمجھوتہ کر لیا تھا اور یہ سمجھوتہ اس کی مرضی کے خلاف تھا۔ ان واقعات سے گاندھی جی نے یہ سبق لیا کہ قوم کے لیڈروں کو بارہا ایسے فیصلے لینے پڑتے ہیں جو ان کے پیروؤں کو ناگوار بھی ہو سکتے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کو مخالف سیاسی فکروں سے صرف نظر کر کے ایک نئی سیاسی فکر، قیادت کا نیا انداز اور جد وجہد کے نئے طریقوں کی ارتقا کرنے اور ان کو محدود دائرہ میں آزمانے کا موقع ملا۔ انہوں نے تحریک کو اعتدالی دور (Moderate Phase) سے نکال کر گاندھیائی دور میں داخل کیا۔ وہ گاندھیائی طریقہ کے جزئیات سے اس کی کمیوں اور کمزوریوں کے ساتھ ساتھ، اچھی طرح واقف تھے اور ان کو پورا یقین تھا کہ یہی طریقہ تحریکی جد وجہد کے لیے سب سے اچھا اور موثر ہے۔ بس ہندوستان میں اس پر عمل کرنا باقی ہے۔

13.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے جانا کہ گاندھی جی ایک گجراتی مودھ بنیا خاندان میں پوربندر کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کے باپ دادا پوربندر اور راجکوٹ کے دیوان رہے تھے۔ کم عمری میں ہی ان کی شادی کستور بابائی کے ساتھ کر دی گئی جن سے ان کی متعدد اولاد ہوئیں۔ راجکوٹ کے ہائی اسکول سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد پہلے شیامل کالج بھاؤنگر اور پھر لندن کا رخ کیا۔ لندن میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ہندوستان آئے اور کچھ ناکام تجربات کے بعد جنوبی افریقہ جا پہنچے۔ جنوبی افریقہ کے نٹال اور ٹرانسوال میں ان

کے نسلی تجربات اور مشاہدات نے انہیں اس کے خلاف مہم چلانے پر تحریک دلائی۔ کئی سال کی لڑائیوں اور غیر متشدد عدم تعاون تحریکوں کے بعد بالآخر وہ کامیاب رہے۔ جنوبی افریقہ میں ان کے کارہائے نمایاں نے ان کو ہندوستان میں بھی بہت مقبول اور معروف کر دیا تھا۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان میں ہی وہ مشہور نہیں تھے بلکہ ان پڑھ دیہاتی بھی ان کے نام سے واقف ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان واپسی کے بعد جب گاندھی جی کمبھ میلہ گئے تو لوگوں کا بھاری ہجوم ان کا درشن کرنے امنڈ پڑا۔ 1915 میں جنوبی افریقہ سے حتمی واپسی کے بعد انہوں نے جدوجہد آزادی میں نہایت اہم کردار نبھایا جسے آپ اگلی اکائیوں میں مزید تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔

13.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

بوئیر ریاستیں	:	بوئر جمہوریہ جنہیں بسا اوقات بوئر ریاستوں کے طور پر بھی جانا جاتا ہے، آزاد، خود مختار جمہوریائیں تھیں جنہیں کیپ کالونی کے ڈچ بولنے والے باشندوں اور ان کی اولادوں کے ذریعے تشکیل دیا گیا تھا۔ اس میں ٹرانسوال اور اورینج فری اسٹیٹ بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ تھیں۔
شخصی محصول	:	(Poll Tax) کسی فرد پر اس کے کسی ریاست میں رہائش پذیر ہونے کے بدلے عائد کردہ محصول۔
نمائندہ حکومت	:	(Representative Government) نمائندہ حکومت، جمہوریت کی ایک قسم ہے جہاں شہری، حکومت میں اپنے خیالات اور خدشات کی نمائندگی کے لیے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس کے بعد منتخب نمائندے اپنے اعمال کے لیے ووٹرز کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔
مسودہ قانون	:	(Bill) ایک مجوزہ قانون کا مسودہ جو پارلیمنٹ میں بحث کے لیے پیش کیا گیا ہو۔
ویٹو	:	(Veto) کسی مجوزہ قانون یا بات کو نامنظور کر دینے کا خصوصی اختیار
رائے دہندہ	:	رائے دہندہ یا ووٹر وہ ہوتا ہے جو ووٹ دیتا ہے یا اسے ووٹ دینے کا قانونی حق حاصل ہوتا ہے، خاص طور پر انتخابات میں۔ مثال کے طور پر، کوئی شخص جو الیکشن کے دوران اپنا ووٹ ڈالتا ہے وہ ووٹر ہے۔

13.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. بوئر ریاستوں کو کس نے قائم کیا تھا؟
2. جنوبی افریقہ میں 'قلی' ('Coolie') کسے کہا جاتا تھا؟
3. کیا نٹال ایک بوئر ریاست تھی؟
4. گاندھی جی کے خاندان کے افراد گجرات کی کس برادری سے تعلق رکھتے تھے؟
5. گاندھی جی کے والد کا نام کیا تھا اور وہ کس عہدے پر تھے؟

6. گاندھی نے کس کالج سے قانون کی ڈگری حاصل کی؟

7. گاندھی جی جنوبی افریقہ میں کس کے وکیل بن کر گئے؟

8. جنوبی افریقہ میں کسے فٹ پاتھ پر چلنے یا رات کو اجازت نامہ (permit) لیے بغیر باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی؟

9. لندن ٹائمز نے ٹرانسوال میں کن مخصوص علاقوں کو گھیٹو (ghetto) کا نام دیا تھا؟

10. نٹال انڈین کانگریس کب قائم کی گئی؟

13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. جنوبی افریقہ میں گاندھی کے نسلی تعصب کے تجربات پر نوٹ لکھیے۔
2. پریٹوریا کے دیوانی مقدمہ پر نوٹ لکھیے۔
3. نٹال انڈین کانگریس کے قیام پر نوٹ لکھیے۔
4. نٹال اسمبلی کے متنازعہ بل پر روشنی ڈالیے۔
5. جنوبی افریقہ میں گاندھی کے سیاسی کردار کا مختصراً تجزیہ کیجیے۔

13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مہاتما گاندھی کے ابتدائی حالات زندگی اور تعلیم پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی آمد پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
3. جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی کی سیاسی تحریک کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

13.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Bhana, Surendra, and Goolam Vahed, *The Making of a Political Reformer*: *Gandhi in South Africa*, *1893–1914*, Manohar, New Delhi, 2005.
3. Chandra, Bipan, et al., *India's Struggle for Independence*, *1857–1947*, Penguin Books, New Delhi, 1989.
4. Gandhi, Rajmohan, *Mohandas*: *A True Story of a Man, His People and an Empire, Penguin, New Delhi, 2006.*
5. Guha, Ramachandra, *Gandhi*: *The Years that Changed the World*, *1914–1948*, Penguin, Gurgaon, 2006.
6. Guha, Ramachandra, *Gandhi before India*, Penguin, Gurgaon, 2013.
7. Hardiman, David, *Gandhi: In His Times and Ours*, Permanent Black, Delhi, 2003.
8. Kripalani, J.B., *Gandhi*: *His Life and Thought*, Publications Division, Government of India, 2019 (first pub in 1970).
9. Lelyveld, Joseph, *Great Soul*: *Mahatma Gandhi and His Struggle with India*, HarperCollins, New Delhi, 2011.
10. Turner, Graham, *Catching Up with Gandhi*, Penguin, New Delhi, 2010.

اکائی 14۔ چمپارن اور کھیڑا

(Champaran and Kheda)

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 چمپارن تحریک

14.2.1 پس منظر

14.2.2 تین کٹھیا نظام

14.2.3 کانگریس کا کلکتہ اجلاس

14.2.4 گاندھی کا پٹنہ اور مظفر پور کا سفر

14.2.5 گاندھی کی گرفتاری، مقدمہ اور رہائی

14.2.6 تحقیقات کا آغاز

14.2.7 تحریک کی کامیابی

14.3 کھیڑا تحریک

14.3.1 پس منظر

14.3.2 تحریک کا آغاز

14.3.3 تحریک کا اختتام

14.4 اکتسابی نتائج

14.5 کلیدی الفاظ

14.6 نمونہ امتحانی سوالات

14.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید (Introduction)

پچھلی اکائی میں آپ نے مہاتما گاندھی کی ابتدائی زندگی، ان کے جنوبی افریقہ پہنچنے اور وہاں ہندوستانیوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کے بارے میں پڑھا۔ اس اکائی میں ہم مہاتما گاندھی کے جنوبی افریقہ سے واپس لوٹنے کے بعد سے لے کر ہندوستان میں ان کی پہلی سیاسی مہمات یعنی چمپارن اور کھیرا کے بارے میں پڑھیں گے۔ جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے کئی انوٹھے اور انوکھے طریقے عمل میں لائے۔ اس میں سب سے اہم پر امن احتجاج، عدم تعاون اور غیر متشدد ستیا گرہ تھے۔ ہندوستان میں اپنی مزاحمتی تحریک کے دوران گاندھی نے ان کا بخوبی اور کامیاب استعمال کیا۔ اس ضمن میں ان کے سب سے اہم اور کامیاب تجربات چمپارن، احمد آباد اور کھیڑا تھے، جن کے بارے میں ہم اس اکائی میں تفصیل سے جانیں گے۔ ہندوستان کا سیاسی ماحول جنوبی افریقہ کی سیاست سے یکسر مختلف تھا جہاں مہاتما گاندھی کا مقابلہ پہلے خود مختار بویر ریاستوں کے باشندوں کے ساتھ تھا اور برطانوی حکمراں ان کے دشمن نہ ہو کر ان سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ہندوستان میں صورتحال مختلف تھی یہاں ان کا مقابلہ ایک جابرانہ نوآبادیاتی حکومت کے ساتھ تھا اور یہ حکومت کوئی اور نہ ہو کر خود برطانوی حکومت تھی۔ چمپارن، بہار میں ایک مقام تھا اور ہندوستان کے مشرق میں واقع تھا جبکہ کھیڑا گجرات میں پڑتا تھا جو کہ ہندوستان کا مغربی علاقہ تھا۔ اس طرح سے گاندھی نے ہندوستان کے دو مختلف علاقوں سے ہندوستان میں اپنی سیاست کا آغاز کیا۔ چمپارن کے کسانوں کا مدعا یہ تھا کہ وہ نیل اگانا نہیں چاہتے تھے جبکہ انہیں اس پر زبردستی مجبور کیا جارہا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے انہیں کھانے کے لیے اناج کم پڑ جارہا تھا جبکہ انہیں نیل کی فصل کے بدلے مناسب دام بھی نہیں دیے جارہے تھے۔ دوسری طرف کھیڑا کے کسان اپنا لگان ادا کرنے سے عاجز تھے کیونکہ ان کے علاقے میں سوکھا پڑنے کی وجہ سے فصل برباد ہوگئی تھی اور بھکمری پھیل گئی تھی۔ مہاتما گاندھی نے ان دونوں تحریکوں کو اپنے طریقے سے کس طرح کامیاب بنایا وہ آپ اسے اکائی میں جانیں گے اور انہی دونوں تحریکوں کی کامیابی کے بعد انہیں ایک مقبول کل ہند عوامی لیڈر کی حیثیت حاصل ہوئی۔

14.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- گاندھی کے چمپارن اور کھیڑا تحریک میں اہم کردار کو سمجھ سکیں گے۔
- چمپارن تحریک کے پس منظر، تین کٹھیا نظام اور باغان مالکوں کے ظلم واستحصال سے واقف ہو سکیں گے۔
- چمپارن تحریک کے آغاز اور کامیابی پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- کھیڑا تحریک کے پس منظر، آغاز اور اختتام کو جان سکیں گے۔
- ان تحریکوں کے گاندھی کی آئندہ سیاسی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوئے، تجزیہ کر سکیں گے۔

14.2 چمپارن تحریک (The Champaran Movement)

14.2.1 پس منظر (The Context)

1915 میں جنوبی افریقہ سے واپس آکر اب تک گاندھی جی ہندوستان کے حالات کے مطالعہ ہی میں مصروف تھے اور ہندوستان کی سیاسی تحریک کو اپنی مخصوص راہ پر چلانے کا فیصلہ کر لینے کے باوجود انہیں اس پر عمل پیرا ہونے کا کوئی موقع دستیاب نہ ہوا تھا لیکن حسنِ اتفاق سے لکھنؤ کانگریس کے دوران میں ان کی ملاقات چمپارن کے ایک کسان راجکمار شکلا سے ہوئی، جس نے انہیں چمپارن آنے کی دعوت دی۔ گاندھی جی کی زندگی کے دوسرے اہم واقعہ کو بیان کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں چمپارن کے متعلق بھی چند ضروری باتوں کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ چمپارن صوبہ بہار کے ترہٹ ڈویزن کا ایک ضلع تھا جسے اب مشرقی اور مغربی چمپارن میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ کمشنر کے صدر مقام کا نام موتی ہاری تھا۔ صوبہ بہار کے دوسرے حصوں کی طرح اس ضلع کی اراضی بھی وہاں کے بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت تھی۔ 1917ء سے قبل زمیندار نہایت سخت شرائط پر کسانوں کو زمین دیا کرتے تھے اور جب چاہتے تھے انہیں بے دخل کر دیتے تھے۔ نیز کسانوں میں جہالت اور فاقہ کشی عام تھی۔ انیسویں صدی کے وسط میں بعض زمینداروں نے اپنی عیش پسندی کی بدولت مقروض ہو جانے کے باعث اپنی اراضی کو یا تو انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا یا رہن رکھ دیا تھا۔ بہار کے سب سے بڑے زمیندار گھرانے بیتیہ کے زمین داروں نے ان کو پٹے پر زمینیں دیں تھیں۔ 19 ویں صدی کے آغاز میں یورپی مالکوں نے نیل کے فارم اور کارخانے چمپارن ضلع میں قائم کیے تھے۔ زمین کے یہ نئے سفید مالک نیل کی کاشت کو زیادہ نفع بخش سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایسے طریقے رائج کیے جن کی وجہ سے کاشتکار اراضی کے مقررہ حصے میں نیل کی کاشت پر مجبور ہو گئے۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ برطانوی فارموں کی بہتر زمینیں ہل بیل اور مقامی مزدوروں کے ذریعے جوتی یا بوئی جاتی تھی اور ان مزدوروں کو براہ راست کارخانے، اس کام پر لگائے ہوئے تھے۔ دوسرا طریقہ جس کے تحت اکثر نیل کی کاشت کی جاتی تھی وہ تین کٹیا تھا۔

14.2.2 تین کٹھیا نظام (Tin Kathiya System)

ابتدا میں نیل کی لازمی کاشت کے لیے زیر کاشت اراضی کے حصوں میں سے $\frac{5}{20}$ حصے مقرر کیے تھے لیکن کسانوں کی ناراضگی کے پیش نظر 1867ء میں انہیں گھٹا کر حصے کر دیا گیا تھا۔ چونکہ بہار میں ایک ایکڑ کے $\frac{1}{20}$ حصہ کو 'کٹھیہ' کہتے ہیں اس لیے یہ نیا نظام 'تن کٹھیا' کہلاتا تھا۔ اس طریقے کے ماتحت کسان اپنی زمین کا $\frac{3}{20}$ حصہ جو علی العموم بہترین حصہ ہوتا تھا کارخانے کی دیکھ ریکھ میں نیل کی کاشت کے لیے مخصوص کر دیتا تھا۔ کارخانہ ساری پیداوار کو مقررہ اور عام طور پر غیر منافع بخش قیمت پر خرید لیتا تھا۔ اس ایک طرفہ انتظام کو قانونی معاہدوں کا لبادہ اوڑھا دیا جاتا تھا جس پر تہدید و ترغیب کے ذریعے کسانوں سے دستخط کرا لیے جاتے تھے۔ یہ باغ مالک، نیل کی کاشت کرانے کے لیے کسانوں کو ساڑھے چھ روپیہ فی ایکڑ کے حساب سے پیشگی رقم بھی دیا کرتے تھے۔ لیکن 1867ء میں حکومت کے اصرار پر اس رقم کو نو روپیہ ایکڑ کر دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود کسان مطمئن نہ ہو سکے۔ اور 1897ء میں اس رقم کو بارہ روپیہ اور 1909ء میں ساڑھ تیرہ روپیہ فی ایکڑ دینا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی کسانوں سے یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ نیل کے زیر کاشت اراضی کے لیے ان سے لگان نہیں لیا جائے گا لیکن یہ وعدہ پورا

نہیں کیا گیا۔

انگریز تاجروں کے لیے نیل کی کاشت اس درجہ نفع بخش ثابت ہوئی کہ 1892ء اور 1899ء کے درمیان کسانوں کو مجبور کر کے ہر سال کم بیش 9597 ایکڑ میں نیل کی کاشت کرتے رہے۔ کسانوں کی درخواستوں سے اور اور کبھی کبھار کے تشدد سے جو بات حاصل نہ ہو سکی اسے جرمن صنعت نے بیسویں صدی کے آغاز میں کر دکھایا۔ جب جرمنی سے مصنوعی نیل آنے لگا تو چمپارن میں نیل کی کاشت بھی کم ہونے لگی۔ مصنوعی نیل نے فطری نیل کو بازار سے باہر کر دیا۔ چمپارن ضلع میں نیل کی کاشت 1892 سے 97 کے درمیان 91 ہزار ایکڑ سے گھٹ کر 1905ء میں 47800 ایکڑ اور 1914 میں صرف 8100 ایکڑ رہ گئی۔ باغ مالکوں نے مجبور اکسانوں کے پرانے معاہدے کے تحت نیل کی کاشت کرنے کی ذمہ داری اٹھالی اور ایسا کرنے میں انہوں نے نیل کاشت نہ کرنے کا معاوضہ یا خسارہ بھی لیا۔ لگان بڑھ گئے۔ عام طور سے 60 فیصد کے قریب اضافہ ہو گیا۔ لگان بڑھانے کے علاوہ باغ مالک کسانوں سے نقد و جنس کی شکل میں بہت سی غیر قانونی وصولیاں کرنے لگے۔ ان سے ایسی نہروں سے پانی لینے کا ٹیکس لیا جاتا جن کا وجود بھی نہیں تھا۔ باغ مالک ہاتھی مکان یا کار خریدتا تو کسانوں کو اس میں بھی حصہ رسدی دینا پڑتا۔ قانونی طور سے جائز وراثت کو تسلیم کروانے کے لیے بھی انہیں موت ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ ان میں سے بھی غیر قانونی رقمیں ہندوستانی زمیندار بھی وصول کر لیا کرتے تھے لیکن ہندوستانی زمینداروں کا حکام پر اس کا آدھا بھی اثر نہیں تھا جتنا یورپی باغ مالکوں کا تھا۔ اس لیے زمیندار کسانوں کا خون کم چوس پاتے تھے۔ ایسی بھی مثالیں تھیں کہ یورپی باغ مالکوں اور ان کے ایجنٹوں نے کسانوں کو برسر عدالت زد و کوب کیا۔۔ چونکہ یہ کاشت چونکہ خود کسانوں کے لیے نفع بخش نہیں تھی اس لیے وہ کسی زمانے میں بھی اسے خوشی کے ساتھ انجام دینے پر رضامند نہ ہو سکے۔ کسانوں کی بے چینی 1867 کی طرح بعض اوقات ایک بے بس غصے کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ باغ مالکوں کا صوبائی حکومت اور ضلعی حکام پر جو اثر و رسوخ تھا اور مقدمات میں جو تاخیر اور خرچے ہوتے تھے، ان سب کی وجہ سے کسانوں کو انصاف پانے کی امید نہیں رہ جاتی تھی۔ جنگ عظیم اول شروع ہو جانے کے باعث چونکہ جرمنی سے نیل آنا بند ہو گیا تھا، اس لیے ان انگریز تاجروں کی قسمت پھر جاگ اُٹھی۔ چنانچہ 1916ء میں 21900 ایکڑ میں نیل کی کاشت کی گئی اور 1917ء میں اس کی پیمائش 26884 ایکڑ تک پہنچ گئی۔ اس کے باوجود جہاں تک کسانوں کا تعلق تھا انہیں کوئی رعایت حاصل نہیں ہوئی۔ وہ زیر کاشت رقبہ کے پانچویں حصے میں نیل کی کاشت کرنے پر مجبور تھے۔ ان سے اس رقبہ کا لگان بھی وصول کیا جاتا تھا۔ اپنی اس کاشت کے لیے زمینداروں کی مقرر کی ہوئی رقم لینے پر مجبور تھے اور انہیں ہر ممکن طریقے پر مرعوب اور کمزور کیا جاتا تھا۔

14.2.3 کانگریس کا کلکتہ اجلاس (The Calcutta Session of the Congress)

کافی دنوں سے چمپارن ضلع میں زرعی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ نیل کے کارخانوں کے یورپی مالکوں اور ہندوستانی کسانوں کے تعلقات میں جو کھنچاؤ تھا اس کو نسلی عنصر نے اور بھی ہوا دی۔ انڈین نیشنل کانگرس کے کلکتہ اجلاس منعقدہ دسمبر 1917 میں گاندھی جی بھی موجود تھے اور وہاں چمپارن کی بے چینی بھی زیر بحث آئی تھی۔ ان سے اس بحث میں حصہ لینے کو کہا گیا لیکن انہوں نے اس لیے انکار کر دیا کہ اس کے بارے میں انہیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ان کے لیے ابھی تک چمپارن ہندوستان کے نقشے پر صرف ایک نقطے کی حیثیت رکھتا

تھا۔کانگریس کے اجلاس کے بعد چمپارن کے ایک کسان راجکمار شکلا نے گاندھی سے درخواست کی کہ وہ چمپارن تشریف لائیں اور وہاں کی صورتحال اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔شکلا سے انہیں برج کشور پرشاد وکیل نے ملوایا جو بہار میں قومی کاموں کے روح رواں تھے۔شکلہ اپنی دھن کے پکے تھے۔وہ ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک گاندھی کے پیچھے لگے رہے اور انہیں اپنے ساتھ چمپارن لاکر اس مسئلے کے روبرو لا کھڑا کیا جو تقریباً ایک صدی سے باغات کے مالکوں اور کسانوں کے تعلقات خراب کیے ہوئے تھا۔

راجکمار شکل اور بابو برج کشور پرشاد، چمپارن کے کسانوں پر برپا ہونے والے ان مظالم کے خلاف کانگریس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے لکھنؤ آئے تھے۔جب ان لوگوں کی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی تو انہوں نے گاندھی جی سے تمام حالات بیان کرنے کے بعد اس معاملہ میں امداد کرنے کی درخواست کی لیکن انہوں نے جواب دیا کہ جب تک میں بچشم خود تمام حالات کو نہیں دیکھ لوں اس معاملے میں کوئی رائے ظاہر نہیں کر سکتا۔ان کے جواب کے بعد انہیں چمپارن آنے کی دعوت دی گئی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔اس سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے کہ 'سچ پوچھیے تو اس وقت تک مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ چمپارن کہاں ہے بلکہ میں نے اس کا نام تک نہیں سنا تھا۔'

14.2.4 گاندھی کا پٹنہ اور مظفر پور کا سفر (Gandhi's Travels to Patna and Muzaffarpur)

بہرحال کانگریس کے اس اجلاس میں بابو برج کشور پرشاد نے اہل چمپارن سے ہمدردی کی جو قرارداد پیش کی تھی وہ باتفاق رائے منظور ہو گئی۔گاندھی جی نے چمپارن جانے کے سلسلے میں جو وعدہ کیا تھا وہ اسے اپریل میں پورا کر سکے۔اس سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے کہ 'میں کلکتہ میں بپن بابو کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ راجکمار پہلے سے وہاں موجود ہیں۔غرض اس بے پڑھے لکھے بھولے بھالے مگر دھن کے پکے کسان نے مجھے گرفتار ہی کر لیا' اس طرح وہ سب سے پہلے پٹنہ پہنچ کر راجکمار کی رہنمائی میں بابو راجندر پرشاد کی کوٹھی پر پہنچے۔لیکن اول تو موصوف مکان پر موجود ہی نہیں تھے۔دوسرے وہ گاندھی جی سے واقف بھی نہیں تھے،اس لیے کسی نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔وہ لکھتے ہیں کہ 'بنگلہ میں دو تین نوکر تھے جنہوں نے ہماری بات تک نہیں پوچھی،میرے پاس تھوڑا بہت کھانے کا سامان موجود تھا۔مجھے کھجوروں کی ضرورت تھی جو میرے دوست نے بازار سے لادیں۔بہار میں چھوت چھات کا زور تھا۔بابو راجندر پرشاد کے نوکر اس کے روادار نہیں تھے کہ جس وقت وہ کنویں کے پاس موجود ہوں میں پانی بھروں۔گاندھی جی اپنے برطانیہ کے قیام کے زمانے نیز بمبئی کانگریس کے موقع پر پٹنہ کے مشہور قوم پرست مسلمان مظہر الحق بیرسٹر سے مل چکے تھے اور سندھ میں ان کی ملاقات اچاریہ کرپلانی سے بھی ہو چکی تھی۔کرپلانی نے اس زمانے میں مظفر پور کے گورنمنٹ کالج سے استعفیٰ دیا تھا،لیکن مظفر پور ہی میں مقیم تھے۔گاندھی جی نے مظہر الحق کو پٹنہ میں اپنی موجودگی کی اطلاع دی۔وہ خود ان سے ملنے اور انہیں اپنے یہاں لے جانے کے لیے آئے لیکن چونکہ گاندھی جی اس سفر میں دو تین روز سے زیادہ صرف نہیں کرنا چاہتے تھے،اس لیے انہوں نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا اور ان سے مشورہ کرنے کے بعد چمپارن جانے کے لیے اسی شام کو مظفر پور روانہ ہو گئے۔گاندھی جی نے اچاریہ کرپلانی کو تار کے ذریعے سے اپنے مظفر پور آنے کی اطلاع دے دی تھی۔اسٹیشن سے کرپلانی جی انہیں پروفیسر ملکانی کے مکان پر جہاں وہ خود مقیم تھے لے گئے۔دوسرے روز چند مقامی وکیل ان سے ملنے کے لیے آئے اور انہیں مشورہ دیا کہ آپ جس کام کے لیے یہاں آئے ہیں وہ پروفیسر ملکانی کے یہاں رہ کر نہیں ہو سکے گا،اس لیے آپ ہم لوگوں میں سے کسی کے مکان پر قیام کیجیے۔چنانچہ گاندھی جی گیا

بابو کے یہاں چلے گئے اور کچھ روز کے بعد بابو برج کشور، بابو راجندر پرشاد اور بہادر کے دوسرے قومی کارکنوں سے ان کے تعلقات بہت زیادہ وسیع ہو گئے۔

چمپارن کے کسانوں کے متعلق مقامی کارکنان سے گاندھی جی کو جو کچھ معلوم ہوا اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کے مقدمہ بازی کی بجائے انہیں کسانوں کے دل سے زمینداروں نیز نیل کی کاشت کرنے والے انگریزوں کا رعب دور کرنا چاہیے اور اگرچہ وہ دو روز ہی کے لیے چمپارن جانا چاہتے تھے، لیکن اب انہوں نے اس علاقے میں اس وقت تک ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب تک یہاں کے کسانوں کو ان کی مشکلات سے نجات حاصل نہ ہو جائے۔ گاندھی جی کے دوستوں نے انہیں ہر قسم کی امداد دینے کا یقین دلایا۔ لیکن یہ بھی کہا کہ جیل جانے پر آمادہ ہونا ہمارے لیے بالکل نئی بات ہے، لیکن ہم کوشش کریں گے کہ ہم میں اتنی ہمت پیدا ہو جائے۔ خود اپنے بیان کے مطابق گاندھی جی اس دورے میں ان شکایات کی تحقیقات کرنا چاہتے تھے جو کسانوں کو نیل کے باغان مالکوں کے خلاف تھیں، اس سلسلے میں سب سے پہلے انہوں نے باغان مالکوں کی انجمن کے سکریٹری اور ترہٹ کے کمشنر سے ملاقات کی۔ انجمن کے سکریٹری نے ان سے کہا کہ تم باہر کے آدمی ہو تمہیں ہمارے اور کسانوں کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اس کے بعد جب گاندھی جی کمشنر سے ملے تو انہوں نے گاندھی جی کو فوراً ترہٹ سے چلے جانے کا حکم دے دیا۔

14.2.5 گاندھی کی گرفتاری، مقدمہ اور رہائی (Gandhi's Arrest, Trial, and Release)

کمشنر کے اس طرز عمل کے بعد گاندھی جی کو یقین ہو گیا کہ حکومت انہیں چمپارن جانے کی اجازت نہیں دے گی اور اگر انہوں نے کسی ایسے حکم کی خلاف ورزی کی تو انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ مظفر پور کے بجائے انہیں موتی ہاری یا بٹیا میں جہاں نیل کے کسانوں کی حالت اور مقامات سے بھی بدتر تھی گرفتار ہونا چاہیے۔ اس فیصلے کے بعد وہ موتی ہاری چلے گئے اور دوسرے دن صبح کو ایک ایسے گاؤں کی طرف روانہ ہوئے جہاں کے ایک کسان کے ساتھ حال ہی میں کوئی زیادتی کی گئی تھی۔ راستے میں انہیں پولیس سپرنٹنڈنٹ کی طرف سے ایک پیغام ملا اور وہ منزلِ مقصود پر پہنچنے سے قبل ہی پیغام لانے والے شخص کے ساتھ واپس چلے آئے۔ راستے میں انہیں مجسٹریٹ کی ایک تحریر دکھائی گئی جس میں انہیں فوراً چمپارن سے رخصت ہو جانے کا حکم مندرج تھا۔ گاندھی جی نے اطلاع یابی کے طور پر لکھ دیا کہ میں اس حکم کی تعمیل نہیں کروں گا اور جب تک میری تحقیقات ختم نہیں ہو جائے گی چمپارن سے نہیں جاؤں گا۔ اس جواب کے پیشِ نظر ان کے خلاف مقدمہ قائم کر دیا گیا۔

18 اپریل 1917ء کو جب گاندھی جی کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو انہوں نے اقبالِ جرم کرنے کے بعد ایک تحریری بیان پڑھ کر سناتے ہوئے کہا کہ میں نے سرکاری حکم کی خلاف ورزی اس لیے کی ہے کہ میرے اور حکام کے نقطۂ نظر میں فرق ہے۔ میں اس علاقے میں انسانی اور قومی خدمت کے لیے آیا ہوں۔ مجھ سے ان کسانوں کی امداد کے لیے کہا گیا تھا، جن کے ساتھ باغان مالک غیر منصفانہ برتاؤ کرتے ہیں، لیکن تحقیقات کے بغیر ان کی امداد نہیں کر سکتا، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ حکومت اور ان باغان مالکوں کی امداد سے صورتحال کا مطالعہ کروں۔

میری موجودگی کشت وخون کا موجب نہیں ہو سکتی۔ موجودہ حالات میں ہر خوددار آدمی کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ قانون شکنی کرکے چپ چاپ سزا بھگتے۔ ترہت کمشنری کے کمشنر یا مجسٹریٹ نے اعلیٰ حکام کے مشورے کے بغیر ہی گاندھی کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیے تھے۔ حکومت بہار نے بعد میں (23 مئی 1917) حکومت ہند کو یہ وضاحت پیش کی کہ لیفٹیننٹ گورنران کونسل، کا خیال ہے کہ کمشنر نے گاندھی کے بارے میں ایسا طریقہ کار کرنے اور مقامی حکومت کی منظوری کے بغیر ایسے قدم اٹھانے دونوں ہی میں فیصلے کی شدید غلطی کی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اس منزل پر مسٹر گاندھی جیسے تجربہ کار شخص کو تحقیقات کرنے سے روکنا ناممکن تھا۔ کمشنر نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس سے تو عوام کی دلچسپی اور بڑھے گی اور دلوں میں یہ شبہ پیدا ہو گا کہ حکومت تحقیقات کا گلا گھونٹ دینا چاہتی ہے۔ اس لیے کمشنر اور ڈپٹی ڈسٹرکٹ آفیسر دونوں کو احکام جاری کیے گئے کہ وہ مقدمے کی مزید ساعت سے اعتراض کریں اور مسٹر گاندھی کو ہر معقول سہولت فراہم کریں لیکن انہیں یہ متنبہ بھی کر دیں کہ رعیت (کسان) ایسی حالت میں ہے کہ اسے آسانی سے بھڑکایا جا سکتا ہے۔

14.2.6 تحقیقات کا آغاز (Initiating the Investigation)

اس پہلی ہی پیشی کے چند روز بعد گورنر کے حکم سے یہ مقدمہ واپس لے لیا گیا اور گاندھی جی کو تحقیقات کی اجازت دے دی گئی۔ ایک طرف تو گاندھی جی نے نیل کے کسانوں کی شکایتوں اور تکلیفوں کی تحقیقات شروع کی اور دوسری طرف بہار کے دیہات کو دیکھنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک دیہات میں تعلیم نہیں ہو گی وہاں کوئی مستقل کام نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ جہالت کے باعث کسانوں کی حالت بہت افسوس ناک تھی۔ ان کے بچے یا تو بیکار مارے مارے پھرتے تھے یا صبح سے شام تک تیل کے کھیتوں میں دو تین پیسے روز پر کام کرتے تھے۔ ان دنوں مزدوری کی شرح ڈھائی آنے، عورتوں کے لیے ڈیڑھ آنے اور بچوں کے لیے تین پیسہ سے زیادہ نہ تھی اور جو شخص چار آنے روز کما لیتا تھا وہ بڑا خوش قسمت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے دیہات میں مدرسے کھولنے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنے مقامی ساتھیوں، احمد آباد آشرم کے بعض رہنے والوں نیز انجمن خدام ہند کے چند کارکنوں کی امداد سے چمپارن کے دیہات میں تعلیم، حفظان صحت اور ذہنی تربیت کا کام شروع کر دیا، لیکن ان کی دیگر غیر متوقع مصروفیتوں کے باعث یہ کام زیادہ عرصہ تک نہ چل سکا۔

ابھی گاندھی جی کسانوں کی شکایتوں کی تحقیقات میں مصروف ہی تھے کہ گورنر نے ایک خط کے ذریعے سے انہیں اس تحقیقات کو جلد از جلد ختم کر دینے کی ہدایت کی۔ اس کے جواب میں گاندھی نے لکھا کہ اگر حکومت چاہتی ہے کہ یہ تحقیقات بند کر دی جائے تو اس کی آسان تدبیر یہ ہے کہ یا تو حکومت کسانوں کی شکایتوں کو تسلیم کرکے انہیں دور کرانے کی کوشش کرے یا کم سے کم ان کے بیانات کو قابل توجہ سمجھ کر فوراً ایک سرکاری تحقیقاتی کمیشن مقرر کر دے۔ گورنر نے گاندھی جی کی تجویز کے دوسرے حصے کے مطابق ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی۔ خود گاندھی جی بھی اس کمیٹی کے ایک رکن تھے۔ انہوں نے یہ رکنیت ان شرائط پر منظور کی تھی کہ

1. دورانِ تحقیقات میں وہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر سکیں گے
2. حکومت اس بات کو تسلیم کرے کہ کمیٹی کے کارکن ہوتے ہوئے بھی وہ کسانوں کے پیروکار سمجھے جائیں گے
3. اگر وہ کمیٹی کی تحقیقات کے نتیجے سے مطمئن نہ ہو سکے تو وہ کسانوں کو ان کے آئندہ طرز عمل کے متعلق مشورہ دے سکیں گے۔

14.2.7 تحریک کی کامیابی (Success of the Movement)

کمیٹی نے کسانوں کے موافق رپورٹ دی اور یہ تجویز کی کہ نیل کے تاجروں نے کمیٹی کی رائے میں کسانوں سے جو رقوم ناجائز طور پر وصول کی ہیں ان کا کچھ حصہ واپس دلایا جائے اور تن کٹھیا کا طریقہ منسوخ کر دیا جائے۔ حکومت نے مذکورہ بالا سفارشات کے پیشِ نظر ایک قانون منظور کر کے ان سفارشات کو عملی جامہ پہنا دیا اور گاندھی جی کے الفاظ میں 'اس طرح تن 'کٹھیا' کا وہ طریقہ جو سو سال سے جاری تھی منسوخ ہو گیا۔'

14.3 کھیڑا تحریک (The Kheda Movement)

14.3.1 پس منظر (The Context)

کھیڑا گجرات کا ایک ضلع ہے۔ یہ ضلع کم و بیش چھ سو مواضعات پر مشتمل ہے اور تھوڑے سے ریتیلے حصے کو چھوڑ کر باقی تمام ضلع زرخیز تصور کیا جاتا ہے۔ 1917ء کے موسم برسات میں بارش کی کثرت کے باعث اس ضلع کی فصل بالکل برباد ہو گئی تھی۔ لگان کی وصولیابی کے سلسلے میں ایک قاعدہ یہ ہے کہ اگر فصل کسی وجہ سے پچیس فیصدی سے کم ہو تو کاشتکار سال رواں کے لگان کی معافی کی درخواست کر سکتا ہے۔ کھیڑا کے کسانوں کی رائے تھی کہ فصل ایک چوتھائی سے بھی کم ہے لیکن حکومت کے کارندے اسے پچیس فیصدی سے زیادہ قرار دیتے تھے۔ اس زمانے کے بعض ذمہ دار گجراتی رہنما جن میں مسٹر وٹھل بھائی پٹیل بھی شامل تھے، کمشنر نیز بمبئی کی حکومت کو اس معاملے پر توجہ دلا چکے تھے، لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ اس معاملے پر غور کرنے کے لیے سردار ولبھ بھائی پٹیل کے مکان پر ایک چھوٹا سا مشاورتی جلسہ منعقد کیا گیا جس میں گاندھی جی بھی شریک ہوئے۔ سر گوکل داس پارکھ اور مسٹر وٹھل بھائی پٹیل اس وقت قانون شکنی کے مخالف تھے لیکن گاندھی جی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ کسانوں کو عدم ادائیگی لگان کی مہم شروع کرنے کا مشورہ دیں گے۔

14.3.2 تحریک کا آغاز (Beginning of the Movement)

اس فیصلے کے بعد سب سے پہلے انہوں نے اپنے معتمدین کی معرفت از سر نو حالات کی تحقیقات کرائی اور جب انہیں شکایت کی صحت کا یقین ہو گیا تو انہوں نے خطوط کے ذریعے سے نیز ذاتی طور پر ملاقات کر کے حکام کو یہ مشورہ دیا کہ وہ لگان کی دوسری قسط وصول نہ کریں۔ لیکن انہیں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے کسانوں سے لگان ادا نہ کرنے کے حلف نامہ پر دستخط لے کر عدم ادائیگی لگان کی مہم شروع کر دی۔ ابتداء میں حکومت محض کسانوں کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کو قرق اور نیلام کرنے ہی پر اکتفا کرتی رہی، لیکن کچھ عرصے کے بعد اس نے فصلیں قرق کرنے کے علاوہ کسانوں کو یہ اطلاع بھی دینی شروع کر دی کہ اگر انہوں نے مقررہ تاریخ تک لگان ادا نہ کیا تو ان کی اراضی کو بھی ضبط کر لیا جائے گا۔ اس دھمکی سے متاثر ہو کر خوشحال کسانوں نے لگان ادا کرنا شروع کر دیا۔ یہ حال دیکھ کر کسانوں کی ہمت بڑھانے کے لیے گاندھی نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ فصل کی قرقی کے باوجود کھیتوں سے پیاز اٹھا لائیں۔ اس سلسلے میں چند لوگوں کو گرفتار کر کے ایک ایک ماہ کی سزا بھی دی گئی لیکن چونکہ کسان ہمت ہار چکے تھے اس لیے گاندھی جی باعزت سمجھوتہ کی کوئی راہ تلاش کرنے لگے۔

14.3.3 تحریک کا اختتام (End of the Movement)

گاندھی جی نے ستیہ گرہ کا جو حلف نامہ مرتب کیا تھا اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اگر حکومت لگان کی وصولیابی ملتوی کر دے گی تو خوشحال کاشتکار اپنا لگان ادا کر دیں گے۔ ستیا گرہ کی تحریک کے دوران میں انہیں ایک سرکاری افسر کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی کہ اگر خوشحال کسان اپنا لگان ادا کر دیں گے تو غریب کسانوں کو لگان معاف کر دیا جائے گا۔ یہ اطلاع موصول ہونے کے بعد جب گاندھی جی کلکٹر سے ملے تو اس نے نہایت سرد مہری کے ساتھ ان سے کہا کہ میں پہلے ہی اس سلسلے میں ضروری احکام دے چکا ہوں۔ گاندھی جی نے لکھا ہے کہ کلکٹر نے اس طرح گفتگو کی کہ گویا اس نے جو کچھ کیا ہے وہ کسی سمجھوتے کے ماتحت نہیں بلکہ اپنی مرضی سے کیا ہے۔ ان احکام کے پیش نظر انہوں نے عدم ادائیگی لگان کی اس مہم کو ختم کر دینے کا اعلان کر دیا اور اسے فریقین کی فتح سے تعبیر کیا۔

14.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

جنوبی افریقہ سے واپس آنے کے بعد مہاتما گاندھی نے چمپارن اور کھیرا میں تحریک چلائی۔ دونوں جگہ انہوں نے کسانوں کے حق میں آواز بلند کی اور ان کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کو اجاگر کیا۔ گاندھی کے پر امن احتجاج اور ستیا گرہ کے طریقے نے برطانوی انتظامیہ کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ اپنی شرائط نرم کرے اور کسی سمجھوتے پر پہنچا جا سکے۔ اس طرح سے یہ گاندھی کی آئندہ تحریک کے لیے ابتدائی مشق تھی جس سے انہوں نے کئی اہم سبق حاصل کیے۔ کھیڑا میں ان کی کامیابی قدرے مشکل رہی لیکن اس سے انہوں نے گجرات کے کسانوں کے درمیان ایک خود اعتمادی اور اور اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ یہ بھی ایک اہم بات تھی کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران گاندھی کسی بھی صورت میں حکومت سے کوئی بڑا ٹکراؤ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جنگ عظیم میں ہندوستانیوں کی مدد کے بدلے برطانوی حکومت از خود ہی ہندوستانیوں کو حکومت خود اختیاری سے نواز دے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ خیال آگے چل کر غلط ثابت ہوا۔ بجائے اس کے کہ حکومت احسان تسلیم کرتی اس نے 1919 میں رولٹ ایکٹ کی صورت میں ایک کالا قانون ہندوستانیوں کے سروں پر نافذ کر دیا جس کے خلاف ملک گیر سطح پر احتجاج اور آواز بلند ہوئی۔ اس ایکٹ کے آنے سے گاندھی کو بھی ایک شدید دھچکا پہنچا۔ برطانوی حکومت کے بارے میں ان کا حسن ظن قطعی طور پر کافور ہو گیا۔ اپنی زندگی کی آئندہ تحریکوں میں انہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بھرپور مزاحمت کرنے کا عہد کیا جس کا مظاہرہ ہمیں خلافت اور عدم تعاون تحریک، عام نافرمانی تحریک اور ہندوستان چھوڑو تحریک کی صورت میں دیکھنے کو ملتا ہے جن کو کہ آپ آئندہ اکائیوں میں تفصیلی طور پر پڑھیں گے۔

14.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

تین کٹھیا نظام	:	ایسا نظام جہاں کسان کو اپنی زمین کے 3/20 حصے پر نیل بونے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔
نیل	:	ایک پودھا جسے کپڑے کو رنگنے اور سفید کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

14.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

14.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. چمپارن کہاں واقع ہے؟
2. کھیڑا کہاں واقع ہے؟
3. چمپارن میں کس چیز کی کاشت پر کسان پریشان تھے؟
4. گاندھی کو کس نے چمپارن آنے کے لیے راضی کیا؟
5. کانگریس کے کس سیشن میں چمپارن کے کسانوں کے حق میں قرارداد منظور ہوئی؟
6. گاندھی کو کہاں جانے سے روکا گیا؟
7. گاندھی کی گرفتاری کے احکامات کس نے دیے؟
8. کیا تین کٹھیا نظام، تحریک کے چلتے ختم کر دیا گیا؟ ہاں/نہیں
9. کھیڑا کے کسان لگان معافی کیوں چاہتے تھے؟
10. کھیڑا میں گاندھی نے کون سا احتجاجی طریقہ آزمایا؟

14.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. چمپارن تحریک کے پس منظر پر نوٹ لکھیے۔
2. کلکتہ اجلاس پر نوٹ لکھیے۔
3. گاندھی جی کے پٹنہ اور مظفر پور کے سفر پر نوٹ لکھیے۔
4. گاندھی کی گرفتاری، مقدمے اور رہائی پر نوٹ لکھیے۔
5. چمپارن تحریک کے سلسلے میں تحقیقات کے آغاز پر نوٹ لکھیے۔

14.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. چمپارن تحریک پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. کھیڑا تحریک پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. تین کٹھیا نظام پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

14.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Bhana, Surendra, and Goolam Vahed, *The Making of a Political Reformer*: *Gandhi in South Africa*, *1893–1914*, Manohar, New Delhi, 2005.
3. Chandra, Bipan, et al., *India's Struggle for Independence*, *1857-1947*, Penguin Books, New Delhi, 1989.
4. Gandhi, Rajmohan, *Mohandas*: *A True Story of a Man, His People and an Empire, Penguin, New Delhi, 2006.*
5. Guha, Ramachandra, *Gandhi*: *The Years that Changed the World*, *1914–1948*, Penguin, Gurgaon, 2006.
6. Guha, Ramachandra, *Gandhi before India*, Penguin, Gurgaon, 2013.
7. Hardiman, David, *Gandhi: In His Times and Ours*, Permanent Black, Delhi, 2003.
8. Kripalani, J.B., *Gandhi*: *His Life and Thought*, Publications Division, Government of India, 2019 (first pub in 1970).
9. Lelyveld, Joseph, *Great Soul*: *Mahatma Gandhi and His Struggle with India*, HarperCollins, New Delhi, 2011.
10. Turner, Graham, *Catching Up with Gandhi*, Penguin, New Delhi, 2010.

اکائی 15۔عدم تعاون تحریک

(Non-Cooperation Movement)

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 عدم تعاون تحریک کے ظہور کے اسباب

15.3 عدم تعاون تحریک: کلکتہ اجلاس سے ناگپور اجلاس تک

15.4 عدم تعاون تحریک کے اہم مراحل

15.4.1 پہلا مرحلہ

15.4.2 دوسرا مرحلہ

15.4.3 تیسرا مرحلہ

15.4.4 تحریک سے متعلق عوامی رد عمل

15.4.5 ریاستی جبر

15.4.6 تحریک کا پھیلاؤ اور اس کے مقامی تغیرات

15.4.7 تحریک کا آخری مرحلہ

15.5 عدم تعاون تحریک سے دستبرداری کی وجوہات

15.6 تحریک کے اثرات

15.7 اکتسابی نتائج

15.8 کلیدی الفاظ

15.9 نمونہ امتحانی سوالات

15.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید (Introduction)

عدم تعاون تحریک ایک سیاسی مہم تھی جس کے ذریعے ایم۔ کے۔ گاندھی نے ہندوستانیوں کو برطانوی حکومت سے اپنا تعاون واپس لینے کی ہدایت دی۔ اس تحریک میں ایم۔ کے۔ گاندھی نے عدم تشدد اور عدم تعاون پر مبنی جدوجہد کی تکنیک کو قومی سطح پر اپنایا۔ اس تحریک کو وائسرائے کے نام گاندھی کے بھیجے ہوئے 22 جون والی نوٹس کے بعد یکم اگست 1920 کو شروع کیا گیا تھا۔ اس تحریک کے ذریعے گاندھی نے اس بات پر زور دیا تھا کہ 'کسی حکمران کے ساتھ تعاون سے انکار کرنا رعایا کا تسلیم شدہ حق ہے۔' لہذا، یکم اگست 1920 کو کانگریس نے برطانوی حکومت کے ساتھ عدم تعاون کا آغاز کیا، اور اسی دن بال گنگادھر تلک کی وفات کی وجہ سے اس تحریک کی قوت رفتار میں اضافہ ہوا۔

15.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- عدم تعاون تحریک کے ظہور کے اسباب جان سکیں گے۔
- عدم تعاون تحریک کے عروج وارتقا کے بارے میں علم حاصل کر سکیں گے۔
- عدم تعاون تحریک کی قیادت سے واقف ہو سکیں گے۔
- عدم تعاون تحریک کے عوامی ردعمل کو جان سکیں گے۔
- علاقائی تغیرات اور اس تحریک کے اثرات کا تجزیہ کر سکیں گے۔

15.2 عدم تعاون تحریک کے ظہور کے اسباب

(Reasons for the Emergence of Non-Cooperation Movement)

بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اواخر میں ہندوستانی رائے عامہ برطانوی راج سے کافی نالاں تھی۔ رولٹ ایکٹ، جلیانوالہ باغ قتل عام، پنجاب میں مارشل قانون اور ترکی کے ساتھ ہوئی ناانصافیوں نے انگریزوں کے تمام فراخدلانہ وعدوں کو جھٹلایا۔ مون ٹیگ چیمسفورڈ اصلاحات (1919) کے ذریعے پیش کی گئی دوعملی حاکمیت (Dyarchy) کی اسکیم سے صرف چند لوگ مطمئن ہوئے۔ ہندوستانی مسلمان برطانوی راج سے اس وقت بددل ہو گئے جب انہیں معلوم ہوا کہ جنگ کے بعد ترکی کے ساتھ فراخدلانہ سلوک کی یقین دہانیوں کے ذریعے ان کی وفاداری خریدی گئی تھی۔ دراصل یہ وہ وعدہ تھا جو کہ برطانوی سیاستدانوں کو پورا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ان وجوہات کو مندرجہ ذیل سطور میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے:

- پہلی جنگ عظیم کے بعد روزمرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہوا جس کی وجہ سے عام لوگ سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ درآمدات کا حجم، جو پہلی جنگ عظیم کے دوران کم ہوا تھا، جنگ ختم ہونے کے بعد دوبارہ بڑھ گیا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستانی صنعتوں کو کافی نقصان ہوا، پیداوار میں کمی واقع ہوئی، متعدد کارخانے بند ہو گئے اور مزدوروں کی آمدنی پر برا اثر پڑا۔ کسان طبقہ بھی ٹیکسوں کے بھاری بوجھ

تلے دب رہا تھا۔ اس طرح، جنگ کے بعد ملک کی معاشی صورتحال تشویشناک ہو چکی تھی۔ مزید برآں، سیاسی میدان میں قوم پرست رہنما اس وقت مایوس ہو گئے جب انگریزوں نے عوام کے لیے جمہوریت اور خود مختاری کا نیا دور لانے کا وعدہ پورا نہ کیا، جس سے ہندوستانیوں کے انگریز مخالف رویے کو تقویت مل گئی۔

- دوسری اہم وجہ رولٹ قانون ہے۔ یہ قانون مارچ 1919 میں پاس کیا گیا۔ یہ قانون حکومت کو یہ اختیار بخشتا تھا کہ وہ عدالت میں بغیر مقدمہ چلائے کسی بھی شخص کو قید کر سکتا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد قوم پرست رہنماؤں کو اپنے دفاع کا موقع دیے بغیر قید کرنا تھا۔ گاندھی نے ستیہ گرہ کے ذریعے اس کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا۔ مارچ اور اپریل 1919 میں ہندوستان میں ایک غیر معمولی سیاسی بیداری وجود میں آچکی تھی، اور رولٹ ایکٹ کے خلاف متعدد احتجاج اور مظاہرے کیے گئے۔
- اسی دور میں امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں برطانوی سامراج نے اپنی بربریت کا مظاہرہ کیا۔ 13 اپریل 1919 کو جلیانوالہ باغ میں ایک غیر مسلح ہجوم، اپنے مقبول رہنماؤں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے جمع ہوا تھا۔ امرتسر کے فوجی کمانڈر جنرل ڈائر نے اپنے فوجیوں کو غیر مسلح ہجوم پر بغیر کسی انتباہ کے گولی چلانے کا حکم دیا۔ سینکڑوں مارے گئے اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے۔ اس سانحہ نے پوری دنیا کو چونکا دیا، اور مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے احتجاج کے طور پر اپنا نائٹ ہڈ اعزاز (Knighthood Award) چھوڑ دیا۔
- آئینی اصلاحات یعنی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 نے بھی ہندوستان کے قوم پرستوں کو مزید مایوس کر دیا، کیونکہ یہ اصلاحات لوگوں کی بڑھتی ہوئی مانگوں جیسے حصول سوراج (attainment of Swaraj) وغیرہ، کو پورا کرنے میں ناکام رہیں۔ اکثر رہنماؤں نے ان اصلاحات کو مایوس کن اور غیر تسلی بخش قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی۔
- مسلمان ترکی کے خلیفہ کو اپنا روحانی سربراہ مانتے تھے۔ جب 1920 میں ترکی کو مختلف اطراف میں اپنی وسیع اراضی سے محروم کیا گیا اور خلیفہ کے اقتدار کو مجروح کیا گیا، تو ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کی مذمت کی۔ انہوں نے اس مقدس ادارے کی بحالی کے لیے خلافت تحریک شروع کی۔ 1920 کے ابتدائی مہینوں میں خلافت رہنماؤں کو واضح طور پر کہا گیا تھا کہ انہیں مزید کسی چیز کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ مئی 1920 میں ترکی کے ساتھ ہوئے سیورز معاہدے نے یہ واضح کر دیا تھا کہ ترک سلطنت کی تقسیم کا عمل مکمل ہو چکا ہے۔
- اس دوران، کانگریس سیاسی پیش رفتوں سے متعلق آئینی اصول وضوابط پر شک کرنے لگی تھی۔ اس کے علاوہ، کانگریس لیڈران پنجاب میں ہوئی بربریت کی تفتیش کرنے والی ہنٹر کمیٹی کے رپورٹ سے بھی نالاں تھے۔ متذکرہ بالا واقعات کو مدّنظر رکھتے ہوئے مئی 1920 میں کل ہند کانگریس کمیٹی کی نشست میں عدم تعاون پر غور کرنے پر اتفاق کیا گیا اور ستمبر میں ہنگامی اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔

اس سیاسی منظر میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ سیاسی عمل کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی، اور برطانوی حکومت کے خلاف عوامی بغاوت کے لیے صورتحال تیار کی۔ اس تحریک میں مسئلۂ خلافت کے ذریعے مسلمانوں کی حمایت حاصل کی گئی، اور گاندھی کی قیادت نے اس تحریک (خلافت تحریک) کو ایک حتمی شکل دے دی۔ عدم تعاون تحریک وائسرائے کے نام گاندھی کے بھیجے ہوئے 22 جون والی نوٹس کے

بعد یکم اگست 1920 کو شروع کی گئی۔ اس تحریک کے ذریعے گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف عدم تعاون پروگرام کے نفاذ پر زور دیا۔ عدم تعاون پروگرام میں برطانوی القابات اور اعزازات سے دستبرداری، انتخابات کا بائیکاٹ، غیر ملکی کپڑوں کا بائیکاٹ، دیسی کھادی کا استعمال، سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ وغیرہ شامل ہے۔ عدم تعاون تحریک برطانوی راج سے ہندوستان کی آزادی کی وسیع تر تحریک میں سے ایک تھی جو 5 فروری 1922 کو چوری چورا کے واقعے کے بعد اچانک ختم ہوئی۔

15.3 عدم تعاون تحریک: کلکتہ سے ناگپور اجلاس تک

(Non-Cooperation Movement: From Calcutta to Nagpur Conference)

1920 کے اوائل میں، خلافت کے مسئلے پر شکایات کا ازالہ کرنے کے لیے ایک مشترکہ ہندو مسلم وفد برطانوی وائسرائے کے پاس بھیجا گیا، لیکن یہ مشن ناکام ثابت ہوا۔ فروری 1920 میں، گاندھی نے اعلان کیا کہ اگر امن معاہدے کی شرائط ہندوستانی مسلمانوں کو مطمئن کرنے میں ناکام رہیں، تو بہت جلد وہ عدم تعاون تحریک شروع کریں گے۔ مئی 1920 میں، سیورز معاہدے نے ترکی کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ مذکورۂ بالا واقعات کے پس منظر میں جون 1920 میں الہ آباد میں آل پارٹی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں اسکولوں، کالجوں اور عدالتوں کے بائیکاٹ کے پروگرام کی منظوری دی گئی اور گاندھی کو اس کی قیادت کرنے کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے گاندھی نے عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا، جس میں مندرجہ ذیل نکات شامل ہیں:

- برطانوی القابات اور اعزازات کو چھوڑ دیا جائے۔
- صوبائی اور مرکزی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا جائے۔
- غیر ملکی کپڑوں کا بائیکاٹ اور اس کے بجائے دیسی کھادی کا استعمال کیا جائے۔
- حکومت کے ذریعے تسلیم شدہ اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔
- عدالتوں کا بائیکاٹ اور اس کے بجائے پنچایتوں کے ذریعے انصاف کی فراہمی کی جائے۔ اس میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ اور ٹیکس کی غیر ادائیگی سمیت بڑے پیمانے پر عام نافرمانی بھی شامل تھی۔

مندرجہ بالا نکات کو حاصل کرنے کے لیے قومی اسکول اور کالج قائم کیے گئے، تنازعات کے حل کے لیے پنچایتیں قائم کی گئی، ہاتھ سے کپڑا کاتنے اور بُننے کی حوصلہ افزائی کی گئی، ہندو مسلم اتحاد کو ترجیح دے دی گئی اور اچھوت پن کو ترک کرنے کی کوشش کی گئی۔ گاندھی نے شرکاء کو یقین دلایا کہ اگر اس پروگرام کو مکمل طور پر عمل میں لایا جائے تو ایک سال کے اندر سوراج حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اگست اور دسمبر 1920 کے درمیان تحریک کا منظر تمثیلی انداز میں بدل گیا۔ موتی لال نہرو نے ستمبر 1920 میں کلکتہ میں کانگریس کے خصوصی اجلاس میں گاندھی کی حمایت کی، اور چترنجن داس، جنھوں نے دسمبر میں ناگپور میں ہونے والے کانگریس اجلاس کے لیے بنگال سے آنے والی مخالف وفد کی مالی معاونت کے لیے بہت بڑی رقم خرچ کی تھی، نے ایک قرارداد پاس کی جس نے عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کو قبول کیا۔ اس قرارداد میں حکومت کے ساتھ رضاکارانہ وابستگی سے دستبرداری کے ساتھ ساتھ ٹیکسوں کی غیر ادائیگی بھی شامل ہے۔

اس طرح ناگپور اجلاس (دسمبر 1920) نے کانگریس کو بڑے پیمانے پر کارروائی کے پروگرام کا پابند بنایا۔ انقلابی کارکنان کے بہت سے گروہوں، جیسے بنگال انقلابی کارکنوں نے بھی تحریک کی حمایت کی۔ اپنے نئے عہد کو پورا کرنے کے لیے، کانگریس کے مختلف عقائد اور تنظیمی ڈھانچے میں بھی اہم تبدیلیاں لائی گئی۔ کانگریس کا مقصد آئینی اور قانونی طریقوں سے خود مختاری کے حصول کو پرامن اور جائز طریقوں سے سوراج کے حصول میں بدل دیا گیا۔ کانگریس کے نئے آئین میں گاندھی نے دیگر اہم تبدیلیاں بھی متعارف کروائیں۔ کانگریس نے اب اپنے روز مرہ کے امور کی دیکھ بھال کے لیے پندرہ ارکان کی ایک ورکنگ کمیٹی بنائی۔ اس تجویز کو پہلی بار تلک نے 1916 میں پیش کیا تھا، لیکن اعتدال پسند رہنماؤں نے اسے مسترد کر دیا۔ گاندھی بھی اسی نظریہ کے حامل تھے کہ کانگریس تب تک ایک پائیدار تحریک کی رہنمائی نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کے پاس ایک ایسی سرگرم تنظیم نہ ہو جو سال بھر کام کرے۔ اس کے علاوہ، صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو اب لسانی بنیادوں پر منظم کیا گیا، تاکہ وہ مقامی زبان کا استعمال کرتے ہوئے لوگوں سے رابطے میں رہ سکے۔ کانگریس تنظیم کو گاؤں اور محلہ یا وارڈ کمیٹیوں کی تشکیل کے ذریعے گاؤں اور محلہ کی سطح تک پہنچایا گیا۔ غریب اور معاشی طور پر کمزور طبقے کو رکنیت بخشنے کے لیے داخلے کی فیس کو کم کر کے چار آنہ سالانہ مقرر کیا گیا، جس کی وجہ سے کانگریس کو آمدنی کا باقاعدہ ذریعہ بھی حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ، دوسرے طریقوں سے بھی کانگریس کے تنظیمی ڈھانچے کو ہموار اور جمہوری بنانے کی کوشش کی گئی۔ کانگریس نے ہر ممکنہ صورت میں ہندی زبان کا استعمال کرنا شروع کیا۔ اس مرحلے پر کچھ رہنماؤں جیسے محمد علی جناح، اینی بیسنٹ، جی۔ ایس۔ کھرپڑے اور بی۔ سی۔ پال نے کانگریس کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ آئینی اور قانونی جدوجہد میں یقین رکھتے تھے جبکہ سوریندر ناتھ بنرجی جیسے کچھ دوسرے لوگوں نے انڈین نیشنل لبرل فیڈریشن کی بنیاد ڈالی، اور اس کے بعد سے قومی سیاست میں معمولی کردار ادا کیا۔

گاندھی کے لیے یہ کوئی آسان کام نہیں تھا کہ وہ کانگریس کے سبھی کارکنوں کو اپنی سیاسی حکمت عملی کے پروگرام کو قبول کروائے۔ رویندر کمار لکھتے ہیں کہ گاندھی نے تلک کو ستیہ گرہ کی خوبیوں اور خلافت پر مسلم کمیونٹی کے ساتھ اتحاد کی ضرورت پر قائل کرنے کے لیے ایک ٹھوس کوشش کی۔ تلک، ستیہ گرہ کے سیاسی طریق کار پر شکوک رکھتے تھے۔ وہ مذہبی مسئلے پر مسلم رہنماؤں کے ساتھ اتحاد کے حق میں بھی نہیں تھے۔ تلک مانتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعاون کی بنیاد لکھنؤ معاہدے (1916) کی طرح سیکولر ہونی چاہیے۔ یکم اگست 1920 کو تلک کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد لالہ لاجپت رائے اور سی۔ آر۔ داس نے کونسل انتخابات کے بائیکاٹ کی شدید مخالفت کی۔ جواہر لال نہرو بھی اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ 'تقریباً کانگریس کے سبھی پرانے پاسبانوں نے گاندھی کی عدم تعاون قرارداد کی مخالفت کی۔'

اس کے بعد عدم تعاون اور بائیکاٹ پروگرام صوبائی کانگریس کمیٹیوں (Provincial Congress Committee) کے سامنے رکھا گیا۔ متحدہ صوبجات (The United Provinces) کی کانگریس کمیٹی نے طویل بحث کے بعد عدم تعاون، سرکاری اسکولوں، کالجوں، سرکاری دفاتر اور برطانوی اشیاء کے بتدریج بائیکاٹ کو منظوری دے دی۔ بمبئی پی۔ سی۔ سی۔ نے عدم تعاون کو احتجاج کا جائز طریقہ قرار دیا، لیکن اس نے کونسل کے بائیکاٹ پر اعتراض کیا اور پہلے مرحلے کے طور پر صرف برطانوی تیار شدہ اشیاء کے بائیکاٹ کی سفارش کی۔ بنگال پی۔ سی۔ سی۔ نے بھی عدم تعاون کے اصول کو قبول کیا لیکن کونسل کے بائیکاٹ کی مخالفت کی۔ مدراس پی۔ سی۔ سی۔ نے بھی عدم

تعاون کی پالیسیوں کو قبول کیا، لیکن گاندھی کے پروگرام کے دیگر اصولوں کو مسترد کر دیا۔

اگرچہ گاندھی کے پروگرام کے بارے میں ہندوستانی سیاست کے روایتی علاقوں کا یہ رویہ تھا، لیکن ہندوستانی سیاست میں نسبتاً غیر روایتی علاقوں جیسے گجرات اور بہار نے گاندھی کے پروگرام کی مکمل حمایت کی۔ آندھرا اور پنجاب پردیش کانگریس کمیٹیوں نے عدم تعاون پروگرام کو منظوری دے دی، لیکن گاندھیائی پروگرام کے دیگر اصولوں کے بارے میں انہوں نے خصوصی اجلاس تک فیصلہ موخر کر دیا۔ انہی حالات میں ستمبر 1920 میں کلکتہ میں کل ہند کانگریس کمیٹی کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس کے صدر لالہ لاج پت رائے منتخب کیے گئے تھے۔ اس اجلاس میں گاندھی کے پروگرام کی سخت مخالفت کی توقع کی جارہی تھی۔ لیکن اجلاس شروع ہونے سے پہلے زیادہ تر سیاسی رہنماؤں کے ارادوں کے برعکس، گاندھی ایک ہزار ووٹوں کی اکثریت سے اپنی تجاویز کو قبول کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ گاندھی کے حامیوں میں موتی لال نہرو، سیف الدین کچلو، جتیندر لال بنرجی، شوکت علی، یعقوب حسن اور ڈاکٹر انصاری شامل تھے۔ جبکہ ان کے مخالفین میں پنڈت مدن موہن مالویہ، اینی بیسنٹ، وغیرہ شامل تھے۔ گاندھی کی کامیابی بنیادی طور پر کاروباری گروہوں اور مسلمانوں کی حمایت کی وجہ سے ہوئی۔ اس طرح، کلکتہ کانگریس نے مندرجہ ذیل نکات پر مبنی پروگرام کو منظوری دے دی:

- برطانوی القابات اور اعزازات کو چھوڑ دیا جائے۔
- قانون ساز اسمبلی کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا جائے۔
- سرکاری اسکولوں، عدالتوں اور غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ اور دیسی کھادی کا استعمال کیا جائے۔
- قومی اسکولوں اور پنچایتوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

اس طرح کانگریس نے حکومت کے ساتھ گاندھیائی عدم تعاون کے منصوبے کی حمایت کی اور پنجاب اور خلافت مسئلے کا حل اور سوراج قائم ہونے تک اسے جاری رکھنے کا اعلان کیا پھر بھی حتمی فیصلہ دسمبر 1920 میں منعقد ہونے والے کانگریس کے ناگپور اجلاس کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ مزید برآں سوراج کی قطعی نوعیت واضح نہیں کی گئی۔ حالانکہ گاندھی نے کہا تھا کہ یہ ہندوستانیوں کی خواہشات کے مطابق پارلیمانی سوراج ہے۔ جواہر لال نہرو نے اس کا اعتراف کیا اور بتایا کہ یہ ایک مبہم سوراج ہے جس کے پیچھے کوئی واضح نظریہ کا فقدان ہے۔ اسی اثنا میں نومبر 1920 میں انتخابات منعقد کیے گئے، اور کانگریس کے تمام امیدواروں نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ انتخابات کے بائیکاٹ کی کال کو مختلف ہندوستانی صوبوں سے زبردست ردعمل ملا۔ برطانوی حکومت کے لیے یہ ایک خطرناک علامت تھی۔ شہری علاقوں میں صرف 27.3 فیصد ہندو ووٹرز اور 12.1 فیصد مسلم ووٹروں نے حصہ لیا۔ دیہی علاقوں میں 41.8 فیصد ہندو اور 28.3 فیصد مسلمانوں نے ووٹ ڈالا۔

گاندھیائی پروگرام پر بہت سارے تنازعات اور مباحثوں کے دوران کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں 26 دسمبر 1920 سے شروع ہوا۔ اس اجلاس میں سی۔ آر۔ داس کے سیاسی کردار میں تمثیلی تبدیلی آگئی؛ اور عدم تعاون پروگرام کی قرارداد پاس کی گئی، جس میں حکومت کے ساتھ تمام رضاکارانہ وابستگی سے دستبرداری اور ٹیکسوں کی غیر ادائیگی کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ، اس پروگرام میں. کونسلوں

سے استعفیٰ، قومی اسکولوں کا قیام، معاشی بائیکاٹ، قومی خدمت کے لیے کارکنوں کی تنظیم، قومی فنڈ کا قیام اور ہندو مسلم اتحاد بھی شامل تھے۔
ناگپور اجلاس نے کانگریس کی تنظیم نو میں بھی انقلابی تبدیلی لائی۔ وہ تبدیلیاں مندرجہ ذیل سطور میں بیان کی گئی ہیں:

- 15 ارکان پر مشتمل کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تشکیل۔
- 350 اراکین پر مشتمل کل ہند کانگریس کمیٹی کی تشکیل۔
- شہر سے گاؤں کی سطح تک کانگریس کمیٹیوں کی تشکیل۔
- صوبائی کانگریس کمیٹیوں کی لسانی بنیادوں پر تنظیم نو۔
- 21 سال یا اس سے زیادہ عمر کے تمام مردوں اور عورتوں کو چار آنے کی ادائیگی پر کانگریس کی سالانہ رکنیت کا آغاز۔

اس پروگرام کی وجہ سے کانگریس کو ایک عوامی سیاسی جماعت بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اس دور میں کانگریس کی سماجی ساخت کے ساتھ ساتھ اس کے نقطہ نظر اور پالیسیوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں آگئیں۔ عدم تشدد اور ستیہ گرہ جیسے نئے ہتھیاروں کے ساتھ گاندھی کانگریس پارٹی میں ایک بڑے لیڈر بن کر سامنے آگئے۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تحریک عدم تعاون کے پروگرام کے دو اہم پہلو تھے:

1. تعمیری۔
2. تخریبی۔

تعمیری پروگرام میں مندرجہ ذیل نکات شامل ہیں:

- قومی تعلیم کا انعقاد۔
- مقامی اشیا کا فروغ۔
- چرخہ اور کھادی کی حوصلہ افزائی۔
- رضاکاروں کا اندراج۔

تخریبی پروگرام میں مندرجہ ذیل کا بائیکاٹ شامل ہے:

- عدالت۔
- تعلیمی ادارے۔
- قانون ساز اسمبلی کے انتخابات۔
- سرکاری کام۔
- برطانوی اشیا کے ساتھ ساتھ ان کے عطا کردہ اعزازات۔

15.4 عدم تعاون تحریک کے اہم مراحل
(Important Stages in the Non-Cooperation Movement)

عدم تعاون تحریک کی مہم 1921 کے اوائل سے بڑے جوش و خروش کے ساتھ شروع ہوگئی۔ تاہم، ہمیں ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک تحریک کی نوعیت میں کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ اس تحریک کی سیاسی سرگرمیوں کو مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

15.4.1 پہلا مرحلہ (First Phase: January, 1921 – March, 1921)

پہلے مرحلے میں (جنوری سے مارچ 1921 تک) بنیادی زور اسکولوں، کالجوں، عدالتوں کے بائیکاٹ اور چرخہ کے استعمال پر دیا گیا۔ طلباء میں بڑے پیمانے پر بے چینی پھیل گئی، اور سی۔ آر۔ داس اور موتی لال نہرو جیسے سرکردہ وکلاء نے اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔ جنوری 1921 سے اس تحریک نے پورے ملک میں خاطر خواہ کامیابیاں حاصل کیں۔ گاندھی نے علی برادران کے ساتھ ملک گیر دورہ کیا، سینکڑوں اجلاس منعقد کیے اور بڑی تعداد میں سیاسی کارکنوں سے ملاقات کی۔ پہلے مہینے میں، ہزاروں طلباء (ایک اندازے کے مطابق 90,000) نے اسکول اور کالج چھوڑ دیئے اور 800 سے زیادہ قومی اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ حاصل کیا۔ اسکولوں کا بائیکاٹ خاص طور پر بنگال میں کامیاب رہا، جہاں طلباء نے انتظامیہ کو حکومت سے الگ ہونے پر مجبور کیا۔ سی آر داس نے تحریک کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اور سبھاش چندر بوس کلکتہ میں انڈین نیشنل کانگریس کے سرکردہ رہنما بن گئے۔ اس ملک گیر جدوجہد میں سودیشی جذبے کو نئے جوش کے ساتھ زندہ کیا گیا۔ بنگال کے بعد پنجاب میں بھی اسکولوں کا بائیکاٹ بڑے پیمانے پر کیا گیا۔ دیگر علاقوں میں بمبئی، یوپی، بہار، اڑیسہ اور آسام شامل تھے۔ وکلاء کی طرف سے عدالتوں کا بائیکاٹ اسکولوں کے بائیکاٹ کی طرح زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ ملک کے کئی سرکردہ وکلاء، جیسے سی۔ آر۔ داس، موتی لال نہرو، ایم۔ آر۔ جیاکر، سیف الدین کچلو، ولبھ بھائی پٹیل، سی راج گوپالا چاری، ٹی۔ پر کاسم اور آصف علی نے اپنے منافع بخش پیشے کو چھوڑ دیا۔ اس تحریک کی سب سے اہم خصوصیت غیر ملکی کپڑوں کا بائیکاٹ تھا۔ رضاکار گھر گھر جا کر غیر ملکی کپڑوں کو اکٹھا کر کے جلاتے تھے۔ پر بھوداس گاندھی، جو 1921 کے پہلے حصے میں گاندھی کے ملک گیر دورے میں شامل تھے، لکھتے ہیں کہ کس طرح ریلوے اسٹیشنوں پر گاندھی کا استقبال کرنے والے لوگ موقعے پر ہی غیر ملکی کپڑوں سے بنی ہوئی ٹوپیوں، دوپٹوں اور پگڑیوں کو پھینک کر جلاتے تھے۔ غیر ملکی کپڑا فروخت کرنے والی دکانوں کے سامنے دھرنا بھی بائیکاٹ کی ایک اہم شکل تھی۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان میں غیر ملکی کپڑوں کی برآمد 1920-21 میں 102 کروڑ روپیے سے 1921-22 میں 57 کروڑ تک کم ہوگئی۔ اس کے علاوہ، اس تحریک میں تاڑی دکانوں کے سامنے بھی دھرنا دیا گیا۔ الغرض، اس مرحلے میں حکومتی محصولات میں کافی کمی واقع ہوئی۔ یہ مرحلہ مارچ 1921 میں ختم ہوا اور اس کے بعد دوسرا مرحلہ اپریل 1921 سے شروع ہوا۔

15.4.2 دوسرا مرحلہ (Second Phase: April, 1921 – July, 1921)

دوسرے مرحلے میں (اپریل سے جولائی 1921 تک) اگست 1921 تک 'تلک سوراج فنڈ' کے لیے ایک کروڑ روپے جمع کرنے کا

ہدف مقرر کیا گیا اور کانگریس پارٹی میں ایک کروڑ ارکان کا اندراج اور 30 جون تک 20 لاکھ چرخے نصب کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ کل ہند کانگریس کمیٹی نے مارچ 1921 کے وجے واڑہ اجلاس میں فنڈ کی وصولی، اراکین کے اندراج اور چرخوں کی تقسیم پر توجہ مرکوز کی۔ اگرچہ ایک کروڑ ممبران کا ہدف حاصل نہیں ہوا، لیکن پھر بھی کانگریس کی رکنیت تقریباً 50 لاکھ تک پہنچ گئی۔ تلک سوراج فنڈ نے ایک کروڑ روپے کے ہدف کو پار کر دیا۔ چرخوں کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا اور کھادی قومی تحریک کا مقبول لباس بن گیا۔ جب مدورائی میں طلبہ کی نشست میں یہ شکایت آگئی کہ کھادی کپڑا مہنگا ہے، تو گاندھی نے جواب دیا کہ ہمیں کم کپڑے پہننے چاہئے۔ اس دن سے انہوں نے اپنی دھوتی اور کُرتہ چھوڑ کر لنگوٹ پہننا شروع کیا۔

15.4.3 تیسرا مرحلہ (Third Phase: November, 1921 – February, 1922)

تیسرے مرحلے میں (نومبر 1921 سے فروری 1922 تک) غیر ملکی کپڑوں کے بائیکاٹ، 17 نومبر 1921 کو پرنس آف ویلز کے آنے والے دورے کا بائیکاٹ، چرخہ اور کھادی کو مقبول بنانے اور کانگریس کے رضاکاروں کے ذریعے جیل بھرو تحریک پر زور دیا گیا۔ 1921 کے اواخر تک تمام اہم قوم پرست رہنماؤں سمیت (سوائے گاندھی کے) 3000 دیگر کانگریس کے کارکنوں کو گرفتار کیا جا چکا تھا۔ جس دن پرنس آف ویلز بمبئی میں اترے اس دن ملک میں ہرتال منایا گیا۔ پرنس آف ویلز کا استقبال خالی گلیوں اور بند شٹروں (Downed Shutters) سے کیا گیا۔ انہیں حکومت نے لوگوں اور شاہی ریاستوں کے اندر برطانوی راج سے متعلق وفاداری کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے ہندوستان بلایا تھا۔ اسی اثنا میں گاندھی نے بمبئی میں عمر شوبھانی کی ایلفنسٹون مل (Elphinstone Mill) کے احاطے میں ایک بڑے جلسے سے خطاب کیا، اور غیر ملکی کپڑے کا ایک بہت بڑا انبار جلا دیا۔ تاہم، بدقسمتی سے شہزادے کی استقبالیہ تقریب میں شرکت کرنے والے لوگوں اور گاندھی کے جلسے سے واپس آنے والے ہجوم کے درمیان جھڑپیں ہوئیں۔ اس کے بعد فسادات ہوئے، جس میں پارسی، اینگلو انڈین اور عیسائی برطانوی راج کے وفاداروں کے طور پر حملے کا ہدف بن گئے۔ تین دن تک جاری رہنے والے فسادات کے نتیجے میں پچانوے (95) افراد ہلاک ہوئے۔ گاندھی کے تین دن تک بھوک ہرتال پر رہنے کے بعد ہی امن بحال ہوا۔

تیسرے مرحلے میں، اس تحریک میں بنیاد پرستی اور انقلاب پسندی کے کئی عناصر ظاہر ہوگئے۔ کانگریس کے رضاکاروں نے عوام کے ساتھ ریلیاں نکالی اور ملک بغاوت کے دہانے پر کھڑا ہو گیا۔ دسمبر 1921 کے احمد آباد اجلاس میں ایک قرارداد پاس کی گئی جس میں اس عزم کی تصدیق کی گئی کہ پنجاب اور خلافت کی غلطیوں کا ازالہ اور سوراج قائم ہونے تک، کانگریس عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کے پروگرام کو زیادہ زور وشور سے جاری رکھے گی۔ قرارداد میں تمام لوگوں خصوصاً طلباء پر زور دیا گیا کہ وہ بغیر کسی مظاہرے کے رضاکار تنظیموں سے تعلق رکھتے ہوئے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کریں۔ تمام ستیہ گرہوں کو قول و فعل میں عدم تشدد پر قائم رہنے کی تلقین کی گئی۔ اس کے علاوہ، ستیہ گرہوں سے ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، پارسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان اتحاد کو فروغ دینے، سودیشی پر عمل کرنے اور کھادی پہننے کا عہد لیا گیا۔ ہندو رضاکاروں کو بتایا گیا کہ وہ اچھوت پن ترک کریں۔

گاندھی نے باردولی میں محصول کی غیر ادائیگی کی مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اظہار رائے، پریس اور انجمن سازی کی آزادی کے لیے بڑے پیمانے پر سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا ارادہ کیا لیکن 5 فروری 1922 کو اتر پردیش کے گورکھپور ضلع میں چوری چورا کے مقام پر مشتعل کسانوں کے ایک مقامی تھانے پر حملے نے پوری صورتحال بدل دی۔ کسانوں کے ایک بڑے ہجوم نے پولیس پر حملہ کیا اور پولیس تھانے کو آگ لگادی۔ فرار ہونے کی کوشش کرنے والے پولیس اہلکاروں کو جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا، جس کی وجہ سے 22 پولیس اہلکار ہلاک ہوگئے۔ واقعہ کی اطلاع ملتے ہی گاندھی نے عدم تعاون تحریک ختم کرنے کا فیصلہ لیا۔ انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کو بھی اپنے فیصلے کی توثیق کرنے پر آمادہ کیا اور اس طرح 12 فروری 1922 کو عدم تعاون تحریک اختتام کو پہنچ گئی۔

15.4.4 تحریک سے متعلق عوامی رد عمل (Public Response to the Movement)

ابتدائی دور میں اس تحریک کی قیادت متوسط طبقے کے ذریعے ہوئی۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس جیسی جگہوں پر اس تحریک سے متعلق اشراف طبقے سے وابستہ سیاست دانوں کا رد عمل بہت کم تھا۔ اس کے علاوہ، سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دینے، سرکاری عہدوں سے دستبردار ہونے وغیرہ کے مطالبے پر بھی ان کا رد عمل دل شکستہ تھا۔ تاہم، ہندوستانی کاروباری گروہ، معاشی بائیکاٹ کی حمایت کر رہا تھا، کیونکہ مقامی تیار شدہ اشیاء کے استعمال سے کپڑے کی صنعتوں کو فائدہ ملتا تھا۔ پھر بھی کاروباری پیشے سے وابستہ لوگوں کا ایک بہت بڑا حصہ عدم تعاون تحریک کی تنقید کر رہا تھا کیونکہ ان کا کاروبار عدم تعاون تحریک کی وجہ سے متاثر ہو رہا تھا۔ اشراف سیاست دانوں کے علاوہ، کئی سرگرم رہنماؤں نے اس تحریک میں اپنی دلچسپیوں اور خواہشات کا اظہار پایا۔ بہار میں راجندر پرشاد، گجرات میں سردار ولبھ بھائی پٹیل جیسے رہنماؤں نے اس تحریک کو ٹھوس مدد فراہم کی۔ برطانیہ مخالف جدوجہد کی مختلف قوتیں جیسے خلافت تحریک، کسان سبھا، کسان تحریک، وغیرہ عدم تعاون تحریک میں ضم ہوگئے۔ کیرالہ میں خلافت اور عدم تعاون تحریک کے پروپیگنڈے نے مسلم کسانوں کو ان کے زمینداروں کے خلاف بیدار کرنے میں مدد کی، لیکن بدقسمتی سے اس تحریک نے کیرالہ میں فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا۔

اس تحریک میں کسانوں نے بھرپور شرکت کی۔ عام طور پر کسان زمینداروں اور تاجروں کے خلاف ہوگئے۔ اس تحریک نے محنت کش عوام کو انگریزوں کے علاوہ ہندوستانی جاگیرداروں اور تاجروں کے خلاف اپنے حقیقی جذبات ظاہر کرنے کا موقع فراہم کیا۔ آسام میں چائے کی کاشت کرنے والے مزدوروں نے ہڑتال کی۔ بنگالی قوم پرست رہنما جے۔ ایم۔ سین گپتا نے ان پیش رفتوں میں اہم کردار ادا کیا۔ آندھرا میں جنگل سے متعلق قوانین کی خلاف ورزی مقبول ہوگئی۔ راجستھان کے کچھ علاقوں میں کسانوں اور قبائلی لوگوں نے زندگی بہتر بنانے کے لیے تحریکیں شروع کی۔ پنجاب میں سکھوں نے گردواروں کے بداطوار پجاریوں کے کنٹرول کی جانچ کے لیے اکالی تحریک شروع کی، جو عدم تعاون تحریک کا حصہ بن گئی۔ عدم تعاون تحریک سے متعلق اس طرح کی کئی مثالیں تاریخ ہند میں موجود ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ عدم تعاون تحریک کے نتیجے میں پیدا ہوئی خلاف ورزی کے جذبے نے ملک کے مختلف حصوں میں بہت سی مقامی تحریکوں کو جنم دیا۔ اس تحریک سے متعلق طلبہ اور خواتین کا رد عمل بہت موثر تھا۔ ہزاروں طلباء نے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ کر قومی سکولوں اور کالجوں میں داخلہ لیا۔ نئے قومی ادارے جیسے کاشی ودیاپیٹھ، گجرات ودیاپیٹھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دیگر متعدد ادارے وجود میں آئے جہاں طلباء نے داخلہ لیا۔

اس طرح طلبہ تحریک کے سر گرم رضاکار بن گئے اور خواتین نے پردہ چھوڑ کر تلک فنڈ کے لیے اپنے زیورات پیش کیے۔

موپلا بغاوت جیسے واقعات کے باوجود اس تحریک میں مسلمانوں کی شرکت اور فرقہ وارانہ اتحاد کو برقرار رکھنا ایک بڑی کامیابی تھی۔ متعدد جگہوں پر گرفتار ہونے والوں میں سے دو تہائی مسلمان تھے اور اس قسم کی شرکت ماضی میں کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ گاندھی اور دیگر رہنماؤں نے مساجد میں مسلم عوام سے خطاب کیا، اور یہاں تک کہ (گاندھی کو) مسلم خواتین کے اجلاسوں میں خطاب کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے علاوہ، آریہ سماج کے معروف رہنما سوامی شردھانند کو مسلمانوں نے دہلی کی جامع مسجد کے منبر سے تبلیغ کرنے کی اجازت دے دی، اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو سکھوں کے عبادت گاہ گولڈن ٹیمپل کی چابیاں سونپی گئی۔

15.4.5 برطانوی حکومت کا ظلم واستبداد (Repression by the British Government)

مئی 1921 میں، گاندھی اور وائسرائے ریڈنگ کے درمیان مذاکرات ناکام رہے کیونکہ حکومت چاہتی تھی کہ گاندھی علی برادران کو ترغیب کرے کہ وہ اپنی تقریروں میں تشدد پر اکسانے سے گریز کریں۔ گاندھی نے محسوس کیا کہ حکومت ان کے اور خلافت رہنماؤں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس جال میں پھنسنے سے انکار کر دیا۔ دسمبر 1921 میں، حکومت نے مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا۔ رضاکاروں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا، عوامی جلسوں اور پریس پر پابندی لگادی گئی اور متعدد رہنماؤں (ماسوائے گاندھی) کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے والے رہنماؤں میں سب سے پہلے سی آر داس تھے اور ان کے بعد ان کی اہلیہ بسنتی دیوی۔ بسنتی دیوی کی گرفتاری نے بنگال کے نوجوانوں کو اس قدر مشتعل کیا کہ ہزاروں لوگوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ اگلے دو مہینوں میں ملک بھر سے 30,000 سے زیادہ افراد کو گرفتار کیا گیا۔ اس طرح جبر کا سلسلہ جاری رہا، جلسے منعقد کرنے اور اخبارات پر پابندی عائد کی گئی۔ کانگریس اور خلافت کے دفاتر پر چھاپے ڈال کر لوگوں کی سرگرمیوں کو قابو کرنے کی کوشش کی گئی۔

15.4.6 تحریک کا پھیلاؤ اور اس کے مقامی تغیرات

(Spread of the Movement, and its Regional Variations)

عدم تعاون تحریک کو بلا شبہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ سال 1921 اور 1922 میں برطانوی راج کے خلاف سیکڑوں عوامی مظاہرے وقوع پذیر ہوئے۔ تاہم متعدد جگہوں پر مقامی حالات کے مطابق مختلف قسم کے رد عمل کا سامنا کرنا پڑا۔ دراصل یہ لوگوں کی مقامی شکایتیں تھیں جن کا اظہار اس تحریک کے ذریعے ہوا۔ عدم تعاون تحریک کے حوالے سے مختلف خطوں کا مختصر جائزہ مندرجہ ذیل میں بیان کیا گیا ہے:

بنگال: بنگال میں گاندھیائی طریقوں کے مطابق احتجاج کرنے میں کم دلچسپی کا مظاہرہ کیا گیا۔ دراصل رابندر ناتھ ٹیگور نے عوام میں ایک نیا شعور لانے کے لیے گاندھی کی تعریف کی۔ لیکن انہوں نے ان کی تنگ نظری اور مبہم خیالات کی تنقید کی۔ کلکتہ کے اشراف طبقے بھی کچھ گاندھیائی طریقوں سے نالاں تھے۔ لیکن اس کے باوجود عدم تعاون تحریک نے شہری اور دیہی عوام میں منفرد فرقہ وارانہ اتحاد اور بیداری قائم

کی۔ ہڑتالوں اور گرفتاریوں نے برطانوی حکومت کو اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کیا۔ مدناپور ضلع کے دیہاتیوں نے یونین بورڈ اور ان کی طرف سے لگائے گئے ٹیکس کی مخالفت کی۔ لوگوں نے شمالی بنگال کے مضافاتی اضلاع میں سرکاری یا نجی زمینداروں کو ٹیکس دینے سے انکار کر دیا۔

بہار: بہار میں سرکاری زمین پر مویشیوں کو چرانے کا مقامی مسئلہ اور مقدس دھاگہ پہننے کے معاملے پر اونچی اور نچلی ذاتوں کے درمیان تناؤ بھی عدم تعاون تحریک میں ضم ہو گیا۔ گائے کے تحفظ اور کسانوں کے حقوق کے مسائل پر بھی توجہ دی گئی۔ مندرجہ بالا مسائل کی وجہ سے شمالی بہار، خاص طور پر چمپارن، سارن، مظفر پور اور پورنیہ جیسے اضلاع نومبر 1921 تک تحریک کے مراکز بن گئے۔

متحدہ صوبجات: متحدہ صوبجات (United Provinces) گاندھیائی عدم تعاون تحریک کے بنیادی مراکز بن چکے تھے۔ یہ تحریک شہروں اور قصبوں میں زیادہ متحرک تھی اور دیہی علاقوں میں اس نے ایک مختلف شکل اختیار کی تھی۔ متحدہ صوبوں میں کسان تحریک بھی عدم تعاون تحریک میں ضم ہو گئی۔ کانگریس کی جانب سے عدم تشدد کی بار بار اپیل کے باوجود کسان نہ صرف تعلقداروں کے خلاف بلکہ تاجروں کے خلاف بھی بغاوت پر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جنوری اور مارچ 1921 کے درمیان، رائے بریلی، پرتاپ گڑھ، فیض آباد اور سلطان پور کے اضلاع میں بابا رام چندر کی قیادت میں بڑے پیمانے پر زرعی فسادات ہوئے۔ ان کے اہم مطالبات میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

- کوئی نذرانہ ادا نہیں کیا جائے گا۔
- کسی کسان کو زمین سے بے دخل نہیں کیا جائے گا۔
- کسی فرد کو جبری مشقت (Forced Labour) کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

پنجاب: پنجاب کے شہری علاقوں میں اس تحریک کا ردعمل زیادہ قابل ذکر نہیں تھا۔ لیکن یہاں گرودواروں کی اصلاح کے لیے قائم کی گئی اکالی تحریک بھی عدم تعاون تحریک میں ضم ہو گئی۔ جب گاندھی نے اس تحریک کو منظوری دے دی، تو اکالیوں نے عدم تعاون پروگرام کو مسلسل استعمال کیا۔ انہوں نے سکھوں، مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک قابل ذکر فرقہ وارانہ اتحاد پیدا کیا۔

مہاراشٹرا: مہاراشٹر میں عدم تعاون تحریک نسبتاً کمزور رہی کیونکہ تلک کے حامی گاندھی کے بارے میں پرجوش نہیں تھے، اور مہاراشٹر کے لوگوں نے محسوس کیا کہ کانگریس چتپاون برہمنوں کے زیر اثر کام کرتا ہے۔ اونچی ذات کے لوگوں نے پسماندہ طبقات کی حوصلہ افزائی اور عدم تعاون تحریک میں ان کی شرکت پر زور دینے کو ناپسند کیا۔ تاہم، اس علاقے میں مقامی اشتعال انگیزی کے کچھ واقعات بھی سامنے آ گئے۔

آسام: آسام میں عدم تعاون پروگرام کو بڑے پیمانے پر حمایت ملی۔ آسام کے چائے کاشتکاروں نے زیادہ اجرت اور کام کی حالت بہتر بنانے کے لیے 'گاندھی مہاراج کی جے' کے نعروں کے ساتھ بغاوت کی۔

راجستھان: راجستھان میں کسان تحریک نے عدم تعاون تحریک کو تقویت بخشی، جیسا کہ انہوں نے بہار اور متحدہ صوبوں میں کیا تھا۔ کسانوں نے ٹیکس ادا کرنے اور جبری مشقت (Forced Labour) کے خلاف احتجاج کیا۔ میوار میں بجولیا تحریک اور موتی لال تیجاوت

کی بھیل تحریک نے عدم تعاون تحریک کو مزید قوت بخشی۔

آندھرا: آندھرا میں جنگلاتی قوانین کے خلاف قبائلی اور دیگر کسانوں کی شکایتیں عدم تعاون تحریک کے ساتھ جڑ گئی۔ انہوں نے ستمبر 1921 میں کڈپا میں گاندھی سے ملاقات کی تاکہ ان کے ٹیکسوں میں کمی اور جنگلات کی پابندیوں کو ہٹایا جاسکے۔ محکمہ جنگلات میں کام کرنے والے افسروں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اپنا حق جتانے کے لیے انہوں نے چرائی ادا کیے بغیر مویشیوں کو زبردستی جنگلوں میں بھیج دیا۔ پالند علاقے میں سوراج کا اعلان کیا گیا اور پولیس اہلکاروں پر حملہ کیا گیا۔ مظاہرین کا خیال تھا کہ گاندھی راج آنے والا تھا۔ دسمبر 1921 اور فروری 1922 کے درمیان آندھرا میں محصول کی غیر ادائیگی سے متعلق ایک تحریک بھی شروع کی گئی۔ اسی دور میں الوری سیتارام راجو نے آندھرا میں قبائلیوں کو منظم کیا اور ان کے مطالبات کو عدم تعاون تحریک کے ساتھ جوڑ دیا۔

کرناٹک: کرناٹک اس تحریک سے نسبتاً غیر متاثر رہا اور مدراس پریزیڈنسی کے کئی علاقوں میں اعلیٰ اور متوسط طبقوں کا ابتدائی ردعمل محدود تھا۔ اسی طرح کا ردعمل متعدد دوسرے خطوں میں دیکھا گیا۔ مثال کے طور پر اڑیسہ میں کانکاراج کے کسانوں نے ابواب ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن، گجرات میں، یہ تحریک خالصتاً گاندھیائی طریق کار پر چلی۔

15.4.7 تحریک کا آخری مرحلہ (The Last Phase of the Movement)

آخری مرحلے میں حکومت نے سیاسی پیش رفتوں کا غور سے مشاہدہ کیا اور صوبوں سے خفیہ رپورٹس حاصل کی۔ جب لوگوں نے عدم تعاون پروگرام پر عمل کیا، تو حکومت نے جبر کا سہارا لینا شروع کیا۔ کانگریس اور خلافت رضاکاروں کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ جلسوں اور جلوسوں پر پابندی لگادی گئی۔ کئی مقامات پر پولیس نے ستیہ گرہیوں پر گولیاں چلائی۔ گرفتاریاں اور لاٹھی چارج ایک عام منظر بن گیا۔ 1921 کے آخر تک گاندھی کے علاوہ تمام اہم رہنما قید کر لیے گئے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد سے گھبرا کر حکومت نے کانگریس اور خلافت رہنماؤں کے درمیان پھوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح حکومت نے تحریک کو کچلنے کے لیے متعدد کوششیں کی۔

انگریزوں کے جبر نے ہندوستانیوں کے جوش و خروش کو جاری رکھا، اور ان کے عزائم کو مضبوط کیا۔ دریں اثناء وائسرائے نے مدن موہن مالویہ کے ذریعے کانگریس رہنماؤں سے بات چیت کرنے کی کوشش کی اور سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کی پیشکش کی۔ جنوری 1922 کے وسط میں، گاندھی نے آل پارٹی کانفرنس میں عدم تعاون تحریک کے موقف کی وضاحت کی۔ یکم فروری کو انہوں نے وائسرائے کو خبردار کیا کہ اگر سیاسی قیدیوں کو رہا نہ کیا گیا اور جابرانہ اقدامات ترک نہ کیے گئے تو باردولی (گجرات) سے بڑے پیمانے پر سول نافرمانی شروع کی جائے گی۔ چونکہ پورا ملک سول نافرمانی کے لیے تیار تھا اس لیے انہوں نے اسے 5 فروری کو شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب ضلع گورکھپور کے چوری چورا گاؤں میں کانگریس کے رضاکاروں پر پولس نے گولی چلائی تو جوابی کارروائی میں مشتعل ہجوم نے 22 پولیس اہلکاروں کو ہلاک کر دیا۔ اس پر تشدد واقعے نے گاندھی کو صدمہ پہنچایا اور انہوں نے عدم تعاون تحریک کو معطل کر دیا اور باردولی میں مجوزہ سول نافرمانی کو بھی ملتوی کر دیا۔ گاندھی کے اس فیصلے سے بہت سے کانگریسی حیران ہوگئے۔ انہوں نے گاندھی کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ سبھاش چندر بوس نے اس فیصلے کو

'قومی آفت' قرار دیا۔ جواہر لعل نہرو نے اس فیصلے پر 'حیرت اور تشویش' کا اظہار کیا۔ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے، گاندھی نے جواہر لعل نہرو سے مخاطب ہو کر کہا کہ 'تحریک غیر شعوری طور پر صحیح راستے سے ہٹ گئی تھی۔ ہم اپنی جگہوں پر واپس آکر دوبارہ سیدھے راستے پر آ سکتے ہیں۔' گاندھی نے مزید بتایا کہ نظم وضبط اور تحمل کے بغیر یہ تحریک بہت بڑی غلطی کے طور پر ثابت ہوئی۔ 12 فروری 1922 کو باردولی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے چوری چورا کے غیر انسانی طرز عمل کی مذمت کی۔ اسی دن کفارہ کے طور پر گاندھی نے پانچ روزہ بھوک ہڑتال شروع کی۔ 10 مارچ 1922 کو گاندھی کو گرفتار کر لیا گیا اور انہیں چھ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ گاندھی کی پالیسیوں سے غیر مطمئن ہو کر، سی۔ آر۔ داس اور موتی لال نہرو نے سوراج پارٹی کی بنیاد رکھی اور کونسل میں داخلے کے پروگرام کی وکالت کی۔

15.5 عدم تعاون تحریک سے دستبرداری کی وجوہات

(Reasons for the Withdrawal of the Non-Cooperation Movement)

عدم تعاون تحریک سے دستبرداری کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے گاندھی نے کہا کہ چوری چورا واقعہ نے انہیں تحریک روکنے پر مجبور کیا۔ اس واقعہ نے ثابت کر دیا ہے کہ لوگوں نے ابھی تک عدم تشدد کا سبق نہیں سیکھا ہے۔ گاندھی کہتے ہیں کہ 'میں تحریک کو پر تشدد ہونے سے روکنے کے لیے ہر ذلت، اذیت، جلاوطنی اور موت برداشت کروں گا۔' چوری چورا کے تشدد کے جواب میں گاندھی کے تحریک واپس لینے کے فیصلے نے ایک تنازعہ کھڑا کر دیا جس کی گرمی اب بھی علمی سیمیناروں اور تاریخ کے سنجیدہ حلقوں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ موتی لال نہرو، سی آر داس، جواہر لعل نہرو، سبھاس بوس، اور بہت سے دوسرے لوگوں نے یہ خبر سن کر اپنی حیرانی بیان کر دی۔ وہ سمجھ نہیں پارہے تھے کہ ایک گاؤں کے کچھ لوگوں کے پاگل روپے کی قیمت پورے ملک کو کیوں چکانا پڑے۔ ملک میں بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ گاندھی ایک رہنما کے طور پر بری طرح ناکام ہو گئے ہیں اور ان کی شان کے دن ختم ہو گئے ہیں۔

India Today میں آر۔ پی۔ دت کی قائم کردہ روایت کی پیروی کرتے ہوئے بعد کے بہت سے اسکالروں نے گاندھی کے فیصلے کی مذمت کی اور اس میں گاندھی کے ہندوستانی سماج کے باوقار طبقوں کے لیے فکر مندی کا ثبوت دیکھا۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ گاندھی نے محض عدم تشدد کی ضرورت پر یقین رکھنے کی وجہ سے تحریک واپس نہیں لی تھی۔ بلکہ اس لیے واپس لے لی کیونکہ چوری چورا کا واقعہ عوام کی بڑھتی ہوئی عسکریت پسندی اور بنیاد پرستی کی علامت تھی۔ اس بنیاد پرست امکان کی حوصلہ شکنی کے لیے، تحریک ان کے ہاتھوں سے نکل کر بنیاد پرستوں کے ہاتھوں میں جانے سے روکنے کے لیے اور جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ کے لیے، گاندھی نے یہ تحریک روک دی۔

جہاں تک کسانوں کا تعلق تھا، عدم تعاون تحریک رفتہ رفتہ زمینداروں کے خلاف محصول کی غیر ادائیگی کی تحریک میں تبدیل ہو رہی تھی۔ لیکن کانگریس کو زمینداروں کے قانونی حقوق پر حملہ کرنے میں کسی بھی طرح کی دلچسپی نہیں تھی۔ گاندھی کا مقصد ایک عوامی تحریک قائم کرنا تھا جس میں مختلف ہندوستانی طبقات شامل ہونگے، نہ کہ طبقاتی انقلاب۔ اس لیے وہ اس تحریک کے تسلسل کے خلاف تھے جو

شاید طبقاتی انقلاب میں بدل سکتا تھا۔ انہوں نے واضح کیا کہ وہ اس مرحلے پر کسی بھی پر تشدد یا بنیاد پرست تحریک کے خلاف ہیں۔ اس کے علاوہ، اس وقت ہندوستان میں انقلابی صورتحال کے باوجود کوئی متبادل انقلابی قیادت موجود نہیں تھی۔ اگر تحریک کو معطل نہ کیا جاتا تو یہ افراتفری کا باعث بن سکتی تھی کیونکہ کانگریس قیادت کا مقامی تحریکوں پر قابو کم ہوتا جارہا تھا۔

تحریک سے دستبرداری کے لیے گاندھی کو مندرجہ ذیل نکات پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ پہلی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ایک دور دراز گاؤں میں تشدد اس فیصلے کے لیے کافی وجہ نہیں ہو سکتی۔ گاندھی نے پہلے ہی اس بات کا ذکر کیا تھا کہ وہ باردولی میں بڑے پیمانے پر سول نافرمانی تحریک شروع کرنے والے ہیں۔ اس لیے ملک کے کسی دوسرے حصے میں کوئی عدم تشدد تحریک نہیں ہوگی۔ انہوں نے آندھرا صوبائی کانگریس کمیٹی سے وہ اجازت واپس لینے کے لیے کہا تھا جو انہوں نے سول نافرمانی شروع کرنے کے لیے ضلع کانگریس کمیٹیوں کو دی تھی۔ اس کی ایک واضح وجہ یہ تھی کہ ایسی صورت حال میں تحریک آسانی سے پر تشدد رخ اختیار کر سکتی ہے جیسا کہ پہلے بمبئی (نومبر 1921) میں اور اس کے بعد چوری چورا میں۔ اس کے علاوہ اگر کہیں بھی تشدد ظاہر ہوا تو حکومت پوری تحریک پر حملہ کرنے کا بہانہ بنا سکتی ہے۔

یہ ممکن ہے کہ باردولی میں بڑے پیمانے پر سول نافرمانی کی مہم چلانے کے امکانات چوری چورا واقعہ کے بعد مزید کم ہو گئے۔ گاندھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ سول نافرمانی تحریک شروع کرنے سے پہلے ہی حکومت ان کو اور دیگر کارکنوں کو حراست میں لے جائے، جس کی وجہ سے تحریک متاثر ہو جاتی۔ اس لیے گاندھی نے عدم تعاون تحریک کا بوجھ اپنے اور ورکنگ کمیٹی کے کندھوں پر ڈال کر تحریک کو ممکنہ جبر اور لوگوں کو مایوسی سے بچایا۔ یہ سچ ہے کہ عدم تعاون کی دستبرداری سے سرگرم سیاسی کارکنوں کے حوصلے پست ہو گئے، لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ تحریک کو دبانے اور کچلنے سے (جیسا کہ 1932 میں ہوا) سیاسی کارکن زیادہ حوصلہ شکنی کے شکار ہو جاتے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ عدم تعاون تحریک انگریزوں کے خلاف کل ہند عوامی جدوجہد کی پہلی کوشش تھی، اور اس ابتدائی مرحلے میں تحریک کو دبانے سے ایک طویل مدت کے لیے لوگوں میں حوصلہ شکنی، مایوسی اور بے چینی پیدا ہو سکتی تھی۔

عدم تعاون تحریک سے دستبردار ہونے کی دیگر وجوہات میں بنیاد پرست قوتوں کے بڑھنے کا خوف تھا۔ لیکن چوری چورا کے ہجوم نے زمینداروں اور ان کے املاک پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ محض پولیس والوں کے انتہا پسند رویے سے ناراض تھے اور ان پر حملہ کر کے اپنا غصہ نکالتے تھے۔ زیادہ تر اودھ اور مالابار میں کسانوں کی بدامنی اس وقت تک ختم ہو چکی تھی۔ اودھ کے کچھ دیہی علاقوں میں بھی، جہاں ایکا تحریک چل رہی تھی، زمینداری نظام ختم کرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ یہ صرف زمینداروں کو محصول اور غیر قانونی ٹیکسوں میں اضافہ کرنے سے روکنا چاہتے تھے۔ درحقیقت، ایکا تحریک میں شامل ہونے والے کسانوں کی طرف سے یہ حلف لیا گیا تھا کہ وہ خریف اور ربیع پیداوار میں باقاعدگی سے محصول ادا کریں گے۔ گنٹور میں ٹیکس کی غیر ادائیگی تحریک عدم تعاون تحریک کے نقش قدم پر چلی۔ یہ پرامن تحریک حکومت کے خلاف تھی، لیکن فروری 1922 سے پہلے ہی زوال کا شکار ہو گئی۔ لہذا، یہ بتانا مشکل ہے کہ بنیاد پرست رجحانات کے آثار کیسے غالب ہو رہے تھے۔ باردولی کی قرارداد (جس نے تحریک سے دستبرداری کا اعلان کیا) میں ایسے جملے بھی شامل تھے جن میں کسانوں کو ٹیکس ادا کرنے کے لیے کہا گیا تھا، اور زمینداروں کو یقین دلایا گیا تھا کہ کانگریس انہیں ان کے حقوق سے محروم کرنے کا کوئی

ارادہ نہیں رکھتی۔ کانگریس نے تحریک کے دوران کسی بھی مرحلے پر زمینداروں کے حقوق پر سوال نہیں اٹھایا۔

گاندھی کا فیصلہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ملک کے بہت سے حصوں میں، 1921 کے دوسرے نصف میں تحریک کمزور ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ طلباء نے اسکولوں اور کالجوں میں جانا شروع کر دیا، وکلاء نے عدالتوں کی طرف رخ کیا، تجارتی گروہوں نے غیر ملکی کپڑوں کو برآمد کرنا شروع کیا اور جلسوں اور ریلیوں میں حاضری کم ہو گئی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باردولی (گجرات) یا گنٹور (آندھرا) میں بھی عوام جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ لیکن وہ جوش و خروش جو 1921 کے پہلے حصے میں پورے ملک میں عیاں تھا، شاید، کم ہو چکا تھا۔ گاندھی کے ناقدین اکثریہ تسلیم کرنے میں ناکام رہتے ہیں کہ عوامی تحریکوں میں ایک خاص اونچائی حاصل کرنے کے بعد زوال کا ایک فطرتی رجحان ہوتا ہے، کیونکہ عوام میں جبر، مصائب اور قربانیاں برداشت کرنے کی لامحدود صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا، ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب عوام کو آرام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ جدوجہد کے اگلے دور کے لیے مضبوطی حاصل کی جائے۔ اس لیے، تحریک سے دستبرداری کے مرحلے میں منتقل ہونا حکمت عملی کا ایک حصہ ہے جس کی بنیاد عوام پر ہے۔ لہٰذا، دستبرداری غداری کے مترادف نہیں ہے بلکہ حکمت عملی کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔

15.6 تحریک کے اثرات (Impacts of the Movement)

عدم تعاون تحریک اپنی ناکامی کے باوجود تاریخ میں نہ صرف سیاسی بلکہ سماجی پہلوؤں کے حوالے سے بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ گاندھی نے ذات پات کی رکاوٹوں، فرقہ پرستی، اچھوت پن، وغیرہ جیسی برائیوں کو دور کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ جلسوں اور جیلوں میں تمام ذاتوں اور برادریوں کے لوگ مل کر کام کرتے تھے اور ساتھ کھاتے تھے۔ اس نے اچھوت پن کو کمزور کیا اور سماجی نقل و حرکت اور اصلاح کی رفتار کو بڑھا دیا۔ اس تحریک نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایسا اتحاد قائم کیا کہ کئی جگہوں پر خلافت، عدم تعاون اور کسان سبھا کے اجلاس میں فرق کرنا مشکل ہوتا تھا۔

1920–22 کا معاشی بائیکاٹ 1905–08 کے سودیشی تحریک سے زیادہ موثر تھا۔ 1905–08 میں درآمد کی گئی 1292 ملین کپاس گز کے مقابلے میں 1921–22 میں صرف 955 ملین گز درآمد کیے گئے۔ اس سے برطانوی سرمایہ دار قدرتی طور پر متاثر ہو گئے، جس کی وجہ سے ہندوستانی صنعتوں کو بہت فائدہ ہوا۔ چرخہ اور کرگھا (Kargha) کی مقبولیت عام ہو گئی۔ پنچایت کے ذریعے گاؤں کی تعمیر نو کے پروگرام سے اقتصادی بحالی ہوئی اور کپڑے کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ سیاسی میدان میں تمام طبقات پر مشتمل عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں نے قومی تحریک میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔ ایک نئی قوم پرست بیداری پیدا ہوئی اور قومی تحریک زمین کے دور دراز کونوں تک پہنچ گئی۔ عام لوگ پہلی بار قومی تحریک کے مرکزی دھارے کا لازمی حصہ بنے۔ ہندوستانی لوگوں کی خود اعتمادی مضبوط ہوئی۔ اس نے لوگوں میں مایوسی اور بے بسی کی جگہ آزادی کا حقیقی احساس پیدا کیا۔ اس سے عوام کے حوصلے اور قومی وقار بلند ہوا۔ سیاسی مرحلے میں مسلمانوں کی شرکت سے تحریک کو بہت سے علاقوں میں حقیقی عوامی کردار حاصل ہوا۔ بعض مقامات پر گرفتار ہونے والوں میں سے دو تہائی

مسلمان تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو بھائی چارہ دیکھنے کو ملا وہ قابل دید تھا۔ گاندھی اور دیگر رہنماؤں نے مساجد میں مسلم عوام سے خطاب کیا، اور یہاں تک کہ (گاندھی کو) مسلم خواتین کے اجلاسوں میں خطاب کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے علاوہ، آریہ سماج کے معروف رہنما سوامی شردھانند کو مسلمانوں نے دہلی کی جامع مسجد کے منبر سے تبلیغ کرنے کی اجازت دے دی، اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو سکھوں کے عبادت گاہ گولڈن ٹیمپل کی چابیاں سونپی گئی۔

15.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

عدم تعاون کی تحریک بلاشبہ ہندوستان کی تاریخ آزادی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ رولٹ ایکٹ، مون ٹیگ اور چیمسفورڈ اصلاحات، جلیانوالہ باغ قتل عام اور خلافت کے مسئلہ عدم تعاون تحریک کا پس منظر فراہم کرتا ہے۔ گاندھی نے ان مسئلوں کو برطانوی حکومت کے خلاف متحدہ ہندو مسلم تحریک کے لیے استعمال کیا۔ ابتدائی اعتراضات کے باوجود، گاندھی نے متعدد رہنماؤں کو برطانوی راج کے خلاف خلافت اور عدم تعاون تحریک شروع کرنے پر آمادہ کیا۔ اس تحریک کے پروگرام میں حکومت اور تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ، عدالتوں کا بائیکاٹ، چرخہ اور کھادی کا استعمال وغیرہ شامل تھے۔ اس تحریک کو ہندوستان کے مختلف گوشوں سے زبردست حمایت حاصل ہوئی، اور بڑے پیمانے پر عام لوگوں کی شرکت اس تحریک کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی۔ آہستہ آہستہ 1921 کے آخر تک، یہ تحریک خاص طور پر دیہی علاقوں میں کانگریس قیادت کے کنٹرول سے باہر ہو گئی۔ آخر کار چوری چورا واقعہ کی وجہ سے یہ تحریک معطل کر دی گئی۔ یہ سچ ہے کہ تحریک اپنے بنیادی مقاصد یعنی خلافت کی بحالی اور سوراج حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ لیکن اس تحریک کی وجہ سے عوام میں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی۔ گاندھی نے دعوی کیا کہ اس تحریک نے ایک سال میں وہ حاصل کر لیا جو پہلے کے طریقوں سے تیس سالوں میں نہ ہو سکا۔ لہذا، ان دو سالوں میں عدم تعاون تحریک نے ہندوستانی قوم پرستی کا ایک طوفانی دور تشکیل دیا، جس میں تقریباً پورا ہندوستان پہلی بار طاقتور برطانوی راج کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔

15.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

کھادی : ہاتھ سے کاتا ہوا کپڑا۔

عدم تعاون : برطانوی تعلیمی اداروں، عدالتوں، کونسلوں وغیرہ کا بائیکاٹ۔

پنچایت : ثالثی کی روایتی ہندوستانی عدالتیں۔

ستیہ گرہ : سچائی پر اصرار اور عدم تشدد کے فلسفے پر مبنی تحریک کا گاندھیائی طریقہ۔

سودیشی : مقامی۔

سوراج : خود حکمرانی۔

اہنسا : دوسرے کو نقصان نہ پہنچانا۔

15.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

15.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. باردولی قرارداد کب پاس کی گئی؟
2. بال گنگادھر کی وفات کب ہوئی؟
3. جلیان والا باغ قتل عام کب واقع ہوا؟
4. 1920 میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کس نے کی؟
5. عدم تعاون تحریک کب معطل ہوئی؟
6. کانگریس ورکنگ کمیٹی میں کتنے ارکان تھے؟
7. 1921 میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کس نے کی؟
8. ابواب سے کیا مراد ہے؟
9. عدم تعاون تحریک کے کن ہی دو رہنماؤں کے نام بتائیے؟
10. سوراج پارٹی کی بنیاد کس نے ڈالی؟

15.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. عدم تعاون تحریک سے متعلق کسانوں کا کیا رد عمل تھا؟ تحریر کیجیے۔
2. عدم تعاون کی تحریک کے اثرات بیان کیجیے۔
3. عدم تعاون تحریک کیوں معطل کی گئی؟ جائزہ لیجیے۔
4. چوری چورا واقعہ پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
5. گاندھی کے ستیہ گرہ اور عدم تشدد کی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔

15.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. وہ کون سے اسباب تھے جن کی وجہ سے عدم تعاون تحریک کا ظہور ہوا؟ تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ عدم تعاون کی تحریک ناکام ثابت ہوئی، کیونکہ یہ تحریک سوراج کے حصول میں ناکام رہی؟ بحث کیجیے۔
3. عدم تعاون کی تحریک کے تین مختلف مراحل پر روشنی ڈالیے۔

15.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Amin, Shahid, *Event, Metaphor, Memory*: *Chauri Chaura*, *1922–1992*, Penguin, New Delhi, 2006 (first pub. in 1995).
2. Bandhopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman Private Limited, 2004.
3. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, 2014.
4. Brown, Judith, *Gandhi's Rise to Power*: *Indian Politics*, *1915–1922*, Cambridge University Press, 1972.
5. Chandra, Bipan, *Nationalism and Colonialism in Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 1979.
6. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin, New Delhi, 2000.
7. Gandhi, Rajmohan, *Mohandas*: *A True Story of a Man, His People and an Empire, Penguin, New Delhi, 2006.*
8. Guha, Ramachandra, *Gandhi*: *The Years that Changed the World*, *1914–1948*, Penguin, Gurgaon, 2018.
9. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal*: *A New History of British India*, HarperCollins, Noida, 2021.
10. Minault, Gail, *The Khilafat Movement*: *Religious Symbolism and Political Mobilization in India*, Oxford University Press, New Delhi, 1982.
11. Sarkar, Sumit, *Modern India*, *1885–1947*, MacMillan, New Delhi, 1982.
12. چندر، بپن، مردلا مکھرجی، آدتیہ مکھرجی، حصول آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد(1947-1857)، مترجم سعید احمد انصاری، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2014۔

اکائی 16۔ خلافت تحریک

(Khilafat Movement)

اکائی کے اجزا

16.0	تمہید
16.1	مقاصد
16.2	خلافت تحریک: تاریخی پس منظر
16.3	مسئلۂ خلافت
16.4	کل ہند خلافت کمیٹی کا قیام
16.5	خلافت تحریک کا آغاز
16.6	خلافت تحریک کے مطالبات
16.7	کانگریس اور مسئلۂ خلافت
16.8	گاندھی کی قیادت میں خلافت اور عدم تعاون تحریکوں کا اشتراک
16.9	ریاستی جبر
16.10	خلافت تحریک کا خاتمہ
16.11	خلافت تحریک کی اہمیت
16.12	اکتسابی نتائج
16.13	کلیدی الفاظ
16.14	نمونہ امتحانی سوالات
16.15	تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید (Introduction)

اتحادی طاقتوں کے استنبول پر فوجی قبضے (1918)اور معاہدہ ورسائی (1919) کے بعد خلیفہ کا عہدہ اور سلطنت عثمانیہ کا وجود ابہام کا شکار ہوگیا۔اس تحریک نے سیورز کے معاہدے (1920) کے بعد عروج حاصل کیا جس میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی تجویز رکھی گئی تھی اور یونان کو اس کے کچھ حصے ہڑپنے کی چھوٹ دی گئی تھی۔ یہ تحریک 1922 کے اواخر تک کمزور پڑ گئی، جب اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا کے زیر قیادت ترکی نے اتحادیوں کو گالی پولی، سمرنا اور باغی عربوں کو حلب کے قریب شکستوں سے دوچار کیا۔ نتیجتاً ترکی ایک خود مختار جمہوریہ کے طور پر ابھرا اور عہدہ خلافت ختم کر دیا گیا۔اسی کے ساتھ 1924 تک آتے آتے ہندوستان میں خلافت تحریک بھی از خود ختم ہوگئی۔ اگرچہ ہندوستان میں یہ ایک مسلم مذہبی تحریک تھی جو ترکی کے عثمانی خلیفہ کی حمایت میں چلائی گئی، لیکن یہ تحریک ہندوستان کی تحریک آزادی کا بھی حصہ بن گئی۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ خلافت اور عدم تعاون تحریکیں ہندوستانی قوم پرستی کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان تحریکوں نے عوام کو بڑے پیمانے پر متحرک کیا اور ہندوستانی سیاست کے مستقبل کو یکسر تبدیل کر دیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عدم تعاون تحریک عملی طور پر رولٹ مخالف احتجاج اور خلافت تحریک کی وجہ سے وجود میں آئی۔ دراصل، یہ خلافت کانفرنس تھی جس نے سب سے پہلے عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا تھا، لیکن، کانگریس نے اس حکمت عملی کو اپنا کر اسے ایک نامور تحریک کی شکل دے دی۔ مزید یہ کہ جب ایم۔کے۔ گاندھی نے اس تحریک کو واپس لے لیا اور کانگریس نے اسے دستبرداری کی توثیق کی، تب عدم تعاون تحریک تو ختم ہوگئی، جب کہ خلافت تحریک اس کے بعد بھی جاری رہی۔ اس طرح خلافت تحریک، عدم تعاون تحریک سے پہلے شروع ہوئی، اور اس کے بعد بھی کافی دیر تک چلی۔ اگرچہ ان کی رفتار مختلف تھی، لیکن دونوں تحریکیں سامراج مخالف تھیں اور گاندھی کی قیادت میں ساتھ ساتھ چلی۔ درحقیقت، گاندھی کی غیر موجودگی میں ان دو سامراج مخالف دھاروں کی ہم آہنگی اور ارتکاز بھی ممکن نہیں تھا۔ خلافت تحریک ایک اسلامی، سیاسی اور احتجاجی مہم تھی جو برصغیر ہند کے مسلمانوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانوی حکومت کے خلاف خلافت عثمانیہ کے تحفظ کے لیے شروع کی تھی۔ خلافت تحریک ایک منفرد تحریک تھی، جسے اسلامی نظریات کے ماہرین، ہندوستانی قوم پرستوں، کمیونسٹوں اور مغربی مفکروں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی نوآبادیاتی مخالف تحریک کے طور پر پیش کیا ہے۔ جب اس بات کا جائزہ لیا جاتا ہے، تو اس کے پیچھے غیر معمولی تضادات نظر آتے ہیں۔ جہاں تک اس تحریک کی کامیابی کا تعلق ہے، تو اس کی دیرپا میراث وہ جائز مقام ہے جو اس نے جمعیت علمائے ہند کی باقاعدہ سیاسی تنظیم کی شکل میں حاصل کیا، جسے مسلم دانشوران اور علماء نے سیاسی اور نظریاتی اعتبار سے فعال مداخلت کے لیے استعمال کیا ہے۔ ہندوستانی تاریخ میں پہلے کبھی مسلم دانشوروں اور علماء کو سیاسی زندگی میں ایسا مقام نہیں دیا گیا تھا۔

16.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- تحریک خلافت کے اغراض ومقاصد کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مسئلۂ خلافت، تحریک کی قیادت، تحریک کی اہمیت اور تحریک کے اثرات کو سمجھ سکیں گے۔

- خلافت تحریک میں علی برادران اور گاندھی کے کردار سے واقف ہوں گے۔

16.2 خلافت تحریک کا تاریخی پس منظر (Historical Background to the Khilafat Movement)

بیسویں صدی کے اوائل میں ایک نئی مسلم قیادت وجود میں آئی، جو سر سید کی برطانوی وفاداری کی سیاست اور علی گڑھ کی اشرافیہ فکر سے مختلف تھی اور پورے مسلم سماج کی بیداری چاہتی تھی۔ ان نوجوان رہنماؤں کے اندر مسلم خود اثباتی (Self-affirmation) اور ہندوستانی قوم پرستی کے درمیان کوئی بنیادی تضاد نہیں تھا۔ اس دوران کچھ نئے مسائل بھی سامنے آگئے، جنہوں نے برطانوی سرپرستی میں ان کے اعتماد کو جھنجھوڑا اور متزلزل کر دیا۔ مسلم یونیورسٹی کی مہم (جس کا احیاء 1910 کے بعد دوبارہ کیا گیا) کو اس وقت دھچکا لگا جب حکومت نے اس کے کنٹرول پر سخت لائحہ عمل اختیار کیا اور اسے ایک الحاق شدہ ادارہ بنانے کے خیال کو نامنظور کر دیا۔ تقسیم بنگال 1911 میں منسوخ کر دی گئی اور مسلم لیگ نے 1912 میں کلکتہ کے اجلاس میں اس پر افسوس کا اظہار کیا۔ 12-1911 میں بلقان جنگیں اور طرابلس کی جنگ (Tripolitan War) سلطنت عثمانیہ کو کمزور کرنے کی یورپی سازش کے طور پر نمودار ہوئی، جو دنیا کی آخری مسلم طاقت تھی۔ انگریزی اور اردو زبانوں میں شائع ہو رہے مسلم اخبارات اور رسالے جیسے کامریڈ، ہمدرد، زمیندار، الہلال وغیرہ، اس وقت کے پڑھے لکھے ہندوستانی مسلمانوں کے ان خدشات کی عکاسی کرتے ہیں۔

ایک نئی تعلیم یافتہ متوسط طبقے کی قیادت کے ساتھ ساتھ مسلم علماء بھی ایک نئی سیاسی قوت کے طور پر ابھر رہے تھے، اور ہندوستان کے مختلف مسلم گروہوں کے درمیان ایک "اہم ربط" قائم کر رہے تھے۔ دار العلوم دیوبند اور فرنگی محل لکھنؤ نے مسلمانوں کے شعور کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔ 1910 میں، دیوبندیوں نے جمعیت الانصار (طلبہ کی ایک پرانی انجمن) اور 1913 میں دہلی میں ایک قرآنی اسکول قائم کیا، تاکہ وہ اس وسیع تر مسلم معاشرے تک پہنچ جائے، جب مسلمان بلقان جنگوں کی وجہ سے جذباتی اور سیاسی طور پر شدید متاثر ہو رہے تھے۔ اٹھارویں صدی کا اسلامی اور استدلالی فکری ادارہ فرنگی محل لکھنؤ نے 1870 کی دہائی سے ہی مسلم دنیا کے واقعات میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس ادارے سے وابستہ نامور علماء جیسے عبد الباری، محمد علی اور شوکت علی نے مل کر ایک کل ہند انجمن خدام کعبہ کی بنیاد ڈالی، تاکہ مسلمانوں کے مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے تمام ہندوستانی مسلمانوں کو متحد کیا جا سکے۔ اس طرح نوجوان مسلم رہنماؤں نے اس فاصلے کو ختم کر دیا، جسے سید احمد خان نے علماء کے ساتھ برقرار رکھا تھا۔ اس کے علاوہ، وہ سید احمد خان کے نظریۂ 'قوم' کے برخلاف، امت یا مومنین کی جماعت بنانے کے لیے زیادہ بے چین تھے۔

اس دوران، محمد علی، وزیر حسن اور ابوالکلام آزاد کی شمولیت کی وجہ سے بھی مسلم لیگ کا کانگریس مخالف اور حکومت نواز رویہ بدل رہا تھا۔ محمد علی جناح نے لیگ اور کانگریس کے درمیان تعلقات کو استوار کرنے میں اچھا کردار ادا کیا۔ یہ رجحانات اس وقت زیادہ نمایاں ہوئے جب نومبر 1914 میں برطانیہ نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ مسلمانوں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ یہ ایک غیر مذہبی جنگ ہے، کیونکہ جنگ شروع ہوتے ہی ترک نواز علی برادران کو سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔ 1916 میں لکھنؤ معاہدے نے لیگ اور کانگریس کی

مشترکہ اسکیم کی پیشکش کی، جس میں آئینی اصلاحات، ہندوستان کے لیے نمائندہ حکومت (Representative Government) اور خود حکمرانی (Dominion Status) کا مطالبہ کیا گیا۔ علیحدہ انتخابی حلقے (Separate Electorate) کے اصول کو قبول کیا گیا، اور مرکزی اور صوبائی قانون ساز مجلسوں میں متناسب نمائندگی پر اتفاق کیا گیا۔ 1917 میں مسلم لیگ نے اینی بیسنٹ کے شروع کردہ ہوم رول تحریک کی بھی حمایت کی۔ لیکن اس میل جول کے فوراً بعد بہار، متحدہ صوبوں اور بنگال میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑنے سے عوام اور ان کے رہنماؤں کے درمیان مسلسل نااتفاقی کا انکشاف ہوا۔ ہندوستانی رہنماؤں کو آئینی سیاست پر اس وقت بھروسہ ختم ہوگیا، جب 1919 میں مونٹیگ اور چیمسفورڈ اصلاحات نے لکھنؤ معاہدے کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیا؛ اور ستمبر 1920 میں مسلم یونیورسٹی بل کو منظور کیا گیا جس میں سخت حکومتی کنٹرول کے تحت ایک یونیورسٹی فراہم کی گئی۔ اس کے علاوہ، ترکی کی شکست نے ہندوستان میں عوامی حمایت کو متحرک کیا۔ ان پیشرفتوں کی وجہ سے مسلم لیگ کی قیادت اعتدال پسند آئین سازی سے ان نظریات میں تبدیل ہوگئی جو اسلامی مذہبی خود اعتمادی اور وسیع البنیاد عوامی تحریک پر یقین رکھتے تھے۔ دسمبر 1918 میں، مسلم لیگ کے دہلی اجلاس میں علماء کو بھی مدعو کیا گیا، جس کی وجہ سے وہ براہ راست سیاست میں آ گئے، جس سے انہیں بے حد مقبولیت حاصل ہوگئی۔ اس طرح، خلافت تحریک کے آغاز کے لیے بنیاد تیار کی گئی، جو کہ ایک منقسم ہندوستانی مسلم معاشرے کے درمیان سیاسی اتحاد پیدا کرنے کے لیے پہلی عوامی تحریک تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران، سلطنت عثمانیہ نے جرمنی کے ساتھ جنگ میں شمولیت اختیار کی۔ لیکن ترکی اور جرمنی جنگ ہار گئے اور اتحادی افواج نے سلطنت عثمانیہ کو تقسیم کرنے اور خلافت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اکتوبر 1918 میں مدروس (Mudroos) کی جنگ بندی، استنبول پر اتحادی افواج کے قبضے اور معاہدہ ورسائی (1919) کے بعد خلیفہ کا عہدہ اور خلافت عثمانیہ کی حیثیت ابہام کا شکار ہوگئی۔ اس پس منظر میں ہندوستانی مسلمانوں نے مسلم ملک کی مدد کرنا اپنا مذہبی فریضہ محسوس کیا۔ یہ دراصل اسلام کے مذہبی جوش پر مبنی اضافی علاقائی وابستگی تھی جس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں نے خلافت تحریک شروع کی۔ مزید برآں، مسئلۂ خلافت کو حل کرنے اور پنجاب میں ہوئے مظالم کا ازالہ کرنے کے لیے، گاندھی نے بھی تحریک میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ برصغیر ہند کے مسلمان بہت ہی عجیب و غریب حالت میں تھے، کیونکہ وہ خلافت سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ وہ اس مقدس ادارے کا احترام کرتے تھے۔ اس لیے، پہلی جنگ عظیم میں برطانوی حکومت کی طرف ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت دو شرائط پر مبنی تھی:

1. ترکی کے مقدس مقامات کی حفاظت۔
2. ترکی کو اپنے علاقوں سے محروم نہ کیا جائے۔

حالانکہ برطانوی حکومت نے ان دونوں وعدوں کو پورا نہیں کیا اور 1920 کے سیورز معاہدے کے ذریعے ترکی سے سمرنا (Smyrna)، تھریس (Thrace) اور اناطولیہ (Anatolia) جیسے علاقے چھین لیے اور انہیں یورپی ممالک میں تقسیم کر دیا۔ اس کی وجہ سے مسلم دنیا میں غصے کی لہر دوڑ گئی، اور ہندوستانی مسلمان برطانوی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا

محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور دیگر مسلم رہنماؤں نے برطانوی حکومت کی پالیسی کے خلاف ردعمل کا اظہار کیا۔ وہ مضبوط اور مربوط سامراج مخالف جذبات کے حامل تھے۔ انہوں نے خلافت کے مقدس ادارے کی بحالی کے لیے خلافت تحریک قائم کی۔ 1920 کے ابتدائی مہینوں میں خلافت رہنماؤں کو واضح طور پر کہا گیا تھا کہ انہیں مزید کسی چیز کی توقع نہیں رکھنی چاہیے، اور مئی 1920 میں ترکی کے ساتھ ہوئے سیورز معاہدے نے یہ واضح کر دیا تھا کہ ترک سلطنت کی عملی تقسیم مکمل ہو چکی ہے۔

اس صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ سیاسی عمل کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی۔ 1916 کے لکھنؤ معاہدہ نے کانگریس اور مسلم لیگ کے اتحاد کو متحرک کیا تھا، رولٹ قانون کے خلاف اعتراضات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اکٹھا کیا تھا اور محمد علی، ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خان اور حسن امام جیسے بنیاد پرست اور قوم پرست مسلمان اب علی گڑھ کے ان قدامت پسند عناصر سے زیادہ بااثر ہو چکے تھے جو پہلے مسلم لیگ پر حاوی تھے۔ مسلم نوجوان عناصر نے عسکریت پسند قوم پرستی اور قوم پرست تحریک میں فعال شرکت کی وکالت کی۔ ان تمام پیش رفتوں نے برطانوی حکومت کے خلاف عوامی بغاوت کے لیے صورتحال تیار کی۔ اس پس منظر میں خلافت کا مسئلہ ابھرا آیا، جس کے ارد گرد تاریخی عدم تعاون تحریک نے جنم لیا۔

16.3 مسئلہ خلافت (The Khilafat Question)

پہلی جنگ عظیم کے دوران ترکی نے برطانیہ کے خلاف جرمنی اور آسٹریا کے ساتھ اتحاد کیا تھا۔ ہندوستانی مسلمان ترکی کے سلطان کو اپنا روحانی پیشوا یا خلیفہ مانتے تھے، اس لیے ظاہری طور پر ان کی ہمدردیاں ترکی کے ساتھ تھیں۔ یہ تحریک اس لیے خلافت تحریک کہلاتی تھی، کیونکہ اس کا بنیادی مقصد خلیفہ کے اقتدار کو برقرار رکھنا تھا۔ اسلامی عقیدہ یہ تھا کہ خلیفہ کو مومنوں کا دفاع کرنا چاہیے، اور پیغمبر محمدؐ کے حکم کے مطابق جزیرۃالعرب یعنی عرب، شام، عراق اور فلسطین اور وہاں کے مقدّس مقامات خلیفہ کے کنٹرول میں رہیں۔ یہ مطالبات محمد علی نے 1920 میں پیرس میں مختلف ملکوں سے وابستہ سفارت کاروں کے سامنے پیش کیے تھے۔ اس کے برعکس، جنگ کے بعد برطانیہ نے ترکی میں خلیفہ کا اقتدار ختم کر دیا۔ گیل مینالٹ اور فرانسیس رابنسن کا استدلال ہے کہ خلافت کے رہنما مشرق وسطیٰ میں خلیفہ کی حیثیت سے فکرمند نہیں تھے، بلکہ ان کے لیے خلافت ایک ایسی علامت تھی جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اتحاد بخشا، جو اس وقت وسیع علاقائی، ثقافتی اور طبقاتی اختلافات کے ساتھ جوجھ رہے تھے۔ خلافت ایک ایسا ادارہ تھا جو عالمی سطح پر مسلمانوں کو متحرک کر سکتا تھا۔ اس لیے، مسلمانوں نے خلیفہ کی حیثیت کو بحال کرنے کے لیے ہندوستان میں خلافت تحریک شروع کی۔ اس تحریک کے بنیادی مطالبات یہ تھے:

1. مسلمانوں کے مقدس مقامات پر خلیفہ کا کنٹرول برقرار رکھا جائے۔
2. جنگ کے بعد خلیفہ کے پاس کافی علاقے چھوڑ دیے جائیں۔

1919 کے اوائل میں، علی برادران، مولانا آزاد، اجمل خان اور حسرت موہانی کی قیادت میں بمبئی میں ایک خلافت کمیٹی تشکیل دی گئی، تاکہ انگریزوں کو ترکی کے بارے میں اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کیا جا سکے۔ یہ پہل مسلمان تاجروں نے کی تھی اور ان کے اقدامات خلیفہ

کے حق میں ملاقاتوں، درخواستوں اور وفود تک محدود تھے۔ تاہم، جلد ہی اس تحریک کے اندر عسکریت پسندی کا رجحان پیدا ہوا۔ اس رجحان کے رہنما اعتدال پسند طرز عمل سے مطمئن نہیں تھے۔ اس لیے، انہوں نے ایک ملک گیر تحریک شروع کرنے کی تبلیغ کی۔ گاندھی، جو کافی عرصے سے خلافت کے رہنماؤں کے ساتھ قریبی رابطے میں تھے، نے بھی نومبر 1919 کی خلافت کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ گاندھی خلافت رہنماؤں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے، کیونکہ انہیں لگتا تھا کہ انگریزوں نے ان کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے۔ اسی کانفرنس میں حسرت موہانی نے برطانوی تیار شدہ اشیاء کے بائیکاٹ کی اپیل کی۔ خلافت رہنماؤں نے واضح طور پر کہا تھا کہ جنگ کے بعد امن کی شرائط مسلمانوں کے لیے ناگوار ہونے کی صورت میں وہ حکومت کے ساتھ ہر طرح کا تعاون بند کریں گے۔

خلافت کا مسئلہ ہندوستان کی سیاست سے براہ راست منسلک نہیں تھا لیکن خلافت کے رہنما ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ اس کے علاوہ، گاندھی کو اس تحریک کے ذریعے انگریزوں کے خلاف ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ لیکن کل ہند خلافت کمیٹی کے صدر ہونے کے باوجود گاندھی نے مئی 1920 تک ایک معتدل طرز عمل اپنایا تھا۔ لیکن سیورز معاہدے اور ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ کی اشاعت نے ہندوستانیوں کو مشتعل کر دیا، اور اس لیے، گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف عدم تعاون کا اعلان کیا۔ گاندھی نے اصرار کیا کہ جب تک پنجاب اور خلافت مسئلوں کو حل نہ کیا جائے، حکومت کے ساتھ عدم تعاون جاری رہے گا۔ خلافت رہنماؤں نے سول سروس، پولیس، فوج کا بائیکاٹ اور ٹیکسوں کی غیر ادائیگی کے ذریعے حکومت کے ساتھ عدم تعاون پروگرام کا آغاز کیا، اور کانگریس نے اس کی حمایت کی۔ اس کے پس منظر میں، گاندھی نے کلکتہ کے خصوصی اجلاس میں پنجاب سانحہ، خلافت اور سوراج جیسے مسائل پر زور دیا۔

16.4 کل ہند خلافت کمیٹی کا قیام (Establishment of the All-India Khilafat Committee)

ترکی میں اتحادی طاقتوں کی طرف سے اٹھائے گئے اقدامات پر ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ مارچ 1919 میں، علی برادران، مولانا ابوالکلام آزاد، اجمل خان اور حسرت موہانی کی قیادت میں کل ہند خلافت کمیٹی بمبئی میں قائم کی گئی، جس نے برطانوی حکومت کو ترکی کے ساتھ اپنا رویہ بدلنے پر زور دیا۔ اس طرح ملک گیر احتجاج کی بنیاد تیار ہوگئی۔ مرکزی خلافت کمیٹی کا اجلاس جون 1920 کو الہ آباد میں ہوا۔ اجلاس میں کانگریس اور خلافت کے کئی رہنماؤں نے شرکت کی، اور حکومت کے ساتھ عدم تعاون کے پروگرام کا اعلان کیا گیا۔ اس پروگرام میں مندرجہ ذیل نکات شامل تھے:

- حکومت کی طرف سے عطا کردہ اعزازات کا بائیکاٹ۔
- سول سروس، فوج، پولیس اور تمام سرکاری ملازمتوں کا بائیکاٹ۔
- حکومت کی طرف ٹیکس کی غیر ادائیگی۔

4 اور 9 ستمبر 1920 کے درمیان کلکتہ کے خصوصی کانگریس اجلاس میں گاندھی نے بھی پنجاب میں ہوئے مظالم، مسئلۂ خلافت اور سوراج (خود حکمرانی) کے حصول کی بنیاد پر سول سروسز، پولیس اور فوج کے بائیکاٹ اور ٹیکس کی عدم ادائیگی پر زور دیا۔

نومبر 1919 میں دہلی میں کل ہند خلافت کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں گاندھی اور نہرو جیسے کانگریسی رہنماؤں نے شرکت کی۔ انڈین نیشنل کانگریس نے ترکی کے ساتھ ہونے والی غلطیوں کا ازالہ کرنے اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ہندو مسلم اتحاد کے حصول کے لیے خلافت تحریک کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے ترکی کی حالتِ زار پر ناراضگی ظاہر کرنے کے لیے جنگ کے بعد جشن فتح کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ، انہوں نے برطانوی اشیاء کا بائیکاٹ کرنے اور حکومت کے ساتھ عدم تعاون کا بھی فیصلہ کیا۔ دسمبر 1919 میں، خلافت کانفرنس امر تسر میں منعقد ہوئی، جس میں مولانا محمد علی اور شوکت علی نے شرکت کی، اور عوام کو متحرک کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد گاندھی نے سرکاری اسکولوں کے بائیکاٹ، سرکاری اعزازات سے دستبرداری، عدالتوں کے بائیکاٹ اور قانون ساز کونسلوں کی اصلاح پر زور دیا۔ اس کی تکمیل برطانوی کپڑوں کے بائیکاٹ، قومی تعلیمی اداروں کے قیام، قومی عدالتوں اور کھادی کپڑے کی مقبولیت سے کی گئی۔

فروری 1920 میں، گاندھی نے خلافت کمیٹی کو تجویز دی کہ وہ حکومت کے رویے کے خلاف عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کا پروگرام اپنائے۔ اپریل 1920 میں، شوکت علی نے انگریزوں کو خبردار کیا کہ اگر حکومت ہندوستانی مسلمانوں کو مطمئن کرنے میں ناکام رہی تو ہم عدم تعاون کی مشترکہ ہندو مسلم تحریک شروع کریں گے۔ انہوں نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا کہ یہ تحریک ایم۔ کے۔ گاندھی کی قیادت میں شروع ہوگی، جو ہندو اور مسلمانوں کی نظر میں ایک قابل احترام شخصیت ہے۔ 9 جون 1920 کو الہ آباد میں خلافت کمیٹی نے متفقہ طور پر عدم تعاون کی تجویز اور گاندھی کی قیادت کو قبول کیا۔

16.5 خلافت تحریک کا آغاز (Beginning of the Khilafat Movement)

ہندوستان میں خلافت تحریک ترکی میں خلیفہ کے ادارے کی حفاظت کے لیے وجود میں آئی۔ اسلامی روایت میں خلیفہ کو پیغمبر اسلام کا جانشین، مومنوں کا سپہ سالار اور مسلمانوں کے مقدس مقامات کا نگہبان اور محافظ سمجھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی میں سلطنت عثمانیہ واحد اسلامی سلطنت تھی، اور اسی لیے ترکی کے سلطان کو ہندوستانی مسلمانوں نے خلیفہ کے طور پر بہت اہمیت دی۔ چونکہ پہلی جنگ عظیم میں ترکی کو شکست ہوئی تھی اور یہ یقینی تھا کہ فاتح اتحادی طاقتیں اس پر سخت شرائط عائد کریں گے۔ اس لیے، ہندوستان کے مسلمانوں نے خلیفہ کے ساتھ نرمی برتنے اور سلطنت عثمانیہ کی علاقائی سالمیت کے تحفظ کے لیے خلافت تحریک شروع کی۔

خلافت تحریک کے نظریاتی ماخذ کی وضاحت دو طریقوں سے کی گئی ہے۔ ایک طرف علمائے کرام نے اسے نظریہ 'الوحدۃ الاسلامیہ' یا اتحاد اسلامی (Pan-Islamism) کے جذبات میں پایا ہے۔ دوسری طرف، کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ اس تحریک نے اتحاد اسلامی کی علامتوں کا استعمال کرکے کل ہند (Pan-India) مسلم شناخت بنانے اور اسے ہندوستانی قوم پرستی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے کیا ہے۔ اس طرح، خلافت کو ہندوستانی مسلم قیادت کی جانب سے اتحاد اسلامی اور ہندوستانی قوم پرست جذبات کو ایک ساتھ لانے کی کوشش کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہی ترکیب تھی جس نے 1919 کے بعد عام لوگوں کو بڑے پیمانے پر متحرک کیا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے اتحاد کی جستجو کو خلیفہ کے دفتر اور خلیفہ کی شخصیت میں ایک مذہبی مرکز ملا۔ انیسویں صدی کے اواخر سے ہی ہندوستانی سنی مسلمانوں نے ترکی کے سلطان کو خلیفہ کے طور پر تسلیم کیا۔ اس طرح، جب بھی ترکی کسی پریشانی میں مبتلا ہو جاتا تھا، اس وقت ہندوستانی مسلم رہنماؤں کے اندر اتحاد اسلامی کے جذبات ابھر آتے تھے۔ مثال کے طور پر، 78-1877 میں روس اور ترکی کے درمیان جنگ، 1897 میں یونان اور ترکی کے درمیان جنگ اور 13-1911 کے دوران بلقان جنگوں کا سلسلہ، جس سے مسلم رہنماؤں کے ذہنوں میں یہ خوف پیدا ہوا کہ عیسائی طاقتیں سلطنت عثمانیہ اور خلیفہ کی طاقت کو کچلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد یہ جذبات پھر سے منظر عام پر آئے۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی، جرمنی اور آسٹریا کے ساتھ اتحادی طاقتوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد برطانوی حکومت نے ترکی کے اقتدار کو کمزور کر دیا۔ ترکی پر ایک سخت معاہدہ مسلط کیا گیا، جس کے ذریعے اسے متعدد علاقوں اور اثر ورسوخ سے محروم کر دیا گیا۔ ان حالات میں، ہندوستانی مسلمانوں نے ایک تحریک شروع کی، جس نے مطالبہ کیا کہ خلیفہ کو مسلمانوں کے مقدس مقامات پر اپنا کنٹرول برقرار رکھنا چاہیے اور خلیفہ کے پاس کافی علاقے چھوڑ دیے جائیں تاکہ وہ مقدس مقامات کا دفاع کر سکے۔ یہ تحریک اشراف طبقے کے ساتھ ساتھ مقبول شہری طبقے اور مسلم مذہبی دانشوروں میں بھی تیزی سے پھیل گئی۔ برطانوی حکومت کو دشمن قرار دیا گیا، خلافت تحریک کی مالی امداد کے لیے مسلمانوں نے پیسے اور زیورات وقف کیے، خلافت کے جلسوں میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی اور سرحدی علاقوں سے ہزاروں لوگوں نے دشمن کی سرزمین سے مسلم آبادی والے علاقوں میں ہجرت کی۔

تحریک نے اپنی قیادت دو دھاروں سے حاصل کی۔ دونوں دھارے نوآبادیاتی حکمرانی کے تناظر میں مسلمانوں کے لیے تعلیمی اصلاحات میں شامل تھے۔ ان میں سے ایک علی گڑھ میں مقیم مغرب زدہ دانشور تھے جنہوں نے انگریزی تعلیم کی وکالت کی اور سرکاری خدمات میں ملازمت کے لیے مہم چلائی۔ دوسرے وہ علماء تھے جنہوں نے مدارس پر مبنی روایتی اسلامی نظام تعلیم کو مضبوط کرنے کی کوشش کی اور انگریزی تعلیم اور مغربی آداب کی مخالفت کی۔ ان دو دھاروں کی قیادت نے تحریک میں ایک تغیر پیدا کیا۔ مغربی تعلیم یافتہ قیادت نے عام طور پر اعتدال پسندی کی کوشش کی، جب کہ علمائے کرام نے اس تحریک کو ایک بنیاد فراہم کی۔ تاہم، یہ دونوں دھارے برطانوی مخالف مؤقف اور اسلامی مقصد کی حمایت میں متحد تھے۔ گاندھی، عبدالباری اور علی برادران کے درمیان قریبی روابط قائم تھے۔ گاندھی نے 'اعتدال پسند' اور 'بنیاد پرست' خلافت رہنماؤں؛ اور خلافت تحریک کے رہنماؤں اور ہندو سیاست دانوں کے درمیان ثالثی کا کردار بخوبی نبھایا۔ دسمبر 1919 میں علی برادران اور ابوالکلام آزاد کی رہائی کے بعد، یہ تحریک دوسرے اور بنیاد پرست مرحلے میں داخل ہوئی۔ اس کے بعد ہی خلافت قیادت بمبئی کے تاجروں کے ہاتھوں سے نکل کر متحدہ صوبوں کے صحافیوں اور مبلغین کے پاس چلی گئی۔ متحدہ صوبوں میں چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں محنت کش یا کسان مسلم آبادی نے مقامی مساجد اور مقامی اخبارات کے ذریعے تحریک کو مقبولیت بخشنے میں بہترین کردار ادا کیا۔

تحریک کو صحیح طریقے سے منظم کرنے کے لیے قیادت نے دو کل ہند تنظیمیں، مثلاً، کل ہند خلافت کمیٹی اور جمعیت العلماء ہند قائم کیں۔ اس سے پہلے کی معروف سیاسی تنظیم مسلم لیگ 1920 کے وسط تک ان دونوں تنظیموں کے زیر سایہ رہی۔ اس طرح 1919 میں

خلافت کے مطالبات کے لیے مسلم کمیونٹی کو متحرک کرنے کی مہم شروع ہوئی۔ تاہم، یہ بات بالکل واضح تھی کہ انگریزوں کے خلاف لڑائی اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ غیر مسلم ہندوستانیوں کو بھی سامراج مخالف جدوجہد میں متحرک نہ کیا جائے۔ اس وقت غیر مسلم قیادت میں کانگریس بحیثیت ایک قوم پرست تنظیم اور ایم۔ کے۔ گاندھی، ایک قابل قبول رہنما کے طور پر سب سے موزوں انتخاب تھے۔ گاندھی خلافت تحریک کی قیادت کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد کے لیے بالکل تیار تھے، لیکن انڈین نیشنل کانگریس ابھی تک کل ہند تحریک کے لیے تیار نہیں تھی۔ تاہم، مختلف دیگر حالات نے بہت سی سامراج مخالف تنظیموں اور رجحانوں کا ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہونا ممکن بنادیا۔ خلافت تحریک کا یوپی گروہ، بمبئی خلافت کمیٹی سے زیادہ بنیاد پرست تھا، جس نے اپنا نام بدل کر مرکزی خلافت کمیٹی رکھ لیا تھا۔ 1919 کے اواخر تک اس گروہ نے تحریک کو کنٹرول کیا تھا۔ خلافت تحریک کو مسلم آبادی کے تمام طبقات کو متحرک کرنے کے لیے، اسلامی اتحاد کی ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا۔ علاوہ ازیں، اس تحریک کے رہنماؤں نے ہندوؤں سے تعاون مانگنے کی بھی اجازت دی۔

16.6 خلافت تحریک کے مطالبات (Demands of the Khilafat Movement)

خلافت تحریک کے مندرجہ ذیل مطالبات تھے:

- سلطنت عثمانیہ کی علاقائی سالمیت کو قائم رکھا جائے۔
- خلافت کے ادارے کو برقرار رکھا جائے۔
- مقدس مقامات کو ترک حکومت کی تحویل میں رہنا چاہیے۔
- جزیرۃ العرب، بشمول میسوپوٹامیا(Iraq)، عرب، شام(Syria)اور فلسطین جس میں مقدس مقامات موجود ہیں، ہمیشہ خلافت کے براہ راست زیر تسلط رہنا چاہیے۔
- خلافت تحریک کا مقصد خلیفہ کی وقتی طاقت کا تسلسل تھا۔

21 مارچ 1920 کو محمد علی نے خلافت تحریک کے مطالبات پیرس میں سفارت کاروں کے سامنے کی گئی تقریر میں کچھ اس طرح سے پیش کیے تھے کہ ’خلافت عثمانیہ کی علاقائی سالمیت پر کوئی آنچ نہیں آنی چاہئے، عقیدے کی دفاع کے لیے خلیفہ کے پاس کافی طاقت ہونی چاہئے، جزیرۃ العرب میں بغیر کسی حکم یا تحفظ کے مسلمانوں کا کنٹرول رہنا چاہئے اور یہ کہ پہلے کی طرح خلیفہ تمام مسلم مقدس مقامات کا پاسبان اور نگہبان ہونا چاہئے۔‘ علی برادران نے لکھنؤ میں فرنگی محل کے علماء کی بھی حمایت کی، جنھوں نے ملک گیر ہڑتال پر زور دیا، اور 23-22 نومبر کو دہلی میں کل ہند خلافت کانفرنس میں عدم تعاون تحریک کی تجویز رکھی۔

16.7 کانگریس اور مسئلہ خلافت (Congress and the Khilafat Question)

یہ بالکل واضح تھا کہ خلافت تحریک کی کامیابی کے لیے کانگریس کی حمایت ضروری تھی۔ اگرچہ گاندھی خلافت کے مسئلے پر حکومت کے خلاف ستیہ گرہ اور عدم تعاون شروع کرنے کے لیے تیار تھے، لیکن کانگریس اس سیاسی کاروائی پر متحد نہیں تھی۔ تلک مذہبی معاملے میں

مسلم رہنماؤں کے ساتھ اتحاد کرنے کے مخالف تھے اور وہ سیاست میں ستیہ گرہ کے اصول پر بھی مشکوک تھے۔ پروفیسر رویندر کمار لکھتے ہیں کہ گاندھی نے تلک کو ستیہ گرہ کی خوبیوں اور مسئلہ خلافت کی مطابقت کے بارے میں سمجھایا۔ اس طرح، گاندھی نے خلافت تحریک کے موقع پر عدم تعاون کی سیاسی کاروائی کو اپنانے کے لیے کانگریس پر زور ڈالا، کیونکہ یہ محسوس کیا گیا کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے اور مسلم عوام کو قومی تحریک میں شامل کرنے کا سنہری موقع ہے۔ لوگوں کے اندر یہ احساس جگانے کی کوشش کی گئی کہ اب سماج کے مختلف طبقات یعنی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، کسان، کاریگر، سرمایہ دار، قبائلی لوگ، خواتین، طالب علم، وغیرہ، اپنے حقوق کے لیے قومی تحریک میں آسکتے ہیں۔ پنجاب سانحہ اور ہنٹر کمیٹی کی متعصبانہ رپورٹ کے بعد کانگریس آئینی جدوجہد پر اعتماد کھو رہی تھی۔ اس کے علاوہ، کانگریس کو معلوم تھا کہ عوام اپنے عدم اطمینان کو ظاہر کرنے کے لیے بیتاب ہیں۔

16.8 گاندھی کی قیادت میں خلافت اور عدم تعاون تحریکوں کا اشتراک

(Collaboration of Khilafat and Non-Cooperation Movements under the Leadership of Gandhi)

گاندھی قومی سیاسی منظر نامے پر چمپارن، کھیڑا اور احمد آباد میں کسانوں اور مزدوروں کی جدوجہد میں تعمیری مداخلت کے بعد ابھرے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد، وہ کانگریس کی قیادت کے لیے تقریباً ایک متفقہ امیدوار کے طور پر سامنے آچکے تھے۔ عدم تشدد میں ان کا یقین اور ستیہ گرہ کے ذریعے ان کی جدوجہد کا طریقہ بھی لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا۔ رولٹ مخالف احتجاج اور خلافت تحریک جنگ عظیم کے بعد دو بڑی تحریکیں تھیں جو نوآبادیاتی حکومت کے خلاف چلائی گئیں، اور گاندھی نے ان دونوں میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی قیادت ہی نے اس دور میں سامراج مخالف دو دھاروں یعنی سامراج مخالف تحریک اور خلافت تحریک کا اتحاد ممکن بنایا۔ خلافت تحریک کے رہنما شروع سے ہی اپنے مقصد کے لیے ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بہت پرجوش تھے۔ اس کوشش میں انہوں نے گاندھی کو اپنا سب سے مضبوط اتحادی پایا۔ گاندھی نے کوشش کی کہ کانگریس کے 'خود حکمرانی' کے مطالبے کو مسئلۂ خلافت کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ مسلمانوں کے مسئلے کے مناسب حل میں ہی سوراجیہ کے حصول کی دلیل ہے۔" اس کوشش نے ایک بے مثال ہندو مسلم اتحاد کو جنم دیا جس کی عکاسی نوآبادیاتی حکمرانی کے خلاف بعد میں ہونے والی عوامی تحریکوں میں ہوئی۔ رولٹ مخالف مظاہروں کے دوران، ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک ساتھ مظاہرے کیے، اور اتحاد کی علامتیں کھل کر سامنے آگئیں۔ خلافت رہنماؤں نے مسلمانوں کو عید الاضحی کے تہوار کے لیے گائے کو قربان نہ کرنے کی تلقین کی۔ آریہ سماج کے رہنما سوامی شردھانند سے درخواست کی گئی کہ وہ دہلی کی جامع مسجد کے منبر سے تقریر کریں۔ امرتسر میں، ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو گولڈن ٹیمپل کی چابیاں سونپی گئیں۔ کلکتہ میں، ہندوؤں کو پہلی بار ناخدا مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دی گئی۔ بمبئی میں، دونوں برادریوں کے رہنماؤں نے پرجوش انداز میں ممنوعہ سیاسی ادب فروخت کیا۔

ابتدا میں خلافت کمیٹی نے اعتدال پسند موقف اختیار کیا۔ کمیٹی کی سرگرمیاں صرف ملاقاتوں، درخواستوں اور وفود تک محدود تھیں تاکہ پیرس امن کانفرنس میں ترکی کے ساتھ بہتر سلوک کیا جا سکے۔ تاہم، یہ علمائے کرام کا عسکریت پسندانہ رجحان تھا جس نے تحریک کو امن کے حدود سے باہر دھکیل دیا۔ عسکریت پسند تحریک کے حامیوں نے رولٹ مخالف احتجاج کی بھرپور حمایت کی، اور نوآبادیاتی حکومت کے

خلاف عدم تعاون تحریک کی ترغیب پیش کی۔ 17 اکتوبر 1919 کو کل ہند یوم خلافت منایا گیا جو ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ بازار بند کیے گئے، روزوں کا اہتمام کیا گیا، نمازیں ادا کی گئی، جلسے منعقد کیے گئے اور حکومت کے خلاف احتجاج کیے گئے۔ دہلی، مدراس اور بمبئی میں اپنے رہنماؤں کو سننے کے لیے بڑی تعداد میں سامعین جمع ہوگئے۔ یہ واضح تھا کہ نئی مسلم قیادت زیادہ تر شہری آبادی تک پہنچ رہی تھی۔ اس تناظر میں، 24-23 نومبر 1919 کو دہلی میں ایک کل ہند خلافت کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں گاندھی کو بھی بلایا گیا۔ کانفرنس نے پیرس امن معاہدے میں ترکی کے ساتھ کیے گئے غیر منصفانہ سلوک کی صورت میں کچھ اہم قراردادیں پاس کیں۔ کانفرنس کے تشکیل شدہ پروگرام میں مسلمانوں کی طرف سے امن کی تقریبات کا بائیکاٹ، حکومت کے ساتھ عدم تعاون اور برطانوی اشیاء کا بائیکاٹ شامل تھا۔ گاندھی کو خلافت تحریک کا وہ سرکردہ رہنما قرار دیا گیا، جس کو ہندو اور مسلمان عزت اور تعظیم کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ گاندھی خود اپنی قوم پرست تحریک کے لیے ہمہ جہت حمایت چاہتے تھے اور اس لیے وہ دونوں تحریکوں کو ایک ساتھ لانے کے خیال کے خلاف نہیں تھے بشرطیکہ وہ ان کے طرز سیاست کے مطابق ہوں۔ اس طرح، 1920 کے اوائل میں انہوں نے اعلان کیا کہ خلافت کا مسئلہ آئینی اصلاحات (1919) اور پنجاب کے مظالم سے بھی زیادہ اہم ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر امن کی شرائط ترکی کے مفادات کے خلاف ہوئیں، تو وہ عدم تعاون کی تحریک شروع کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے علاوہ، وسیع پیمانے پر عدم تعاون تحریک شروع کرنے کے لیے دیگر مسائل بھی موجود تھے۔ مثال کے طور پر، حکومت نے رولٹ قانون کو منسوخ کرنے سے انکار کر دیا تھا، پنجاب کے مظالم کی تفتیش کے لیے منتخب کی گئی ہنٹر کمیٹی نے قصورواروں کو بچانے کی کوشش کی، برطانوی ہاؤس آف لارڈز نے جنرل ڈائر کے گھناؤنے جرائم کے حق میں ووٹ دیا تھا، برطانیہ میں جنرل ڈائر کی بہادری کے لیے عوام نے 30 ہزار پاؤنڈ کی رقم بطور تحفہ پیش کی تھی۔

پیرس امن معاہدے کے شرائط، جو مئی 1920 میں عام ہوئے، خلافت رہنماؤں کی خواہشات پر کاری ضرب ثابت ہوئی۔ ترکوں کے زیر قبضہ عثمانی سلطنت کو متعدد ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا۔ عرب ممالک کو سلطنت عثمانیہ سے آزاد قرار دیا گیا۔ شام، فلسطین اور میسوپوٹامیا کو فرانسیسی اور برطانوی مینڈیٹ کے تحت رکھا گیا۔ مشرقی تھریس (Thrace) اور سمرنا (Smyrna) کو یونان کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ قسطنطنیہ ترکی کے ساتھ رہا، لیکن آبنائے باسفورس کو بین الاقوامی نگرانی کے تحت رکھا گیا۔ ترکوں کے جذبات کی ایسی تذلیل سے بیشتر ہندوستانی مسلمانوں کو بہت تکلیف ہوئی۔ 2-1 جون 1920 کو الہ آباد کے خلافت کانفرنس اجلاس میں کانگریس کے اراکین کے ساتھ ہوئی نشست میں حکومت کے خلاف عدم تعاون پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا، جس میں مندرجہ ذیل نکات شامل ہیں:

- حکومت کی طرف سے عطا کردہ القابات سے دستبردار ہونا۔
- تمام اقسام کی سرکاری ملازمتوں سے استعفیٰ دینا، بشمول فوج اور پولیس۔
- حکومت کی طرف ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرنا۔

گاندھی اور خلافت رہنما جلد از جلد عدم تعاون تحریک شروع کرنے کے خواہشمند تھے۔ تاہم اس کے لیے کانگریس کی حمایت ضروری تھی۔ کانگریس کے بعض رہنما خلافت تحریک کی مخالفت کر رہے تھے کیونکہ انہیں لگتا تھا کہ خلافت جیسے مذہبی مسئلے ہندوستانی

سیاست کی ترقی کے لیے ساز گار نہیں ہو سکتے۔ ان کے خدشات کسی حد تک درست تھے، کیونکہ خلافت تحریک کا تاریخی پس منظر اور ذخیرۂ الفاظ مکمل طور پر اسلامی نظریات اور بیان بازی سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ان میں سے مولانا آزاد جیسے بہترین قوم پرستوں کے دلائل، غیر مسلموں کے ایک گروہ (یعنی ہندوؤں) کے ساتھ غیر مسلموں (یعنی انگریزوں) کے دوسرے گروہ کے خلاف اتحاد کی حمایت کرتے تھے۔ تحریک کے پورے دورانیہ میں، دو برادریوں کو انگریزوں کے خلاف متحد کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا، جو ترکی میں خلیفہ کے خلاف اور ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے خلاف جارح سمجھے جاتے تھے۔ لہٰذا، خلافت تحریک اگرچہ سامراج مخالف تھی، لیکن اس کا تلفظ اور لہجہ بنیادی طور پر اسلامی تھا۔

تاہم، تحریک کے دوران مضبوط قوم پرست جذبات کا اظہار پایا گیا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے قیام پر زور دیا گیا۔ مزید برآں، خلافت کے رہنماؤں نے دل کی عمیق گہرائیوں سے قوم پرست اور سامراج مخالف تحریک کی حمایت کی۔ یہ تحریک گاندھی اور کانگریس نے رولٹ قانون کے خلاف شروع کی تھی اور مسلمانوں کو اس میں بھرپور حصہ لینے کی تلقین کی تھی جس کے نتیجے میں اس تحریک کو زبردست کامیابی نصیب ہوئی۔ گاندھی اور شوکت علی نے مل کر ملک بھر کا دورہ کیا اور عدم تعاون کی حمایت کو متحرک کیا۔ گاندھی کی قیادت میں خلافت کے دیگر قائدین بھی اس مقصد کی حمایت میں رضامند اور سرگرم تھے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ 1920ء کے موسم گرما میں ان دونوں تحریکوں کا ارتکاز ہوا تھا۔

16.9 ریاستی جبر (Government's Repression)

مئی 1921 میں، گاندھی اور وائسرائے ریڈنگ کے درمیان مذاکرات ناکام رہے کیونکہ حکومت چاہتی تھی کہ گاندھی علی برادران کو ترغیب کرے کہ وہ اپنی تقریروں میں شدت اختیار کرنے سے گریز کریں۔ گاندھی نے محسوس کیا کہ حکومت ان کے اور خلافت رہنماؤں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس جال میں پھنسنے سے انکار کر دیا۔ دسمبر 1921 میں، حکومت نے مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا۔ رضاکاروں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا، جلسے منعقد کرنے پر روک لگا دی گئی، اخبارات پر پابندی عائد کی گئی اور متعدد رہنماؤں (ماسوائے گاندھی) کو گرفتار کر لیا گیا۔ اگلے دو مہینوں میں ملک بھر میں خلافت اور عدم تعاون تحریک میں حصہ لینے والے 30,000 سے زیادہ افراد کو گرفتار کیا گیا۔ اس طرح جبر کا سلسلہ جاری رہا اور کانگریس اور خلافت کے دفاتر پر چھاپے ڈال کر لوگوں کی سرگرمیوں کو قابو میں لانے کی کوشش کی گئی۔

16.10 خلافت تحریک کا خاتمہ (End of the Khilafat Movement)

ادارۂ خلافت کو برقرار رکھنے اور مسلمانوں کے مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے قائم کی گئی تحریک آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا کے ہاتھوں خلافت کا خاتمہ برصغیر ہند میں خلافت تحریک کے لیے ایک سنگین دھچکا تھا۔ انہوں نے آخری عثمانی خلیفہ سلطان عبدالمجید کو جلاوطن کر دیا، جس کی وجہ سے برصغیر میں خلافت تحریک کی تمام سرگرمیاں ختم ہو کر رہ گئیں۔ اے۔ آر۔ دیسائی لکھتے ہیں کہ

1922’ میں کمال پاشا، جو سلطنت عثمانیہ میں فوجی خدمات انجام دے رہا تھا، ایک قومی رہنما کے طور پر ابھرا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور قابض غیر ملکی افواج کے خلاف کاروائی کی۔ اس طرح، وہ غیر ملکی افواج کو ترکی سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا، جس سے ان کی حیثیت مضبوط ہو گئی۔ ‘نومبر 1922 میں ترکی میں اتاترک کی قیادت میں نئی سیاسی پیش رفت ہوئی جس نے خلیفہ کے اختیارات کو محدود کر دیا۔ 1922 میں اتاترک کو ریاست کا سربراہ منتخب کیا گیا، اور گرینڈ نیشنل اسمبلی کے ذریعے ریاست کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ ترکی ایک جمہوری ملک بن گیا۔ مارچ 1924 میں ترکی کی گرینڈ نیشنل اسمبلی نے خلافت کے ادارے کو ختم کر دیا۔ چنانچہ اس طرح، ترکی کی نئی قیادت نے اس مقدس ادارے کی جگہ لے لی۔ اس سے ہندوستانی مسلمانوں میں شدید ناراضگی پھیل گئی۔ انہوں نے ترکی میں متعدد وفود بھیجے، لیکن اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ جیسے ہی اس ادارے کو ختم کیا گیا، خلافت تحریک کمزور ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی۔

16.11 خلافت تحریک کی اہمیت (Significance of the Khilafat Movement)

پہلی جنگ عظیم کے بعد ملک میں نوآبادیاتی مخالف جذبات اور برطانوی سامراج کے خلاف متعدد شکایات کی وجہ سے لوگ متحد ہو چکے تھے، اور گاندھی اس وقت کے واحد مقبول ترین رہنما کے طور پر سامنے آ چکے تھے۔ مسئلۂ خلافت ہندوستانی سیاست سے براہ راست منسلک نہیں تھا لیکن گاندھی نے اس تحریک کو انگریزوں کے خلاف ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے کے لیے استعمال کیا۔ یہ ہندوستان کی پہلی بڑی سیاسی تحریک تھی جس نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں عام لوگوں کو شامل کیا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے خلافت تحریک کے تحفظ اور بحالی کے لیے بے شمار قربانیاں دیں، لیکن بعض وجوہات کی بنا پر یہ کامیاب نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ غیر مسلموں نے بھی اس تحریک کی حمایت کی۔

خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں نے ہندوستانی عوام میں سامراج مخالف شعور پیدا کرنے اور پھیلانے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ اس نے مختلف برادریوں کے درمیان ایک قابل ذکر اتحاد قائم کیا۔ دونوں تحریکوں نے مختلف مسائل کے باوجود عدم تشدد اور عدم تعاون کا ایک متفقہ لائحہ عمل اپنایا۔ اس دور میں کانگریس اور مسلم لیگ کا اتحاد بھی دیکھنے میں آیا۔ پورے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر سامراج مخالف جدوجہد میں حصہ لیا، اور ایسی صورتحال پیدا ہوئی کہ اکثر عدم تعاون تحریک اور خلافت تحریک کے اجلاسوں اور احتجاجوں میں فرق کرنا مشکل ہوتا تھا۔ مالابار کے واقعات کے علاوہ (جن میں مسلم کسانوں نے اپنے زیادہ تر ہندو جاگیر داروں کے خلاف بغاوت کی اور ان میں سے متعدد لوگوں کو قتل کیا)، ہندو مسلم اتحاد اس پورے عرصے میں برقرار رہا۔ بعض مقامات پر عدم تعاون تحریک کے دوران گرفتار ہونے والوں میں سے دو تہائی مسلمان تھے۔

ایک اور اہم مسئلہ جسے تحریک عدم تعاون نے سامنے لایا وہ ذات پات کے امتیاز اور اچھوت کے خلاف لڑنے کی ضرورت تھی۔ پہلی بار قومی سیاست میں اس مسئلے کو ایم۔ کے۔ گاندھی نے پیش کیا۔ اس کے بعد یہ مسئلہ قوم پرست سیاست کے لیے کافی اہم بن گیا۔ سماجی انصاف کی ضرورت کو واضح طور پر تسلیم کیا گیا اور بعد میں اسے آزاد ہندوستان کے آئین میں شامل کیا گیا۔ اس وقت آبادی کے مختلف طبقوں کے درمیان مضبوط نوآبادیاتی مخالف تحریکیں چل رہی تھیں۔ اس عرصے کے دوران شہری اور دیہی دونوں علاقوں میں متوسط طبقے کے علاوہ کسان

اور مزدور خاص طور پر سر گرم تھے۔ اس دوران کئی کسان اور مزدور تحریکیں بھی شروع ہوئیں۔ سنہ 1921 میں 396 ہڑتالیں ہوئیں جن میں 600,351 مزدور شامل تھے۔ اس کے علاوہ، متعدد مقامات پر نمایاں کسان تحریکیں چلائی گئیں۔ متحدہ صوبجات کے مشہور علاقے اودھ میں، راجستھان کے میواڑ میں اور شمالی بہار کے کئی اضلاع میں کسانوں کی متعدد مضبوط کسان تحریکیں شروع کی گئی، جن میں لاکھوں لوگوں نے شمولیت اختیار کی۔ شہری علاقوں میں بھی متوسط طبقے کے مختلف گروہوں کی شرکت ملک بھر میں بے مثال تھی۔ مزید یہ کہ گاندھی کے عدم تشدد پر اصرار نے خواتین کی ایک بڑی تعداد کو تحریک میں شامل کیا۔ خواتین کا اس طرح متحرک ہونا اور خواتین کا ان کے گھروں کی چار دیواری سے باہر آنا بھی ایک بہت اہم واقعہ تھا۔ اس طرح، گاندھی کی قیادت میں ان تحریکوں نے کئی طریقوں سے ہندوستانی سیاست کے ڈھانچے میں انقلاب برپا کیا۔ اس تحریک کی سب سے اہم کامیابی ملک بھر کے مختلف طبقوں کے لوگوں کو متحرک کرنا، اور ان میں سیاسی اور سماجی شعور پیدا کرنا تھا۔ اس طرح، عام لوگ اب قوم پرستی اور سامراج مخالف منصوبے کے لیے لازم وملزوم ہو چکے تھے۔

خلافت تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست میں مذہبی نظریات بھی قائم کئے۔ ہندوستان کی سیاست میں مذہبی نظریہ کو مسلم لیگ نے نہیں بلکہ خلافت تحریک نے متعارف کیا۔ مسلم قوم پرستی اسلام کی تحریک نہیں بلکہ مسلمانوں کی تحریک تھی۔ یہ تحریک دراصل یوپی، بہار اور پنجاب کے غیر منحرف مسلم پیشہ ور افراد اور سرکاری ملازمت کے متلاشی تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلم متوسط طبقے کی نسلی تحریک تھی۔ ان کے مقاصد معمولی تھے، کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے ملازمتوں میں منصفانہ اور متناسب حصے اور اپنے مفادات کے لیے کچھ تحفظات سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ ہندوستان میں مسلم قومیت، مذہبی تحریک کے بجائے سیکولر تھی۔ بنیادی طور پر، یہ تحریک کوئی ہندو مخالف تحریک نہیں تھی۔

سمیت سرکار لکھتے ہیں کہ کس طرح نچلے طبقے کے مسلمانوں نے لفظ 'خلافت' کی الگ الگ طریقے سے تشریح کی۔ بعض نچلے طبقے کے مسلمانوں نے اسے موجودہ اقتدار کے خلاف ایک عام بغاوت سمجھ لیا تھا۔ مثال کے طور پر، متحدہ صوبجات میں اس تحریک کو اردو لفظ 'خلاف' (against) سے جوڑا گیا۔ مالا بار میں مشتعل موپلوں (Moplas) نے خلافت تحریک کو نمبودری جاگیر داروں کے خلاف بغاوت میں بدل دیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی عوامل تھے جنہوں نے مسلمانوں کے جذبات کو ابھارا اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں مزدوروں، کسانوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو مشتعل کیا۔ 1919-20 کی شدید احتجاجی لہر کی شروعات بمبئی، کانپور، جمال پور، مدراس، احمد آباد، جمشید پور اور بنگال کی مسلسل ہڑتالوں سے ہوگئی، جس میں اونی ملوں، ریلوے، بحری کمپنیوں، لوہے اور سٹیل کے کارخانوں اور جوٹ ملوں کے مزدوروں نے شمولیت کی۔ خلافت کی اہمیت کے بارے میں گیل مینالٹ لکھتے ہیں:

> خلیفہ، پیغمبر محمد کے جانشین، وفاداروں کے کمانڈر، زمین پر خدا کا سایہ جیسے اعلیٰ القابات امت اسلامیہ کے لیے خلافت کی علامتی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ نظریاتی طور پر خلیفہ سنی مسلمانوں کا روحانی اور وقتی رہنما ہوتا ہے، جو زمین پر خدائی انصاف کی حکمرانی کے دفاع اور توسیع کو یقینی بناتا ہے، اور اس طرح خدا کے مقصد کو آگے بڑھانے میں، تمام مسلمانوں کے لیے ابدی نجات کو یقینی بنانے میں مدد کرتا ہے۔

16.12 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ترکی پر برطانوی دباؤ اور پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطنت عثمانیہ کی وسعت میں آنے والی کمی کے تناظر میں مسئلہ خلافت ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تشویش کا باعث تھا۔ ہندوستان میں برطانوی نوآبادیت کی موجودگی کی وجہ سے یہ مذہبی جذبات اور بھی شدید ہوگئے۔ اس طرح ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی اور سامراج مخالف جذبات نے برطانوی نوآبادیت کے خلاف شدید ردعمل پیدا کیا۔ خلافت کے خاتمے کے باوجود، خلافت تحریک مسلمانوں کی سیاسی ترقی کی طرف ایک اہم پیش رفت تھی۔ مسلمانوں نے قیادت اور سیاسی تنظیم کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔ اس تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کو ترکی کے خلیفہ کی حمایت میں برطانیہ کے خلاف متحد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے اندر دنیا بھر میں اپنے مسلم بھائیوں کے لیے جذبات کو ابھارا۔ اسی تحریک کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر اپنے لیے الگ وطن کا خیال اور خواہش پیدا ہوئی۔ اس تحریک کے دوران پیش آنے والے دیگر مختلف واقعات کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ اب وہ انگریزوں پر مزید بھروسہ نہیں کرسکتے۔

دوسری طرف، نوآبادیاتی حکومت کی جانب سے جنگ کے بعد ہندوستانیوں کے ساتھ کیے گئے خود حکمرانی (Self-Rule) کے وعدے کو پورا کرنے کی ناکامی نے سیاسی طور پر سرگرم گروہوں میں ناراضگی پیدا کی۔ اس کے علاوہ، رولٹ ایکٹ اور اس کے بعد جلیانوالہ باغ قتل عام نے ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد کے جذبات کو مزید مجروح کیا۔ اس وقت، گاندھی نے تحریک آزادی کو ایک قابل تعریف قیادت فراہم کی اور متعدد سامراج مخالف دھاروں کو متحد کیا، جو ملک میں مشہور عدم تعاون کی تحریک میں تبدیل ہوگئی۔ اگرچہ یہ تحریک ادارۂ خلیفہ کو بچانے اور ہندوستان میں خود مختار حکومت قائم کرنے میں ناکام رہی، لیکن اس نے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو متحرک کیا اور انہیں ان کے سیاسی حقوق کے بارے میں شعور بخشا۔ ملک کے متعدد گوشوں میں غریب اور بے اختیار لوگ دنیا کی طاقتور ترین سلطنت کے خلاف کھڑے ہوئے اور آزادی کے لیے آواز بلند کی۔ اپنے آپ میں یہ سب سے بڑی کامیابی تھی جس کی خواہش کوئی بھی تحریک کرسکتی ہے۔ تاہم، یہ تحریک بہت جلد اپنی اہمیت کھو بیٹھی جب خلافت کو ہی ختم کردیا گیا۔ نومبر 1922 میں اتاترک کو ترکی کی گرینڈ نیشنل اسمبلی کے ذریعے ریاست کا سربراہ مقرر کیا گیا اور مارچ 1924 میں اسی اسمبلی نے خلافت کے ادارے کو ختم کردیا۔ ترکی کو ایک سیکولر ریاست قرار دیا گیا۔ اس نے یورپی ماڈل کے قانونی نظام کو قائم کیا، خواتین کو حقوق فراہم کیے، تعلیم کو قومی سطح پر متعارف کیا اور صنعتی ترقی کے لیے اقدامات اٹھائے۔

16.13 کلیدی الفاظ (Keywords)

خلیفہ	:	لغوی اعتبار سے پیغمبر کا دنیاوی اور مذہبی جانشین، بعد میں اس عہدے کے کردار میں کئی بدلاؤ آئے۔
عدم تعاون	:	انگریزوں کے ساتھ عدم تعاون کی پالیسی، جو تعلیمی اداروں، عدالتوں، کونسلوں وغیرہ کے بائیکاٹ کے ذریعے ظاہر ہوئی۔ حکومت کے قوانین کی اطاعت سے انکار کرنا بھی اس میں شامل تھا۔
ستیہ گرہ	:	سچائی پر اصرار اور عدم تشدد کے فلسفے پر مبنی تحریک کا گاندھیائی طریقہ۔

سودیشی : مقامی، ملکی، گھریلو طور پر بنا ہوا۔

سوراج : خود حکمرانی۔

جزیرۃ العرب : جزیرۃ العرب سے مراد عراق، عرب، شام اور فلسطین ہے۔

16.14 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

16.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. خلافت کمیٹی کب قائم کی گئی؟
2. معاہدۂ ورسائی (Treaty of Versailles) کب طے پایا؟
3. جمعیت الانصار کس سال میں قائم ہوئی؟
4. 1920 میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کس نے کی؟
5. خلافت تحریک کب ختم ہوئی؟
6. رولٹ قانون کب پاس ہوا؟
7. پہلی جنگ عظیم کب ختم ہوئی؟
8. سلطنت عثمانیہ کے آخری خلیفہ کا نام بتائیے۔
9. سیورز معاہدہ کب طے ہوا؟
10. کل ہند یوم خلافت کب منایا گیا؟

16.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. خلافت تحریک کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔
2. خلافت تحریک کے مطالبات بیان کیجیے۔
3. کل ہند خلافت کمیٹی کے قیام پر ایک مختصر مضمون قلمبند کیجیے۔
4. خلافت تحریک کے اہم رہنماؤں پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
5. پہلی جنگ عظیم میں ہندوستانی مسلمانوں کے ذریعے برطانوی حکومت کی حمایت کن دو شرائط پر مبنی تھی؟ وضاحت کیجیے۔

16.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. گاندھی کی قیادت میں خلافت اور عدم تعاون تحریکوں کے اشتراک پر بحث کیجیے۔
2. کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ خلافت تحریک ناکام ثابت ہوئی، کیونکہ یہ ادارۂ خلافت کی بحالی میں ناکام رہی؟ بحث کیجیے۔

3. خلافت تحریک کی اہمیت پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔

16.15 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ashraf, K.M., *Hindu-Muslim Question and Our Freedom Struggle*, *1857–1935*, Vol. I (two volumes), Sunrise Publications, New Delhi, 2005.
2. Bandhopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition: A History of Modern India*, Orient Longman Private Limited, New Delhi, 2004.
3. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, 2014.
4. Brown, Judith, *Gandhi's Rise to Power*: *Indian Politics*, *1915–1922*, Cambridge University Press, 1972.
5. Chandra, Bipan, *Nationalism and Colonialism in Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 1979.
6. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin, New Delhi, 2000.
7. Grover and Grover, *A New Look at Modern Indian History*, S. Chand & Co. Ltd., New Delhi, 1983.
8. Islam, Shamsul, *Muslims against Partition*: *Revisiting the Legacy of Allah Bakhsh and Other Patriotic Muslims*, Pharos, New Delhi, 2015.
9. Kidwai, Hashim M., *The Life and Times of a Nationalist Muslim*, Universal Book House, Aligarh, 2015.
10. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal*: *A New History of British India*, HarperCollins, Noida, 2021.
11. Minault, Gail, *The Khilafat Movement*: *Religious Symbolism and Political Mobilization in India*, Oxford University Press, New Delhi, 1982.
12. Qasmi, Ali Usman and Megan Eaton Robb eds., *Muslims against the Muslim League*: *Critiques of the Idea of Pakistan*, Cambridge University Press, Delhi, 2017.
13. Sarkar, Sumit, *Modern India, 1885–1947*, MacMillan, New Delhi, 1982.
14. Shakir, Moin, *Khilafat to Partition*: *A survey of Major Political Trends among Indian Muslims during 1919–1947*, New Delhi, 1970.
15. Qureshi, Naeem M., *Pan-Islamism in British India*: *The Politics of the Khilafat Movement*, *1918–1924*, Oxford University Press, Karachi, 2009.

اکائی 17۔ سول نافرمانی اور ہندوستان چھوڑو تحریک

(Civil Disobedience and the Quit India Movements)

اکائی کے اجزا

17.0 تمہید

17.1 مقاصد

17.2 تاریخی پس منظر

17.3 سول نافرمانی تحریک

17.4 تحریک سے متعلق عوامی رد عمل اور علاقائی رجحانات

17.5 گاندھی ارون معاہدہ سے دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی تک

17.6 1932 کے اوائل میں سول نافرمانی تحریک کی بازیافت

17.7 سول نافرمانی تحریک کا تنقیدی جائزہ

17.8 سول نافرمانی تحریک کے اختتام سے اگست 1942 کی قرارداد تک

17.9 ہندوستان چھوڑو تحریک

17.10 ہندوستان چھوڑو تحریک کے ظہور کے اسباب

17.11 ہندوستان چھوڑو تحریک کی نوعیت

17.12 دوسری عالمی جنگ اور ہندوستان چھوڑو تحریک

17.13 1942 میں ہندوستان کی سیاسی صورتحال

17.14 تحریک کے علاقائی پہلو

17.15 اکتسابی نتائج

17.16 کلیدی الفاظ

17.17 نمونہ امتحانی سوالات

17.18 تجویز کردہ اکتسابی مواد

17.0 تمہید (Introduction)

اس اکائی میں سول نافرمانی تحریک (1930–34) اور ہندوستان چھوڑو تحریک (1942) کا تاریخی اور تنقیدی پہلو بیان کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ، اس میں گاندھی کی قیادت میں مربوط سامراجیت مخالف تحریک کی اہمیت کا جائزہ لیا جائے گا۔ سول نافرمانی تحریک (1930–34) نے عدم تعاون (1920–22) تحریک کے مقابلے سامراجیت مخالف جدوجہد کی سماجی رسائی کو وسیع کرنے میں ایک واضح پیش رفت کی۔ 1934 میں سول نافرمانی کی تحریک کے خاتمے کے نتیجے میں کانگریس کے اندر شدید اختلافات پیدا ہوئے۔ جب گاندھی نے عارضی طور پر فعال سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی، تو متعدد سوشلسٹ اور دیگر بائیں بازو کے رہنماؤں جیسے جے پرکاش نارائن، اچیوتا پٹوردھن، اشوک مہتا اور مینو مسانی نے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ 1937 کے انتخابات کے بعد، گاندھی نے عدم تشدد اور تعمیری پروگرام کی عمل آوری میں اپنا اعتماد ظاہر کیا۔ 1930 کی دہائی کے اواخر میں، کانگریس کے بائیں بازو کے رہنما جیسے بوس اور نہرو نے رجواڑہ ریاستوں میں زیادہ سے زیادہ مداخلت کی خواہش پر اصرار کیا، تاکہ انہیں برطانوی ہندوستان میں ہونے والی سیاسی پیش رفتوں کے برابر لایا جاسکے۔

ستمبر 1939 میں دوسری جنگ عظیم کے آغاز نے ہندوستانی سیاست میں نئے تغیرات پیدا کیے۔ بالآخر، لنلتھگو کے اگست تجاویز (1940) کے غیر متعینہ مستقبل میں ڈومینین اسٹیٹس (Dominion Status) کی پیشکش اور کرپس مشن (1942) کے دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر ڈومینین اسٹیٹس کی پیشکش نے کانگریس کو اگست قرارداد پاس کرنے پر مجبور کیا۔ اس طرح، 8 اگست 1942 میں کل ہند کانگریس کمیٹی نے "ہندوستان چھوڑو" کی قرارداد پاس کی، جس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ اگر اقتدار فوری طور پر ہندوستانیوں کے حوالے نہ کیا گیا تو گاندھی کی ہدایات کے مطابق بڑے پیمانے پر سول نافرمانی شروع کی جائے گی۔ ہندوستان چھوڑو تحریک کو بجا طور پر سب سے بڑی سامراج مخالف جدوجہد کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس تحریک نے 1942 کے بعد آنے والے پانچ سالوں میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں بے مثال اور ہنگامہ خیز واقعات پیدا کیے۔ ان واقعات میں بڑھتی ہوئی قوم پرستی، 1943 کے بنگال قحط کی وجہ سے متعدد اموات، برما اور ملایا میں جاپانی جارحیت کا ظہور، سبھاس چندر بوس کی 'آزاد ہند فوج' کا قیام اور فرقہ وارانہ صورتحال شامل ہیں۔

17.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- سول نافرمانی اور ہندوستان چھوڑو تحریک کے ظہور کے اسباب جان سکیں گے۔
- ان تحریکوں پر عوامی ردعمل کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- تحریک سے متعلق علاقائی رجحانات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- تحریکوں کی نوعیت اور اثرات کا تجزیہ کر سکیں گے۔

17.2 تاریخی پس منظر (The Historical Context)

1922 میں گاندھی کی طرف سے عدم تعاون تحریک کی معطلی کے فوراً بعد انڈین نیشنل کانگریس کی رکنیت میں زبردست کمی واقع ہوئی۔ کانگریس میں بہت سے لوگوں نے گاندھیائی حکمت عملی کی افادیت پر اعتماد کھو دیا اور نوجوانوں کے ایک حصے نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے انقلابی تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ مخالف تبدیلی (no-changers) گروہ نے دیہی علاقوں میں گاندھیائی تعمیری پروگرام پر توجہ مرکوز کی جبکہ حمایت تبدیلی (pro-changers) گروہ (یعنی سوراج کے حامی) کونسل کی سیاست میں شامل ہو گئے۔ خلافت اور عدم تعاون تحریک کے زوال کی وجہ سے قلیل مدتی مسلم لیگ اور کانگریس اتحاد بھی خطرے میں پڑ گیا۔ شمال مغربی ہند کے سرحدی علاقے میں کوہاٹ (Kohat) کے مقام پر فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ 1923 میں، سی۔ آر۔ داس کا ہندو مسلم معاہدہ ٹوٹ گیا، جس کے نتیجے میں اپریل 1926 میں کلکتہ میں شدید فسادات واقع ہوئے۔ 1923 اور 1927 کے درمیان متحدہ صوبوں میں 88 فسادات ہوئے جس کے نتیجے میں ہندو مسلم تعلقات تقریباً مکمل طور پر ٹوٹ گئے۔ اس صورتحال میں اچھوت بھی مایوس ہو گئے کیونکہ ان کے حالات کو بہتر بنانے کی مہم نے پورے ہندوستان میں منفی رد عمل محسوس کیا۔ اس کے برعکس، دوسرے پہلوؤں میں کچھ ایسی تبدیلیاں واقع ہوئیں جنھوں نے برطانوی راج کے خلاف عوامی تحریک کی بنیاد تیار کی۔ سب سے پہلے، برآمدات پر مبنی نوآبادیاتی معیشت 1920 کی دہائی کے اواخر میں ایک عظیم مالی بحران کا شکار ہو گئی۔ زرعی فصلوں کی قیمتوں میں تیزی سے کمی واقع ہوئی- اس طرح، سال 29–1928 میں، ہندوستان میں مزدوروں کی صورتحال بہت غمگین تھی، جس کی وجہ سے ملک کے اطراف واکناف میں احتجاج ہوا۔ اگرچہ مزدور طبقے نے خود مختاری کا مظاہرہ کیا، لیکن اس سرگرمی کے پیچھے ایک بڑا سبب کمیونسٹ ذہنیت کا اثر ورسوخ تھا- تاہم، 1930 تک، یہ کمیونسٹ اثر ورسوخ کم ہو گیا کیونکہ حکومت نے ان کے خلاف جابرانہ اقدامات اٹھائے۔

انتشار کی اس بے ترتیب صورتحال میں، 1927 کے اواخر سے ہندوستانی سیاست ایک بار پھر متحرک ہو گئی جب لندن کی ٹوری (Tory) حکومت نے ہندوستان میں آئینی نظام کا جائزہ لینے کے لیے سر جان سائمن کی قیادت میں ایک قانونی کمیشن مقرر کیا۔ کمیشن میں ہندوستانیوں کی عدم شمولیت نے ہندوستان کے تمام سیاسی گروہوں کی طرف سے احتجاج کو اکسایا اور اس کے نتیجے میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے ملک گیر بائیکاٹ میں حصہ لیا۔ 1928 کے اوائل میں جب سائمن کمیشن ملک میں آیا تو اس کا استقبال 'سائمن واپس جاؤ' جیسے نعروں سے کیا گیا۔ اس تناظر میں موتی لال نہرو نے مشترکہ ہندو مسلم آئینی اسکیم کے لیے بات چیت شروع کی اور اگست 1928 میں لکھنؤ میں ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس میں نہرو رپورٹ پیش کی۔ نہرو رپورٹ برطانوی ہندوستان میں آل پارٹیز کانفرنس کی اصلاحی تجویز تھی جس میں نئے ڈومینین اسٹیٹس (Dominion Status) اور وفاقی حکومت کے قیام کی اپیل کی گئی تھی۔ موتی لال چاہتے تھے کہ گاندھی اس اسکیم کی حمایت کریں، تاکہ کانگریس اسے آسانی سے قبول کرے۔ لیکن حصول سوراج کے لیے گاندھی کانگریس سے باہر عوام کو متحرک کرنا چاہتے تھے۔ اگر گاندھی کے لیے کانگریس کی زیر قیادت قوم پرست سیاست میں داخل ہونے کا ایک طریقہ نہرو رپورٹ تھا، تو دوسرا طریقہ 1928 کی باردولی ستیہ گرہ تھی۔ باردولی ستیہ گرہ کا آغاز 4 فروری 1928 کو گجرات کانگریس کمیٹی کے صدر ولبھ بھائی پٹیل نے کیا

تھا۔اگرچہ پٹیل نے مقامی ثالثوں کی مدد سے اس تحریک کو منظم کیا، لیکن یہ تحریک دراصل گاندھی کی تحریک تھی، کیونکہ انہوں نے پٹی دار کسانوں اور کالی پراج قبائیلیوں کو متحرک کرنے کے لیے گاندھی کا استعمال کیا۔اس تحریک کو قومی پریس میں بڑے پیانے پر پیش کیا گیا، کیونکہ یہ ولبھ بھائی پٹیل کی ایک شاندار کامیابی تھی۔ بار دولی ستیہ گرہ کی کامیابی نے گاندھی کو ایک بار پھر منظر عام پر لا دیا اور اس تحریک نے ان کے نظریہ کو ثابت کیا کہ ستیہ گرہ آئینی طریقوں سے زیادہ مؤثر ہے۔

اس کے علاوہ، 1929–33 کے عالمی اقتصادی بحران نے بھی قومی تحریک پر دور رس اثرات مرتب کیے۔ برطانوی نوآبادیاتی حکومت سیاسی اور اقتصادی کشیدگی کی وجہ سے 1920 کی دہائی کے اواخر اور 1930 کی دہائی کے اوائل میں ابھرتے ہوئے ہندوستانی مفادات کو ترتیب دینے میں ناکام رہی۔ لنکے شائر (Lancashire) سے کپڑے کی درآمدات نے مقامی صنعت کاروں کی پریشانی اور تشویش میں اضافہ کیا۔ مذکورۂ بالا صورتحال کو جواب دینے کے لیے کانگریس نے 1929 میں لاہور کے اجلاس میں ٹیکس کی عدم ادائیگی اور سول نافرمانی کے پروگرام کو مجاز ٹھہرایا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر برطانوی حکومت نے 1929 کے آخر تک نہرو رپورٹ کو قبول نہیں کیا، تو وہ آنے والے لاہور اجلاس میں سول نافرمانی کی مہم کا اعلان کریں گے۔ اگرچہ گاندھی کو مخصوص جگہ اور وقت پر تحریک شروع کرنے کا اختیار دیا گیا تھا، لیکن وہ شدت کے ساتھ اس تحریک کے لیے ایک معیاری ضابطے کی تلاش میں تھے۔

17.3 سول نافرمانی تحریک (The Civil Disobedience Movement)

فروری 1930 کے وسط میں، کانگریس ورکنگ کمیٹی نے سابرمتی آشرم کے اجلاس میں گاندھی کو مخصوص جگہ اور وقت پر تحریک شروع کرنے کا مکمل اختیار دیا۔ عوامی جدوجہد کا تجربہ کار ماہر، شدت سے اس تحریک کے لیے ایک معیاری ضابطے کا متلاشی تھا۔اس سلسلے میں گاندھی نے لارڈ ارون کے سامنے 31 جنوری 1930 تک گیارہ نکاتی پروگرام پر عمل آوری کی تجویز پیش کی۔ وہ 11 نکات مندرجہ ذیل ہیں:

1. نشہ آور اشیاء پر پابندی عائد کی جائے۔
2. روپیہ اور اسٹرلنگ کے درمیان تناسب کو تبدیل کریں۔
3. زرعی ٹیکس میں 50 فیصد کمی کی جائے۔
4. نمک ٹیکس اور حکومت کی نمک پر اجارہ داری کو ختم کیا جائے۔
5. فوجی اخراجات اور اعلیٰ درجے کے ملازموں کی تنخواہوں میں کمی کی جائے۔
6. سول انتظامیہ پر اخراجات کو کم کریں۔
7. غیر ملکی کپڑے پر محصول لگائیں۔
8. پوسٹل ریزرویشن بل (Postal Reservation Bill) کو قبول کیا جائے۔
9. سی۔آئی۔ڈی۔ ڈیپارٹمنٹ کو ختم کردیں۔
10. تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے۔

11. اپنے تحفظ کے لیے شہریوں کو اسلحہ رکھنے کی سند جاری کریں۔

گاندھی نے واضح کیا کہ اگر 11 نکاتی پروگرام کو نظر انداز کیا گیا تو کانگریس کے پاس سول نافرمانی کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہو گا۔ جب اروِن نے گاندھی کے اس پروگرام کو نظر انداز کیا تو کانگریس نے سول نافرمانی تحریک شروع کرنے کی تیاری کی۔ کانگریس کے مسلم ممبران، جیسے ڈاکٹر انصاری، ناخوش تھے کیونکہ فرقہ وارانہ اتحاد، سول نافرمانی تحریک کی کامیابی کے لیے ایک لازمی شرط تھا۔ مسلم لیگ نے اس تحریک کو ہندو راج قائم کرنے کی سازش قرار دیا۔ اسی طرح سکھوں کی حمایت بھی کانگریس سے دور ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ مدراس میں ہندو مہا سبھا اور جسٹس پارٹی ('Justice Party') کی طرح غیر کانگریسی ہندوؤں نے سول نافرمانی کی مخالفت کا اعلان کیا۔ کاروباری گروہ لاہور کی قرارداد کے غیر یقینی امکانات کے بارے میں خوفزدہ تھے، جب کہ نوجوان کانگریسی مزید عسکریت پسندانہ کارروائی کے لیے دباؤ ڈال رہے تھے۔ ان حالات میں، 26 جنوری 1930 کو "یوم آزادی" کے جشن نے پنجاب، متحدہ صوبوں، دہلی اور بمبئی کے لوگوں میں کافی جوش و خروش پیدا کیا۔ بہار میں جشن منانے کے نتیجے میں پولیس اور کانگریس کے رضاکاروں کے درمیان پر تشدد جھڑپیں ہوئیں۔

سمت سرکار کی درجہ بندی کے مطابق، گاندھی کا گیارہ نکاتی پروگرام ایک سمجھوتا تھا، جس میں چھ عام دلچسپی کے مسائل، تین مخصوص متوسط طبقے کے مفادات اور دو کسانوں کے مطالبات شامل تھے۔ یہ ایسے مطالبات تھے جن کے ذریعے ہندوستانیوں کو ایک بار پھر اعلیٰ سیاسی قیادت میں متحد کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح گاندھی نے آزادی کے تجریدی تصور کو مخصوص مطالبات سے جوڑ دیا۔ لیکن تمام مطالبات میں سے، نمک ٹیکس بہت سی وجوہات کی بنا پر سب سے اہم معلوم ہوتا تھا۔ اس نے آبادی کے تمام طبقوں کو متاثر کیا تھا۔ اس سے حکومتی مالیات یا کسی کے ذاتی مفادات کو کوئی خطرہ نہیں تھا اور نہ ہی یہ حکومتی جبر کو اکسا دیتا۔

فروری 1930 میں گاندھی نے نمک کے بارے میں کہا کہ 'پانی کے علاوہ نمک جیسی کوئی شئے نہیں ہے جس پر ٹیکس لگا کر حکومت لاکھوں بھوکے، بیمار، معذور اور بے بس لوگوں تک پہنچ سکتی ہے۔ اس لیے یہ محصول غیر انسانی اور غیر واجب ہے۔' انہوں نے وائسرائے اروِن کو مطلع کیا کہ 12 مارچ کو وہ سابرمتی آشرم سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نمک کے قانون کی خلاف ورزی کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے اور ڈانڈی کے ساحل پر پہنچ کر وہ نمک کے قانون کو توڑ دیں گے۔ یہ ایک شاندار تصوراتی منصوبہ تھا حالانکہ اس وقت چند لوگ ہی اس کی اہمیت کو سمجھ سکتے تھے۔ جب لوگ سابرمتی آشرم میں ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوئے، گاندھی نے اپنے منصوبوں کی وضاحت کی، مستقبل کے اقدامات کے لیے ہدایات دیں، لوگوں کو عدم تشدد کی ضرورت کے بارے میں خبردار کیا اور انہیں حکومت کے رد عمل کے لیے تیار کیا۔ گاندھی نے لوگوں سے کہا کہ جہاں بھی ممکن ہو، نمک کے قانون کی سول نافرمانی شروع کر دی جائے، شراب اور غیر ملکی کپڑوں کی دکانوں پر دھرنا دیا جائے، اگر لوگوں کے پاس مطلوبہ طاقت ہے تو وہ ٹیکس ادا کرنے سے انکار کریں، وکلاء اپنا پیشہ چھوڑ دیں، عوام قانونی عدالتوں کا بائیکاٹ کریں اور سرکاری ملازمین اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیں۔ میں صرف ایک ہی شرط پیش کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔ اور وہ یہ ہے کہ حصول سوراج کے لیے سچائی اور عدم تشدد کے عہد کو وفاداری سے برقرار رکھا جائے۔

سول نافرمانی تحریک میں نمک کے مسئلے کو مرکزی بنانے کی تجویز کافی فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ ارون نے بھی گاندھی سے مخاطب ہو کر کہا کہ 'آپ نے نمک کے معاملے میں ایک عمدہ حکمت عملی کی منصوبہ بندی پیش کی ہے۔' گاندھی نے 78 ارکان کے ساتھ، جن میں ہندوستان کے تقریباً ہر علاقے اور مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل تھے، 12 مارچ کو سابرمتی آشرم سے پیدل سفر شروع کیا اور احمد آباد سے ڈانڈی تک گجرات کے دیہاتوں سے ہوتے ہوئے تقریباً 240 میل تک کی دوری طے کی۔ 6 اپریل 1930 کو وہ ڈانڈی پہنچ گئے۔ گاندھی کے ذریعے نمک کے قانون کو توڑنے کا مطلب حکومت کے تئیں عوام کی وفاداری کے دعوے کو مسترد کرنا تھا۔ مزید برآں، ساحلی علاقوں میں نمک کی غیر قانونی پیداوار سے لوگوں کو بھی معمولی آمدنی حاصل ہو سکتی ہے۔ ڈانڈی مارچ اور ملک کے متعدد علاقوں میں نمک کے قانون کی خلاف ورزی نے ایک غیر متشدد عوامی جدوجہد کی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ جب گاندھی ڈانڈی کی طرف مارچ کر رہے تھے تو ان کے ساتھیوں نے لوگوں میں قوم پرستی کا پیغام پھیلانے، فنڈ اکٹھا کرنے اور شہروں اور دیہاتوں کا دورہ کرنے کا مشکل کام انجام دیا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اس طرح ایک ایسا پروگرام تیار کیا، جس سے ہندوستانی سماج بنٹنے اور تخریبی اثرات سے بچا رہے۔ لیکن اپریل کے اواخر دنوں میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں پر تشدد سرگرمیاں اور غیر منظم عوامی بغاوت شروع ہو گئی۔ نتیجتاً ہندوستان کے تقریباً تمام حصوں میں اس عوامی تحریک کی حوصلہ افزائی ہوئی جس میں نہ صرف غیر ملکی حکومت کے ساتھ عدم تعاون کیا گیا بلکہ مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے تحریک کے اصولوں کی حقیقی خلاف ورزی بھی کی گئی۔ یہاں تک کہ تین مختلف علاقوں میں حکومتی عملے کے خلاف تشدد کا استعمال کیا گیا۔ اس لحاظ سے، سمت سرکار کے مطابق سول نافرمانی تحریک، عدم تعاون تحریک کے مقابلے میں بنیاد پرست تھی۔

17.4 تحریک سے متعلق عوامی رد عمل اور علاقائی رجحانات

(Public Response to the Movement, and the Regional Trends)

جب ڈانڈی میں گاندھی کی غیر معمولی سیاسی سرگرمی سے سول نافرمانی کا آغاز ہوا، تو پورے ملک میں نمک کے قوانین کی خلاف ورزی شروع ہو گئی۔ ستیہ گرہیوں نے آسام، بنگال اور مدراس، سندھ، اڑیسہ اور بہت سے دوسرے مقامات پر جلوس نکالے۔ تمل ناڈو میں، سی راجگوپال چاری نے تروچیراپلی سے ویدارنیم تک مارچ کی قیادت کی۔ مالابار میں، کے۔ کیلاپن نے کالی کٹ سے پیانور تک مارچ کی قیادت کی۔ اڑیسہ کے سمندری ساحل پر مشہور گاندھیائی رہنما گوپابندھو چودھری نے کٹک سے انچوڈی تک ستیہ گرہیوں کی قیادت کی۔ آسام میں ستیہ گرہیوں نے نمک کی پیداوار کے لیے سلہٹ (Sylhet) سے نوکھالی (بنگال) تک پیدل سفر کیا۔ آندھرا میں، نمک ستیہ گرہیوں کے ہیڈ کوارٹر کے طور پر مختلف اضلاع میں متعدد سبیرام (کیمپ) قائم کیے گئے۔

اس عرصے میں ایک نئی قسم کی محصول کی عدم ادائیگی مہم وجود میں آ گئی جس میں چوکیداری ٹیکس ادا کرنے سے انکار کیا گیا۔ چوکیداروں اور دیہی پولیس کے چھوٹے دستے کی تنخواہ کو دیہاتوں پر لگائے جانے والے ٹیکسوں سے ادا کیا جاتا تھا۔ چوکیداروں کو اکثر حکومت کے حق میں کام کرنے والے جاسوس اور مقامی جاگیرداروں کے پاسبانوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ یہ تحریک چوکیداروں کو اپنے کام سے استعفیٰ کا مطالبہ کرتی تھی۔ اس طرح، مونگیر، سارن اور بھاگلپور اضلاع میں ٹیکس ادا کرنے سے انکار کیا گیا، چوکیداروں کو استعفیٰ دینے پر آمادہ کیا گیا

اور مزاحمت کرنے والوں کے خلاف سماجی بائیکاٹ کیا گیا۔ حکومت نے چند روپے ٹیکس کے عوض سینکڑوں اور ہزاروں روپیوں کی املاک اور جائیداد ضبط کر کے اور مار پیٹ اور تشدد سے بدلہ لیا۔ جب برسات کی وجہ سے بنگال میں نمک کی پیداوار مشکل ہو گئی، تب لوگوں نے چوکیداری مخالف اور یونین بورڈ مخالف احتجاج کی طرف دھیان دیا۔ دیگر جگہوں کی طرح، بنگال کے دیہاتیوں نے بہادری کا مظاہرہ کیا، ریاستی جبر کا مقابلہ کیا اور ضبطی اور تباہی سے ہزاروں روپے کی املاک کھو دی۔ چوکیداری ٹیکس کی عدم ادائیگی اور اس کے خاتمے کے مطالبے نے اڑیسہ کے ساحلی اضلاع میں برسات کے آغاز پر (بالخصوص بالاسور میں) ایک نئی بلندی حاصل کی۔ احتجاج کی اجتماعی شکلیں اور پولیس پر حملہ اس وقت منظر عام پر آیا جب سول نافرمانی تحریک کے دوران حکام نے چوکیداری ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرنے والے لوگوں کی جائیدادیں ضبط کرنے کی کوشش کی۔

محصول کی عدم ادائیگی کی تحریک ضلع سورت کے باردولی تعلقہ میں، بروچ میں اور جمبوسر میں بھی شروع ہوئی۔ اس خطے میں ہزاروں لوگوں نے اپنے مال مویشیوں کے ساتھ برطانوی ہندوستان سے شاہی ریاست (بروڈا) میں ہجرت کی، جہاں انہوں نے کھلے میدانوں میں مہینوں تک ڈیرے ڈالے۔ دوسری طرف برطانوی حکام نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے ان کے گھروں کو توڑا، ان کا سامان تباہ کر دیا اور ان کی زمینیں ضبط کر لی۔ پولیس نے ولبھ بھائی پٹیل کی اسّی سالہ ماں کو بھی نہیں بخشا، جو کرمساد (Karmasad) میں اپنے گھر میں کھانا پکا رہی تھی۔ ان کے برتنوں کو باہر پھینکا گیا اور کھانے کی اشیاء کو برباد کیا گیا۔ جب مارچ 1931 میں گاندھی ارون سمجھوتہ ہوا، اس کے بعد ہی کسان اپنے آبائی وطن کی طرف لوٹے۔

مہاراشٹر، کرناٹک، مرکزی صوبوں اور دیگر قبائلی علاقوں میں بڑے پیمانے پر جنگل سے متعلق قوانین کی خلاف ورزی کی گئی۔ کچھ جگہوں پر، جنگل سے متعلق قوانین کو توڑنے والے ہجوم کی تعداد 70,000 یا اس سے بھی زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ، کنن گھم فرمان (Cunningham Circular) کے جواب میں آسام کے طلباء نے زبردست احتجاج کیا۔ اس فرمان کے ذریعے طلباء اور ان کے سرپرستوں کو نوآبادیاتی حکومت کے ساتھ اچھے برتاؤ کی یقین دہانی پیش کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ دسمبر 1929 میں جواہر لال نہرو کے لاہور قرارداد نے ملک بھر کے عوامی رد عمل کو پرجوش بنایا۔ نہرو نے اپنے ہم وطنوں کو یاد دلایا کہ "یہ جھنڈا لہرایا گیا ہے اور اسے اس وقت تک نہیں گرایا جانا چاہیے جب تک ہندوستان میں کوئی ایک بھی ہندوستانی، مرد، عورت یا بچہ زندہ ہے"۔ شدید مظالم کا سامنا کرتے ہوئے قومی پرچم کی عزت کا دفاع انتہائی بہادری سے کیا گیا۔ ٹوٹانار سیانائیڈو کی مثالی ہمت نے اپنے ہاتھوں سے قومی پرچم کو چھوڑنے کے بجائے پندرہ رکنی پولیس فورس کے ہاتھوں بے ہوش ہونے کو ترجیح دی۔ اس کے بعد کالی کٹ میں مقیم ایک قوم پرست پی۔ کرشنا پلائی نے بھی اسی طرح کے عزم کا مظاہرہ کیا۔ ہاتھوں سے قومی پرچم چھیننے کی کوششوں کو ناکام کرنے کے لیے، سورت میں بچوں کے ایک گروہ کو قومی پرچم کے تین رنگوں میں کھادی کے ملبوسات پہنائے گئے۔

ابتدائی مہینوں میں، سول نافرمانی تحریک نے متحدہ صوبوں میں غیر معمولی رد عمل کا اظہار کیا، لیکن برطانوی جبر کے بڑھنے کے ساتھ ہی وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس تحریک میں محصول (revenue) کی عدم ادائیگی اور لگان (rent) کی عدم ادائیگی شامل کی گئی۔

محصول کی عدم ادائیگی زمینداروں کے لیے حکومت کو محصول ادا کرنے سے انکار کرنے کی ہدایت تھی اور لگان کی عدم ادائیگی کسانوں کے لیے لگان ادا نہ کرنے کا مشورہ تھا۔ چونکہ زمیندار بہت حد تک حکومت کے وفادار تھے، اس لیے بہت جلد یہ تحریک محصول عدم ادائیگی کی جدوجہد بن گئی۔

سول نافرمانی تحریک نے نوآبادیاتی مخالف سیاست کی قوم پرست شکلوں کو متحرک کیا اور مقبول بنایا۔ مثال کے طور پر، رضاکار دستوں کی تشکیل کی گئی، سوراج کے پیغام کو عام کرنے کے لیے شہروں اور دیہاتوں میں گھومنے کے لیے سنکرتن جلوسوں کی تنظیم کی گئی، جس میں دیہاتوں اور قصبوں میں خواتین اور بچوں سمیت لوگ صبح کے وقت قوم پرست گیت گاتے ہوئے گھومتے تھے؛ دیہی اور شہری علاقوں میں عوامی جلسوں کا انعقاد کیا گیا؛ جادوئی لالٹینوں کی نمائش کا انعقاد کیا گیا؛ قوم پرستانہ خیالات کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے دیہاتوں میں قوم پرست ادب پر مشتمل کتابچوں کی تشہیر کی گئی؛ اور خفیہ کانگریس کے آشرموں کا قیام قوم پرست سرگرمیوں کا مانوس طریقہ بن گیا۔ اپریل 1930 میں نمک کے قانون کی خلاف ورزی پر نہرو کی گرفتاری نے مدراس، کلکتہ اور کراچی میں زبردست مظاہروں کو جنم دیا۔ گاندھی کی گرفتاری 4 مئی 1930 کو ہوئی جب انہوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ مغربی ساحل پر دھرشانہ نمک کارخانے پر سول نافرمانی کی قیادت کریں گے۔ گاندھی کی گرفتاری کے بعد بمبئی، دہلی، کلکتہ اور شولاپور میں زبردست احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ ان کی گرفتاری کے بعد، کانگریس ورکنگ کمیٹی نے تین اہم اقدامات کی منظوری دی، جن میں درج ذیل شامل تھے:

- رعیت واری علاقوں (Ryotwari Areas) میں محصول کی عدم ادائیگی۔
- زمینداری علاقوں (Permanent Settlement Areas) میں چوکیداری ٹیکس کی عدم ادائیگی۔
- مرکزی صوبوں میں جنگل کے قوانین (Forest Laws) کی خلاف ورزی۔

سماجی بائیکاٹ کے تحت متعدد نچلے درجے کے سرکاری افسران بشمول پولیس اہلکار اپنی خدمات سے مستعفی ہو گئے۔ جیسے ہی تحریک زور پکڑنے لگی، حکومت نے انتقامی کارروائی کو بڑھانا شروع کیا جیسا کہ امریکی صحافی ویب ملر نے مشاہدہ کیا تھا۔ اس طرح، ریاستی جبر اور ظلم کی وجہ سے تحریک نے سرگرم اور فعال کردار اختیار کیا۔ جب نمک ستیہ گرہ نے عروج حاصل کیا تو تین اہم تبدیلیاں وجود میں آگئیں جو گاندھیائی سول نافرمانی کی حدود سے باہر نکل گئیں۔ سب سے پہلے، بنگال میں انقلابی قوم پرستی نے برطانوی جبر کے مواقع کو فروغ دیا۔ دوسری بات یہ کہ 23 اپریل 1930 کو پشاور میں خان عبدالغفار خان کی گرفتاری نے ایک زبردست بغاوت کو جنم دیا جب ہندو سپاہیوں نے حب الوطنی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور عدم تشدد کی عمدہ مثال میں ایک مسلمان ہجوم پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ تیسرا، شولاپور میں کپڑا مزدوروں کی ہڑتال کے نتیجے میں شراب کی دکانوں، پولیس چوکیوں اور سرکاری عمارتوں پر حملے ہوئے، جس نے مئی کے شروع میں کچھ دنوں کے لیے متوازی حکومت جیسی چیز کو جنم دیا۔

سول نافرمانی کی تحریک کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اسے بڑے پیمانے پر کاروباری طبقے کی حمایت حاصل تھی۔ انہوں نے ابتدائی دور میں دو اہم طریقوں سے حصہ لیا۔ انہوں نے تحریک کو مالی امداد فراہم کی اور غیر ملکی کپڑوں کے بائیکاٹ کی حمایت کی۔ سول نافرمانی

کی تحریک کی دوسری سب سے اہم خصوصیت خواتین کی بڑے پیمانے پر شرکت تھی۔ڈانڈی مارچ کے دوران تقریباًہر وقفے پر خواتین گاندھی کو سننے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتی تھی۔ تاہم، 1930 کے آس پاس گاندھیائی قوم پرستی کی حمایت عدم تعاون کی تحریک کے مقابلے میں کم تھی۔ صرف چند وکلاء نے اپنا پیشہ چھوڑ دیا اور چند طلباء نے سرکاری اسکولوں کے بجائے 'قومی اسکولوں' میں شمولیت اختیار کی۔ انقلابی قوم پرستی نے بنگال میں پڑھے لکھے نوجوانوں کو زیادہ اپنی طرف راغب کیا اور ایک مختصر عرصے کے لیے بھگت سنگھ شمالی ہندوستان کے قصبوں میں گاندھی سے زیادہ مقبول ہو گئے۔اس تحریک میں جیل جانے والوں کی تعداد 23-1922 کے اعداد و شمار سے تین گنا زیادہ تھی۔ اس مرحلے پر جی۔ڈی۔ برلا کی سربراہی میں کلکتہ کے مارواڑیوں نے قوم پرست تحریک کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا۔

17.5 گاندھی ارون معاہدہ سے دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی تک

(From Gandhi-Irwin Pact to the Failure of the 2nd Round Table Conference)

سول نافرمانی تحریک 1930 کے آخری چند مہینوں میں متضاد مرحلے پر پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ کسانوں اور قبائلی عسکریت پسندی کے واقعات میں اضافہ ہوا، لیکن سرکاری رپورٹوں کے مطابق شہری تاجروں میں جوش و خروش اور حمایت میں واضح کمی آگئی۔ بہت سے لوگوں نے غیر ملکی اشیاء کو دھوکہ دہی سے فروخت کرنا شروع کر دیا۔ صنعت کاروں نے صبر کے حدود توڑ دیئے، جبکہ ہومی مودی نے بار بار تجارت اور صنعتیں متاثر ہونے کی شکایت کی۔ حکومت کی طرف سے عوامی املاک پر قبضوں نے امیر کسانوں کے قومی جذبے کو کم کر دیا۔اس کے پس منظر میں گاندھی کو اپنے سیاسی منصوبوں سے پیچھے ہٹنا پڑا اور 5 مارچ 1931 کو ارون کے ساتھ بات چیت کرنی پڑی۔اس سمجھوتے کے تحت سول نافرمانی تحریک کو ختم کیا گیا؛ برطانوی سامان کے بائیکاٹ کا خاتمہ کیا گیا؛ قیدیوں کی رہائی یقینی بنائی گئی؛ اور سمندر کے کنارے رہنے والے لوگوں کو نمک بنانے کی اجازت دی گئی۔ ہر طرف ناخوشی کا احساس قائم تھا۔ یہ ناخوشی اور رنجیدگی اس وقت بڑھ گئی، جب گاندھی کی تین انقلاب پسندوں کی معافی کی درخواست کو نظر انداز کیا گیا اور 23 مارچ 1931 کو بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو کو پھانسی دے دی گئی۔ نہرو لکھتے ہیں کہ سول نافرمانی دھماکے سے نہیں بلکہ سرگوشی سے مر گئی۔

گاندھی ارون معاہدہ کچھ مورخین کے درمیان بحث کا موضوع رہا ہے۔ آر۔جے۔ مور نے سب سے پہلے اس بات کی نشاندہی کی کہ سمجھوتے کے پیچھے متوسط طبقے کا دباؤ ایک اہم عنصر تھا۔ سومت سرکار نے استدلال کیا کہ ہندوستانی بورژوا طبقے نے تحریک کی ابتدائی کامیابی اور دستبرداری میں متوسط طبقے نے اہم کردار ادا کیا۔اس موقف کو دوسرے مورخین جیسے جوڈتھ براؤن، کلاڈ مارکووِض اور باسودیو چٹرجی نے بھی قبول کیا ہے۔ یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ ابتداء سے ہی کانگریس اور سرمایہ داروں کے درمیان کچھ خاص اتحاد نہیں تھا اور مسلسل عوامی تحریک نے کاروباری طبقوں کے مفادات کو متاثر کیا۔اس لیے، وہ قیام امن کو موقع دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا، گاندھی پر آئینی سیاست میں واپس آنے کا دباؤ تھا جس کا نتیجہ گاندھی ارون معاہدے کی صورت میں سامنے آگیا۔ لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ 1931 میں کاروباری گروہوں نے مشکل سے یکساں طبقے کی نمائندگی کی۔ اے۔ڈی۔ڈی۔ گورڈن کہتے ہیں کہ صنعت کاروں کا جوش عالمی بحران، بائیکاٹ اور ہڑتالوں کی وجہ سے ماند پڑ گیا تھا اور وہ یا تو سول نافرمانی کو ختم کرنا چاہتے تھے یا پھر کانگریس اور حکومت کے درمیان امن قائم کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ کاروباری

برادری نے تحریک کی حمایت کی اور اس کی ابتدائی کامیابی کا سہرا حاصل کیا، لیکن وہ کبھی گاندھی پر تحریک کو واپس لینے کے لیے دباؤ ڈالنے کی حیثیت میں نہیں تھے۔ گاندھیائی کانگریس خود کو ایک چھتری تنظیم کے طور پر کام کر رہی تھی، جس میں تمام مختلف طبقات اور برادریوں کو شامل کیا جاتا تھا۔ لہٰذا، اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ گاندھی صرف ایک مخصوص طبقے کے مفادات کو پورا کرنے کے لیے اتنا اہم فیصلہ لیں گے۔ تاہم، یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تحریک سے دستبرداری کی سب سے بڑی وجہ کچھ نچلے طبقوں کے درمیان بنیاد پرستی اور تشدد کا ظہور تھا جنہوں نے مقامی کانگریس رہنماؤں کے کنٹرول میں رہنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے تحریک سے دستبرداری کا اعلان کیا اور دوسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے انگریزوں سے سمجھوتہ کیا۔ دوسری گول میز کانفرنس (ستمبر سے دسمبر 1931 تک) ناکام ثابت ہوئی جس میں گاندھی نے امبید کر اور مسلم رہنماؤں کے ساتھ علیحدہ انتخابی حلقوں کے مطالبے پر تکرار کیا۔

17.6 1932 کے اوائل میں سول نافرمانی تحریک کی بازیافت

(Resumption of the Civil Disobedience Movement in Early 1932)

جب دوسری گول میز کانفرنس میں حکومت کے ساتھ مذاکرات ناکام ہوئے تو گاندھی لندن سے خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ کانگریس نے کانفرنس کے پہلے اجلاس کا بائیکاٹ کیا تھا۔ دوسرا سیشن اقلیتوں کے معاملے پر تعطل کا شکار ہو گیا، جیسا کہ نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ دیگر تمام اقلیتوں، جیسے اچھوت، اینگلو انڈینز، ہندوستانی عیسائیوں اور یورپیوں نے علیحدہ انتخابی حلقوں کا مطالبہ کیا، جسے گاندھی تسلیم نہ کرنے پر اٹل تھے۔ جب وہ ہندوستان پہنچ گئے، تو انہوں نے سول نافرمانی تحریک کو بحال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح، دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی کے نتیجے میں 1932 کے اوائل میں سول نافرمانی کی تحریک دوبارہ شروع ہوئی۔ برطانوی حکومت نے اس تحریک کو کچلنے کے لیے کئی سخت جابرانہ اقدامات اختیار کیے۔ یہ تحریک تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہی۔ اپریل 1932 میں، اس تحریک کے سلسلے میں لارڈ ویلنگڈن نے بنگال اور بمبئی کو 'دو سیاہ دھبوں' کے طور پر پیش کیا۔ بنگال میں زرعی بدامنی کے ساتھ ساتھ عسکریت پسندوں کی سرگرمیاں زور و شور سے قائم تھیں۔ اس طرح، 34-1932 کے مرحلے میں جبر اور رہنماؤں کی گرفتاریوں کے باوجود کانگریس نے جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے لوگوں کو حوصلہ دیا۔ اس مرحلے میں پولیس کے خلاف مزاحمت، گرفتار ستیہ گرہیوں کی رہائی، ضبط شدہ کانگریس کے آشرموں کی بحالی اور عدالت کے احاطے میں ممنوعہ نمک فروخت کرنے پر توجہ مرکوز کی گئی۔ لیکن 1933 تک، یہ تحریک اس حد تک کمزور ہو چکی تھی کہ گاندھی کے مخلص حامی (گجراتی اور مارواڑی) بھی حوصلہ کھو چکے تھے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ تاجروں اور مزدوروں نے اس تحریک سے کنارہ کشی اختیار کی۔ مسلم عوام اکثر اس تحریک کے مخالف رہے۔ شدید سرکاری جبر کے نتیجے میں کانگریس کے ہزاروں رضاکاروں کو قید کیا گیا۔ ان حالات میں، گاندھی نے مئی 1933 میں تحریک کو عارضی طور پر معطل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپریل 1934 میں یہ تحریک رسمی طور پر ختم کی گئی۔

17.7 سول نافرمانی تحریک کا تنقیدی جائزہ

(An Appraisal of the Civil Disobedience Movement)

کانگریس کے لیے سول نافرمانی تحریک کسی بھی طرح ناکام نہیں تھی۔ 1934 تک، کانگریس نے زبردست سیاسی حمایت کو متحرک کیا، جو 1937 میں ایک زبردست انتخابی فتح میں بدل گیا۔ بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ گاندھی ارون معاہدے کے تحت سول نافرمانی تحریک کو معطل کرنے کا گاندھی کا فیصلہ پیچھے ہٹنا تھا، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ کچھ عملی وجوہات کی بنا پر ان اقدام کی تصدیق کی گئی۔ سب سے پہلے، یہ سمجھنا ضروری ہے کہ عوامی تحریکیں لازمی طور پر قلیل المدت ہوتی ہیں اور کارکنوں کے مقابلے میں عوام کی قربانی دینے کی صلاحیت محدود ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ستمبر 1930 کے بعد دکانداروں اور تاجروں میں تھکان کے واضح آثار نمایاں تھے۔ گاندھی نے محسوس کیا تھا کہ لوگوں کی توانائی کے وسیع ذخائر ختم ہو گئے ہیں۔ حالانکہ، اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ نوآبادیاتی حکومت نے 1932 میں ہی اس تحریک کو بے رحمی سے دبا دیا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ کانگریس کے بہت سے حامی خاص طور پر نوجوان کافی مایوس تھے۔ گجرات کے کسان مایوس تھے کیونکہ ان کی زمینیں فوری طور پر بحال نہیں کی گئی۔ (انہیں صوبے میں کانگریس کی وزارت کے دور میں اپنی زمینیں واپس مل گئی)۔ لیکن عوام کی بڑی تعداد بلاشبہ اس بات پر خوش تھی کہ برطانوی حکومت کو ان کی تحریک اور ان کے رہنما کو اپنے برابر سمجھنا پڑا، اس لیے، انہیں گاندھی کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا۔

17.8 سول نافرمانی تحریک کے اختتام سے اگست 1942 کی قرارداد تک

(From the End of Civil Disobedience to the August 1942 Resolution)

1934 کے آس پاس سول نافرمانی کی تحریک کے خاتمے کے نتیجے میں کانگریس کے اندر شدید اختلاف پیدا ہوا۔ 1934 میں گاندھی نے عارضی طور پر فعال سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی اور متعدد سوشلسٹ اور دیگر بائیں بازو کے رہنماؤں جیسے جے پرکاش نارائن، اچیوتا پٹوردھن، اشوک مہتا، یوسف مہرالی، نریندر دیو اور منو مسانی نے کانگریس سوشلسٹ پارٹی تشکیل دی۔ سوشلزم کے لیے ان کی ہمدردی کے باوجود، نہرو نے کبھی بھی باضابطہ طور پر اس گروہ میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ تاہم، جلد ہی کانگریس کے اندر تضاد و مسائل پیدا ہو گئے؛ ایک کونسل میں داخلہ اور دوسرا دفتر کی منظوری۔ 1937 کے انتخابات کے نتائج، جن کے لیے دائیں اور بائیں بازو نے مشترکہ طور پر مہم چلائی، کانگریس کے لیے شاندار تھے۔ کانگریس نے 1937 میں نئے حق رائے دہندوں کو استعمال کر کے الیکشن جیت لیا۔ نئے حق رائے دہندوں میں صنعتی مزدور، کسان اور کچھ دلت بھی شامل تھے۔

کسانوں کے محاذ پر ان تمام پیش رفتوں کی وجہ سے اپریل 1936 میں کانگریس کے لکھنؤ اجلاس میں آل انڈیا کسان سبھا کا قیام عمل میں آیا۔ سہجانند سرسوتی کو اس تنظیم کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے ممبران کی وجہ سے آل انڈیا کسان سبھا، کانگریس کا حصہ رہا اور انہوں نے صوبائی کانگریس کمیٹیوں کے ساتھ قریبی تعلقات برقرار رکھے۔

اسی دور کا ایک اور اہم پہلو جہاں کانگریس کی قیادت غالب کردار ادا کرنا چاہتی تھی وہ شاہی ریاستیں تھیں۔ 1920 اور 1930 کی دہائیوں کے دوران، کانگریس نے اپنی رعایا پر روایتی حکمرانوں کے حقوق کا احترام کرتے ہوئے، شاہی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا انتخاب کیا تھا۔ ریاستوں کے مقامی لوگوں نے خود کو پرجامنڈلوں میں منظم کیا، آئینی تبدیلیوں اور جمہوریت کے لیے اعتدال پسند مطالبات اٹھائے اور بعد میں 1927 میں کل ہند اسٹیٹ پیپلز کانفرنس (AISPC) کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ 1930 کی دہائی کے اواخر میں، کانگریس کے بائیں بازو کے رہنما جیسے بوس اور نہرو نے شاہی ریاستوں میں زیادہ سے زیادہ مداخلت کی خواہش پر اصرار کیا، تاکہ انہیں برطانوی ہندوستان میں ہونے والی سیاسی پیش رفتوں کے برابر لایا جاسکے۔ دائیں بازو کے رہنماؤں نے بھی اب ممکنہ طور پر، جیسا کہ ایان کوپلینڈ (1999) نے کہا ہے، مجوزہ وفاقی مرکز میں اقتدار کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کے لیے انہوں نے شہزادوں کو پرجامنڈلوں میں اپنے قریبی لوگوں کو نامزد کرنے کا مطالبہ کیا۔ خیالات اور عزائم کے اس سنگم کے نتیجے میں 1938 میں ہاری پورہ کانگریس اجلاس میں پالیسی میں تبدیلی آئی، جہاں ریاستوں میں عوامی تحریکوں کی حمایت کے لیے ایک قرارداد منظور کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ فروری 1939 میں، نہرو نے AISPC کی صدارت قبول کی۔ اس کے نتیجے میں، 1938 کے اواخر اور 1939 کے اوائل میں کئی شاہی ریاستوں میں عوامی تحریکیں وجود میں آگئیں۔

ستمبر 1939 میں دوسری جنگ عظیم کے آغاز کی وجہ سے ہندوستانی سیاست میں نئے تغیرات سامنے آگئے۔ جنگ نے برطانوی پالیسیوں اور کانگریس کی حکمت عملیوں میں بھی تبدیلیاں لائی۔ وائسرائے لن لتھگو نے ہندوستان کو جرمنی کے خلاف جنگ میں شامل کرنے کا اعلان کیا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے واضح کیا کہ وہ برطانیہ کی حمایت صرف اس صورت میں کریں گے، جب وہ جنگ کے بعد آزادی اور مرکز میں فوری قومی حکومت کا وعدہ کرے گی۔ لیکن 14 اکتوبر کو لن لتھگو نے جو پیشکش کی وہ کانگریس کی امیدوں سے بہت کم تھی۔ احتجاج میں کانگریس وزراء نے 29 اور 30 اکتوبر 1939 کے درمیان استعفیٰ دے دیا۔ جناح اور مسلم لیگ نے اس دن کو 'یوم نجات' کے طور پر منایا۔ اس مرحلے پر جنگ ابھی ہندوستانی سرزمین سے کافی دور تھی، پھر بھی متعدد کانگریس رہنماؤں نے فاشزم کی مزاحمت کی اور برطانوی جنگی کوششوں کی حمایت کرنے کے خواہشمند تھے، بشرطیکہ کچھ آئینی رعایتوں کا وعدہ کیا جائے۔

لہٰذا، اگست 1940 میں لن لتھگو کے ذریعے غیر متعینہ مستقبل میں ڈومینین اسٹیٹس (Dominion Status) کی پیشکش، جنگ کے بعد ایک آئینی مشاورتی ادارہ، وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی توسیع اور جنگی مشاورتی کونسل کی فراہمی وغیرہ کانگریس کی توقعات سے بہت کم تھیں۔ اسی دوران، دسمبر 1941 سے جاپانی فتوحات نے جنگ کو ہندوستان کے قریب لا دیا۔ دسمبر 1941 سے مارچ 1942 کے درمیان ہانگ کانگ، بورنیو، منیلا، سنگاپور، جاوا، رنگون، سماترا اور انڈمان اور نکوبار جزائر جاپان کے قبضے میں آگئے۔ اس لیے، جنگی کوششوں کو آگے بڑھانے اور ہندوستانی حمایت حاصل کرنے کے لیے بات چیت کی فوری ضرورت پڑھ گئی۔ اس پس منظر میں، مارچ 1942 میں کرپس مشن ہندوستان بھیجا گیا۔ کرپس مشن کا مقصد یہ تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد انتخابات اور مکمل خود مختاری (ڈومینین اسٹیٹس) کے وعدے کے عوض برطانوی جنگی کوششوں کے لیے ہندوستان کی وفاداری حاصل کی جائے۔

17.9 ہندوستان چھوڑو تحریک (The Quit India Movement)

1942 کے وسط تک ہندوستان میں یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ برطانوی اقتدار عنقریب ختم ہونے والا ہے اور اس لیے یہ ایک مناسب لمحہ تھا کہ اس کے خاتمے کی جنگ لڑی جائے اور ہندوستان کو تقریباً دو سو سال کی نو آبادیاتی حکومت سے آزاد کیا جائے۔ گاندھی بھی عسکریت پسندی کے اس مقبول مزاج کو محسوس کرنے میں سست نہیں رہے اور انہیں احساس ہوا کہ برطانوی راج کے ساتھ ان کی آخری مصروفیت کا لمحہ آ پہنچا ہے۔ گاندھی نے مئی 1942 میں کہا کہ 'ہندوستان کو خدا پر چھوڑ دو۔ اگر یہ زیادہ ہے تو اسے انتشار اور سیاسی افراتفری کے لیے چھوڑ دو۔ اگر مکمل لاقانونیت ہوئی تو میں اس کا خطرہ مول لوں گا۔' جولائی میں، کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بڑے پیمانے پر سول نافرمانی کی قرارداد پاس کی۔ 8 اگست 1942 کو بمبئی میں کل ہند کانگریس کمیٹی کی طرف سے منظور کردہ 'ہندوستان چھوڑو' کی قرارداد میں تجویز پاس ہوئی تھی کہ اگر اقتدار فوری طور پر ہندوستانیوں کے حوالے نہ کیا گیا تو گاندھی کی ہدایات کے مطابق بڑے پیمانے پر سول نافرمانی شروع کر دی جائے گی۔ اس موقع پر، گاندھی نے اپنی تقریر میں مشہور نعرہ 'کرو یا مرو' پیش کیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ہندوستانیوں کو آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کی قربانی دینی ہوگی۔ انہوں نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اب سے ہر شخص کو اپنے آپ کو 'آزاد' سمجھنا چاہیے اور اگر رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا تو لوگ اپنی کارروائی کا خود انتخاب کریں۔ ان کا خوف صحیح ثابت ہوا، کیونکہ گاندھی سمیت کانگریس کے تمام صف اول کے لیڈروں کو 9 اگست کی صبح کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد بے مثال عوامی غصہ نمودار ہوا جسے قوم پرست افسانوں میں 'اگست انقلاب' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وائسرائے لنلتھگو نے اسے '1857 کے بعد سے اب تک کی سب سے سنگین بغاوت' کے طور پر بیان کیا۔ یہ تحریک شروع سے ہی پر تشدد اور مکمل طور پر بے قابو تھی، کیونکہ کانگریس کے تمام اعلیٰ رہنماؤں کو تحریک شروع ہونے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔

17.10 ہندوستان چھوڑو تحریک کے ظہور کے اسباب

(Reasons for Starting the Quit India Movement)

ہندوستان چھوڑو تحریک کے ظہور کے متعدد اسباب تھے۔ آئینی تعطل کو حل کرنے میں کرپس مشن کی ناکامی نے ہندوستان میں آئینی پیش رفت پر برطانیہ کے رویے کو بے نقاب کیا۔ بڑھتی ہوئی قیمتوں اور چاول، نمک، وغیرہ کی قلت کی وجہ سے عوام میں عدم اطمینان پیدا ہو گیا۔ جنوب مشرقی ایشیا میں انگریزوں کی شکست کی خبروں اور ممکنہ برطانوی راج کے زوال نے ہندوستان میں عوامی عدم اطمینان کا اظہار کرنے کی خواہش کو بڑھا دیا۔ علاوہ ازیں جنوب مشرقی ایشیا میں جاپان کی متعدد فتوحات سے ہندوستانی رعایا کے عزائم کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

17.11 ہندوستان چھوڑو تحریک کی نوعیت (Nature of the Quit India Movement)

اس تحریک کو ابتدائی طور پر 1942 کی عوامی سول نافرمانی کی تحریک کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ قوم پرست تاریخ نگاری میں اسے انگریزوں کے خلاف 'تیسری عظیم لہر' کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یہ تحریک گاندھی کی طرف سے شروع کی گئی دیگر تحریکوں سے یکسر مختلف تھی۔ 22-1920 کی عدم تعاون تحریک اور 34-1930 کی سول نافرمانی تحریک کو ہندوستان میں برطانوی راج کے خلاف پر امن

مزاحمت کے طور پر تصور کیا جاتا ہے۔ تاہم، 1942 کی تحریک انگریزوں کو ہندوستان سے مکمل طور پر دستبردار ہونے پر مجبور کرنے کی ایک زبردست بغاوت تھی۔ اس تحریک میں روایتی ستیہ گرہ پر نہیں بلکہ 'لڑائی ختم کرنے' پر زور دیا گیا، کیونکہ یہ ریاستی مشینری کے لیے ایک چیلنج کی نمائندگی کرتی تھی۔ مزید یہ کہ گاندھی اب فسادات اور تشدد کے لیے بھی تیار تھے۔ ان کی تیاری عوام کے مزاج کو سمجھنے پر مبنی تھی۔ 1942 کی تحریک اپنے اعلان کردہ مقاصد میں مبہم نہیں تھی۔ اس کا آغاز ہندوستان سے برطانوی اقتدار کے مکمل انخلاء کو یقینی بنانے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس تحریک کی چار اہم خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

- یہ تحریک ریاست کے خلاف تشدد کے لیے موزون تھی۔
- اس کا مقصد ہندوستان میں برطانوی راج کو ختم کرنا تھا۔
- اگر کانگریس کے لیڈروں کو گرفتار کیا جائے تو طلباء پر زور دیا گیا کہ وہ تحریک میں نمایاں کردار ادا کریں اور اس کی قیادت کریں۔
- یہ تحریک مکمل طور پر حکومتی عملداری کے خلاف تھی۔

استعماری تاریخ نویسوں نے کانگریس پر برطانوی حکومت کی موجودہ شکل کو مفلوج کرنے کا الزام لگایا۔ دوسری طرف قوم پرست مورخین نے بغاوت کی مرکزی سمت اور تنظیم کو نمایاں کرنے اور کانگریس کے عروج کو ظاہر کرنے کے لیے ان الزامات کی تردید کی۔ ایک بار جب 8 اگست 1942 کو تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا اور مرکزی رہنما گرفتار کر لیے گئے تو حکومت نے اپنی توجہ بنیاد پرست پہلوؤں کی طرف مبذول کی۔ سرکاری مباحثوں میں اس تحریک کا تصور سب سے زیادہ 'غیر گاندھیائی' کے طور پر کیا گیا۔ فرانسس ہچنز (Francis Hutchins) اس تحریک کی نشاندہی 'نامکمل انقلاب' کی 'بے ساختگی' کے طور پر کرتے ہیں اور اسے ہندوستان میں قومی تحریک کی تاریخ میں اب تک کا سب سے بڑا طوفان اور ایک پیچیدہ واقعہ کے طور پر بتاتے ہیں۔ دانشوروں نے 1942 کی تحریک پر توجہ مرکوز کی ہے تاکہ ملک کے مختلف حصوں میں کانگریس کی قیادت کے بارے میں سوال کیا جا سکے۔ قوم پرست مصنفین نے یہ ثابت کیا ہے کہ 1942 میں قوم اپنے لیڈروں کے ساتھ متحد تھی۔ حالیہ دنوں میں، اسکالرز نے اس تحریک پر تحقیق کی اور ثابت کیا کہ اس نے نچلی سطح پر بھی ترقی کی۔ پال گرینو (Paul Greenough) نے مشاہدہ کیا کہ یہ تحریک ان مسائل، موضوعات اور علامتوں سے ہٹ کر تھی جو گاندھی نے وضع کیے تھے جس نے ہندوستان چھوڑو تحریک کو ایک مخصوص کردار فراہم کیا اور اس میں اندرونی تناؤ پیدا کیا۔ تاہم، گیانیندر پانڈے لکھتے ہیں کہ عوامی غصے اور عمل کو محض گاندھیائی اصولوں کے انحراف سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

17.12 دوسری عالمی جنگ اور ہندوستان چھوڑو تحریک

(World War–II and the Quit India Movement)

40–1939 میں، سامراجی ریاست نے جنگی کوششوں کو تیز کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اتحادی طاقتوں کو جاپانی فوج کے ہاتھوں درپیش فوجی شکستوں نے اشارہ دیا کہ جاپان کے کامیاب حملے کی صورت میں برما اور ہندوستان جیسے ممالک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا جائے گا۔ یہ احساس اس وقت مضبوط ہوا جب جاپانی افواج نے برما پر قبضہ کیا اور مشرقی بنگال میں چٹاگانگ کی سرحد سے متصل علاقے

اکیاب پر پچیس بار چھاپہ مارا۔ برطانوی فوج اور بحریہ جاپانیوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہی۔ 1942 کے دوران خلیج بنگال پر جاپانی فضائی اور بحری برتری نے کلکتہ، چٹاگانگ، مدراس اور ویزاگ کی مشرقی ساحلی بندرگاہوں کو بڑی حد تک ناقابل استعمال بنا دیا۔ اس طرح، ہندوستان اپنی مشرقی زمینی سرحد پر اور مشرقی سمندری حدود پر اس وقت خطرہ محسوس کر رہا تھا، جب جرمنی مغرب میں پیش قدمی کر رہا تھا۔ جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا میں جاپانی فتوحات نے برطانوی فوجی نظام کو بے چین کر دیا تھا۔ شمال مشرقی ہندوستان کی دفاع اور جاپانیوں کی آمد کی حوصلہ شکنی کے لیے بجلی گھروں، تیل تنصیبات، وائرلیس اور ٹیلی گراف اسٹیشنوں کو تباہ کیا گیا۔ بنگال میں انکار کی پالیسی (Denial Policy)، جس میں جاپانی مداخلت کو روکنے کے لیے ملک سے چاول اور دیگر ضروری اشیاء، کشتیوں اور سائیکلوں کو نکالا گیا۔ 1940 کے بعد جنگ کی وجہ سے پٹ سن اور اناج کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوا۔ بنگال کے چاول اگانے والے علاقوں میں آبادی کے بڑے حصوں کی نقل و حرکت متاثر ہوئی اور کھانے پینے کی اشیاء کی فراہمی میں مزید کمی آگئی۔ اس سے انتہائی عدم تحفظ کی صورت حال وجود میں آگئی اور قیاس آرائیوں اور ضروری اشیاء کی بڑے پیمانے پر ذخیرہ اندوزی کی۔ ماچس، نمک، مٹی کا تیل، سرسوں کا تیل، چینی اور چاول جیسی چیزیں گاؤں کے بازاروں سے غائب ہوگئیں۔ اتحادی افواج کی ایک بڑی تعداد کے آنے کے ساتھ بڑھتی ہوئی قیمتوں اور غذائی قلت میں اضافہ ہوا۔ اس طرح فوج کو کھانا کھلانے کے لیے ملک کے غذائی ذخائر ختم ہونے کا خدشہ بے بنیاد نہیں تھا۔

17.13 1942 میں ہندوستان کی سیاسی صورتحال (Political Situation in India in 1942)

ہندوستان چھوڑو تحریک کے آغاز سے پہلے مختلف اوقات میں اور ملک کے مختلف حصوں میں کانگریس کے بہت سے رہنماؤں کے بیانات میں تضادات تھے۔ کرپس کی ناکامی کے تناظر میں گاندھی کی زبان واضح طور پر زیادہ شدت پسند تھی۔ مئی 1942 میں انہوں نے کہا کہ ''میں نے انتظار کیا اور اس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ ملک غیر ملکی جوئے کو اتارنے کے لیے ضروری عدم تشدد کی طاقت کو تیار نہ کر لے۔ لیکن اب میرا رویہ بدل گیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب میں انتظار کرنے کا متحمل نہیں ہوں...اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ بعض خطرات کے باوجود، میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ وہ غلامی کی مزاحمت کرے۔''

اگست 1942 کے اوائل تک تحریک شروع کرنے کی خاطر خواہ تیاریاں کی جا چکی تھیں۔ لندن نے گاندھی کے ساتھ مذاکرات شروع کرنے کا مشورہ اس وقت دیا جب اسٹافورڈ کرپس ہندوستان سے واپس چلے گئے تھے۔ تاہم، گاندھی اس مرحلے پر مذاکرات کے لیے تیار نہیں تھے۔ سیاسی بدامنی، جنگی صورتحال اور جنگ کے دوران حکومت میں کانگریس کی شمولیت سے انگریزوں کے انکار نے گاندھی کو مزید عسکریت پسند بننے پر مجبور کیا۔ اس سلسلے میں مئی 1942 میں، گاندھی نے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے برطانیہ سے کہا کہ وہ "ہندوستان کو خدا پر چھوڑ دیں"۔ اگر یہ زیادہ ہے، تو اسے انتشار اور سیاسی افراتفری کے لیے چھوڑ دو۔ اگر مکمل لاقانونیت ہوئی تو میں اس کا خطرہ مول لوں گا۔ 14 جولائی کو، کل ہند کانگریس کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کانگریس کے مطالبات تسلیم نہ ہونے پر سول نافرمانی کا پروگرام تجویز کیا گیا۔ اس انتباہ (ultimatum) کے ایک ماہ بعد کل ہند کانگریس کمیٹی کا اجلاس 7 اگست 1942 کو بمبئی کے گووالیا ٹینک میدان میں شروع ہوا۔ جنگ کی غیر یقینی صورتحال کی وجہ سے پیدا ہونے والے خدشات نے گاندھی کو اپنی تقریر میں یہ کہنے پر مجبور کیا کہ انہیں یقین

نہیں تھا کہ برطانیہ ہار جائے گا، لیکن اگر وہ شکست کھا گئے تو وہ ہندوستان میں زرعی پیداوار اور املاک کو تباہ کر دیں گے، جیسا کہ انہوں نے برما اور ملایا میں کیا تھا۔ 8 اگست 1942 کو 'ہندوستان چھوڑو' قرارداد کو بالآخر منظور کر لیا گیا۔ گاندھی نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا:

> یہ ایک مختصر منتر ہے، جو میں آپ کو دیتا ہوں۔ آپ اسے اپنے دلوں پر چھاپ لیں اور اپنی ہر سانس میں اس کا اظہار کریں۔ منتر یہ ہے: 'کرو یا مرو'۔ ... ہم یا تو ہندوستان کو آزاد کرائیں گے یا اس کوشش میں اپنی جان قربان کر دیں گے۔ ہم اپنی غلامی کے دوام کو دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہیں گے۔ ہر سچا کانگریسی ملک کو غلامی میں دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہنے کے پختہ عزم کے ساتھ جدوجہد میں شامل ہو گا۔ آپ خدا اور اپنے ضمیر کو گواہ بنا کر عہد کریں کہ آپ آزادی حاصل کرنے تک آرام نہیں کریں گے اور اس کے حصول کی کوشش میں اپنی جانیں بھی قربان کرنے کے لیے تیار رہیں گے۔ جو اپنی جان کھو دے گا، وہ اسے حاصل کر لے گا۔ جو اسے بچانے کی کوشش کرے گا، وہ اسے کھو دے گا۔

ہندوستان کی برطانوی حکومت، کانگریس کی قیادت کو بے اثر کرنے کے لیے پر عزم تھی۔ اس طرح، 8 اگست 1942 کو 'ہندوستان چھوڑو' قرارداد کی منظوری کے چند گھنٹوں کے اندر اندر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ذمہ داروں کو گرفتار کر کے مختلف جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ اگلے دن، گاندھی، نہرو اور انڈین نیشنل کانگریس کے بہت سے دوسرے رہنماؤں کو برطانوی حکومت نے گرفتار کر لیا۔ اس سے ملک کے مختلف حصوں میں تحریک کے پھیلاؤ کا آغاز ہوا۔ 9 اگست کو دیگر لیڈروں کے ساتھ گاندھی کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن ابھی بھی کچھ کانگریسی جیسے مولانا آزاد، صادق علی، دھیابائی پٹیل، پیارے لال نائر، رام منوہر لوہیا، اچیوت پٹوردھن اور سچیتا کرپلانی آزاد تھے۔ ان افراد نے بمبئی میں ایک بارہ نکاتی پروگرام تشکیل دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بارہ نکاتی پروگرام کانگریس لیڈروں نے گاندھی کی ہدایات کے تحت 9 اگست سے پہلے تیار کیا تھا۔ اس کا آغاز ہڑتال کے اعلان کے ساتھ ہوا اور اس میں عدم تشدد، عدم تعاون اور سول نافرمانی کے تمام طریقوں کو شامل کیا گیا۔ یہ نکات کانگریس لیڈروں کی گرفتاری کے فوراً بعد 9 سے 11 اگست کے درمیان لوگوں میں پھیلا دیے گئے۔

17.14 تحریک کے علاقائی پہلو (Regional Aspects of the Movement)

ہندوستان چھوڑو تحریک کے دو اہم مراحل تھے۔ ایک ابتدائی عوامی تحریک کا مرحلہ جو اگست سے ستمبر تک جاری رہا اور دوسرا طویل نیم گوریلا بغاوت کا مرحلہ۔ بمبئی میں 14-9 اگست تک اور کلکتہ میں 17-10 اگست تک ہڑتال جاری رہی۔ کانپور، لکھنؤ اور ناگپور میں ہڑتالیں ہوئی اور دہلی میں مزدوروں کے ساتھ پر تشدد جھڑپیں ہوئیں۔ پٹنہ میں، 11 اگست کو سکریٹریٹ کے سامنے جھڑپوں کے بعد پولیس دو دن تک شہر پر تقریباً مکمل طور پر کنٹرول کھو بیٹھی۔ اس کے بعد، آزاد اور سرگرم کارکن شہروں سے نکل کر دیہی علاقوں میں بغاوت میں شامل ہو گئے۔ اشتعال انگیز خفیہ اشاعتوں کی وجہ سے لوگوں کی شرکت میں اضافہ ہوا۔ جب کانگریس کی پوری قیادت کو قید کر لیا گیا اور ان کے دفاتر، اثاثے اور پرنٹنگ پریس ضبط کر لیے گئے، اس وقت ہندوستان کی متعدد خفیہ اشاعتوں جیسے *Bombay Provincial Bulletin*، *Free India*، *War of India Bulletin*، *Do or Die News-sheet*، *Free State of India Gazette* اور *Congress Gazette* نے تحریک کو مقبولیت بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔

9 اگست 1942 کے بعد زیادہ تر جگہوں پر تحریک دو سے چار ہفتوں میں زوال پذیر ہو گئی، کیونکہ فوج اور پولیس نے جبر کے ذریعے ان سرگرمیوں کو کچل دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں تحریک کی رہنمائی کرنے والے قائدین لوگوں میں بغاوت کے جذبے کو مستحکم کرنے میں ناکام رہے۔ لیکن تحریک کے پھیلاؤ اور شدت نے برطانوی حکومت کو حیران کر دیا۔ حکومت کی انٹیلی جنس مشینری حکام کو تحریک کی ممکنہ حد کے بارے میں خبردار کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس طرح بغاوت کے پہلے دو ہفتوں کے دوران متحدہ صوبوں، بہار، بنگال، اڑیسہ، مرکزی صوبوں، مہاراشٹر اور مدراس پریزیڈنسی کے کچھ حصوں میں حکومت عملی طور پر ناکام ہو گئی۔

مغربی ہندوستان میں اگست 1942 میں یہ تحریک آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی لیکن پھر اس نے زور پکڑ لیا اور یہ تحریک 1943 تک جاری رہی۔ مشرقی خاندیش، ستارا، بروچ اور سورت جیسے اضلاع میں کسانوں کی بڑی تعداد نے گوریلا طرز سے سرکاری املاک، مواصلاتی نظام اور برطانوی حکومت کے ہمدردوں پر حملے کیے۔ پونے، احمد نگر اور احمد آباد جیسے شہروں میں بھی قابل ذکر احتجاج ہوا۔ مغربی ہندوستان نے بھی بم دھماکوں اور تخریب کاری کی سرگرمیوں میں پیش قدمی کی۔ اگست 1942 سے جنوری 1944 تک ہندوستان میں ریکارڈ کیے گئے 664 بم دھماکوں میں سے تقریباً 76 فیصد بمبئی پریزیڈنسی میں ہوئے تھے۔ احمد آباد، بڑودا، سورت، کھیڑا اور جمبوسر کانگریس کے مضبوط اڈے تھے۔ تحریک کے نقطہ نظر سے گجرات ویایم پرچارک منڈل (Gujarat Society for the Propagation of Physical Training) ایک اہم گروہ تھا۔ اس کے لیڈر، چھوٹو بھائی پرانی کا تعلق انتہا پسند قوم پرست تنظیموں سے تھا۔ بعد میں وہ گاندھیائی کانگریس کے ایک سرگرم رکن بن گئے تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی بھی عدم تشدد کے اصول کو مکمل طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ انہوں نے پورے گجرات میں جمنازیم کا ایک نیٹ ورک قائم کیا تھا جس میں نوجوانوں کو سکھایا گیا کہ وہ انگریزوں سے لڑنے کے لیے اپنے جسم اور دماغ کو تیار کریں۔ گاندھی نے ان سرگرمیوں کی جزوی طور پر منظوری دے دی کیونکہ چھوٹو بھائی پرانی نے اپنے جمنازیم میں دائیں بازو کے ہندو اور مسلم مخالف جذبات کی حوصلہ شکنی کی۔ 1942 میں گجرات میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو ذہنی اور جسمانی طور پر انگریزوں کے خلاف پر تشدد جدوجہد کے لیے تیار تھے۔ اسی اشتعال انگیز ماحول میں کانگریس لیڈروں نے ہندوستان چھوڑو تحریک کا آغاز کیا جس میں ولبھ بھائی جیسے رہنما نے لوگوں کے پر تشدد مزاج کی حمایت کی، جبکہ مورارجی دیسائی نے زیادہ محتاط رویہ اختیار کیا کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ گاندھی کے عدم تشدد فلسفے کو ختم کر دیا جائے گا اگر عوامی تشدد کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

ملک کے تقریباً تمام بڑے شہروں کی ایک جیسی کہانی تھی۔ جیسے ہی گاندھی کی گرفتاری کی خبر پھیل جاتی تھی، مزدور اپنے اوزار گرا دیتے تھے، تاجر اپنی دکانیں بند کرتے تھے، طلباء اپنے اسکول اور کالج چھوڑ کر چلے جاتے تھے اور بڑی بھیڑ سڑکوں پہ جمع ہو جاتی تھی۔ احمد آباد میں، ہجوم نے پولیس اہلکاروں اور نوآبادیاتی ثقافت کی علامت والی شمسی ٹوپی (solar hat) پہننے والے ہر شخص کو نشانہ بنایا۔ کھیڑا میں 11 سے 19 اگست کے درمیان پولیس کے ہاتھوں کل دس افراد مارے گئے۔ کھلے عام جھڑپوں کے علاوہ ٹیلی گراف تاروں کی کٹائی اور عوامی املاک پر توڑ پھوڑ کی گئی۔ روجر لوملی (بمبئی کے گورنر 43–1937) کے مطابق، اگست کے دوران کھیڑا بمبئی پریزیڈنسی کا سب سے زیادہ پریشان کن ضلع رہا۔ ریاست بڑودہ میں، 17 اگست تک اعتدال پسند پرجامنڈل کے رہنماؤں کو عوامی دباؤ کے ذریعے مجبور کیا گیا کہ وہ ہندوستان

چھوڑو تحریک کی حمایت کا اعلان کریں۔ 18 اگست کو جب تنظیم پر پابندی لگائی گئی اور رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا تو ہنگامہ خیز مظاہرے ہوئے۔

گجرات میں ہندوستان چھوڑو تحریک سماجی طور پر زیادہ بنیاد پرست نہیں تھی۔ اس کے باوجود احمد آباد میں ایک ہی کامیاب متوازی حکومت (آزاد حکومت) قائم ہوئی۔ اس نے موجودہ انتظامی مشینری کو ہر میونسپل وارڈ کے خفیہ رہنما تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اس نے احتجاجی مظاہروں کا اہتمام کیا، ٹیکس لگائے، رسالوں میں معلومات جاری کی، جاسوسوں کے نیٹ ورک کو منظم کیا اور متعدد پولیس والوں کو سزا دی۔ اس متوازی حکومت نے شہر کے ہندو متوسط طبقے سے اپنی قانونی حیثیت حاصل کی۔ دیہی علاقوں میں ایسی حکومتیں قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

دیگر جگہوں کی طرح بہار اور مشرقی متحدہ صوبوں میں، 1942 کے فسادات سب سے پہلے شہروں میں واقع ہوئے۔ جیسا کہ میکس ہارکورٹ کہتے ہیں کہ 8 سے 10 اگست کے درمیان متعدد شہروں میں شدید فسادات ہوئے، اس کے بعد یہ سلسلہ دیہی علاقوں میں بھی شروع ہوا۔ بہار میں خفیہ تحریک بہت مضبوط ہوئی، جس نے 44-1942 تک برطانیہ کے لیے امن وامان کے مسائل پیدا کیے تھے۔ سخت جبر کے باوجود 1943 تک بہار کے مختلف حصوں میں کئی انقلابی تنظیمیں قائم ہو گئی۔ ان میں سے بہت سے گروہوں کا تعلق کانگریس سوشلسٹ پارٹی سے تھا۔ انہوں نے چھوٹے سوشلسٹ 'آزاد دستے' قائم کیے اور کانگریس کے نام پر کارروائیاں کیں۔ ونیتا دامودرن نے ان ڈاکو گروہوں کو ایرک ہوبسبوم کے 'سماجی ڈاکوؤں' سے تشبیہ دی اور مشاہدہ کیا کہ وہ گاؤں کی آبادی کے تعاون سے دیہی علاقوں میں گھومتے رہے اور 1942 سے 1944 کے درمیان سیاسی خلا کو پر کیا۔ بنیادی طور پر غذائی قلت کو پورا کرنے کے لیے ڈکیتیوں میں اضافہ ہوا، لیکن ڈاکخانوں، سرکاری خزانوں اور گولہ بارود کے ڈپو کو بھی لوٹنے کی کوشش کی گئی۔ یہ حرکتیں اکثر 'گاندھی کی جے' کے نعروں کے ساتھ ہوتی تھیں۔ دربھنگہ میں مقامی زمیندار کے دفتر پر حملے کا اہتمام کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے رہنما سورج نارائن سنگھ نے کیا تھا جس نے نیپال میں مسلح سرگرمیوں کی تربیت حاصل کی تھی۔ بھاگلپور میں سیتارام سنگھ کی قیادت میں ڈاکو گروہوں کو دیہاتیوں کی وسیع حمایت ملی۔ جے پرکاش نارائن نومبر 1942 میں نیپال کی جیل سے فرار ہو گئے اور رام منوہر لوہیا کی مدد سے نیپال کی سرحد پر ایک متوازی حکومت قائم کی، جو 1944 تک قائم رہی۔

مشرقی بنگال میں یہ تحریک قصبوں اور شہروں تک محدود تھی۔ یہاں قوم پرستی کا پروپیگنڈہ کافی شدید تھا۔ ٹرین سفر کے خلاف تنبیہ 'ریل بھرمان بپاد جانک' (ٹرین کا سفر خطرناک ہے) جیسے کتابچوں کی تشہیر کی گئی، جس نے روزمرہ کے مواصلات کو متاثر کیا۔ دیگر کتابچے جیسے 'ہم جنگ میں غیر جانبدار کیوں ہیں؟' دوسری جنگ عظیم میں کانگریس کی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہیں۔ میمن سنگھ کے پرچوں نے یہ پروپیگنڈا عام کیا کہ راس بہاری بوس کی سربراہی میں ہندوستانی سپاہیوں نے امپھال پر قبضہ کر لیا ہے اور سبھاش چندر بوس برما میں ہیں اور اسی لمحے کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ 10,000 کی فوج کے ساتھ بنگال پر حملہ کریں۔ بنگال کے میدناپور میں عدم تعاون کی تحریک کے دنوں سے کانگریس کی جڑیں مضبوط تھی۔ 1942 میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کے درمیان، میدناپور میں سب سے اہم پیش رفت ایک متوازی حکومت کی تشکیل تھی جس کا نام 'مہابھارت یوکتاراشٹر: تمرالیپتا جاتیہ سرکار' تھا۔ یہ حکومت 1944 تک کام کرتی رہی۔

17.15 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں سول نافرمانی تحریک (34-1930) اور ہندوستان چھوڑو تحریک (1942) کا تاریخی اور تنقیدی پہلو بیان کیا گیا۔ اس کے علاوہ، اس میں گاندھی کی قیادت میں مربوط سامراجیت مخالف تحریک کی اہمیت کا جائزہ لیا گیا۔ سول نافرمانی تحریک (34-1930) نے عدم تعاون (22-1920) تحریک کے مقابلے سامراجیت مخالف جدوجہد کی سماجی رسائی کو وسیع کرنے میں ایک واضح پیش رفت کی۔ 1934 میں سول نافرمانی کی تحریک کے خاتمے کے نتیجے میں کانگریس کے اندر شدید اختلافات پیدا ہوئے۔ جب گاندھی نے عارضی طور پر فعال سیاست سے کنارہ کشی کی، جس کی وجہ سے کانگریس سوشلزم سے متاثر ہونے لگی۔ 1937 کے انتخابات کے بعد، گاندھی نے عدم تشدد اور تعمیری پروگرام کی عمل آوری میں اپنا اعتماد ظاہر کیا۔ 1930 کی دہائی کے اواخر میں، رجواڑہ ریاستوں میں مداخلت کی گئی، تاکہ انہیں برطانوی ہندوستان میں ہونے والی سیاسی پیش رفتوں کے برابر لایا جا سکے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اگست تجاویز (1940) اور کرپس مشن (1942) نے کانگریس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس تناظر میں اگست قرارداد پاس ہوئی اور ہندوستان چھوڑو تحریک شروع کی گئی۔ ہندوستان چھوڑو تحریک کو بجا طور پر سب سے بڑی سامراجیت مخالف جدوجہد کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس تحریک نے 1942 کے بعد آنے والے پانچ سالوں میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں بے مثال اور ہنگامہ خیز واقعات پیدا کیے۔ حالیہ تحقیق نے دلیل پیش کی ہے کہ ہندوستان چھوڑو تحریک کو بنیادی طور پر اس لیے نظر انداز کیا گیا ہے کیونکہ اس میں کسی بھی بڑی سیاسی پارٹی نے مرکزی کردار ادا نہیں کیا۔ یہ بنیادی طور پر ذیلی طبقات کی تحریک تھی۔ اگر اس تحریک میں اشراف طبقے کے کردار کا غلبہ ہوتا، تو یہ تحریک قدامت پسندی سے متاثر ہوتی۔ متعدد حوالوں کے مطابق اس تحریک میں روایتی قیادت کی غیر موجودگی میں پسماندہ طبقوں نے اپنی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ ہندوستان چھوڑو تحریک ہندوستان میں برطانوی راج کو ختم کرنے میں ناکام رہی۔ اس کے باوجود، یہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے سامراجی حکام کی زبردستی کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستانیوں کی متنوع برادریوں کی خواہش کا مظاہرہ کیا۔ ہندوستان چھوڑو تحریک اس جذبے اور جوش کے لحاظ سے پہلے کی تحریکوں سے الگ تھی کیونکہ اس نے دیسی اداروں کی حمایت کے لیے عام لوگوں کو استعمال کیا۔ اس کے علاوہ، متوازی حکومتوں کا قیام اس تحریک اور دیگر تحریکوں میں فرق کی نشاندہی کرتی ہیں۔ عدم تعاون تحریک شہری بنیادوں پر کھڑی تھی اور اس کی حمایت زیادہ تر امیر کسان گروہوں نے کی۔ اس کے مقابلے میں سول نافرمانی تحریک زیادہ وسیع تھی۔ اس میں بہت سے غریب کسانوں نے شمولیت اختیار کی، لیکن یہ تحریک مالی بحران کی وجہ سے بنیاد پرست بن گئی۔ ہندوستان چھوڑو تحریک، ان تحریکوں میں سب سے زیادہ بنیاد پرست اور پر تشدد تحریک تھی۔ اس کی حمایت غریب اور مزدور طبقے نے کی، جو جنگ کے وقت مہنگائی اور خوراک کی قلت سے متاثر ہوئے تھے۔

17.16 کلیدی الفاظ (Keywords)

Dominion : ڈومینین برطانوی سلطنت کی کئی خود مختار ریاستوں میں سے کوئی ایک تھی۔ برطانوی سلطنت کے کامن ویلتھ آف نیشنز میں ارتقاء کے ساتھ ہی یہ ڈومینین آزاد ریاستیں بن گئی۔

مزاحمت : (Resistance) ایسی صورتحال جس میں لوگ یا تنظیمیں کسی چیز کے خلاف لڑتی ہیں یا کسی چیز کو قبول

کرنے یا تبدیل کرنے سے انکار کرتی ہیں۔

تنظیم	:	(Organisation)ایک گروہ جو مشترکہ مقاصد کے لیے منظم طریقوں سے مل کر کام کرتا ہے۔
سوراج	:	سوراج کا مطلب خود حکمرانی ہے۔ یہ ایک سیاسی نقطہ نظر تھا جو دعویدار قوم پرستوں نے اپنایا تھا۔
سول نافرمانی	:	سول نافرمانی کا مطلب پرامن طریقے سے کسی قانون، ضابطے یا کسی طاقت کو ماننے سے انکار کرنا ہے۔

17.17 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

17.17.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. گیارہ نکاتی پروگرام کس نے پیش کیا؟
2. ڈانڈی مارچ کس تاریخ پہ شروع ہوا؟
3. کانگریس سوشلسٹ پارٹی کب قائم کی گئی؟
4. کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے معروف رہنماؤں کے نام بتایئے۔
5. 1929 میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کس نے کی؟
6. دوسری عالمی جنگ کب شروع ہوئی؟
7. اگست قرارداد کب پاس کی گئی؟
8. کرپس مشن (Cripps Mission) کب ہندوستان میں آگیا؟
9. پرتی سرکار(‘Prati Sarkar’)سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
10. آزاد ہند فوج کا قیام کب عمل میں آیا؟

17.17.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سول نافرمانی اور ہندوستان چھوڑو تحریک کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا تجزیہ کریں۔
2. سول نافرمانی تحریک کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔
3. سول نافرمانی تحریک کے آغاز کے ذمہ دار عوامل بیان کیجیے۔
4. ہندوستان چھوڑو تحریک کی نوعیت پر بحث کیجیے۔
5. سنہ 1942 میں ہندوستان کی سیاسی صورتحال پر تبصرہ کیجیے۔

17.17.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سول نافرمانی تحریک سے متعلق عوامی ردعمل اور علاقائی رجحانات پر بحث کیجیے۔

2. ہندوستان چھوڑو تحریک کے علاقائی پھیلاؤ کی وضاحت کیجیے۔

3. وہ کون سے فوری عوامل تھے جن کی وجہ سے ہندوستان چھوڑو تحریک شروع ہوئی؟ تفصیلی جائزہ لیجیے۔

17.18 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandhopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman Private Limited, New Delhi, 2004.
2. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, 2014.
3. Brown, Judith, *Gandhi's Rise to Power*: *Indian Politics, 1915–1922*, Cambridge University Press, 1972.
4. Bose, Sugata and Ayesha Jalal, *Modern South Asia*: *History, Culture, Political Economy*, Oxford University Press, New Delhi, 2004.
5. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin, New Delhi, 2000.
6. Chatterjee, Joya, *Shadows at Noon*: *The South Asian Twentieth Century*, Penguin, Gurugram, 2023.
7. Gandhi, Rajmohan, *Mohandas*: *A True Story of a Man, His People and an Empire, Penguin, New Delhi, 2006.*
8. Gordon, L.A., *Bengal: The Nationalist Movement*, *1876–1940*, Columbia University Press, New York, 1974.
9. Grover and Grover, *A New Look at Modern Indian History*, S Chand & Company Limited, New Delhi, 1983.
10. Guha, Ramachandra, *Gandhi: The Years that Changed the World*, *1914–1948*, Penguin, Gurgaon, 2006.
11. Hardiman, David, *Gandhi: In His Times and Ours*, Permanent Black, Delhi, 2003.
12. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal*: *A New History of British India*, HarperCollins, Noida, 2021.
13. Metcalfe, Barbara D., *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, New York, 2006.
14. Sarkar, Sumit, *Modern India, 1885–1947*, Macmillan, New Delhi, 1982.

15. چندر، بپن، مردلا مکھرجی، آدتیہ مکھرجی، حصول آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد (1857-1947)، مترجم سعید احمد انصاری، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2014۔

اکائی 18۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935

(Government of India Act – 1935)

اکائی کے اجزا

18.0 تمہید

18.1 مقاصد

18.2 1935 کے ایکٹ کا تاریخی پس منظر

18.3 1935 کے ایکٹ کے ماخذات

18.4 1935 کے ایکٹ کے اہم دفعات

18.4.1 کل ہند وفاق

18.4.2 ذمہ دار حکومت کے ساتھ تحفظات

18.4.3 صوبائی خود مختاری

18.4.4 صوبائی خود مختاری کی عملیاتی حیثیت

18.5 1935 کے ایکٹ کے دیگر دفعات

18.6 1935 کے ایکٹ کی اہمیت

18.7 1935 کے ایکٹ کے مطابق انتظامی ڈھانچہ۔

18.7.1 پبلک سروس

18.7.2 انتظام مالیات

18.7.3 انتظام عدلیہ

18.7.4 مقامی انتظامیہ

18.8 1935 کے ایکٹ سے متعلق نقطہ ہائے نظر

18.9 اکتسابی نتائج

18.10 کلیدی الفاظ

18.11 نمونہ امتحانی سوالات

18.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

18.0 تمہید (Introduction)

1935 کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (حکومت ہند قانون) آئینی ارتقاء کا ایک اہم مرحلہ تصور کیا جاتا ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے نافذ کیا گیا یہ قانون برطانوی ہند سے متعلق مختلف سیاسی، انتظامی اور آئینی مسائل کو حل کرنے کی ایک جامع کوشش تھی۔ اس کا مقصد برطانوی ہندوستان اور شاہی ریاستوں کا ایک وفاق قائم کرنا تھا۔ تاہم، یہ وفاقی حکومت بڑی حد تک برائے نام تھی، کیونکہ شاہی ریاستوں کی شرکت اختیاری اور محدود تھی۔ اس قانون نے برطانوی ہند میں صوبائی خود مختاری قائم کی۔ اس نے گورنر اور منتخب وزراء کے درمیان اختیارات کو تقسیم کرتے ہوئے صوبائی سطح پر دوعملی حکومت (Dyarchy) کو بھی متعارف کرایا۔ اس کا مقصد حکومت میں ہندوستانی شرکت کو بتدریج بڑھانا تھا۔ لیکن ہندوستانی سیاسی جماعتوں کی مخالفت، دوسری جنگ عظیم اور دیگر سیاسی عوامل کی وجہ سے اسے مکمل طور پر نافذ نہیں کیا جاسکا۔ اس قانون نے صوبائی اور وفاقی سطحوں پر عاملہ (Executive)، قانون سازی (Legislature) اور عدلیہ (Judiciary) کے درمیان اختیارات کی علیحدگی کا خاکہ پیش کیا۔ سابقہ قوانین کے مقابلے میں اس قانون نے بڑی تعداد میں لوگوں کو حق رائے دہی فراہم کی۔ تاہم، اس میں ابھی بھی جائیداد کی اہلیت کی بنیاد پر مختلف پابندیاں برقرار رکھی گئی۔ اس نے عدالتی نظام میں بھی اہم اصلاحات متعارف کروائیں، جن میں وفاقی عدالت اور ہائی کورٹ کا قیام بھی شامل تھا۔ متعدد خصوصیات کے باوجود، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کو متعدد چیلنجوں اور تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ قانون ہندوستانی قوم پرستوں کی خود مختاری اور آزادی کے مطالبات کو پورا کرنے میں ناکام رہا۔ تاہم، اس نے مستقبل میں ہونے والی آئینی پیش رفت کی بنیاد قائم کی۔

18.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 سے متعلق اسباب سے واقف ہوں گے۔
- ایکٹ کی خصوصیات کے بارے میں جان جائیں گے۔
- ایکٹ کے تحت انتظامی ڈھانچے کو سمجھ سکیں گے۔
- ایکٹ کی ناکامی کے وجوہات سے واقف ہوں گے۔

18.2 1935 کے ایکٹ کا تاریخی پس منظر (Historical Context of the Act of 1935)

جب کانگریس نے مون ٹیگیو اور چیمسفورڈ اصلاحات کو ناکافی، غیر تسلی بخش اور مایوس کن قرار دیا، تو انہوں نے حکومت پر زور دیا کہ وہ خود ارادیت کے اصول کے مطابق تیزی سے مطلوبہ اور مکمل ذمہ دار حکومت قائم کرے۔ لیکن تقدیر ایسے ارادوں کے لیے بہت مضبوط ثابت ہوئی۔ فروری 1919 میں، رولٹ کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کی۔ عوامی مخالفت کے باوجود بھی اس کی بنیاد پر سامراج قانون ساز اسمبلی میں دو دستاویزات پاس کیے گئے۔ اس کے بعد گاندھی نے لوگوں سے کہا کہ وہ ان ظالمانہ قوانین کے خلاف ستیہ گرہ کا ہتھیار استعمال کریں۔ عین اُسی وقت گاندھی نے جنوبی افریقہ میں ستیا گرہ کی تکنیک ایجاد کی تھی، جس میں ان کا دعویٰ تھا کہ یہ تکنیک کبھی ناکام نہیں ہو سکتی۔ اس کے مطابق ملک بھر میں ہڑتالیں کی گئیں، جس کے نتیجے میں کئی جگہوں پر ہنگامہ آرائی ہوئی اور مارشل قانون نافذ کیا گیا۔ اسی اثناء میں پنجاب میں سانحہ جلیانوالہ باغ واقع ہوا، جس میں تقریباً چار سو لوگ مارے گئے اور بارہ سو زخمی ہو گئے۔ ایسے اور دیگر مظالم نے قوم پرستوں کو حکومت کے خلاف اتنا بیدار کیا جتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اسی دوران، مسلمان ترکی پر فاتح اتحادی طاقتوں کی طرف سے مسلط کردہ سیورز معاہدے (1920) کے خلاف سخت ناراض تھے۔ گاندھی نے ترکی سے ناانصافی کی تصحیح، خلافت کا قیام، پنجاب مظالم کا ازالہ اور سوراج کے قیام کے لیے عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کی مہم شروع کی۔ ان حالات کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان یکجہتی قائم ہوئی، اور کانگریس نے اپنی پالیسی اور طریقوں کو از سر نو تشکیل کا مطالبہ کیا۔ کانگریس کی پالیسی اور طریقوں میں بنیادی تبدیلی 1921 میں اپنائے گئے آئین کے پہلے آرٹیکل میں جھلکتی ہے جس میں یہ لکھا گیا ہے کہ "انڈین نیشنل کانگریس کا مقصد ہندوستان کے لوگوں کے ذریعے جائز اور پرامن طریقوں سے سوراج کا حصول ہے۔" انہوں نے برطانوی سلطنت کے اندر خود حکمرانی کی بات نہیں کی، جبکہ اسے واضح طور پر مسترد بھی نہیں کیا۔ اس کے علاوہ، آئینی طریقوں کو چھوڑ کر غیر آئینی طریقوں کے استعمال کی بھی بات کی گئی، بشرطیکہ وہ جائز اور پرامن ہو۔ کانگریس کے بنیادی کردار میں یہ تبدیلی مون ٹیگ اور چیمسفورڈ اصلاحات کے افتتاحی سال (1921) میں آگئی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ 1919 کے قانون کی مخالفت مضبوط اور موثر ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے اعتدال پسندوں نے بھی ان اصلاحات کو ناکافی اور غیر تسلی بخش قرار دیا۔ اس پہلو میں ہندوستانی قانون ساز اسمبلی نے ولیم ونسنٹ (Home Member) کے فارمولے کو اپنایا کہ اسمبلی کی نظر میں ہندوستان نے ذمہ دار حکومت کے معاملے میں جو پیشرفت کی ہے اس پر 1929 سے پہلے نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ، ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ کو بھی اس نقطہ نظر سے آگاہ کیا گیا۔ اس کے فوراً بعد کانگریس کے رہنماؤں مثلاً موتی لال نہرو اور سی۔ آر۔ داس نے قانون ساز اسمبلی کے اندر پھوٹ اور مسلسل اور مستقل رکاوٹ ڈالنے کے واضح مقصد کے ساتھ سوراج پارٹی کی تشکیل کی۔ 18 فروری 1924 کو ہندوستانی قانون ساز اسمبلی نے موتی لال نہرو کی استدعا پر ایک قرارداد پیش کی جس میں گورنر جنرل سے اپیل کی گئی کہ ہندوستان میں مکمل ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 میں ترمیم کرے، اور ہندوستانی آئین کی تشکیل کے لیے جلد از جلد ایک گول میز کانفرنس منعقد کرے۔ اس قرارداد کو حکومت نے

قبول نہیں کیا؛ تاہم، اسمبلی کو تسلی دلانے کے لیے الیگزینڈر مڈیمن کی سربراہی میں اصلاحاتی انکوائری کمیٹی قائم کی گئی۔ مڈیمن کمیٹی نے دو رپورٹیں پیش کیں، ایک حکومتی نظریہ کی عکاسی کرتی ہے کہ حکومتی مشینری میں کچھ معمولی اصلاحات کے علاوہ اس قانون میں سب کچھ ٹھیک ہے؛ اور دوسری رپورٹ اس مقبول نظریے کی عکاسی کرتی ہے جو کہتی ہے کہ دو عملی حکومت (Dyarchy) ناکام اور ناقابل عمل ہے، اس لیے صرف گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کی بنیاد پرست ترمیم ہی اس میں کوئی بہتری لا سکتی ہے۔ نومبر 1927 میں، برطانوی حکومت نے بھی 1919 کی اصلاحات کی ناکامی کو سائمن کمیشن کی تقرری کے ذریعے تسلیم کر لیا۔ اس جلد بازی کی ایک ظاہری وجہ ہندوستان کے پرجوش احتجاج تھے؛ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ لارڈ برکن ہیڈ کی قدامت پسند حکومت کو یقین تھا کہ انگلینڈ کے اگلے عام انتخابات میں لیبر حکومت کو اقتدار حاصل ہوگا۔ اس لیے، انہوں نے اس کمیشن کی تقرری ایسی جانشین حکومت پر نہیں چھوڑ دیں۔ یہ بات لارڈ برکن ہیڈ کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ کے نام لکھے گئے ایک نجی خط سے ثابت ہوتی ہے۔

سائمن کمیشن کو برطانوی ہندوستان میں نظام حکومت، تعلیم کی ترقی اور حکومتی اداروں کی ترقی اور اس سے جڑے معاملات کے بارے میں تفتیش کرنا تھا۔ کمیشن کو اس بات کی بھی چھان بین کرنے کے لیے کہا گیا تھا کہ کس حد تک ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کا قیام ضروری ہے۔ تحقیقات کے دوران، کمیشن برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے درمیان تعلقات کو مد نظر رکھے بغیر برطانوی ہندوستان کے آئینی مسائل پر غور کرنے کی ناممکن صورتحال سے متاثر ہوا۔ اس لیے ان تعلقات کے موضوع کو بھی کمیشن کے مضامین میں شامل کیا گیا۔ اس کمیشن میں کوئی بھی ہندوستانی نہیں تھا۔ اسی لیے، ہندوستانی رائے عامہ کے تمام گروہوں نے اس کی مذمت کی تھی، اور کانگریس نے اس کا مکمل بائیکاٹ کیا تھا۔ لارڈ برکن ہیڈ نے ہندوستانیوں کے اخراج کا جواز اس طرح پیش کیا کہ کمیشن کی تقرری پارلیمنٹ کے ذریعے کی گئی ہے۔ اس لیے، اس کمیشن کے ممبران کو پارلیمنٹ کے ارکان تک ہی محدود رکھا گیا۔ لیکن یہ کوئی قابل قبول وجہ نہیں تھی۔

ہندوستان میں داخل ہوتے ہی ملک بھر میں اس کمیشن کے خلاف ہڑتال کیا گیا۔ ہر جگہ کمیشن کا استقبال سیاہ جھنڈوں اور 'سائمن واپس جاؤ' کے نعرے سے کیا گیا۔ مرکزی اسمبلی کو کمیشن کے ساتھ تعاون کے لیے ایک مشترکہ کمیٹی بنانے کی دعوت دی گئی، لیکن اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک طرف سے، سائمن کمیشن نے ہندوستانی رائے عامہ سے الگ تھلگ رہ کر اپنا کام جاری رکھا؛ اور دوسری طرف سے ہندوستان کی سرکردہ سیاسی جماعتیں ایک مشترکہ سیاسی پروگرام بنانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ 19 مئی 1928 کو ڈاکٹر ایم۔ اے۔ انصاری کی زیر صدارت میں ایک آل پارٹیز کانفرنس بمبئی میں بلائی گئی، اور اس نے ہندوستان کے آئین کے اصولوں پر غور کرنے اور ان کا تعین کرنے کے لیے موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی۔ کمیٹی میں تیج بہادر سپرو، علی امان اور ایم۔ ایس۔ اینی، منگل سنگھ، شواب قریشی، جی آر۔ پردھان اور سبھاس چندر بوس شامل تھے۔ ڈاکٹر زکریا کہتے ہیں کہ یہ رپورٹ (جو 10 اگست 1928) 'ماہرانہ اور مدبرانہ' اصولوں کا مجموعہ ہے۔ دوسرے مبصر کا کہنا ہے کہ 'یہ پوری تفصیل کے ساتھ پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی مستحق ہے۔ یہ ہر موضوع پر روشنی ڈالتا ہے، ایک عملی فطری ذہانت کو ظاہر کرتا ہے، خیالی دنیا کی بات نہیں کرتا ہے اور کسی فرسودہ اور بے معنی بات کے پیچھے چھپنے سے گریز کرتا ہے۔' اس رپورٹ کی سفارشات متفقہ تھیں۔ اکثریت نے ڈومینین اسٹیٹس کی حمایت کی۔ اس نے ان تمام گروہوں اور جماعتوں کو آزادی دی، جن کا

مقصد مکمل آزادی کا حصول تھا۔ رپورٹ نے خود کو برطانوی ہند تک محدود رکھا، کیونکہ اس نے مستقبل میں وفاقی بنیادوں پر ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ جڑنے کا تصور پیش کیا تھا۔ جہاں تک فرقہ وارانہ مسئلے کا تعلق ہے، رپورٹ نے آبادی کی بنیاد پر اقلیتوں (پنجاب اور بنگال کے علاوہ) کے لیے کچھ نشستوں (Seats) کی ریزرویشن کے ساتھ دانشمندی سے مشترکہ انتخاب (Joint Electorate) کی سفارش پیش کی۔ مسلمانوں کے مذہبی اور ثقافتی مفادات کو مکمل تحفظ فراہم کیا گیا، اور یہاں تک کہ مسلم اکثریتی صوبوں کی منصوبہ بندی کے پیش نظر لسانی بنیادوں پر نئے صوبے بنانے کی تجویز پیش کی گئی۔ مجوزہ قانون میں انیس بنیادی حقوق کو بھی شامل کرنے کی تجویز دی گئی۔ رپورٹ میں اس بات کی بھی ذکر کی گئی کہ ہندوستانی پارلیمنٹ مندرجہ ذیل اصولوں پر قائم ہونا چاہیے:

- سینیٹ (Senate) کا انتخاب 7 سال کے لیے ہونا چاہیے، جس میں 200 اراکین صوبائی کونسلوں کے ذریعے منتخب کیے جائیں۔
- ایوانِ نمائندگان جس میں بالغ رائے دہی کے ذریعے 500 ممبران پانچ سالوں کے لیے منتخب کیے جائیں۔

گورنر جنرل (جو برطانوی حکومت کے ذریعے مقرر کیا جاتا ہے اور جسے ہندوستانی محصولات سے تنخواہ دی جاتی ہے) کو ایگزیکٹو کونسل کے مشورے پر عمل کرنا ہوگا جو اجتماعی طور پر پارلیمنٹ کی طرف جوابدہ رہے گا۔ صوبائی کونسلوں کا انتخاب، بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر، پانچ سالوں کے لیے ہوگا اور گورنر (جو برطانوی حکومت کی طرف سے مقرر کیا جائے گا) کو صوبائی ایگزیکٹو کونسل کے مشورے پر کام کرنا ہوگا۔ 2 دسمبر 1928 کو کلکتہ میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا، اور مسلم لیگ کی جانب سے جناح نے رپورٹ کے ان حصوں میں متعدد ترامیم پیش کیں، جو فرقہ وارانہ معاملات سے متعلق تھیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے کہا کہ آئین میں اس وقت تک ترمیم نہیں کی جانی چاہیے جب تک کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوان الگ الگ اسے ربع خمسہ (4/5th) اکثریت سے منظور نہ کرلیں۔ 31 دسمبر 1928 کو کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس میں آل پارٹیز کانفرنس رپورٹ کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ قرارداد منظور کی کہ اگر یہ رپورٹ مکمل طور پر ایک سال کے اندر (یعنی 31 دسمبر 1929 تک) برطانوی حکومت نے قبول نہیں کیا، تو کانگریس عدم تشدد، عدم تعاون اور ٹیکسوں کی عدم ادائیگی پر مبنی ایک مہم چلائے گی۔ تین ماہ بعد مسلم لیگ کی کمیٹی نے متعدد حفاظتی اقدامات کے ساتھ نہرو رپورٹ قبول کیا۔ لیکن 31 مارچ 1929 کے دہلی میں منعقد ہوئے مسلم لیگ اجلاس نے نہرو رپورٹ کو مسترد کردیا، اور کسی بھی سیاسی تصفیے کے لیے مسلمانوں کے لیے کم سے کم شرط کے طور پر جناح نے چودہ نکات پیش کیے۔

اس دوران، رامسے میکڈونلڈ کی قیادت میں لیبر پارٹی اقتدار میں آگئی اور اس نے ہندوستانی حلقوں میں بہت سی اعلیٰ امیدوں کو جنم دیا۔ وائسرائے نے برطانیہ کا دورہ کیا، اور 31 اکتوبر 1929 کو واپس آنے پر یہ اعلان کیا کہ وہ برطانوی حکومت کی جانب سے یہ واضح کرنے کے مجاز ہیں کہ 'یہ 1917 کے اعلان میں مضمر ہے کہ ہندوستانی آئینی ترقی کا فطری مسئلہ ڈومینین اسٹیٹس کا حصول ہے۔' انہوں نے مزید کہا کہ سائمن کمیشن کی تجاویز کی اشاعت کے بعد اور مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کے ذریعے اس کی جانچ سے پہلے برطانوی حکومت، برطانوی ہندوستان اور شاہی ریاستوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس بلائی جائے گی۔ اس کانفرنس میں پیش کیے جانے والی حتمی تجاویز کی بنیاد پر ممکنہ معاہدے کی تلاش کی جائے گی۔ لیکن کانگریس رہنما مجوزہ گول میز کانفرنس کے محدود مقصد سے مطمئن نہیں تھے۔ اس کے بعد جواہر لال نہرو کی

صدارت میں لاہور میں ہونے والے کانگریس اجلاس نے گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ اور مکمل آزادی کا اعلان کیا۔ اس اجلاس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے عام نافرمانی تحریک شروع کرنے کی اجازت دے دی۔ نمک قانون (Salt Law) کی خلاف ورزی کی گئی، اور ہزاروں رضاکاروں کو گرفتار کیا گیا۔ 31 اکتوبر 1929 کو برطانیہ کی حکومت کی جانب سے وائسرائے نے اعلان کیا کہ پہلی گول میز کانفرنس 16 نومبر 1930 سے 19 جنوری 1931 تک لندن میں منعقد ہو گی۔ کانگریس رہنما سلاخوں کے پیچھے ہونے کی وجہ سے حکومت کی طرف سے دیگر پارٹیوں کے افراد کو ہندوستان کی نمائندگی کے لیے نامزد کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ مرزا اسماعیل، اکبر حیدری اور بیکانیر کے مہاراجہ ہندوستانی ریاستوں کی نمائندگی کے لیے نامزد کیے گئے۔ طویل بحث و مباحثے کے بعد، کانفرنس میں تین بنیادی اصولوں پر اتفاق کیا گیا:

- نئی حکومت ہند ایک کل ہند وفاق کے طرز پر قائم ہو گی۔
- وفاقی حکومت، کچھ تحفظات کے ساتھ، وفاقی قانون ساز اسمبلی کی طرف جواب دہ ہو گی۔
- صوبوں کو خود مختاری دی جائے گی۔

پہلی گول میز کانفرنس میں کانگریس کی غیر موجودگی کی وجہ سے دوسری کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا، اور امید کی گئی کانگریس بھی اس میں حصہ لے گا۔ اسی اثنا میں تیج بہادر سپرو اور ایم۔ آر۔ جیاکر کی کوششوں سے گاندھی ارون معاہدہ (مارچ 1931) طے ہوا، جس کے ذریعے تمام سیاسی رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا اور عام نافرمانی تحریک ختم ہو گئی۔ دوسری گول میز کانفرنس (Sep-Dec 1931) میں گاندھی کو کانگریس کا واحد نمائندہ مقرر کیا گیا۔ لیکن جناح کو ایک دستخط شدہ کاغذ دینے کے باوجود بھی ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا۔ اس طرح گاندھی کا مشن ناکام ثابت ہوا؛ اور واپسی پر ملک میں داخل ہوتے ہی ان کو گرفتار کیا گیا۔ 16 اگست 1932 کو رامسے میکڈونلڈ کے ذریعے اعلان کردہ کمیونل ایوارڈ (Communal Award) نے مسلمانوں، سکھوں اور یورپیوں کے لیے الگ الگ انتخابی حلقوں کا ذکر کیا۔ تاہم، میکڈونلڈ کے کمیونل ایوارڈ میں تھوڑی دیر بعد پونا معاہدے کے ذریعے جزوی طور پر ترمیم کی گئی تھی جسے ہندو رہنماؤں نے گاندھی کی بھوک ہڑتال کے نتیجے میں قبول کر لیا، تاکہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور نچلے طبقے کے ہندوؤں کے درمیان سیاسی خلل کو روکا جا سکے۔ تیسری گول میز کانفرنس (Nov. 17–Dec. 24, 1932) کے بعد مارچ 1933 میں ایک وائٹ پیپر جاری کیا گیا، جس میں مرکز اور صوبوں میں ذمہ دار حکومت ہند کے نئے آئین کی عملی بنیادوں کی تفصیلات بیان کی گئی۔ فروری 1935 میں، ہندوستان کے سیکرٹری آف اسٹیٹ نے دارالعوام/ہاؤس آف کامنز (House of Commons) میں ایک بل پیش کی، جو پاس ہونے کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 بن گیا۔

18.3 1935 کے ایکٹ کے ماخذ (Sources of the Act of 1935)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 نے مندرجہ ذیل ماخذ سے اپنا مواد اخذ کیا:

- سائمن کمیشن کی رپورٹ۔
- آل پارٹیز کانفرنس رپورٹ یا نہرو رپورٹ۔

- تین گول میز کانفرنسیں۔
- وائٹ پیپر(The White Paper) ۔
- مشترکہ سلیکٹ کمیٹی (Joint Select Committee) کی رپورٹ۔
- لوتھین رپورٹ (Lothian Report) جس نے اس قانون کے انتخابی دفعات کا تعین کیا۔

18.4 1935 کے ایکٹ کی اہم دفعات (Significant Features of the Act of 1935)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کو تشکیل دینے والے وائٹ پیپر اور مشترکہ سلیکٹ کمیٹی کے رپورٹ نے سائمن کمیشن کی بہت سی تجاویز اور گول میز کانفرنسوں کی سفارشات کو خارج کیا۔اس قانون نے برطانوی حکومت کی بالادستی اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کے تمہید کو بھی برقرار رکھا۔اس قانون میں 'خود حکومتی' اور 'ڈومینین اسٹیٹس' کی حیثیت کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ قوانین کی ترمیم، تبدیلی یا منسوخی کے تمام حقوق برطانوی پارلیمنٹ کے پاس رکھے گئے تھے۔اس قانون نے صوبائی سطح پر دو عملی حکومت (Dyarchy) ختم کی، اور اسے مرکزی سطح پر متعارف کرایا۔ پہلی بار، سیاسی امور وں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا،اور ان اموروں کو حکومت کی مناسب سطحوں پر تفویض کیا گیا۔اس قانون کی تین اہم خصوصیات میں کل ہند وفاق، ذمہ دار حکومت کے ساتھ تحفظات اور صوبائی خود مختاری شامل ہیں۔

18.4.1 کل ہند وفاق (All India Federation)

اس قانون نے ہندوستان میں برطانوی صوبوں اور شاہی ریاستوں کی ایک وفاق تجویز کی تھی۔ شاہی ریاستوں کے پاس وفاق میں شامل ہونے کا اختیار تھا۔ لیکن وفاق میں داخل ہونے کے بعد ریاست کی سیاسی نوعیت بدل جاتی تھی،یعنی داخلی کے بعد کوئی ریاست وفاق سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔سائمن کمیشن کی طرف سے مسترد کردہ دو عملی حکومت (Dyarchy) وفاقی حکومت میں فراہم کی گئی تھی۔ دفاع، امور خارجہ، کلیسیائی امور اور قبائلی علاقوں کی انتظامیہ گورنر جنرل کے ہاتھ میں محفوظ تھی جس کا انتظام وہ زیادہ سے زیادہ تین کونسلروں کی مدد سے کریں گے جو ان کے ذریعے مقرر کیے جایں گے۔دیگر وفاقی مضامین (Subjects) کا انتظام گورنر جنرل وزراء کی کونسل کی مدد اور مشورے سے ہونگے۔ گورنر جنرل کے پاس بعض مخصوص مضامین کے حوالے سے خصوصی ذمہ داریاں تھیں، جیسے کہ ہندوستان میں امن قائم کرنے کے لیے کسی بھی سنگین خطرے کی روک تھام کرنا تھا۔ان مضامین میں اسے وزراء کے مشوروں کو قبول کرنے یارد کرنے کی پوری آزادی تھی۔

اس قانون نے دوایوانی مقننہ فراہم کیا-ایوان زیریں (Federal Assembly) براہ راست منتخب ہوگا،اور ایوان بالا (The Council of States)میں شاہی ریاستوں اور افراط رواں طبقوں کی جامع نمائندگی ہوگی۔اس قانون نے ایوان بالا کو مزید اختیارات بھی دیے۔ مسلم نمائندے مضبوط صوبائی حکومتوں کے ساتھ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ماڈل چاہتے تھے۔آزاد خیال نے مخصوص اختیارات کو برقرار رکھتے ہوئے مضبوط مرکز کے ساتھ کناڈا کے ماڈل کی حمایت کی۔

ملک بھر میں مشترکہ دلچسپی کے مضامین وفاقی فہرست میں تھے، جن میں 59 مدّات شامل تھے۔ بنیادی طور پر صوبائی مفادات کے مضامین صوبائی فہرست میں شامل کیے گئے، جس میں 54 مدّات شامل تھے۔ تیسری فہرست میں بنیادی طور پر صوبائی مفادات کے مضامین شامل تھے، جس میں 36 مدّات تھے۔ مستقبل کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خصوصی اختیارات گورنر جنرل کے ہاتھ میں رکھے گئے۔ اس قانون نے دفعات کی تشریح کرنے اور بین الصوبائی تنازعات پر فیصلہ کرنے کے لیے ایک وفاقی عدالت فراہم کی۔ دو عملی حکومت (Dyarchy) کا اصول، یعنی انتظامیہ سے متعلق مضامین کو محفوظ اور منتقل شدہ مضامین میں تقسیم کرنا، مرکز میں متعارف کرایا گیا۔ اس طرح، اس قانون نے ہندوستان کے لیے وفاقی حکومت کی تجویز پیش کی اور پہلی بار برطانوی صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں کو ایک مشترکہ آئین کے تحت لانے کی کوشش کی۔ اس قانون نے نہ صرف ہماری آئینی ترقی کی سمت کی نشاندہی کی بلکہ آزاد ہندوستان میں ہمارے آئین سازی کو بھی بہت متاثر کیا۔ مجوزہ کل ہند وفاق کی تکمیل نہیں ہوئی۔ یہ نظریاتی طور پر ناکافی اور ساختی طور پر ناقص تھا-انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، ہندو مہاسبھا یا شاہی ریاستیں اس سے مطمئن نہیں ہوئے۔ مسلمانوں نے اسے ناپسند کیا، شاہی ریاستوں نے جمہوریت کی طاقتوں کی مخالفت کی اور کانگریس نے شائستگی سے اس وفاق کی تنقید کی۔ اس طرح، یہ ایک 'کھوئی ہوئی مثال' ثابت ہو گئی۔

چونکہ وفاق ایک سیاسی طریق کار ہے، اس لیے، وفاق میں داخل ہونے والے ممبران کو خود مختار اور قانونی طور پر مساوی ہونا چاہیے۔ شاہی ریاستوں کو بھی وفاق (یعنی کونسل آف اسٹیٹس) میں شامل ہونے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اس قانون کے مطابق کونسل آف اسٹیٹس کی رکنیت کا ایک تہائی حصہ ہر تین سال کے بعد کونسل سے دستبردار ہو جاتا تھا اور ساتھ ہی تجدید کیا جاتا تھا۔ شاہی ریاستوں کے لیے کونسل آف اسٹیٹ میں 260 نشستوں (Seats) میں سے 104 نشستیں تھیں، اور ہاؤس آف اسمبلی میں 375 میں سے 125 نشستیں تھیں۔ اس نے مقننہ میں ایک رجعتی بلاک قائم کیا کیونکہ ریاستیں جمہوری اصلاحات کے تعارف اور عمل میں صوبوں سے پیچھے تھیں۔ وفاقی حکومت میں آئین بالادست اور مقتدر رہتا ہے۔ لیکن اس قانون کے ذریعے برطانوی حکومت کی بالادستی برقرار رکھی گئی۔ اس قانون کے مطابق، ہندوستان کے سیکرٹری آف اسٹیٹ اور گورنر جنرل کے پاس حتمی اختیار تھا، اور وہ اس قانون سے بالاتر تھے۔ مرکز میں دو عملی حکومت متعارف کرنے کی وجہ سے، محفوظ مضامین پر گورنر جنرل کا کنٹرول مطلق اور منتقل شدہ پر بہت موثر ہو گیا۔ تمام گورنر اور انڈین سول سروس افسران نے ان کی ہدایات کے تحت کام کیا۔ قانون میں فراہم کردہ تحفظات کے تناظر میں عملی طور پر صوبائی خود مختاری پر بھی کچھ پابندیاں عائد تھی۔ اس کے علاوہ، کانگریس نے بھی محسوس کیا تھا کہ 'خود حکمرانی' کی جدوجہد کو آئینی فریم کے اندر آگے نہیں بڑھایا جا سکتا بلکہ اب اسے بڑے پیمانے پر قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے آزاد خیال نظریات کو زوال اور گاندھی کی عوامی اشتعال انگیز تحریکوں کی حمایت کا اشارہ ملتا ہے۔ اس طرح ہندوستان چھوڑو تحریک کی منطق واضح ہو جاتی ہے۔ وفاقی قانون ساز اسمبلی کے حوالے سے درج ذیل تبصرے پیش کیے گئے ہیں:

- ایوان بالا میں انتخاب براہ راست ہوں گے جبکہ نظریاتی طور پر زیادہ مقبول ایوان زیریں میں انتخاب بالواسطہ ہوں گے۔
- شاہی ریاستوں کو ایوان زیریں میں ایک تہائی اور ایوان بالا میں دو پانچویں (2/5th) نمائندوں کو نامزد کرنا ہوگا۔
- جہاں تک وفاقی اور صوبائی قوانین کی حد کا تعلق ہے، وفاقی مقننہ کو برطانوی ہندوستان کے کسی بھی حصے یا کسی بھی صوبے کے لیے

قانون بنانے کا اختیار حاصل ہوگا، جبکہ ایک صوبائی مقننہ صرف اپنے صوبے کے لیے قانون بنا سکتا ہے۔ وفاقی اور صوبائی قوانین کے حوالے سے، تین فہرستیں تھیں، مثلاً، وفاقی امور کی فہرست (Federal List)، صوبائی امور کی فہرست (Provincial List) اور مشترکہ امور کی فہرست (Concurrent List)۔ مخصوص قانون سازی کے اختیارات گورنر جنرل کے ہاتھ میں رہیں گے، اور یہ اُس کی ذاتی فرضی پر مبنی ہوگا کہ کونسا خاص مضمون کس فہرست میں رکھنا تھا۔

- مقننہ کے اختیارات کافی محدود تھے۔ بعض مضامین کو وفاقی اور صوبائی مقننہ کے دائرہ اختیار سے خارج کر دیا گیا تھا (مثلاً، برطانوی خود مختار یا شاہی خاندان کو متاثر کرنے والے قوانین، آرمی سے متعلق قوانین، ایئر فورس سے متعلق قوانین، وغیرہ)۔ برطانوی تجارتی یا دیگر مفادات کے خلاف امتیازی قانون سازی پر پابندی لگادی گئی۔ اس کے علاوہ بہت سے اہم مضامین تھے جن پر گورنر جنرل یا گورنر کی سابقہ منظوری کے بغیر قانون سازی شروع نہیں کی جا سکتی تھی۔ دونوں ایوانوں کے درمیان تضاد کی صورت میں، گورنر جنرل ایک مشترکہ اجلاس طلب کر سکتا تھا، اور یہاں تک کہ اگر کوئی بل دونوں ایوانوں سے منظور ہو جائے تو وہ اسے ویٹو (Veto) کر سکتا تھا یا اسے نظر ثانی کے لیے واپس بھیج سکتا تھا۔

18.4.2 ذمہ دار حکومت کے ساتھ تحفظات (Reservations along with the Responsible Government)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کی ایک اور نمایاں خصوصیت ذمہ دار حکومت کے ساتھ تحفظات کی فراہمی تھی۔ وفاقی ڈھانچے میں، اس قانون نے گورنر جنرل کو ہندوستان کے پورے آئین کا محور بنا دیا۔ اس نے تین مختلف طریقوں یا صلاحیتوں میں کام کیا:

1. وہ عام طور پر اپنے وزراء کے مشورے کے مطابق کام کرے گا لیکن اسے ہمیشہ ان کے مشوروں پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔
2. اپنی خصوصی ذمہ داریوں کے سلسلے میں، وہ اپنے انفرادی فیصلے پر عمل کر سکتا تھا، اور وزارتی مشورے کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ ان کی خصوصی ذمہ داریاں درج ذیل ہیں:
   - ہندوستان کا مالی استحکام۔
   - ملک یا اس کے کسی بھی حصے کے امن و امان کے لیے کسی بھی سنگین خطرے کی روک تھام۔
   - اقلیتوں، سرکاری ملازمین اور ان کے زیر کفالت افراد کے جائز مفادات کا تحفظ۔
   - برطانوی یا برمی نژاد سامان کے خلاف تجارتی امتیاز کا روک تھام۔
   - ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کے مفادات اور وقار کا تحفظ۔
   - اپنے صوابدیدی اختیارات کے واجب الادا اخراجات کو محفوظ بنانا۔

3. معاملات کی ایک تیسری قسم ایسی تھی جس میں وہ اپنے وزراء سے بھی مشورہ نہیں کریں گے بلکہ اپنی صوابدید سے کام لیں گے۔ اس طرح کے معاملات میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

- دفاع، خارجہ امور، کلیسائی امور اور قبائلی علاقوں سے متعلق معاملات۔

- وزراء کونسل کی تقرری اور برخاستگی۔
- فرمان اور ضابطے بنانا اور گورنر جنرل کے قوانین نافذ کرنا۔
- گورنرز کے لیے ہدایات جاری کرنا۔
- دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کو طلب کرنا، اور قانون ساز اسمبلی سے خطاب کرنا۔

18.4.3 صوبائی خود مختاری (Provincial Autonomy)

1935 کے ایکٹ کے تحت صوبائی سطح پر دوعملی حکومت (Dyarchy) ختم کر کے صوبائی خود مختاری متعارف کی گئی۔ محفوظ (Reserved) اور منتقل شدہ (Transferred) مضامین کے درمیان فرق ختم کر دی گئی اور پوری انتظامیہ قانون ساز اسمبلی سے جوابدہ وزراء کے سپرد کر دی گئی۔ صوبوں کو ایک علیحدہ قانونی حیثیت دی گئی، اور مرکز کے ساتھ وفاقی تعلق قائم کیا گیا۔ لیکن کل ہند وفاق عمل میں نہیں آئی اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کے مطابق صوبوں کو دیے گئے مضامین تفویض شدہ اختیارات بن گئے۔ اہم بات یہ ہے کہ مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ہر صوبے کے پاس عاملہ اور قانون ساز اسمبلی ہوگی۔

مشترکہ امور کی فہرست (Concurrent List) پر مرکز اور صوبوں کے درمیان تصادم کی صورت میں گورنر جنرل کے پاس حتمی اختیارات ہونگے۔ صوبائی قانون ساز اسمبلیوں میں بہت سے بلوں کو گورنر جنرل کی منظوری کی ضرورت ہوگی۔ صوبائی حکومت کے انتظامی اختیارات کو محدود کر دیا گیا۔ گورنر جنرل گورنر کو ہدایات جاری کر سکتا تھا کہ بعض معاملات میں عملی اختیارات کو کس طریقے سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نیز گورنر اپنی صوابدید یا اپنے انفرادی فیصلے میں گورنر جنرل کی ہدایات کا پابند تھا۔ اسی نوعیت کی پابندیاں ہمارے موجودہ آئین میں بھی پائی جاتی ہے۔

گورنر کے صوابدید اور انفرادی فیصلے میں اپنی خصوصی ذمہ داریوں کو نبھانے کا اختیار بہت جامع تھا۔ انہیں شاہی اختیارات کے علاوہ محکمہ پولیس کے حوالے سے خصوصی اختیارات حاصل تھے۔ وہ قانون ساز اسمبلی کو نظرانداز کر سکتا تھا۔ قانون سازی اور مالیاتی اختیارات بھی گورنر کے غیر معمولی اختیارات کی وجہ سے محدود ہوگئے۔ وفاق کی طرح، صوبے میں بھی عاملہ کے اختیارات گورنر کے پاس رکھے گئے، جو برطانوی حکومت کی نمائندگی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ الغرض، صوبے میں ان کا عہدہ گورنر جنرل کے عہدے کے عین مطابق تھا۔

عام طور پر، صوبائی امور کا نظم و نسق صوبائی قانون ساز اسمبلی کے منتخب اراکین میں اور گورنر کی طرف سے مقرر کردہ وزراء کی کونسل کے ذریعے انجام دیا جاتا تھا۔ یہ وزراء گورنر کی میعاد کے دوران عہدہ سنبھالتے تھے۔ گورنر، گورنر جنرل کی طرح، صوبے کے آئینی سربراہ کے طور پر کام کر سکتے تھے۔ ان کے پاس بعض مخصوص مضامین (یعنی صوبے یا اس کے کسی بھی حصے میں امن قائم کرنا) سے متعلق کچھ "خصوصی ذمہ داریاں" انجام دینی تھی۔ اپنی "خصوصی ذمہ داریوں" کی انجام دہی میں، وہ اپنے وزراء کے بغیر اپنی صوابدیدی اختیارات کے مطابق کئی معاملات میں کام کرنے کا مجاز تھا۔ اس کے علاوہ، وہ اپنے وزراء کی طرف سے دیے گئے مشوروں پر غور کرنے کے بعد اپنا انفرادی

فیصلہ لے سکتا تھا۔ مزید یہ کہ کسی خاص مسئلے پر بحث کرنے کے بعد گورنر کا فیصلہ حتمی تھا۔ دوسرے الفاظ میں، کسی خاص معاملے کے حوالے سے وزارتی ذمہ داریوں کا میدان اتنا ہی وسیع یا تنگ تھا جتنا گورنر اسے بنانے کا انتخاب کر سکتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس قانون کے تحت گورنر کے پاس بہت زیادہ اختیارات تھے، جس میں بہت سارے قانون سازی کے اختیارات بھی شامل تھے۔ گورنر کئی معاملات میں وزراء کو برطرف کر سکتا تھا۔ اگر اُس کو لگتا کہ صوبائی حکومتیں عام شقوں کے مطابق نہیں چلایا جا سکتا، تو وہ ایک اعلان کے ذریعے صوبے کی مکمل یا جزوی حکومت بھی اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا (پہلی صورت میں چھ ماہ کے لیے)۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 میں دیئے گئے گورنر جنرل اور گورنر کے صوابدیدی اختیارات (Discretionary Powers) اور خصوصی ذمہ داریاں ذمہ دار حکومت کو کالعدم کرنے کی ایک کوشش تھی۔ مورس ہیلیکٹ (متحدہ صوبجات کے گورنر) کہتے ہیں کہ ' گورنر اور اس کے وزراء کے تعلقات کسی آقا اور اس کے نوکر کے جیسے نہیں ہونگے، بلکہ وہ ایک مشترکہ ادارے یعنی صوبے کی حکومت میں شراکت دار ہیں۔'

اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کے تحت صوبائی وزراء یقینی طور پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کے موازنے میں اپنے پیشرووں سے اختیارات میں برتر تھے۔ وزراء کی تقرری وزیر اعلیٰ کے مشورے پر طے ہونے تھیں، حالانکہ گورنر کو یہ بھی دیکھنا تھا کہ وزارت میں اقلیتوں کی مناسب نمائندگی موجود رہے۔ گورنر کو اجتماعی ذمہ داری کی حوصلہ افزائی کرنی تھی۔ اصل کام کاج میں، کئی عوامل وزارت کی اصل پوزیشن کو کنٹرول کرتے ہیں اور ہمیشہ کی طرح شخصیت کی مساوات سب سے اہم تھی۔ صوبائی مقننہ کی ساخت قدرتی طور پر صوبے کے لحاظ سے مختلف ہوتی تھی۔ تمام صوبائی قانون ساز اسمبلیوں میں تمام ممبران براہ راست عوام کے ذریعے منتخب ہوتے تھے۔ لیکن چھ صوبوں (مدراس، بمبئی، بنگال، یوپی، بہار اور آسام) میں دو ایوانی قانون ساز اسمبلیاں (Bicameral Legislature) تھی جن میں ایک قانون ساز کونسل اور دوسری قانون ساز اسمبلی تھی اور ان میں سے ہر قانون ساز کونسل میں چند نشستیں (Seats) گورنر کے ذریعے نامزد کی جاتی تھی۔ مختلف قانون ساز اسمبلیوں میں نشستوں کی تعداد مختلف تھی؛ جیسے شمال مغربی سرحدی صوبوں میں 50، اڑیسہ اور سندھ میں 60، مرکزی صوبوں میں 112، بہار میں 152، پنجاب اور بمبئی میں 175، مدراس میں 215، متحدہ صوبوں میں 228 اور بنگال میں 250۔

عوام کی طرح نمائندگی کے بجائے، اس قانون نے لوگوں کو مذہبی برادریوں اور دیگر گروہوں میں تقسیم کیا۔ اس قانون کے انتخابی دفعات برطانوی حکومت کے فرقہ وارانہ فیصلوں کے مطابق وضع کیے گئے، جو کہ بعد میں پونا معاہدے میں ترمیم کی گئیں۔ اس کے تحت قانون ساز اسمبلیوں کی نشستیں (Seats) مختلف برادریوں اور گروہوں میں تقسیم کی گئیں۔ اس کے علاوہ، جنرل (General) مسلم، یورپی، اینگلو انڈین، ہندوستانی عیسائی اور سکھ برادریوں کے لیے الگ الگ حلقے بنائے گئے۔ مزید برآں، مزدوروں، زمینداروں، تاجروں، صنعت کاروں، وغیرہ کے لیے الگ الگ انتخابی حلقے بنائے گئے۔ برطانوی حکومت کی اس پالیسی نے ملک میں فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دی، جس نے ہندوستان کے لیے حتمی تقسیم کی راہ ہموار کی۔ اس قانون کے مطابق، رائے دہندگی کی کم از کم اہلیت شرح خواندگی اور مالیاتی پیمانے پر

رکھی گئی۔اس طرح، رائے دہندگان برطانوی ہندوستان کی بالغ آبادی کا بمشکل 27 فیصد تھا۔ یہ 1919 کے قانون کے مقابلے میں ایک بڑی پیش قدمی تھی، لیکن اس میں پھر بھی بالغ رائے دہی کی بہت کمی تھی جو جمہوریت کو وسیع البنیاد بنا سکتی تھی۔

18.4.4 صوبائی خود مختاری کی عملی حیثیت (Practical Situation of Provincial Autonomy)

37-1936 کے موسم سرما میں نئے قانون کے تحت ہونے والے پہلے عام انتخابات کے بعد، کانگریس کو پانچ صوبوں (مدراس، مرکزی صوبے، متحدہ صوبے، بہار، اڑیسہ) کی قانون ساز اسمبلیوں میں مکمل اکثریت حاصل ہوئی۔ بمبئی میں، کانگریس دو یا تین کانگریس نواز گروہوں کے ساتھ اکثریت حاصل کر سکی، جبکہ شمال مغربی سرحدی صوبے اور آسام میں یہ سب سے بڑی پارٹی بن کر سامنے آگئی۔ لیکن کانگریس چاہتا تھا کہ گورنروں کی طرف سے صوبوں کے روزمرہ کے نظم و نسق میں کوئی مداخلت نہیں ہونی چاہئے۔ 22 جون 1937 کو لارڈ لن لتھگو کی مطلوبہ یقین دہانی (صوبوں میں گورنروں کی عدم مداخلت) کے بعد شمال مغربی سرحدی صوبے، مرکزی صوبے، متحدہ صوبے، بہار، بمبئی، مدراس اور اڑیسہ کے صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں بن گئیں۔ متعدد اڑچنوں کے باوجود، دو سالوں تک کانگریس نے کافی حد تک قابل اعتبار کام کیا۔

جب گورنر جنرل کی طرف سے یہ یقین دہانی حاصل ہوئی کہ گورنر روزمرہ کے نظم و نسق میں مداخلت نہیں کریں گے، اور وہ وزراء کے دلائل کو پوری طرح سمجھ کر اپنے فیصلوں پر پہنچیں گے، تو کانگریس نے اقتدار سنبھالا۔ وزارتوں کو بڑی ترقیاتی سرگرمیاں سونپی گئی تھیں اور وہ سماجی تبدیلی کو متعارف کرانے میں مصروف ہو گئے۔ ان مصروفیات میں بنیادی تعلیم، کرایہ داری کے قوانین، زرعی قرض، دیہی ترقی، صنعتی اجرت کے تنازعات، روایتی صنعتیں اور معاشرے کے کمزور طبقات کی بہتری کا احاطہ شامل ہیں۔ لیکن سیاسی مسائل نے دشواریاں پیدا کی، اور گورنر کی بالادستی کی حقیقت واضح ہو گئی۔ مثلاً، اکتوبر 1939 میں دوسری جنگ عظیم میں شمولیت سے متعلق برطانیہ کے یکطرفہ اعلان پر کانگریس کی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس مختصر دور حکومت میں، کانگریس نے قوم پرستی کی سرگرمیوں پر توجہ مرکوز کی اور عوام کے تئیں ہمدردانہ رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو عوام کا خادم سمجھا اور عوام کے اندر اعتماد پیدا کیا لیکن اس دور میں مسلم لیگ نے کانگریس کے خلاف ایک زبردست پروپیگنڈہ کیا کہ کانگریس کے دور حکومت میں مسلمانوں کے حقوق اور مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے۔

اکتوبر 1939 میں، ہندوستان کو دوسری جنگ عظیم میں گھسیٹنے اور انگریزوں کی جانب سے اپنے جنگی مقاصد کو واضح طور پر بیان نہ کرنے کی وجہ سے کانگریس نے استعفیٰ دے دیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کے دفعہ 93 کے تحت کانگریس وزارتوں کے مستعفی ہونے پر گورنروں نے صوبوں کے انتظامیہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ گورنروں نے اپنے صوبوں میں اعلیٰ عہدیداروں میں سے عموماً دو یا تین مشیروں کا تقرر کیا۔ اس طرح 1946 میں کانگریس کی وزارتوں کی بحالی تک برطانوی ہندوستان کے ایک بڑے حصے (بمبئی، مدراس، یوپی، بہار، جی پی کے صوبوں میں) میں کوئی ذمہ دار حکومت نہیں تھی اور نہ ہی صوبائی خود مختاری کا کوئی نشان تھا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں، مسلم لیگ کی وزارت بنائی گئی لیکن 1946 میں اس کی جگہ کانگریس وزارت نے لے لی۔ اڑیسہ میں اتحادی وزارتیں قائم ہوئیں، لیکن

1946 میں وہاں کانگریس نے اقتدار حاصل کیا۔ آسام میں لیگ کی وزارت بنائی گئی، اور 1946 میں اس کی جگہ بھی کانگریس وزارت نے لے لی۔ سندھ اور بنگال میں لیگ کی حکمرانی مستحکم ہو گئی۔ 1946 میں کانگریس، سکھ اور یونینسٹ کو لیشن منسٹری کے قیام تک پنجاب یونینسٹ پارٹی کے زیر تسلط رہا۔

18.5 1935 کے ایکٹ کی دیگر دفعات (Other Provisions of the Act of 1935)

1935 کے ایکٹ کی دیگر دفعات حسب ذیل ہیں:

- اس قانون نے آئین کی تشریح کرنے کے لیے ایک وفاقی عدالت قائم کی، لیکن اس سلسلے میں بھی حتمی اختیارات لندن کے پریوی کونسل (Privy Council) کے پاس رہے۔
- اس قانون کے ذریعے پیش کردہ نیا آئین غیر لچک دار تھا، اس میں ترمیم کرنے کا واحد اختیار برطانوی حکومت کے پاس تھا۔
- اگرچہ صوبائی خود مختاری اور مرکز میں جزوی ذمہ دار حکومت کے تعارف نے ہندوستانی معاملات پر برطانیہ کا کنٹرول کم کر دیا، پھر بھی جب گورنر جنرل یا گورنر اپنے انفرادی فیصلے یا صوابدیدی اختیارات پر عمل کرتے۔ انہیں ہندوستان کے سیکرٹری آف اسٹیٹ کی طرف جواب دہ رہنا ہوتا تھا۔
- الحاق کے ذریعے وفاق کو دیئے گئے کنٹرول کے علاوہ، ہندوستانی ریاستوں کے سلسلے میں برطانوی پارلیمنٹ کے حقوق اور ذمہ داریاں متاثر نہیں ہوئی۔ یہ حقوق اور ذمہ داریاں برطانوی پارلیمنٹ کے نمائندے کے ہاتھ میں چھوڑ دی گئی۔
- سیکرٹری آف اسٹیٹ کی انڈیا کونسل کے بجائے گورنر جنرل کو ایسے مشیر دیے گئے، لیکن ضروری نہیں ہے کہ اُن کے مشورے قبول کیے جاتے۔ اس کونسل کو ہندوستان مخالف پالیسیوں کے خلاف احتجاج کی وجہ سے ختم کر دیا گیا۔

18.6 1935 کے ایکٹ کی اہمیت (Significance of the Act of 1935)

1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا بنیادی تصور یہ تھا کہ حکومت ہند برطانیہ کی ہی حکومت ہے۔ 1919 کے انڈین کونسلس ایکٹ نے ہندوستان کو برطانوی حکومت کا ماتحت تسلیم کیا تھا۔ بعد میں اس قانون نے گورنر جنرل کو سول اور فوجی انتظامیہ پر نگرانی، اور کنٹرول کے اختیارات بھی سونپے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 نے سابقہ قانون کا انحراف کیا اور پختہ عزم کے ساتھ ماضی کے آئینی طریقوں سے منہ موڑ لیا۔ اس نے واضح طور پر برطانوی پارلیمنٹ کے تمام حقوق، اختیار اور دائرہ اختیار، جو کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے علاقوں کی حکومت سے متعلق ہیں، کو دوبارہ شروع کیا۔ گورنر جنرل لارڈ لن لتھگو نے نئی اصلاحات کی اہمیت پر بات کرتے ہوئے کہا کہ 'برطانیہ اور ہندوستان کی مشترکہ حکمتِ عملی سے، نمائندہ خود حکمرانی میں ایک ایسا تجربہ شروع ہونے والا ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے۔ یہ اصلاحات برٹش کامن ویلتھ کے رکن کی حیثیت سے ہندوستان کے تئیں برطانوی پالیسی میں گہری تبدیلی کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اس نے تعاون اور تصفیہ کے نئے نظریات کے لیے سامراجیت اور نوآبادیت کے پرانے نظریات کو ترک کرنے کی کوشش کی۔' رابرٹس کے مطابق، '

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 نے پرانے اور نئے کے درمیان ایک نامیاتی رابطہ قائم کیا اور اس کے اندر آزادی کے بیج موجود تھے۔'

18.7 1935 کے ایکٹ کے مطابق انتظامی ڈھانچے

(Administrative Structures under the Act of 1935)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کے مطابق انتظامی ڈھانچوں کی تنظیم مندرجہ ذیل بیان کی گئی ہے۔

18.7.1 پبلک سروس (Public Service)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 نے پبلک سروس کو اعلی اور دیگر خدمات کے طور پر درجہ بندی کی۔ انڈین سول سروس، انڈین پولیس اور انڈین میڈیکل سروسز کو اعلیٰ خدمات کا درجہ دیا گیا اور سیکرٹری آف اسٹیٹ کے ذریعے کنٹرول کیا گیا۔ انہوں نے خصوصی حقوق اور مراعات حاصل کیے۔ اعلیٰ سروس کے کسی رکن کے خلاف کوئی منفی حکم گورنر کی رضامندی کے بغیر نہیں لیا جاسکتا تھا۔ انہیں کسی مخالف حکم کے خلاف سیکرٹری آف سٹیٹ سے اپیل کرنے کا حق حاصل تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 نے فیڈرل پبلک سروس کمیشن (Federal Public Service Commission) کے قیام کی سفارش کی تھی۔ اس قانون کے ذریعے اس سروس نے ہندوستانیت (Indianisation) اختیار کی۔ ان افسروں کا کردار پالیسیوں کی تشکیل اور ان کے نفاذ تک محدود تھی، لیکن مجموعی طور پر انہوں نے پبلک سروس کے کل ہند کردار کو برقرار رکھا۔

18.7.3 مالیاتی انتظامیہ (Financial Administration)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کے تحت مالی انتظامات نیمیئر کمیٹی (Niemeyer Committee) کی سفارشات پر مبنی تھے۔ محصولاتی ذرائع فہرست نظام (List System) کے مطابق کام کرتی تھی۔ صوبائی مضامین سے حاصل ہونے والی رقم صوبوں کی آمدنی کا بنیادی ذریعہ تھا۔ صوبوں کو آمدنی کے کچھ اضافی ذرائع بھی ہوتے تھے، مثال کے طور پر، محصولِ آمدنی (Income Tax)، مالی عطیہ (Grant-in-Aid) ، وغیرہ۔ صوبوں کو اپنے وسائل کی حفاظت پر قرض لینے کا بھی اختیار دیا گیا۔ اپنی مالی حالت کو محفوظ بنانے کے لیے، مرکز کچھ رقوم اپنے پاس رکھ سکتا تھا جو کہ صوبوں کو تفویض کردہ انکم ٹیکس کے ایک مقررہ فیصد کی شکل میں تجویز کیا جاتا تھا۔ مالیاتی انتظامیہ میں ہندوستان کے آڈیٹر جنرل نے کلیدی حیثیت حاصل کی۔ وہ مرکز کے ساتھ ساتھ صوبوں کے حساب کتاب کو بھی دیکھتا تھا۔ اپریل 1935 میں، ریزرو بینک آف انڈیا کا قیام عمل میں لایا گیا۔ قانون ساز اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے ذریعے اخراجات پر مالی کنٹرول حاصل کیا گیا۔ 1833 کے چارٹر قانون کے بعد سے مالیات (Finance) کی مرکزی نوعیت والی مشینری ہندوستانی نظام کی ایک خصوصیت رہی ہے۔ ہندوستان میں کمپٹرولر اور آڈیٹر جنرل کے دفتر کی حیثیت، ہمارے موجودہ آئین میں ایک قانونی حیثیت، اس تاریخی حقیقت سے تقویت حاصل کرتا ہے۔

18.7.4 عدالتی انتظامیہ (Judicial Administration)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 نے دفعات کی تشریح اور بین الصوبائی تنازعات سے نمٹنے کے لیے وفاقی عدالت قائم کی۔ یہ عدالت وفاقی طرز حکومت کی لازمی یا ضروری شرط تھی۔ لیکن پریوی کونسل اب بھی ہندوستان کے لیے اپیل کی اعلیٰ ترین عدالت تھی۔ وفاقی عدالت نے ہندوستان کی آئینی ترقی میں خاطر خواہ تعاون پیش کیا۔ لیکن اس کا سہرا موریس گائیر (Maurice Gwyer) کو جاتا ہے، جو اس ابتدائی دور کے پہلے چیف جسٹس تھے۔ اس وفاقی عدالت نے نازک دور میں بھی عدلیہ کی آزادی کا بنیادی اصول قائم کیا۔ اس کا فوری مقصد صوبوں کی خود مختاری کا تحفظ اور سیاسی طور پر متحرک ماحول میں نظم و ضبط قائم کرنا تھا۔

18.7.5 مقامی انتظامیہ (Local Administration)

مقامی حکومت ایک منتقلی مضمون (Transferred Subject) پر مبنی تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کے بعد حکومت نے اس کی طرف توجہ مرکوز کی۔ اس سے متعلق نافذ تمام دفعات نے مقامی حکومتوں کو زیادہ نمائندہ اور مقبول بنایا۔ اس قانون میں پسماندہ اور مزدور طبقوں کی نمائندگی فراہم کی گئی ہے۔ چونکہ عام نافرمانی کی تحریک کے ذریعے ملک گیر سیاسی لہر میں بلدیاتی اداروں کا بائکاٹ کیا گیا؛ اس لیے وہ توجہ کی ترجیح کھو بیٹھے۔ روایتی پنچایتی نظام طویل عرصے سے ناکارہ ہو چکا تھا؛ اور نئی مقامی حکومت مضبوط نہیں ہو سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ مقامی فنڈز کی ترتیب اور مفاہمت کے لیے مقامی حکومت کی ضرورت محسوس کی گئی۔ یہ صرف کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے تجربے اور اس کے نتیجے میں پنچایتی راج کی بہتری تھی کہ شراکتی ترقی کے بڑے عمل میں دیہی حکومت کا ڈھانچہ معنی خیز ثابت ہوا۔

18.8 1935 کے ایکٹ سے متعلق نقطہ ہائے نظر (Approaches to the Act of 1935)

- کانگریس نے نئے آئین کو مسترد کر دیا۔ ایک پریس بیان کے دوران، اس وقت کے کانگریس صدر جواہر لال نہرو نے ملک کو یکم اپریل 1937 کا دن یاد دلایا، جب لوگوں کی متفقہ مرضی کے خلاف گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 نے ملک میں 'ناپسندیدہ، غیر جمہوری اور ملک دشمن' آئین زبردستی عائد کیا گیا۔ ایک اور موقع پر نہرو نے اعلان کیا کہ نیا آئین 'انجن کے بغیر مضبوط بریکوں والی مشین ہے۔'
- ایک اور نقاد نے اس بات کی تصدیق کی کہ یہ قانون 'انتظامیہ اور حکومت کی مکمل ہندوستانی صلاحیت کو بالکل اسی طرح جانچتا ہے جس طرح ایک آدمی کی تیراکی کی صلاحیت کو جانچا جاتا ہے، جب اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے دریا میں پھینک دیا جاتا ہے۔ نئے آئین کو 'خود حکومت' کہنا ایک بھیانک مذاق ہے، جس سے مزاحیہ فنکار لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یاد رکھیں کہ نئے وفاقی ڈھانچے کو ایک مظبوط جدوجہد کرنی پڑی۔ اس کی خصوصیت بیان کرنے کے لیے موزوں زبان تلاش کرنا مشکل ہے۔ الغرض، یہ قانون قابل تنفر، زہر آلود اور جارحانہ تھا۔'
- پنڈت مالویہ نے کہا ہے کہ 'یہ قانون ہم پر تھوپ دیا گیا ہے۔ اس قانون کی ظاہری شکل کچھ جمہوری ہے، لیکن اندر سے بالکل کھوکھلا ہے۔'
- سی۔ راجگوپالاچاری نے نئے قانون کو 'دو عملی حکومت (Dyarchy) سے بھی بدتر' قرار دیا۔

- مسٹر جناح نے اسے 'مکمل طور پر بوسیدہ، بنیادی طور پر خراب، اور مکمل طور پر نا قابل قبول' قرار دیا۔
- شنمو خام چیٹی لکھتے ہیں کہ 'واقعی میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 اور ڈومینین اسٹیٹس دو الگ قصے ہیں۔ ہندوستان کو نہ اندرونی اور نہ ہی بیرونی معاملات پر کنٹرول حاصل ہے۔ گورنر جنرل اور گورنروں کے تحفظات اور خصوصی اختیارات، ہندوستانی قانون ساز اسمبلیوں کی کمزوری، وفاقی اور صوبائی حکومتوں میں وزراء کی کمزور حیثیت، کیمونل ایوارڈ، برطانوی ہندوستانیوں کی قیمت پر خریدی گئی ریاستوں کی نمائندگی، اقتصادی مسائل، دفاع پر ہندوستانی کنٹرول کے معمولی اقدامات وغیرہ، یہ سب چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ صورتحال ڈومینین اسٹیٹس سے کافی دور ہے۔'
- بنگال کے وزیر اعلی جناب فضل الحق نے اعلان کیا کہ اس قانون کے تحت نہ ہندو راج ہوگا اور نہ ہی مسلم راج۔
- شفاعت احمد خان لکھتے ہیں کہ 'وفاقی قانون ساز اسمبلی اس قدر تجسس کے ساتھ تشکیل دی گئی ہے اور اس کا طریقہ کار اس قدر چالاکی سے تیار کیا گیا ہے کہ اس کا آزادانہ طور پر کام کرنا مشکل ہے۔ یہ نامیاتی اتحاد سے محروم رہے گا؛ اس میں مشترکہ وفاداری اور قومی یکجہتی کا فقدان ہوگا؛ اور یہ اپنے آپ کو متضاد اور تباہ کن مسائل میں ڈال سکتا ہے جس میں قیادت اور ٹیم ورک کے بنیادی اصولوں کی کمی ہوگی۔'

18.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مون ٹیگ چمسفورڈ اصلاحات نے مرکز میں ایک جوابدہ حکومت اور صوبوں میں دو عملی حکومت (Dyarchy) کی شکل میں ایک استوانی یا مخروطی حکومت قائم کی۔ گول میز کانفرنسوں کے آئینی اصلاحات نے اس کی ناکامی کی تصدیق کی۔ بالآخر تین گول میز کانفرنسوں کے ذریعے تیار کیا ہوا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 نے کل ہند وفاق اور صوبائی خود مختاری کی تجویز پیش کی۔ کل ہند وفاق کو تشکیل نہیں دیا جا سکا کیونکہ اسے نافذ ہونے سے پہلے مخصوص تعداد میں شاہی ریاستوں کی منظوری کی ضرورت تھی۔ صوبائی حکومتوں کے حوالے سے متعدد مضامین پر عمل کیا گیا۔ صوبائی خود مختاری اپنی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ اپنی حدود کو سامنے لانے میں بھی کامیاب رہی۔ تاہم، مجموعی طور پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کافی اہمیت کا حامل رہا۔ اس نے نہ صرف ایک عبوری آئین کے طور پر کام کیا بلکہ آزاد ہندوستان کے لیے آئین کی بنیاد بھی فراہم کی۔ پہلے کی آئینی اصلاحات کے ساتھ اس قانون نے تبدیلی کے عمل کو ایک خصوصی سمت دی اور اس کے مواد کو بھی متاثر کیا۔ یہی وہ پہلو ہے جس نے تبدیلی میں تسلسل فراہم کیا۔

18.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

دو ایوانوں والی قانون ساز اسمبلی : ایوان زیریں اور ایوان بالا۔ عام طور پر ایوان زیریں وسیع البنیاد، نمائندہ اور سیاسی طور پر زیادہ اہم ہوتا ہے۔ لیکن وفاقی حکومت میں ایوان بالا کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

عام نافرمانی تحریک : 1930 میں گاندھی کی طرف سے شروع کی گئی ملک گیر تحریک، جس میں ستیہ گرہ کا استعمال کیا گیا۔ اس میں برطانوی حکومت کے ساتھ وابستگی سے رضاکارانہ دستبرداری اور ٹیکسوں کی عدم ادائیگی پر زور دیا گیا۔

عدلیہ کی آزادی : یہ عدلیہ کو انتظامی اثر ورسوخ سے دور رکھنے کا جمہوری عمل ہے۔ یہ انصاف کے انتظام میں تحفظ اور آزادی فراہم کرتا ہے، اور یہ جمہوریت کی سب سے اہم علامت ہے۔

سہ فہرست نظام : یہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان مضامین کی تفصیلی تقسیم ہے۔ مضامین کو تین اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے، مثال کے طور پر وفاقی، صوبائی اور مشترکہ امور کی فہرست۔

18.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

18.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. سائمن کمیشن کی تقرری کب ہوئی؟
2. 19 مئی 1928 کو بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس کس کی صدارت میں منعقد ہوئی؟
3. نہرو رپورٹ کس کی صدارت میں تیار کیا گیا؟
4. پہلی گول میز کانفرنس کب منعقد ہوئی؟
5. گاندھی ارون معاہدہ کب طے ہوا؟
6. پونا سمجھوتا کس کے درمیان طے ہوا؟
7. دوسری عالمی جنگ کب شروع ہوئی؟
8. 1931 میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کس نے کی؟
9. گاندھی نے کس گول پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کی؟
10. رامسے میکڈونلڈ نے کمیونل ایوارڈ کب پاس کیا؟

18.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 سے متعلق مختلف نقطہ ہائے نظر بیان کریں۔
2. سائمن کمیشن کی سفارشات پر روشنی ڈالیے۔
3. نہرو اسکیم کی خصوصیات بیان کیجیے۔
4. گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 میں تجویز کردہ کل ہند وفاق کی ناکامی کے وجوہات ہیں بیان کیجیے۔
5. گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کے اہم دفعات بیان کیجیے۔

18.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کے تاریخی پس منظر پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

2. صوبائی خود مختاری اور اس کی عملیاتی حیثیت پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کریں۔

3. گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 "انجن کے بغیر مضبوط بریکوں والی مشین ہے۔" وضاحت کیجیے۔

18.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Austin, Granville, *The Indian Constitution*: *Cornerstone of a Nation*, Oxford University Press, New Delhi, 2018 (first pub. in 1966).
2. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
3. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2014.
4. Basu, Durga Das, *Introduction to the Constitution of India*, Prentice-Hall of India, New Delhi, 1997 (eighteenth edition).
5. Bose, Sugata and Ayesha Jalal, *Modern South Asia*: *History, Culture, Political Economy*, Oxford University Press, New Delhi, 2004.
6. Chandra, Bipan, et al., *India's Struggle for Independence*, *1857–1947*, Penguin, New Delhi, 1989.
7. Grover and Grover, *A New Look at Modern Indian History*, S. Chand & Co. Ltd., New Delhi, 1983.
8. Maheshwari, S.R., *Indian Administration*, Orient Longman, New Delhi, 1984.
9. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal*: *A New History of British India*, HarperCollins, Noida, 2021.
10. Mishra, B.B., *The Administrative History of India*, Oxford University Press, London, 1970.
11. Mukherjee, Mithi, *India in the Shadows of Empire*: *A Legal and Political History*, *1774–1950*, Oxford University Press, New Delhi, 2012 (first pub. in 2010).
12. Ranjan Ray, Nisith, et al., *Concise History of the Indian National Congress*, *1885–1947*, Vikas Publishing House, 2019.
13. Robert, P.E., *History of British India under the Company and the Crown*, Oxford University Press, London, 1952.
14. Sarkar, Sumit, *Modern India*, *1885–1947*, MacMillan, New Delhi, 1982.

اکائی 19۔ قومی تحریک اور بائیں بازو کی جماعتیں

(National Movement and the Left)

اکائی کے اجزا

19.0 تمہید

19.1 مقاصد

19.2 پس منظر

19.3 کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا قیام

19.3.1 جواہر لال نہرو اور اشتراکی تحریک

19.4 ایم این رائے اور کمیونسٹ پارٹی

19.5 بائیں بازو کی کچھ دیگر جماعتیں

19.6 بائیں بازو کی تحریکوں کی کمزوریاں

19.7 ہندوستانی سیاست میں بائیں بازو کے اثرات

19.8 اکتسابی نتائج

19.9 کلیدی الفاظ

19.10 نمونہ امتحانی سوالات

19.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

19.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

19.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

19.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

19.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان میں بائیں بازو کا عروج ہندوستانی قومی تحریک کے پس منظر میں ہوا۔اس کے نظریات اور رجحانات کو بیان کرنے کی کسی بھی کوشش کا نقطہ آغاز اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی وقت میں قومی اور انقلابی تحریک تھی۔1917 میں لینن کے ذریعے روس میں زار شاہی کے خاتمہ سے ہندوستان میں بائیں بازو کی تحریکوں کو تقویت ملی۔گاندھی جی کے ذریعے خلافت اور عدم تعاون تحریک کا واپس لیا جانا ایک دوسرا بڑا محرک تھا۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جو حصول آزادی کے گاندھیائی فلسفے سے مطمئن نہیں تھے،ایسے لوگوں میں جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس،آچاریہ نریندر دیو،ایم۔این۔رائے وغیرہ شامل تھے۔

بائیں بازو کی تحریکیں تاریخی طور پر انڈین نیشنل کانگریس کے تحت آزادی کی جدوجہد سے جڑی ہوئی تھیں اور کانگریس میں موجود اس کی نظریاتی قیادت،ابتدائی قوم پرست رہنماؤں کے خیالات اور نظریات سے متاثر تھی۔کانگریس میں موجود بائیں بازو کے رہنماؤں نے اپنی پوری توجہ قومی آزادی پر لگائی اور صرف ملک کو مضبوط کرنے کے مقصد سے انتہا درجے کی سماجی اور معاشی تبدیلیوں کی تبلیغ کی۔ان کا یقین تھا کہ ملک کی آزادی اور قوم کی ترقی کے لیے بڑے پیمانے پر سماجی اور معاشی بدلاؤ کی ضرورت ہے۔وہ صرف ابتدائی قوم پرست رہنماؤں جیسے مہاتما گاندھی کے قدامت پسند سماجی-معاشی نظریات اور جدیدیت مخالف فلسفے سے متنفر ہوئے جو نہ صرف روایتی سماجی درجہ بندی میں کسی بھی بڑی تبدیلی کے خلاف تھے، بلکہ جدید سائنس، تکنیک اور صنعتی ارتقا کو بھی مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے۔کانگریس کے اندر متعدد ایسے دانشوروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی جو ملک میں شدید سماجی اور معاشی تبدیلیوں کے حق میں تھے مگر وہ ہندوستانی زندگی اور سماج کے لازمی عناصر کو نکال پھینکنے کے لیے تیار نہیں تھے۔مارکس کے طبقاتی جدوجہد کے نظریے کا ردعمل نہایت سرد مہری بھرا تھا۔وہ اشتراکی نظریے کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ یہ نظریہ نہ صرف تیز رفتار ترقی کا منصوبہ مہیا کرتا ہے بلکہ قدامت پسندی اور سرمایہ داری کا ایک متبادل بھی پیش کرتا ہے۔اس طرح کے دانشوروں جیسے نہرو، بوس، نریندر دیو، جے پرکاش وغیرہ کے ابھرنے سے ہندوستانی قوم پرستی اور آزادی کی جدوجہد میں ایک زیادہ تغیر پسند اور اہم عنصر کا اضافہ ہوگیا۔

بائیں بازو کے کمیونسٹ طبقے نے دوسری طرف قومی آزادی سے زیادہ طبقاتی کشمکش اور مزدور طبقے کی بین الاقوامیت پر توجہ مرکوز کی، جس کی وجہ سے وہ آزادی کی جدوجہد میں بھرپور جوش وجذبے کے ساتھ حصہ نہیں لے سکے اور عوام کے درمیان مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ایسا مانا جاتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم نے حتمی مقصد یعنی عالمی پرولتاری یا مزدوروں کے انقلاب کی طرف بڑھنے کے لیے پہلے قدم کے طور پر سامراجیت کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے مناسب حالات پیدا کیے۔یہ ایک ایسا مقصد تھا جو انتہا پسند قوم پرستوں کے مقاصد سے زیادہ انقلابی اور غیر مفاہمتی تھا۔کمیونسٹ تحریک کے ابتدائی سالوں میں اس کا سب سے بڑا مقصد ایک ایسی انقلابی پارٹی بنانا تھا جو مزدور طبقے کی ڈھال ہو اور کمیونسٹوں کی قیادت میں ایک انقلاب برپا کرسکے۔ لیکن ابھرتی ہوئی قوم پرستی کے دور میں اپنی پہچان ایک قومی مقصد سے جوڑے بغیر اور قومی بورژوا طبقے کے ساتھ ایک مشترکہ قومی جدوجہد کا محاذ بنائے بغیر یہ کام تقریباً ناممکن تھا۔اسی لیے 1920 کی دہائی میں کمیونسٹ گروہوں کے ابھرنے سے لے کر ایک مسئلہ بار بار سامنے آرہا تھا کہ پرولتاری بین الاقوامیت کے نظریات کا ہندوستانی قوم پرستی کی اقدار کے

ساتھ تال میل کیسے بٹھایا جائے۔ یہی چیز کمیونسٹوں کی عام غیر مقبولیت کا سبب بنی۔ اس اکائی میں آپ ان بائیں بازو کی تحریکوں کے آغاز، عروج اور ارتقا کے بارے میں جانیں گے جنہوں ہندوستانی سیاست کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ اپنی متعدد کمزوریوں کے باوجود ان کا عروج بڑے پیمانے پر قومی تحریک کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا۔ مزدوروں کو ٹریڈ یونینوں میں منظم کرنے، ان کو ان کے سیاسی حقوق کا احساس دلانے اور کسان تحریکوں کو منظم کرنے میں بائیں بازو والوں نے بے حد اہم کردار ادا کیا۔

19.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں جان سکیں گے۔
- جواہر لال نہرو اور اشتراکی تحریک کو سمجھ سکیں گے۔
- ایم این رائے اور کمیونسٹ پارٹی کے بارے میں جان سکیں گے۔
- بائیں بازو کی تحریکوں کی کمزوریوں سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہندوستانی سیاست میں بائیں بازو کے اثرات کا تجزیہ کر سکیں گے۔

19.2 تاریخی پس منظر (The Historical Context)

بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخری سالوں اور تیسری دہائی کے دوران بائیں بازو کی نہایت تیزی سے ترقی ہوئی۔ قومی تحریک کے بنیادی مقصد کو متاثر کرنے میں اس نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ حصول آزادی کے مقصد کے ساتھ اس کا سماجی اور معاشی نظریہ صاف اور کھل کر سامنے آیا۔ آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد اور مظلوم و بے کس مزدور عوام کو ان کی سماجی اور معاشی زبوں حالی سے نجات دلانے کی جدوجہد ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ اشتراکی (Socialist) نظریات ہندوستان کی سرزمین میں پہنچنے شروع ہوئے اور اشتراکیت (Socialism) نوجوانوں کا مقبول ترین نظریہ بن گیا۔ جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس اس نظریے کے نمایاں علمبردار تھے۔ دھیرے دھیرے بائیں بازو کی دو طاقتور پارٹیاں، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (Communist Party of India) یا سی۔ پی۔ آئی۔ (.C.P.I) اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی (Congress Socialist Party) یا سی۔ ایس۔ پی۔ (.C.S.P) ابھر کر سامنے آئیں۔ بائیں بازو کی مختلف جماعتوں کے آغاز اور ارتقا میں روسی انقلاب کا اہم کردار تھا۔ 7 نومبر 1917 میں ولادیمیر ایلچ لینن (Vladimir Ilyich Ulyanov) کی قیادت میں مارکسوادی نظریات کی حامل بالشویک (Bolshevik) پارٹی نے روس میں زار شاہی کا خاتمہ کر کے اشتراکی حکومت قائم کی۔ روس کے نئے اشتراکی حکمرانوں نے چین اور ایشیا کے دوسرے حصوں میں قائم اپنے نوآبادیاتی اختیارات کو چھوڑنے کا اعلان کیا۔ روس کے اس نئے نظام حکومت سے دیگر یورپی طاقتوں کی نوآبادیوں میں امید کی نئی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے اس واقعہ سے ایک سبق یہ بھی لیا کہ اگر عام لوگ یعنی کسان، مزدور اور اہل علم طبقہ متحد ہو کر زار شاہی حکومت کا تختہ پلٹ کر ایک ایسا سماجی نظام قائم کر سکتے

ہیں جس میں کوئی کسی کا استحصال نہیں کرتا ہے، تو انگریزی سلطنت کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہندستانی عوام بھی ایسا کر سکتی ہے۔ اس لیے اشتراکی اصول خصوصاً مارکسی نظریہ فکر نے جو بالشویک پارٹی کا رہنما اصول تھا، لوگوں کو بے حد متاثر کیا اور ایشیائی باشندے خاص طور سے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

1919 میں انتہا پسند لیڈر بپن چندر پال نے لکھا تھا 'آج جرمنی کی فوجی حکومت کے زوال اور مطلق العنان زار شاہی حکومت کے خاتمہ کے بعد پوری دنیا میں عوام کی ایک نئی طاقت ابھری ہے جو اپنے جائز حقوق کے تحفظ کے لیے اور دولت مند و نام نہاد اونچے طبقوں کے ذریعے کیے جارہے استحصال اور ظلم سے نجات پاکر آزادی کے ساتھ اپنی مرضی سے زندہ رہنے کا اختیار حاصل کرنے کے لیے پوری طرح کمر بستہ ہے۔' اشتراکی فکر تیزی سے نوجوانوں میں پھیلنے لگی، خصوصاً ان لوگوں میں جنھوں نے عدم تعاون تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا اور جو اس کے نتیجے اور گاندھیائی عدم تشدد کے اصول اور ان کے سوراج کے منصوبے سے غیر مطمئن تھے۔ نتیجتاً اشتراکیوں اور کمیونسٹوں کی بہت سی تنظیمیں پورے ملک میں وجود میں آگئیں۔ بمبئی میں ایس۔اے۔ ڈانگے (S.A. Dange) نے 'گاندھی اور لینن' (*Gandhi and Lenin*) نام کا ایک پمفلٹ شائع کیا اور پہلے ہفتہ وار اخبار کی شروعات کی جس کا نام 'دی سوشلسٹ' (*The Socialist*) تھا۔ بنگال میں مظفر احمد نے 'نو یگ' (*Nav Yuga*) نکالا اور بعد میں نذر الاسلام کے تعاون سے 'لانگل' (*Langal*) جریدہ وجود میں آیا۔ پنجاب میں غلام حسین نے کچھ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر 'انقلاب' (*Inqilab*) شائع کیا اور مدراس میں ایم۔ سنگارویلو (M. Singaravelu) نے 'لیبر کسان گزٹ' (*Labour Kisan Gazette*) کی بنیاد ڈالی۔

1927 کے بعد سے پورے ملک میں طلبا تنظیموں کا جال سا بچھ گیا۔ 1928 اور 1929 کے دوران سیکڑوں نوجوان کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور ان میں، جن سماجی، معاشی اور سیاسی برائیوں سے ملک دوچار ہو رہا تھا، ان کا مکمل حل تلاش کرنے کی پرزور کوشش کی گئی۔ سامراجیت، سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف بولتے ہوئے جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس نے گھوم گھوم کر پورے ملک میں اشتراکی نظریات کا پرچار کیا۔ چندر شیکھر آزاد اور بھگت سنگھ کی رہنمائی میں انقلابی انتہا پسندوں کا جھکاؤ اشتراکیت کی طرف ہو گیا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پورے ملک میں ٹریڈ یونین اور کسان تحریکیں تیزی سے پھیلتی رہیں۔ پوری دنیا، عظیم مندی (The Great Depression) کا شکار تھی، اس لیے ان دنوں اشتراکی نظریات کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ چونکہ سرمایہ دار دنیا میں بے روزگاری کا غلبہ تھا اس لیے عالمی سطح پر مندی کی وجہ سے سرمایہ داری نظام کو شدید دھکا لگا اور مارکسی اور اشتراکی نظام کی طرف لوگوں کی رغبت میں اضافہ ہوا۔ کانگریسی خیمہ میں ہی 1936 اور 1937 میں جواہر لال نہرو اور 1938 اور 1939 میں سبھاش چندر بوس کے کانگریس کا صدر منتخب ہونے میں بائیں بازو کے رجحان کی جھلک صاف دکھائی پڑتی ہے۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے قیام سے بھی اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔

19.3 کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا قیام (Formation of the Congress Socialist Party)

31–1930 اور 34–1932 کے دوران نوجوان کانگریسیوں کے ایک گروپ نے جیل میں سوشلسٹ پارٹی بنانے میں پہل

کی۔اس وقت تک گاندھیائی حکمت عملی اور قیادت کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور اشتراکی نظریات کے تئیں ان کی دلچسپیاں بڑھ گئی تھیں۔ان میں سے کئی لوگ 1920 کی دہائی کے آخری دور میں نوجوان تحریک میں سرگرم رہ چکے تھے۔ جیل میں ان لوگوں نے مارکسی اور دوسرے اشتراکی نظریات کا مطالعہ اور ان پر مباحثہ کیا تھا۔ وہ مارکسیت ،اشتمالیت اور سویت یونین کے نظریات سے بے انتہا متاثر ہوئے تھے، اس لیے انہیں ہندستانی کمیونسٹ پارٹی (Communist Party of India) کے سیاسی نظریات راس نہیں آئے۔ایسی صورت حال میں ان کو کسی متبادل پارٹی کی تلاش ہوئی جو ان کے نظریات کی بہتر ترجمانی کر سکے۔ بالآخر ان سب نے مل کر اکتوبر 1934 میں بمبئی میں جے پرکاش نرائن(Jayprakash Narayan)، آچاریہ نریندر دیو (Acharya Narendra Dev)اور مینو مسانی (Minu Masani)کی قیادت میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی(Congress Socialist Party) کی بنیاد رکھی۔ ابتدا سے ہی سبھی کانگریسی اور اشتراکی ان چار بنیادی باتوں پر ایک رائے تھے کہ ہندوستان کی اہم ترین جدوجہد 'قومی جدوجہد آزادی' ہے اور اشتراکیت تک پہنچنے کے لیے قومیت ایک ناقابل فراموش مرحلہ ہے۔ سبھی اشتراکیوں کو کانگریس کے اندر ہی رہ کر کام کرنا چاہیے کیونکہ قومی جدوجہد کی قیادت کرنے والی یہی بنیادی تنظیم ہے اور جیسا کہ آچاریہ نریندر دیو نے لکھا تھا کہ 'ہم لوگوں کے لیے قومی تحریک سے کٹ جانا خودکشی کے مترادف ہوگا اور کانگریس ہی بلاشبہ قومی تحریک کی نمائندگی کرتی ہے۔ہم کو ہر حالت میں کانگریس اور قومی تحریک کو اشتراکی سمت کی طرف لے جانا چاہیے اور اس کے حصول کے لیے مزدوروں اور کسانوں کو ان کی طبقاتی تنظیموں میں منظم کرنا اور ان کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔'

کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے شروع سے ہی کانگریس کے مزاج کو بدلنے اور خود کو مضبوط کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کی۔اس کے پیچھے اس کے دو مقاصد تھے۔پہلا مقصد یہ تھا کہ کانگریس کی نظریاتی کایاپلٹ کی جائے جس سے آزاد ہندوستان میں وہ دھیرے دھیرے اشتراکیت کا راستہ اپنالے اور موجودہ مالی معاملات میں اس کا رجحان کسانوں اور مزدوروں کے مفاد میں ہو۔ بہر حال منصوبے اور نظریہ کی یہ تبدیلی اچانک نہیں واقع ہوگی بلکہ اس کے لیے محنت درکار ہے اور اس کو بتدریج آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ مثلاً 1934 میں جے پرکاش نرائن نے اپنے پیروکاروں سے زور دے کر کہا تھا کہ 'ہم کانگریس کے سامنے ایک پروگرام پیش کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کانگریس اس کو منظور کرلے۔ اگر وہ اس کو نہیں منظور کرتی ہے تو ہم یہ نہ کہیں کہ اس کو چھوڑ کر ہم نکلے جا رہے ہیں۔اگر آج ہم ناکام ہوتے ہیں تو کل پھر کوشش کریں اور اگر کل ناکامی ہاتھ آتی ہے تو دوبارہ کوشش کریں گے۔' علاوہ ازیں یہ بھی سوچا گیا کہ کانگریس کی تنظیم میں بڑے پیمانے پر بدلاؤ ہونا چاہیے جس کا مطلب تھا کہ اعلیٰ ترین قیادت کو بدلنا ضروری ہے کیونکہ وہ عوامی جدوجہد کو ترقی دینے میں ہر سطح پر ناکام ثابت ہوئی ہے۔اس لیے مرکزی اشتراکی قیادت کے طور پر کانگریس سوشلسٹ پارٹی کو کانگریس کے نعم البدل کے طور پر پیش کرنا اور فروغ دینا تھا، جیسا کہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے 'میرٹھ مقالہ' ('Meerut Thesis') میں 1935 میں لکھا تھا کہ 'کانگریس کے اندر سامراجیت مخالف عناصر کو سرمایہ داری کے حامیوں سے الگ کرنا ہے اور ان کو انقلابی اشتراکی قیادت کے تحت لانا ہے۔' بہر حال جلد ہی اشتراکیوں کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ ایسا کرنا قریب قریب ناممکن ہے، اس لیے اس خیال کو ہی ترک کر دیا گیا اور ایک ایسی ملی جلی قیادت قائم کیے جانے کا

فیصلہ کیا گیا جس میں ہر سطح کی قیادت پر اشتراکیوں کو شامل کیا جائے۔

کانگریس میں بائیں بازو کے رہنماؤں کے خیالات کو دو بار، 1939 میں تریپورا میں اور 1940 میں رام گڑھ میں فوقیت حاصل ہوئی۔ لیکن جب دائیں اور بائیں بازو کی بنیاد پر تقسیم کی نوبت آئی اور کانگریس کو خالص دائیں بازو کی قیادت سمجھنے پر زور دیا گیا، تو کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور ہندستانی کمیونسٹ پارٹی دونوں ہی پیچھے ہٹ گئیں۔ ان دونوں کے رہنماؤں کو یہ احساس ستانے لگا کہ اس طرح کی کوشش سے نہ صرف قومی تحریک کمزور ہو گی بلکہ بائیں بازو کے لوگ عوامی جدوجہد سے کٹ جائیں گے اور یہ بھی کہ ہندستانی عوام کو صرف گاندھی کی قیادت میں ہی منظم کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں قیادت کے لیے گاندھی کا کوئی متبادل نہیں تھا۔ بہر حال نہرو کی طرح کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور بائیں بازو کے دھڑے اور پارٹیاں اس بات کو مکمل طور پر کبھی تسلیم نہیں کر سکیں اور اسی لیے وہ لوگ وقتاً فوقتاً متبادل قیادت کی رٹ لگاتے رہے۔ بائیں بازو کے دوسرے دھڑوں کے مقابلے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کو ہندستان کی حقیقی صورت حال کا بہتر شعور تھا، اس لیے اس نے کانگریس کی موجودہ قیادت کی تنقید کے باوجود اس سے تعلق بنائے رکھا۔ ہندوستان میں جب اشتراکی جدوجہد کے لیے حالات بد سے بد تر ہو گئے، تب کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے اپنے اشتراکی اصولوں کو نظر انداز کر کے حقیقت پسندی کا راستہ اختیار کیا جو کہ نظریاتی طور پر جواہر لال نہرو کی فکر سے میل کھاتا تھا۔ اس انحراف پر بائیں بازو کی پارٹیوں اور جماعتوں نے اشتراکیوں کو جم کر لتاڑا۔ مثلاً 1939 میں گاندھی اور کانگریس کے دائیں بازو والے گروہ کے مقابلہ میں سبھاش چندر بوس کی حمایت نہ کرنے پر انہیں بہت کھری کھوٹی سنائی گئیں۔ ایسے موقعوں پر اشتراکیوں نے اپنا بچاؤ کیا اور اصل ہندستانی صورت حال کو سمجھنے میں اپنی مہارت کا ثبوت دیا۔ مثلاً 1939 میں کانگریس کے تریپورا اجلاس کے بعد جے پرکاش نرائن نے کہا تھا کہ 'ہم اشتراکی یہ چاہتے ہیں کہ کانگریس میں گٹ بازی نہ ہو اور ہم قیادت کے مسئلہ پر بھی کوئی مقابلہ آرائی نہیں چاہتے ہیں۔ کانگریس کی پالیسی اور منصوبہ سے ہی ہمارا تعلق ہے۔ ہم صرف کانگریس کے فیصلوں پر اثر انداز ہونا چاہتے ہیں۔ پرانے قائدین سے ہمارا چاہے جتنا اختلاف ہو، ہم ان سے جھگڑنا نہیں چاہتے۔ ہم تو سامراجیت مخالف جنگ میں ان کے شانہ بہ شانہ چلنا چاہتے ہیں۔'

شروع سے ہی کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے لوگ موٹے طور پر تین نظریاتی خیموں میں بٹے ہوئے تھے:

1. پہلے وہ لوگ جو مارکسیت کے پیروکار تھے اور انقلابی اور انتہا پسند پر تشدد کاروائیوں کی حمایت کرتے تھے۔
2. دوسرے وہ لوگ جو فیبین انجمن (Fabian Society) کے پیروکار تھے اور آہستہ آہستہ بنا کسی بڑی انقلابی کاروائی کے، اشتراکیت کے حصول میں یقین رکھتے تھے۔
3. تیسرے گروہ میں وہ لوگ شامل تھے جو گاندھی کے عدم تشدد اور دیگر نظریات کی پیروی کرتے تھے۔

اس تقسیم سے پارٹی میں کسی طرح کی کوئی کمزوری نہیں تھی بلکہ یہی اس کی قوت کا سرچشمہ تھا۔ قومی کانگریس کے تحت کانگریس سوشلسٹ پارٹی، گروپ اور معیار پر قائم بذات خود ایک تحریک تھی۔ حالانکہ 1930 کی دہائی کی مارکسیت، بائیں بازو میں پیدا ہوئی اس رنگارنگی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کانگریس سوشلسٹ پارٹی آخر دم تک پریشانی کے دلدل میں پھنسی رہی۔ اس سب کے باوجود پارٹی کے بانیوں میں آپسی اور دوستانہ تعلقات کے باعث بہت عرصے تک نظریاتی اختلافات کھل کر باہر نہیں آسکے۔ اس کے بڑے

رہنما، آچاریہ نریندر دیو اور جے پرکاش نرائن، اشتراکیت اور قومیت کے اصولوں پر پوری طرح جمے رہے۔ لیڈروں کے درمیان نظریاتی اختلافات کے باوجود کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے مارکسیت کی شکل میں اشتراکیت کی بنیادی پہچان کو مکمل طور پر قبول کر لیا تھا۔ مثلاً جے پرکاش نرائن نے اپنی کتاب 'اشتراکیت کیوں؟' (*Why Socialism?*) میں یہ کہا کہ 'پہلے سے کہیں زیادہ آج یہ کہنا ممکن ہو گیا ہے کہ اشتراکیت (Socialism) کا صرف ایک ہی اصول ہے اور وہ ہے اشتمالیت (Communism)۔' جیسے جیسے گاندھیائی سیاست کی اہمیت لوگوں کی سمجھ میں آنے لگی، اس کی فکر کا وسیع جمہوری پہلو، سوشلسٹ پارٹی کا رہنما نظریہ بنتا چلا گیا۔

19.3.1 جواہر لال نہرو اور اشتراکی تحریک (Jawaharlal Nehru and the Socialist Movement)

ہندوستانی قومی تحریک کو اشتراکیت کی طرف لے جانے کا سہرا جواہر لال نہرو کے ہی سر ہے، جنہوں نے سب سے زیادہ زور و شور سے ان نظریات کو پھیلایا۔ 1929 کے بعد تو وہ اشتراکیت اور اشتراکی فکر کا نمونہ بن گئے۔ ان کے خیال میں سیاسی آزادی کے ساتھ سماجی اور معاشی آزادی بھی ضروری تھی۔ چالیس سال کی عمر میں ہی نہرو کو، 1929 کے کانگریس کے تاریخی لاہور اجلاس کا صدر بنایا گیا اور اسی عہدہ پر وہ دوبارہ 1936 اور 1937 میں منتخب ہوئے۔ کانگریس کے صدر اور مہاتما گاندھی کے بعد عوام کے مقبول ترین رہنما کی حیثیت سے انہوں نے کئی بار پورے ملک کا دورہ کیا، ہزاروں میل کا سفر طے کیا اور کروڑوں لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ انہوں نے اپنی کتاب، ایک 'سوانح عمری' (*An Autobiography*) اور 'تاریخ عالم پر ایک نظر' (*Glimpses of World History*) میں اشتراکیت کی اہمیت کو اچھی طرح واضح کیا اور پر زور طریقے سے اعلان کیا کہ معاشی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہے۔ اسی لیے سیاسی آزادی کے حصول کے بعد ہی اشتراکی سماج قائم کیا جاتا ہے۔ اس طرح نہرو نے قوم پرست نوجوانوں کی پوری نسل کو اشتراکی بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انہوں نے نوجوانوں کے دلوں میں اشتراکی قدروں کو اچھی طرح بٹھا دیا۔ نہرو کو معاشی معاملات سے دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب 21–1920 کے دوران مشرقی اتر پردیش کی کسان تحریک سے ان کا رابطہ قائم ہوا۔ 23–1922 کے دوران جب وہ جیل گئے تو وہاں فرصت کے اوقات کو انہوں نے روسی انقلاب نیز دوسرے انقلابات کے مطالعے میں صرف کیا۔ 1921 میں بروسیلس (Brussels) میں نوآبادیاتی سلطنت اور اس کے ظلم و جبر کے خلاف منعقدہ بین الاقوامی کانگریس (International Congress) میں انہوں نے بھی حصہ لیا اور اسی دوران وہ کمیونسٹوں اور نوآبادیاتی سلطنت سے برسر پیکار لوگوں کے رابطے میں آئے۔ اس وقت تک وہ بطور خاص مارکسواد کو ماننے لگے تھے۔ اسی سال انہوں نے سوویت یونین کا دورہ کیا اور وہاں قائم شدہ نئے اشتراکی سماج سے بہت متاثر ہوئے۔ وہاں سے واپسی کے بعد انہوں نے سوویت یونین سے متعلق ایک کتاب شائع کی جس کے سرورق پر انہوں نے ورڈس ورتھ (Wordsworth) کے ذریعے فرانسیسی انقلاب پر لکھی گئی نظم کا مشہور مصرعہ تحریر کیا:

'Bliss was it in that dawn to be alive,
But to be young was very heaven.'

(انقلاب کے ابتدائی دور میں رہنا بے حد پر مسرت تھا، مگر انقلاب کی جوانی تو مکمل جنت ہی تھی۔)

ایس۔ گوپال(Sarvepalli Gopal) کے لفظوں میں جب نہرو ہندوستان واپس ہوئے تب وہ 'ہوشمند ترقی پسند انقلابی 'بن چکے تھے۔ جواہر لال نہرو نے آزادی کے حصول کے لیے انڈیا لیگ('India League')بنانے میں سبھاش چندر بوس کا پورا ساتھ دیا تا کہ سماج کے معاشی ڈھانچہ کو اشتراکی شکل دینے کے لیے جدوجہد کی جاسکے۔ 1929 میں کانگریس کے لاہور اجلاس میں انہوں نے اعلان کیا 'میں تو اشتراکی اور جمہوریت پسند ہوں۔ میں راجاؤں، مہاراجاؤں کے اقتدار میں یقین نہیں رکھتا اور مجھ کو اس نظام میں بھی یقین نہیں ہے جو صنعت و حرفت کے جدید راجاؤں کو پیدا کرتی ہے جن کا تسلط عوام کی زندگی اور قسمت پر، ماضی کے راجاؤں مہاراجاؤں سے بھی زیادہ ہوتا ہے اور جن کے طور طریقے سفاک جاگیرداروں کی ہی طرح کے ہیں۔ انہوں نے واضح کیا کہ 'ملک سے غریبی اور عدم مساوات کو دور کرنے کے لیے اشتراکی پروگراموں کو مکمل طور سے اپنانا پڑے گا۔' کانگریس کے لیے سرمایہ اور مزدور، زمیندار اور کسان کے درمیان توازن قائم رکھنا ممکن نہیں ہے کیونکہ موجودہ حالات میں ترازو کا پلہ بری طرح سرمایہ داروں اور زمینداروں کے حق میں جھکا ہوا ہے۔

اشتراکیت کے تئیں نہرو کی دلچسپیاں 1933 اور 1936 کے دوران کھل کر ظاہر ہوئیں۔ 'ہندوستان کدھر؟' کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے اکتوبر 1933 میں لکھا کہ 'بلاشبہ ہندوستان، انسان کی سماجی اور معاشی برابری کے عظیم مقصد کو حاصل کرنے کی طرف جارہا ہے۔ وہ ایک قوم کے ذریعے دوسری قوم اور ایک طبقہ کے ذریعے دوسرے طبقہ کے استحصال کے خاتمہ کی طرف گامزن ہے۔' مزید برآں دسمبر 1933 میں انہوں نے لکھا 'سچا شہری نمونہ، اشتراکی نمونہ ہے، کمیونسٹ نمونہ ہے۔' اپریل 1936 میں انہوں نے لکھنو کانگریس کے موقع پر اپنی صدارتی تقریر میں اشتراکیت پر اپنے نظریہ کی مزید وضاحت بہت صاف اور پرزور لفظوں میں کی کہ 'مجھے کامل یقین ہے کہ پوری دنیا اور ہندوستان کے سارے مسائل کا حل، اشتراکیت ہے۔ میں جب اس لفظ کا استعمال کرتا ہوں تو مبہم انسانیت پسند معنی میں نہیں بلکہ سائنسی اور معاشی مفہوم میں کرتا ہوں۔ میری سمجھ سے ملک کی غریبی، بے روزگاری، غلامی اور زبوں حالی کا حل اشتراکیت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اس کے لیے ہمارے سماجی اور سیاسی ڈھانچے میں مکمل تبدیلی درکار ہے۔ محدود معنی میں نہ لے کر اس کا مطلب نجی جائداد کا خاتمہ اور منافع کے موجودہ نظام کی جگہ پر امداد باہمی کے اعلیٰ اصول کا قیام ہے۔'

ان ہی دنوں نہرو نے طبقاتی تجزیے اور طبقاتی کشمکش کے کردار پر بہت زور دیا اور اسی دوران ان کے اور گاندھی کے درمیان تعلقات میں پیچیدگی سی پیدا ہوئی۔ نہرو نے گاندھی کی اس لیے تنقید کی کہ وہ طبقاتی کشمکش کے اصول کو نہیں مانتے تھے، ساتھ ہی وہ استحصال کرنے والوں اور استحصال سہہ رہے لوگوں کے درمیان تال میل قائم کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ گاندھی کے تولیت (Trusteeship) کے اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے تھے جس کے ذریعہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کا دل ودماغ بدلنا ہوتا ہے۔ نہرو نے اپنی سوانح عمری میں ایک پورا باب ہی گاندھی کے نظریات کی مخالفت میں صرف کیا اور بڑے نرم لہجہ میں ان کی تنقید کی۔ مگر ساتھ ہی، ہندوستانی سماج میں گاندھی نے جو کردار ادا کیا تھا یا کر رہے تھے اس کی انہوں نے کھل کر تعریف کی۔ نہرو نے اپنے بائیں بازو کے ساتھیوں کے ذریعہ گاندھی پر کی گئی تنقید کے جواب میں جنوری 1936 میں ایک مضمون تحریر کیا کہ 'گاندھی نے ہندوستان میں اہم ترین انقلابی کردار ادا کیا ہے کیونکہ ان کو معاملات سے متعلق حالات کا بہترین استعمال بخوبی معلوم ہے۔ وہ عوام کے دلوں تک پہنچ سکتے ہیں جب کہ مزید ترقی یافتہ نظریات والی دوسری جماعتیں

صرف ہوا میں کام کرتی ہیں۔' بہر حال گاندھی کے قول و عمل نے 'عوام میں زبردست بیداری' پیدا کی۔ سماجی مسائل کو مرکزی اہمیت دی اور جہاں کہیں بھی ضروری ہوا، انہوں نے اپنی دلچسپیوں کی قیمت پر عوام کے حالات سدھارنے پر زور دیا۔ یہی وجہ تھی کہ قومی تحریک نے عوام کی بھلائی میں کام کرنا اپنا اصلی مقصد بنایا۔ 'نہرو نے کانگریس اور بائیں بازو کے دوسرے لوگوں کو گاندھی کے بارے میں اپنائے گئے رویہ کے سلسلہ میں جو مشورہ دیا تھا، اس کو موہت سین (Mohit Sen) نے بہت خوبصورتی سے مختصر لفظوں میں پیش کیا ہے کہ نہرو کو یقین تھا کہ ' کانگریسیوں کی اکثریت، اعتدال پسند لوگوں کی غیر منظم جماعت ہے۔ گاندھی نہ صرف اس کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ کسی بھی عوامی تحریک کے لیے ان کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں کو ان سے یا معتدل لوگوں سے چاہے جتنا بگاڑ کیوں نہ ہو، ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ان کی حکمت عملی، معتدل لوگوں کو خصوصاً گاندھی کو بائیں بازو کی طرف راغب کرنے والی ہونی چاہیے۔'

اشتراکیت کے بارے میں نہرو کا ایک مخصوص دائرہ کار تھا جس میں سیاسی اور نوآبادیت مخالف جدوجہد کو اس وقت تک مرکزی مقام دیا گیا تھا جب تک ملک میں بدیسی حکومت قائم ہے۔ دراصل حکومت کی طاقت کو کمزور کیے بغیر ان دونوں باتوں کو نبھانا اس وقت تک بیحد مشکل کام تھا۔ نہرو نے 1936 میں اشتراکیوں سے یہ کہا کہ ان کو دو بنیادی باتوں نے بہت متاثر کیا ہے اور وہ ہیں 'قومیت اور سماجی آزادی۔' قومیت کی نمائندگی کانگریس کرتی ہے اور سماجی آزادی کی نمائندگی اشتراکیت کرتی ہے اور ان دونوں کو ایک ساتھ جاری رکھ کر شیر و شکر کرنا ہندستانی اشتراکیوں کا خاص مقصد ہے۔' اس لیے نہرو نے کسی بھی ایسی تنظیم کو بنانے کی بات پسند نہیں کی جو کانگریس سے الگ اور اس سے آزاد ہو یا گاندھی سے اور کانگریس کے بائیں بازو کے عنصر سے بے تعلق ہو۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ کانگریس کی پوری ساخت کو تبدیل کر کے اشتراکیت کے نمونے پر ڈھالا جائے۔ اس کے لیے کانگریس کے پرچم کے تحت کام کرنا ضروری ہے۔ اس میں کسان مزدور شامل ہوں اور وہ اس میں اہم کردار ادا کریں اور یہ بھی کوشش ہو کہ بایاں بازو کسی بھی طرح قومی تحریک کے خاص دھارے سے الگ نہ ہونے پائے۔

19.4 ایم این رائے اور کمیونسٹ پارٹی (M.N. Roy and the Communist Party)

سوویت یونین اور اس کے انقلابی نظریات سے متاثر ہو کر ہندستانی انقلابیوں کی کثیر تعداد جو بیرونی ممالک میں جلاوطن تھی سوویت روس پہنچ گئی۔ ان میں سب سے مشہور اور معروف شخص منابندر ناتھ رائے (Manabendra Nath Roy) تھے جنہوں نے لینن کے ساتھ مل کر نوآبادیاتی ملکوں کے لیے کمیونسٹ پارٹی کی بین الاقوامی پالیسی مرتب کرنے میں مدد کی تھی۔ اسی طرح سات ہندستانی رہنماؤں نے مل کر ایم۔ این۔ رائے کی قیادت میں اکتوبر 1920 میں تاشقند میں ہندستانی کمیونسٹ پارٹی قائم کی۔ اس کوشش کے علاوہ بائیں بازو کی بہت سی جماعتیں 1920 کے بعد ملک کی سرزمین پر وجود میں آنے لگی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر تنظیموں کا اتحاد، دسمبر 1925 میں کانپور میں ہوا اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (Communist Party of India) نام کی ایک کل ہند پارٹی کی بنیاد ڈالی گئی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد سچدانند وشنو گھاٹے (Sachchidanand Vishnu Ghate) اس کے جنرل سکریٹری بنے۔ پارٹی نے اپنے سبھی ممبران کو کانگریس کا رکن بننے اور اس کے اندر رہ کر ہر طریقے سے بائیں بازو کو مضبوط کرنے اور انقلابی قوم پرستوں کو پورا تعاون

دینے کے لیے کہا، تاکہ کانگریس زیادہ سے زیادہ انقلابی اور عوامی تنظیم کی شکل اختیار کر سکے۔

ابتدائی دور کے کمیونسٹوں کی سیاسی سرگرمیوں میں، مزدوروں اور کسانوں کو تنظیموں میں منظم کرنا اور انہیں کے ذریعہ کام کرنا شامل تھا۔ اس طرح کی پہلی تنظیم کانگریس کی لیبر سوراج پارٹی (Labour Swaraj Party) تھی جس کو نومبر 1925 میں مظفر احمد، قاضی نذر الاسلام، ہیمنت کمار سرکار جیسے لوگوں نے بنگال میں قائم کیا تھا۔ 1926 کے آخری دور میں بمبئی میں کانگریس لیبر پارٹی اور پنجاب میں کیرتی کسان پارٹی (Kirti Kisan Party) بنائی گئی۔ 1923 سے ہی مدراس میں لیبر پارٹی آف ہندوستان (Labour Party of Hindustan) نامی ایک تنظیم کام کر رہی تھی۔ 1928 تک ان سبھی صوبائی پارٹیوں نے مل کر ملکی سطح کی تنظیم، ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹی (Workers and Peasants Party) بنائی اور اس کی ایک ایک اکائی راجستھان، یوپی اور دہلی میں قائم کی گئی اور سبھی کمیونسٹ، اس کے ممبر ہوا کرتے تھے۔ ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹی کا خاص مقصد کانگریس کے اندر رہ کر کام کرنا تھا جس سے اس کو اور زیادہ انقلابی رجحان والی عوامی پارٹی بنایا جا سکے اور آزادانہ طریقے سے مزدوروں اور کسانوں کو اس میں شامل کیا جائے تاکہ پہلے مرحلہ میں مکمل آزادی (پورن سوراج) اور پھر اشتراکیت کے حصول کا مقصد پورا ہو۔ ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹی نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور تھوڑے ہی وقت میں ہر جگہ خصوصاً بمبئی میں کانگریس پر کمیونسٹ اثرات بڑھنے لگے۔ جواہر لال نہرو اور دوسرے انقلابی رہنماؤں نے کانگریس پر بڑھتے ہوئے کمیونسٹ اثرات کا خیر مقدم کیا۔ جواہر لال نہرو کے ساتھ سبھاش چندر بوس، نوجوان تنظیموں (Young Leagues) اور بائیں بازو کی طاقتوں یعنی ورکرس اینڈ پیزنس پارٹیوں نے کانگریس کے اندر بایاں محاذ مضبوط بنانے اور ہندستانی قومی تحریک کو بائیں بازو کی طرف لے جانے میں اہم کردار ادا کیا۔

ٹریڈ یونینوں کے معاملے میں، ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹیوں نے تیزی سے ترقی کی۔ انہوں نے 1927 اور 1929 کے دوران مزدور طبقہ کی جدوجہد کے ابھرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا اور مزدوروں کے درمیان کمیونسٹ وجود کو پائیدار بنانے میں بڑی تقویت پہنچائی۔ حالانکہ 1929 کے دوران اور اس کے بعد دو ایسے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے قومی تحریک پر کمیونسٹ اور ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹیوں کا تیزی سے بڑھتا ہوا اثر تھوڑا رکا اور آخر میں ختم ہی ہو گیا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ حکومت نے کمیونسٹوں پر بڑے ظلم ڈھائے اور ان پر سخت تشدد کیا۔ 1922 اور 1924 کے دوران سوویت روس سے ہندوستان میں داخل ہونے کی کوشش میں بہت سے کمیونسٹوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر جعل سازی کے بہت سے مقدمے پشاور میں چلائے گئے اور لمبی لمبی سزائیں دی گئیں۔ 1924 میں ایس۔ اے۔ ڈانگے، مظفر احمد، مالنی گپتا اور شوکت عثمانی کو کانپور بالشویک سازش مقدمے میں پھنسا کر چار چار سال کی سزا دی گئی۔

1929 تک قومی اور ٹریڈ یونین تحریکوں پر اشتمالیت (Communism) کے بڑھتے ہوئے اثرات سے حکومت بری طرح پریشان تھی۔ اس نے کمیونسٹوں پر سخت چوٹ کرنے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لیے مارچ 1910 میں یکبارگی اچانک دھاوا بول کر ٹریڈ یونین کے 32 سرگرم سیاسی کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں تین برطانوی کمیونسٹ، فلپ اسپریٹ (Philip Spratt)، بین براڈلے

(Ben Bradley)اور لیسٹر ہچنسن(Lester Huchinson) بھی شامل تھے۔ یہ لوگ ٹریڈ یونین تحریک کو منظم کرنے میں مددگار کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے۔ حکومت کا واحد مقصد ٹریڈ یونینوں کو ختم کرنا اور کمیونسٹوں کو قومی تحریک سے الگ کرنا تھا۔ ان سبھی لوگوں پر میرٹھ جعل سازی کیس کے تحت میرٹھ میں مقدمہ چلایا گیا۔ یہ مقدمہ جلد ہی قومی اہمیت اور وقار کا مسئلہ بن گیا۔ جواہر لال نہرو ،ایم۔اے۔انصاری اور ایم۔سی۔ چھاگلا، ان لوگوں کے دفاع میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ گاندھی نے میرٹھ جا کر قیدیوں سے ملاقات کی۔ ان سے ہمدردی کا اظہار کیا اور آئندہ کی جانے والی جدوجہد میں ان سے تعاون کی اپیل کی۔ قیدیوں نے اپنے دفاع میں جو بیانات دیے ان کو سبھی قومی اخباروں نے شائع کیا اور اس طرح پہلی بار کمیونسٹ نظریات سے ملک کے لاکھوں لوگ واقف ہوئے۔ کمیونسٹوں کو قومی دھارے سے الگ تھلگ کرنے کی حکومت کی خواہش نہ صرف ناکام رہی بلکہ نتائج اس کے برعکس ہی نکلے، مگر حکومت کو مزدور تحریک کو قیادت سے محروم کرنے میں ضرور کامیابی حاصل ہوئی۔ کمیونسٹوں نے بذات خود اپنے ہی اوپر جان لیوا حملہ کیا اور اس نے حکومت کے ذریعہ کیے گئے حملے کی رہی سہی کسر پوری کر دی۔ انھوں نے جلد بازی میں اچانک جو اقدامات کیے اس کو کمیونسٹ اصطلاح میں 'فرقہ پرست سیاست' (Sectarian Politics) یا 'بائیں بازو کا انحراف' (Leftist Deviation) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل کی چھٹی کانگریس کی ہدایت پر کمیونسٹوں نے انڈین نیشنل کانگریس سے اپنا ناطہ توڑ لیا اور اس کو سرمایہ داروں کی پارٹی بتایا نیز یہ بھی کہا کہ سرمایہ دار طبقہ اور کانگریس دونوں سامراجیت کے حمایتی اور مددگار ہیں اور عوامی تحریک کو منظم کر کے مکمل سوراج کے حصول کا نعرہ تو کانگریس کا ڈھونگ ہے۔ یہ عوام کے اوپر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کی سرمایہ دار طبقہ کے ان لوگوں کی کوشش ہے جو برطانوی سامراج سے مصالحت کرنے میں مصروف ہیں۔ بائیں بازو کے کانگریسی لیڈر جیسے نہرو اور بوس قومی تحریک کے اندر سرمایہ داروں کے ایجنٹ بتائے گئے۔ ان پر یہ الزام تھا کہ یہ لوگ مزدور اور محنت کش عوام کو جھانسا دے کر سرمایہ داروں کے زیر اثر رکھنا چاہتے ہیں۔ اب کمیونسٹوں کا ہی کام تھا کہ وہ اس پرامن تحریک کی ساری باتوں کی قلعی کھولیں اور برطانوی سامراج کے خلاف مسلح جدوجہد کو آگے بڑھائیں۔

1931 میں ہوئے گاندھی ارون سمجھوتہ کو قوم کے ساتھ کانگریس کی کھلی بے وفائی بتایا گیا۔ بالآخر ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹیوں کو بھی اس خدشہ کے تحت تحلیل کر دیا گیا کہ دو شاخوں والی پارٹی (مزدور اور کسان)، چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کے زیر اثر آ جائے گی۔ اس لیے کمیونسٹوں نے اس کی جگہ پر ایک غیر قانونی، آزاد اور مرکزی پارٹی بنانے پر پوری توجہ دی۔ ان کے سیاسی نظریہ میں اچانک آئے اس بدلاؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمیونسٹ، قومی تحریک سے ایسے موقع پر الگ تھلگ ہو گئے جب وہ عوام کی سب سے بڑی جدوجہد کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے اوپر بائیں بازو کے اثرات بہت ٹھوس اور مضبوط ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ کمیونسٹ چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بکھر گئے۔ برطانوی حکومت نے ایسے حالات کا فائدہ اٹھایا اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ ان سب کے باوجود کمیونسٹ تحریک مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ اس کے دو اسباب تھے۔ پہلی وجہ تو یہ کہ سارے کے سارے کمیونسٹوں نے سول نافرمانی تحریک سے اپنا ناطہ نہیں توڑا تھا۔ وہ اب بھی اس میں سرگرم تھے۔ اس طرح اشتراکی اور کمیونسٹ نظریات کی اشاعت ملک میں مسلسل جاری رہی۔ اس لیے بہت سارے نوجوان جو عام نافرمانی تحریک نیز انقلابی سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف تھے وہ اشتراکیت، مارکسیت اور سوویت یونین سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے

اور 1934 کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شامل ہو گئے۔

1935 میں پورن چند جوشی (Puran Chand Joshi) کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی دوبارہ منظم کی گئی۔ تب اس کے حالات میں بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی ۔ فسطائیت(Fascism) کے خوف سے اگست 1935 میں ماسکو میں کمیونسٹ انٹر نیشنل (Communist International) یا کامنٹرن(Comintern) کا ساتواں اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں اس نے اپنے پرانے خیالات کو ترک کر کے بالکل نیا رخ اختیار کیا۔ اس نے فسطائیت مخالف، سرمایہ دار ملکوں کے ساتھ اشتراکی ملکوں کا متحدہ محاذ بنانے پر زور دیا۔ اس میں نوآبادیاتی ملکوں میں بورژوا طبقے(*bourgeoisie*)کی قیادت میں چلنے والی قومی تحریکیں بھی شامل تھیں۔ کمیونسٹ کارکنوں کو انڈین نیشنل کانگریس کے تحت چلنے والی قومی تحریک میں شمولیت اختیار کرنی پڑی۔

شروع میں ہندوستان میں کمیونسٹ تحریک میں تبدیلی لانے کی اصولی اور سیاسی بنیاد ایک دستاویز کے ذریعہ رکھی گئی تھی جو دت بریڈلے تھیسس(Dutt-Bradley Thesis)کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں لکھا گیا تھا کہ سامراج مخالف عوامی مزاحمت کو کامیاب بنانے میں انڈین نیشنل کانگریس سب سے نمایاں کردار ادا کر سکتی ہے۔ ایک بار پھر کمیونسٹ پارٹی کے تعلقات انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ مضبوط ہونے لگے۔ اس نے اپنے ممبروں کو اس میں شامل ہونے کے لیے کہا اور زور ڈالا کہ وہ اپنے زیر اثر لوگوں کو بھی کانگریس میں شامل کریں۔ 1938 میں یہ تھوڑا سا اور آگے بڑھی اور تسلیم کیا کہ 'ہندوستانی قومی کانگریس ہندوستان کے عوام کی وہ سیاسی تنظیم ہے جو سامراجیت کے خلاف پوری طرح مستعد ہے۔' 1939 میں پی۔ سی۔ جوشی نے پارٹی کے ہفتہ وار اخبار 'نیشنل فرنٹ' (National Front) میں لکھا کہ آج ہماری سب سے بڑی اور طبقاتی جدوجہد، قومی تحریک ہے اور کانگریس اس کی ترجمان ہے۔ اس کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی قومی تحریک کو مزدور طبقہ کی قیادت میں لانے کے اپنے موقف پر بھی قائم رہی۔ اس دوران کمیونسٹوں نے کانگریس کے اندر بڑی محنت سے کام کیا۔ پارٹی کے بہت سارے لوگ کانگریس کی ضلع اور صوبائی کمیٹیوں کے عہدیدار بن گئے اور تقریباً 20 لوگ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر بھی ہو گئے۔ 1936 اور 1942 کے درمیان ان لوگوں نے کیرالا، آندھرا، بنگال اور پنجاب میں زبردست کسان تحریکیں چلائیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ان لوگوں نے سامراجیت مخالف مجاہدین آزادی کی حیثیت سے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ بحال کر لیا۔

19.5 کچھ دیگر بائیں بازو کی جماعتیں (A Few Other Left-Wing Parties)

1930 کی دہائی میں بائیں بازو میں کچھ دوسرے گٹ اور رجحانات ابھر کر سامنے آئے۔ 1930 میں ایم۔ این۔ رائے (M.N. Roy) ہندوستان لوٹ آئے۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں یعنی رائسٹوں (Royists) کی ایک مضبوط جماعت تیار کی۔ بعد کے سالوں میں ان کی نظریاتی اور سیاسی فکر میں بڑی تبدیلی پیدا ہوئی۔ 1939 میں جب سبھاش چندر بوس کو کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دینے کے لیے مجبور کیا گیا تب بوس نے اپنے بائیں بازو کے ساتھیوں کی ایک الگ پارٹی فارورڈ بلاک(Forward Block) قائم کی۔ 1930 کی دہائی میں کئی دوسری جماعتیں بھی کام کر رہی تھیں جیسے ہندستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن (Hindustan Socialist

(Republican Association، ریولوشنری سوشلسٹ پارٹی(Revolutionary Socialist Party)اور بہت سے ٹراٹسکی کے پیروکار گروہ (Trotskyist Group)وغیرہ۔ سوامی سہجانند سرسوتی، پروفیسر این۔جی۔رنگااور اندولال یاگنک جیسے بائیں بازو کے لوگ کسی بھی تنظیم میں شامل نہیں تھے۔ یہ لوگ اپنے اپنے طور پر کام کرتے تھے۔ سوشلسٹ پارٹی آف انڈیا، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا، جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس اور دوسری بائیں بازو کی جماعتوں اور لیڈروں کا سیاسی پروگرام مشترک تھا،اس لیے تنظیمی اور نظریاتی اختلافات کے باوجود ان سب نے 1935 کے بعد ساتھ ساتھ کام کرکے ہندستانی سیاست کو اشتراکی سمت دی۔ان کے مشترکہ پروگرام کی بنیادی باتیں مندرجہ ذیل تھیں:

- سامراجی اور زمینداری نظام کی مستقل اور پرزور مخالفت کرنا۔
- مزدوروں کی ٹریڈ یونین اور کسانوں کی سبھائیں منظم کرنا۔
- آزاد ہندوستان کو اشتراکی سمت کی طرف لے جانا۔
- لوگوں کی سماجی اور معاشی تبدیلی کے لیے پروگرام چلانا۔
- فسطائیت، نوآبادیت اور جنگ مخالف پالیسی کو تیز کرنا۔

19.6 بائیں بازو کی تحریکوں کی کمزوریاں (Weaknesses of the Left Movements)

حالانکہ بائیں بازو کے زیادہ تر لوگ نہایت حوصلہ مند، جنگجو اور سرفروش مجاہدین آزادی تھے پھر بھی یہ لوگ اپنا بنیادی مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہے یعنی قومی تحریک کو اشتراکی نظریات کے زیر اثر نہیں لاسکے اور اس طرح 1930 کی دہائی میں کیے گئے اپنے عہد و پیمان کو یہ عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔ایسا کیوں ہوا؟اس معمے کو مورخین اب تک حل نہیں کر سکے ہیں۔اس صورتحال کے بارے میں جو وضاحتیں دی گئی ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کانگریس کے بڑے رہنماؤں کے ساتھ بائیں بازو والوں کا اختلاف ہمیشہ غلط باتوں پر ہوتا تھا اور جب یہ رسہ کشی انتہا کو پہنچ جاتی تب بایاں بازو یا تو اس بات کو ماننے کے لیے مجبور ہو جاتا یا پھر قومی تحریک سے الگ تھلگ ہو جاتا تھا۔

کانگریس کے دائیں بازو کے بالکل برعکس بائیں بازو کی حکمت عملی اور نظریے میں ذرہ برابر لچیلا پن نہیں آتا، بلکہ بائیں بازو والے، دائیں بازو والوں کی مخالفت میں یک طرفہ اور انتہا پسندانہ رخ اپنا کر چرب زبانی سے کام لیتے اور سطحی اور غلط باتوں کو لے کر ان سے جھگڑتے۔ ان کے ساتھ ان کا ٹکراؤ نظریاتی مسئلہ پر نہیں بلکہ جدوجہد کے طور طریقوں اور طرز عمل کے سلسلے میں ہوا کرتا تھا۔مثال کے طور پر کانگریس کے دائیں بازو کے خلاف ان کا سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ یہ سامراجیت کا مددگار ہے نیز سرمایہ داروں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے پوری طرح سے سامراجیت کی مخالفت نہیں کرتا ہے۔اس طرح کے لچر اور بے بنیاد الزامات کی تردید بڑی آسانی سے دائیں بازو والوں کے ذریعہ ہو جاتی تھی۔ عوام کا اعتماد دائیں بازو پر تھا مگر بائیں بازو پر نہیں تھا۔اس کے ثبوت میں تین باتوں کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ 1936-37 میں الیکشن اور سرکار بنانے کے مسئلے پر کانگریس کے اندر دونوں بازؤں میں جو ٹکراؤ ہوا،اس کو سامراجیت کے ساتھ مصالحت بتایا گیا۔ 1939-42 میں

عوامی تحریک شروع کرنے کے مسئلہ پر پھر ٹکراؤ کی نوبت آئی۔ گاندھی نے عوامی تحریک شروع کرنے میں جو ہچکچاہٹ دکھائی اس کی تعبیر یہ نکالی گئی کہ گاندھی کا رویہ انگریزوں کے تئیں نرم ہے اور وہ سنہرا موقع ہاتھ سے کھو رہے ہیں۔ 47-1945 میں تیسری بار بائیں بازو کا ٹکراؤ، کانگریس کے طاقتور گروپ کے ساتھ جس میں جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد شامل تھے، اس وقت ہوا جب اقتدار کی منتقلی کی بات چل رہی تھی۔ بائیں بازو والوں نے یہ کہا کہ سامراجیت کے ذریعہ اٹکایا گیا یہ آخری روڑا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ اپنے اقتدار کی مدت کو لمبا کرنا چاہتی ہے اور تھکی ماندی کانگریس قیادت یا تو اقتدار کی بھوکی ہے یا پھر وہ بے وفائی کر رہی ہے۔

ہندوستان کی حقیقی صورت حال کے سلسلہ میں بائیں بازو والوں کا مطالعہ کافی ناقص تھا۔ جواہر لال نہرو کے علاوہ، وہ کانگریسی قیادت کی غالب اکثریت کو سرمایہ داروں کا لیڈر مانتے تھے۔ بات چیت کے ذریعہ معاملہ کو حل کرنے کی کانگریس کی کسی بھی کوشش کو برطانوی سامراجیت کے ساتھ مصالحت سمجھا جاتا تھا اور قانونی دائرہ میں رہ کر کسی بھی کوشش کو حصول آزادی کی جدوجہد سے غداری مانا جاتا تھا۔ وہ ہندوستان کے سماجی طبقات اور ان کے سیاسی امور کی تشریح و وضاحت میں عمومیت (generalisation) اختیار کرتے تھے۔ قومی تحریک کو باضابطہ چلانے کی کوشش کو وہ تحریک کو بھٹکانا سمجھتے تھے۔ عوام کو نظریاتی اعتبار سے متحرک کرنے کے بجائے وہ اپنی تمام تر توجہ ہمیشہ اس بات پر دیتے تھے کہ عدم تشدد کی بہ نسبت مسلح جدوجہد کہیں زیادہ کارگر اور بہتر ہے۔ ان کے خیال سے عوام، قائدین کے ایک اشارہ پر عمل کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ انہوں نے عوام کے درمیان اپنی اہمیت کو بہت بڑھا چڑھا کر آنکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جدوجہد آزادی کی گاندھیائی حکمت عملی کو سمجھنے میں بھی قاصر رہے۔

بائیں بازو کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس کی مختلف پارٹیاں، جماعتیں، اور شخصیتیں بہت دنوں تک متحد نہیں رہ سکیں اور ان کو متحد کرنے کی ساری کوششیں بھی ناکام رہیں۔ اصولی اور نظریاتی اختلافات ان میں اتنے زیادہ تھے اور ان کے لیڈران چڑچڑے ہو گئے تھے اور بات بات میں جذبات سے بے قابو ہو اٹھتے تھے۔ نہرو اور بوس بہت دنوں تک ساتھ ساتھ کام نہ کر سکے اور 1939 میں بر سر عام الجھ پڑے۔ نہرو اور اشتراکی بھی آپس میں تال میل نہیں بٹھا سکے۔ 1939 کے بعد بوس اور اشتراکی بھی الگ الگ ہو گئے۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور کمیونسٹوں نے 1935 سے 1940 تک نہایت محنت سے مل جل کر کام کیا۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے کمیونسٹوں اور رائسٹوں کے لیے 1935 میں اپنا دروازہ کھول دیا تا کہ غیر قانونی کمیونسٹ پارٹی کو قانونی طور پر سیاست میں آنے کا راستہ مل سکے، لیکن جلد ہی اشتراکی اور کمیونسٹ الگ الگ ہو کر ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں میں لمبے عرصہ کے لیے پھوٹ پڑ گئی۔ ہر ایک اشتراکی کو کمیونسٹ، اپنا دشمن اور ہر ایک کمیونسٹ کو اشتراکی، سرمایہ داروں کا رہنما یا (1947 کے بعد) امریکی ایجنٹ دکھائی پڑتا تھا۔

19.7 ہندوستانی سیاست میں بائیں بازو کے اثرات (Influence of the Left on Indian Politics)

بائیں بازو نے ہندستانی سماج اور سیاست پر بنیادی طور سے گہرا اثر ڈالا۔ متعدد کسان اور مزدور تنظیمیں وجود میں آئیں، جن کا قیام بائیں بازو کا بڑا کارنامہ ہے۔ کانگریس پر بھی اس کا بہت اثر پڑا۔ انتظامی نقطہ نظر سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں کئی اہم باتوں پر ایک تہائی ووٹ بائیں

بازو کی حمایت میں پڑتے تھے۔1936 سے 1939 کے درمیان نہرو اور بوس کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔نہرو کو اپنی انتظامیہ کمیٹی میں تین عظیم اشتراکیوں، آچاریہ نریندر دیو، جے پرکاش نرائن اور اچیت پٹوردھن (Achyut Patwardhan) کونامزد کرنے میں کامیابی ملی تھی۔ 1939 میں بائیں بازو کے امیدوار کی حیثیت سے بوس نے صدارتی انتخاب میں 1377 کے مقابلے 1580 ووٹوں سے ڈاکٹر بی پٹا بھی سیتا رمیا (Dr. Bhogaraju Pattabhi Sitaramayya) کو ہرایا تھا۔ نظریاتی اور سیاسی دونوں اعتبار سے کانگریس کا جھکاؤ اکثر بائیں بازو کی طرف رہا جیسا کہ نہرو نے لکھا ہے کہ 'ہندستانی قومیت کو بڑی اہم سماجی تبدیلی کی طرف ڈھکیل دیا گیا ہے اور غیر متعین طور پر ہی سہی، یہ نئے نظریے کے ارد گرد گھوم رہی ہے۔' کانگریس اور اس کے دائیں بازو نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ ہندوستان کی غریبی اور ناداری صرف نوآبادیاتی حکومت کی وجہ سے ہی نہیں ہے بلکہ یہ ملک کے اندرونی سماجی اور معاشی ڈھانچے کا بھی نتیجہ ہے۔اس لیے ان سب میں مکمل تبدیلی بے حد ضروری ہے۔

1931 کے کانگریس کے کراچی اجلاس میں پاس کی گئی بنیادی حقوق اور معاشی پالیسی سے بھی قومی تحریک پر بائیں بازو کے اثرات صاف ظاہر ہوتے ہیں۔اس کے بعد 1936 میں کانگریس کے فیض پور اجلاس میں معاشی پالیسی کی جو تجویز پاس کی گئی تھی،اس سے بھی کانگریس پر بائیں بازو کا اثر واضح طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ مزید برآں 1936 کے کانگریس کے انتخابی منشور (Election Manifesto)، 1938 میں قائم شدہ قومی منصوبہ بندی کمیٹی (National Planning Committee) اور طبقاتی اور معاشی مسائل پر گاندھی کی سوچ میں دھیرے دھیرے تبدیلی میں بھی بائیں بازو کے اثرات کی جھلک ملتی ہے۔پروگریسیو رائٹرس ایسوسی ایشن (Progressive Writers' Association)، آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن (All-India Students' Federation) اور آل انڈیا اسٹیٹس پیپلس کانفرنس (All-India States' People's Conference) کا قیام بائیں بازو کے ہی کارنامے ہیں۔آل انڈیا ویمنس کانفرنس (All-India Women's Conference) کے قیام میں بھی بایاں بازو بہت سرگرم تھا۔ان سب کے علاوہ بائیں بازو نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی جیسی اہم تنظیموں کو بھی شروع کر کے پروان چڑھایا تھا۔

19.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ یہ جان چکے ہونگے کہ کس طرح ہندوستان میں بائیں بازو کی تحریکوں کو عروج حاصل ہوا۔روس میں لینن کی قیادت میں بالشویک انقلاب نے ان تحریکوں کو مزید تقویت پہنچائی۔بائیں بازو کی دو بڑی جماعتیں کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا قیام اور ان کا قومی جدوجہد میں شامل ہونا کئی معنوں میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ان لوگوں نے قومی کانگریس کے اندر اور باہر کسان اور تحریکوں کو منظم کیا،ٹریڈ یونینیں بنائیں اور سامراجی اور سرمایہ دار طبقے کے ذریعے کیے جانے والے استحصال کے خلاف آواز اٹھائی۔جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس اور دیگر اشتراکی رہنماؤں نے کانگریس کو اشتراکی نوعیت بنانے پر زور دیا اور اس میں

مزدوروں اور کسانوں کی شمولیت پر پوری توجہ دی۔ کمیونسٹوں نے بھی کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ہدایات پر ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کی۔ ایم این رائے جیسے رہنماؤں نے کانگریس پر مزدوروں اور کسانوں سے دھوکہ دہی اور سامراجیت کا ساتھ دینے کا الزام لگایا۔ انہوں نے مسلح جدوجہد کو بہتر اور موثر بتایا اور گاندھیائی پرامن جدوجہد کو مسترد کر دیا۔ باہمی اختلافات اور عوام کو اپنی طرف راغب نہ کر پانے کی وجہ سے بائیں بازو کی تحریکیں اپنے حتمی مقصد کے حصول یعنی ہندوستان کی قومی جدوجہد کو اشتراکی بنانے میں ناکام رہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے آزادی کی تحریک اور ہندوستانی سیاست پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے اور معاشی اصلاحات کے منصوبے کو اولیت دلائی۔

19.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

رائسٹوں : (Royists) ایم این رائے کے ذریعے قائم کردہ ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی کے ممبران۔

روسی انقلاب : لینن کی قیادت میں 1917 میں روسی مارکسوادیوں (بالشویکوں) کے ذریعے زار شاہی کا خاتمہ اور پہلی اشتراکی ریاست یعنی سوویت روس کا قیام۔

اشتراکیت : اسے انگریزی میں Socialism کہا جاتا ہے۔ یہ کارل مارکس کے نظریات پر مبنی ہے جس میں معاشی اور سیاسی مساوات، دولت کی مساوی تقسیم اور غیر طبقاتی سماج پر زور دیا جاتا ہے۔

اشتمالیت : اسے انگریزی میں Communism کہا جاتا ہے۔ یہ اشتراکیت کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جس میں ذاتی ملکیت کا مکمل خاتمہ ہو جاتا ہے اور سماج کی ہر چیز پر سماج کے ہر فرد کا مساوی حق ہوتا ہے۔ اشتراکیت اور اشتمالیت سرمایہ داری کے مکمل مخالف ہیں۔

سرمایہ داری : اسے انگریزی میں Capitalism کہا جاتا ہے۔ اس میں دولت چند ایک سرمایہ داروں کے ہاتھ میں اکٹھا ہو جاتی ہے اور یہ ذاتی ملکیت کی حامی ہے۔

بالشویک : روس کے مارکسوادیوں کی ایک پارٹی جو کمیونسٹ اصولوں پر مکمل یقین رکھتی تھی اور سرمایہ داری سے کسی بھی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں تھی۔

فسطائیت : (Fascism) ایک ایسا نظریہ ہے جس میں طاقت کے ذریعے دوسرے ممالک پر قبضہ کرنا اور اور ایک نسل کی برتری ثابت کرنے کو جائز ٹھہرایا گیا۔ اسے ہٹلر اور مسولینی نے عمل میں لایا۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل : (Communist International) یا کامنٹرن (Comintern) عالمی اشتراکی انجمن تھی جو پوری دنیا میں اشتراکیت کے فروغ کے لیے سرگرم تھی۔

19.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

19.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. کانگریس سوشلسٹ پارٹی کب قائم کی گئی؟
2. سی۔پی۔آئی۔(.C.P.I) کا پورا نام بتائیے۔
3. زار کسے کہا جاتا تھا؟
4. روسی انقلاب کس سال رونما ہوا؟
5. دو ہندوستانی اشتراکی رہنماؤں کے نام بتایئے۔
6. ایم این رائے کس پارٹی سے وابستہ تھے؟
7. بالشویک کون تھے؟
8. عظیم مندی کس سال میں آئی؟
9. بورژوازی سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
10. انتخابی منشور کیا ہوتا ہے؟

19.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں بائیں بازو کی تحریکات کے پس منظر پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. بائیں بازو کی تحریکوں کی کمزوریاں بتایئے، آخر یہ ہندوستان میں روس کی طرح کامیاب کیوں نہیں ہو سکیں؟
3. ہندوستانی سیاست میں بائیں بازو کے اثرات پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. بائیں بازو کی کچھ دیگر چھوٹی جماعتوں کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے۔
5. کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے لوگ کتنے دھڑوں میں بنٹے ہوئے تھے؟ وضاحت کیجیے۔

19.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. جواہر لال نہرو اور اشتراکی تحریک پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. ایم این رائے اور کمیونسٹ پارٹی کے ارتقا پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی ابتدا اور ارتقا پر تفصیلی بحث کیجیے۔

19.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2012 (first pub. in 2004).
2. Bose, Subhas Chandra et. al., *The Indian Struggle*, *1920–1942*, Oxford University Press, New Delhi, 1997.
3. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, *1857–1947*, Penguin, New Delhi, 2017.
4. Chandra, Bipan (ed.), *The Indian Left: Critical Appraisals*, Vikas Publishing House, New Delhi, 1983.
5. Chandra, Bipan, *Essays on Indian Nationalism*, Har-Anand Publications, New Delhi, 1993.
6. Chowdhury, Satyabrata Rai, *Leftism in India*, *1917–1947*, Sage, New Delhi, 1977.
7. Gopal, S., *Jawaharlal Nehru*: *A Biography*, Vol. I, Vintage Digital, 2015.
8. Nehru, Jawaharlal, *An Autobiography*, Penguin Random House, New Delhi, 2017.
9. Sarkar, Sumit, *Modern India*, *1885–1947*, MacMillan, New Delhi, 1996 (first pub. in 1983).
10. Shankar, Girja, *Socialist Trends in Indian National Movement*, *Being a Study of the Congress Socialist Party*, 1st edn., Twenty-First-Century Publishers, Meerut, 1987.

اکائی 20۔ دلتوں کا مسئلہ

(The "Untouchable" Question)

اکائی کے اجزا

20.0 تمہید
20.1 مقاصد
20.2 ابتدائی زندگی
20.3 تعلیم
20.4 چھوا چھوت کے خلاف جدوجہد
20.4.1 منواسمرتی نذر آتش کرنا
20.4.2 کالارام مندر ستیہ گرہ
20.5 مذہب کی تبدیلی کا اعلان
20.5.1 بدھ مت میں تبدیلی مذہب
20.6 پونا معاہدہ
20.7 گاندھی کے ساتھ تعلقات اور نظریاتی اختلاف
20.8 سیاسی زندگی
20.8.1 امبیڈکر اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی
20.8.2 آئین سازی
20.8.3 اقتصادی منصوبہ بندی
20.9 امبیڈکر کی صحافت
20.10 علالت، دوسری شادی اور انتقال

20.11 اکتسابی نتائج

20.12 کلیدی الفاظ

20.13 نمونہ امتحانی سوالات

20.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد

20.0 تمہید (Introduction)

ڈاکٹر بھیم راؤامبیڈ کر کی تصویر ہے ، جنہیں پیار سے بابا صاحب امبیڈ کر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، آج، ان کا مجسمہ ہر جگہ اور بالخصوص دلتوں کی کالونیوں میں پایا جاتا ہے، جن کے لیے خاص طور پر انہوں نے ساری زندگی ذات پات کی قدامت پسند طاقتوں سے جنگ جاری رکھی۔ آج کوئی بھی شخص، خصوصاً مختلف سیاسی جماعتیں اور سیاسی و سماجی تنظیمیں انہیں، ان کے پیغام اور ان کے ذریعے چلائی گئی تحریک کو نظرانداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتیں۔ وہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی انہیں غیر متزلزل مزاحمت اور انسانی وقار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ انہیں جدید ہندوستان میں پیدا ہونے والے قد آور اور باثر دانشوروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کیا آپ نے غور کیا کہ کیوں وہ نہ صرف اپنی زندگی میں بلکہ اپنی موت کے اتنے سالوں بعد بھی اس قدر اہمیت کے حامل ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے ؟ انہوں نے ایسا کیا کارنامہ انجام دیا کہ لاکھوں لوگ انہیں باباصاحب (معزز باپ) کے نام سے یاد کر رہے ہیں؟ یہ اکائی آپ کو ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کی کثیر جہتی حصولیابیوں کو جاننے میں مدد کرے گی۔ اس اکائی میں ہم ہندوستان کے دبے کچلے لوگوں کے عظیم رہنما باباصاحب بھیم راؤامبیڈ کر کی حیات، خدمات اور کارناموں کے ذریعے دلتوں کے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ بھیم راؤ رام جی امبیڈ کر (14 اپریل 1891– 6 دسمبر 1951)، جو ڈاکٹر باباصاحب امبیڈ کر کے نام سے مشہور ہیں، ایک عظیم ہندوستانی ماہر اقتصادیات، سیاست دان اور سماجی مصلح تھے۔ انہوں نے 'دلت بدھ تحریک' کو متاثر کیا اور اچھوتوں (دلتوں) سے سماجی بھید بھاؤ کے خلاف مہم چلائی۔ مزید برآں انہوں نے مزدوروں، کسانوں اور خواتین کے حقوق کے لیے بھی آواز بلند کی۔ وہ آزاد ہندوستان کے پہلے 'وزیر برائے قانون وانصاف' اور ہندوستانی آئین کے موسس اور جمہوریہ ہند کے معماروں میں سے ایک تھے۔ امبیڈ کر بے پناہ صلاحیتوں کے حامل طالب علم تھے۔ انہوں نے کولمبیا یونیورسٹی (Columbia University) اور لندن اسکول آف اکنامکس (London School of Economics) دونوں سے معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں اور قانون، معاشیات اور سیاسیات میں بھی تحقیقی کام انجام دیے۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے ابتدائی حصے میں وہ معاشیات کے پروفیسر رہے اور کچھ دن وکالت کی بھی مشق کی اور بعد کی زندگی کا زیادہ تر حصہ سیاسی سرگرمیوں میں گزارا۔ بعد ازاں امبیڈ کر ہندوستان کی آزادی کی مہم اور اس سے متعلق مباحثوں میں شامل ہو گئے اور رسالے شائع کر کے دلتوں کے سیاسی حقوق اور سماجی آزادی کی وکالت کی۔ ہندوستان کی تعمیر میں ان کا نمایاں حصہ تھا۔ ہندو فرقے میں رائج بری رسموں اور چھوا چھوت کے رواج سے تنگ آ کر انہوں نے 1951 میں بدھ مذہب اختیار کر لیا۔ 1990 میں، انہیں بعد از مرگ بھارت

رتن سے نوازا گیا، جو ہندوستان کا سب سے بڑا شہری اعزاز ہے۔ ان کا یوم پیدائش 14 اپریل کو ہندوستان سمیت دنیا بھر میں امبیڈکر جینتی کے طور پر منایا جاتا ہے۔

20.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- امبیڈکر کی ابتدائی زندگی اور تعلیم و تربیت کے بارے میں جانیں گے۔
- امبیڈکر کی چھوا چھوت اور ذات پات کی تفریق کے خلاف جدوجہد سے واقف ہوں گے۔
- امبیڈکر کی تبدیلی مذہب اور بدھ مذہب میں داخلے کے اسباب و نتائج سے واقف ہو سکیں گے۔
- امبیڈکر کی سیاسی زندگی، پونا معاہدے اور گاندھی سے تعلقات اور اختلافات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- امبیڈکر کی صحافت اور ان کے ادب کی جانکاری حاصل کر سکیں گے۔

20.2 ابتدائی زندگی (Early Life)

امبیڈکر 14 اپریل 1891 کو برطانوی ہندوستان میں مرکزی صوبجات (مدھیہ پردیش) میں واقع مہو (Mhow) شہر میں پیدا ہوئے۔ وہ رام جی مالوجی سکپال اور بھیما بائی کے 14 ویں اور آخری بیٹے تھے۔ 1896 میں جب امبیڈکر پانچ سال کے تھے، ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا، اس لیے ان کی پھوپھی میرا بائی نے ان کی نگہداشت کی۔ میرا بائی کے کہنے پر رام جی نے جیجا بائی سے دوسری شادی کی تاکہ کمسن بھیم راؤ کو ماں کا پیار مل سکے۔ ان کا خاندان، کبیر فرقے کو ماننے والا مراٹھی نژاد تھا اور موجودہ مہاراشٹر کے رتناگیری ضلع میں آمباواڑے (Ambavade) گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ان کا تعلق ہندو مہار ذات سے تھا، جو اس وقت اچھوت سمجھی جاتی تھی اور اس لیے انہیں سماجی اور معاشی طور پر گہرا امتیازی سلوک برداشت کرنا پڑتا تھا۔ بھیم راؤ امبیڈکر کے آباؤ اجداد طویل عرصے سے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں ملازم تھے اور ان کے والد رام جی سکپال ہندوستانی فوج کی مہو چھاؤنی میں خدمات انجام دے رہے تھے اور یہاں کام کرتے ہوئے وہ صوبیدار کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ امبیڈکر نے مراٹھی اور انگریزی میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ نو عمر بھیم راؤ کو اپنی ذات کی وجہ سے سماجی تفریق کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایک اچھے طالب علم ہونے کے باوجود، اسکول میں بھیم راؤ کو اچھوت ہونے کی وجہ سے بہت کچھ سہنا پڑتا تھا۔ 7 نومبر 1900 کو رام جی سکپال نے اپنے بیٹے بھیم راؤ کا داخلہ ستارہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں بھیوا رام جی آمبڈویکر کے نام سے کرایا۔ ان کا بچپن کا نام 'بھیوا' تھا۔ امبیڈکر کا آبائی نام سکپال کے بجائے ان کے آمبڈوے گاؤں کے نام پر آمبڈویکر لکھا گیا تھا، چونکہ صوبہ کونکن کے لوگ گاؤں کے نام کو اپنے نام سے ملاتے تھے۔ بعد میں ایک 'دیورکھے برہمن' استاد کرشنا کیشو آمبیڈکر، جو ان سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے، نے ان کے نام سے 'آمبڈویکر' ہٹا کر اپنا سادہ آبائی نام 'آمبیڈکر' جوڑ دیا۔ تب سے آج تک وہ امبیڈکر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ رام جی سکپال اپنے خاندان کے ساتھ بمبئی چلے گئے۔ اپریل 1906 میں، جب بھیم راؤ کی عمر تقریباً 15 سال تھی، ان کی شادی نو سال کی لڑکی رما بائی

سے کر دی گئی۔ تب وہ انگریزی میڈیم کی پانچویں کلاس میں پڑھ رہے تھے۔ ان دنوں ہندوستان میں 'بچپن کی شادی' کا رواج تھا۔

20.3 تعلیم (Education)

امبیڈکر نے 7 نومبر 1900 کو ستارہ شہر کے گورنمنٹ ہائی اسکول (اب پرتاپ سنگھ ہائی اسکول) میں انگریزی کی پہلی کلاس میں داخلہ لیا۔ ان کی تعلیمی زندگی اسی دن سے شروع ہوئی، اسی لیے 7 نومبر مہاراشٹر میں یوم طلبہ کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس وقت انہیں 'بھیوا' کہا جاتا تھا۔ اس وقت اسکول میں ان کا نام 'بھیوا رام جی امبیڈکر' حاضری رجسٹر میں نمبر 1914 پر درج تھا۔ جب انہوں نے چوتھی نگریزی جماعت کا امتحان پاس کر لیا تو بھیم راؤ کی کامیابی کو اچھوتوں میں عوامی جشن کے طور پر منایا گیا، کیونکہ یہ غیر معمولی بات تھی اور ان کے خاندان کے دوست اور مصنف دادا کیلو سکر کی لکھی ہوئی 'بدھ کی سوانح حیات' انہیں انعام بطور دی گئی۔ اسے پڑھنے کے بعد انہیں پہلی بار گوتم بدھ اور بدھ مت کے بارے میں علم ہوا اور وہ ان کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوئے۔ 1897 میں، امبیڈکر کا خاندان ممبئی چلا گیا جہاں انہوں نے ایلفنسٹن روڈ پر واقع گورنمنٹ ہائی اسکول میں آگے کی تعلیم حاصل کی۔

1907 میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اگلے ہی سال وہ ایلفنسٹن کالج میں داخل ہوئے، جو بمبئی یونیورسٹی سے منسلک تھا۔ 1912 تک، انہوں نے بمبئی یونیورسٹی سے معاشیات (Economics) اور سیاسیات (Political Science) میں بیچلر آف آرٹس (B.A.) کی ڈگری حاصل کی۔ چونکہ ان کی تعلیم کا خرچہ بڑودہ ریاست نے اٹھایا تھا اس لیے انہوں نے بڑودہ ریاست میں اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ ان کے اہل خانہ بھی بڑودہ آگئے۔ کچھ عرصے بعد انہیں اپنے بیمار والد کو دیکھنے کے لیے ممبئی واپس آنا پڑا۔ 1913 میں 22 سال کی عمر میں امبیڈکر ریاست ہائے متحدہ امریکہ چلے گئے، جہاں انہیں سیاجی راؤ گائیکواڈ سوم کے ذریعے ایک اسکیم کے تحت نیویارک شہر کی کولمبیا یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا موقع فراہم کرنے کے لیے تین سال کے لیے ماہانہ 11.50 ڈالر کا ریاستی وظیفہ دیا گیا۔ وہاں پہنچنے کے فوراً بعد وہ اپنے پارسی دوست نول بھاتینا کے ساتھ لیونگسٹن ہال میں قیام پذیر ہو گئے۔ جون 1915 میں انہوں نے ماسٹر آف آرٹس (M.A.) کا امتحان پاس کیا، جس میں ان کا بنیادی مضمون معاشیات تھا اور سماجیات، تاریخ، فلسفہ اور بشریات ثانوی مضامین تھے۔ انہوں نے پوسٹ گریجویشن کے لیے 'Ancient Indian Commerce' (قدیم ہندوستانی تجارت) کے موضوع پر تحقیقی کام پیش کیا۔ امبیڈکر 'جان ڈیوی' اور 'جمہوریت' پر ان کے کام سے متاثر تھے۔

1916 میں، انہیں ان کے دوسرے تحقیقی کام، *National Dividend of India: A Historical and Analytical Study* (ہندوستانی قومی حصص - ایک تاریخی اور تجزیاتی مطالعہ) کے لیے دوسرے ماسٹر آف آرٹس سے نوازا گیا۔ انہوں نے تین سال کی مدت کے لیے حاصل کردہ وظیفے کا استعمال کرتے ہوئے صرف دو سال میں امریکہ میں کورس مکمل کیا اور 1916 میں وہ لندن چلے گئے۔ 1926 میں، انہوں نے اپنے تیسرے تحقیقی کام *Evolution of Provincial Finance in British India* (برطانوی ہندوستان میں صوبائی مالیات کا ارتقا) کے لیے معاشیات میں پی ایچ ڈی (Ph.D.) کی ڈگری حاصل

کی۔اپنے تحقیقی کام کی اشاعت کے بعد انہیں 1927 میں باضابطہ طور پر پی ایچ ڈی سے نوازا گیا۔ 9 مئی کو، انہوں نے ماہر بشریات الیگزینڈر گولڈن ویزر (Alexander Goldenweiser) کے ذریعہ منعقدہ ایک سیمینار میں *Castes in India: Their System, Origin and Development* (ہندوستان میں ذاتیں: ان کا نظام، ابتدا اور ارتقا) کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا جو ان کا پہلا شائع شدہ مقالہ بنا۔

اکتوبر 1916 میں، وہ لندن چلے گئے اور بیرسٹر کورس (قانونی مطالعہ) کے لیے گریز ان (Gray's Inn) میں داخلہ لے لیا۔ ساتھ ہی لندن اسکول آف اکنامکس میں بھی داخلہ لیا جہاں انہوں نے معاشیات میں اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے پر کام شروع کیا۔ جون 1917 میں، وہ اپنی تعلیم کو عارضی طور پر ترک کر کے ہندوستان واپس آنے پر مجبور ہو گئے کیونکہ ریاست بڑودہ سے ان کی اسکالرشپ ختم ہو گئی تھی۔ واپسی پر ان کی کتابوں کا مجموعہ ایک علیحدہ جہاز پر بھیجا گیا جسے جرمن آبدوز (submarine) کے ٹارپیڈو نے ڈبو دیا تھا۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا دور تھا، جس وجہ سے انہیں چار سال کے اندر اپنے مقالے کے لیے لندن واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر بڑودہ ریاست کے فوجی سکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہوئے اچانک اپنی زندگی میں دوبارہ کیے جانے والے امتیازی سلوک سے دلبرداشتہ ہو گئے اور اپنی ملازمت چھوڑ کر نجی معلم (tutor) اور محاسب (accountant) کے طور پر کام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنا مشاورتی کاروبار (counselling business) بھی شروع کیا جو ان کی سماجی حیثیت کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ اپنے ایک انگریز شناسا اور ممبئی کے سابق گورنر لارڈ سڈنم (Lord Sydenham) کی بدولت انہیں سڈنم کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس، ممبئی میں پولیٹیکل اکانومی کے پروفیسر کی نوکری مل گئی۔

1920 میں، کولہاپور کے شاہو مہاراج اور اپنے پارسی دوست کی مدد اور کچھ ذاتی بچت سے وہ ایک بار پھر انگلینڈ واپس آنے میں کامیاب ہوئے اور 1921 میں ماسٹر آف سائنس (M.Sc.) مکمل کیا، جس کے لیے انہوں نے *Provincial Decentralisation of Imperial Finance in British India* (برطانوی ہندوستان میں شاہی معیشت کی صوبائی لامرکزیت) کے عنوان سے تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ 1922 میں انہیں 'گریز ان' کی طرف سے بیرسٹر ایٹ لا (Barrister-at-Law) کی ڈگری سے نوازا گیا اور برطانوی بار میں بطور بیرسٹر داخل کر لیا گیا۔ 1923 میں، انہوں نے معاشیات میں ڈی ایس سی (D.Sc.,) کی ڈگری حاصل کی، جس کے لیے ان کے مقالے کا مضمون *The Problem of the Rupee: Its Origin and its Solution* (روپے کا مسئلہ: اس کی ابتدا اور اس کا حل) تھا۔ لندن میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہندوستان واپس آتے ہوئے امبیڈکر تین مہینے جرمنی میں رہے، جہاں انہوں نے بون یونیورسٹی (University of Bonn) میں معاشیات میں اپنی تعلیم جاری رکھی، لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے وہ یونیورسٹی میں زیادہ مدت تک نہ ٹھہر سکے۔ ان کی تیسری اور چوتھی ڈاکٹریٹ، کولمبیا یونیورسٹی سے 1952 میں ایل۔ایل۔ڈی (L.L.D.) اور عثمانیہ یونیورسٹی سے 1953 میں ڈی۔لٹ (D.Litt.,) اعزازی ڈگریاں تھیں۔

20.4 چھوا چھوت کے خلاف جدوجہد (Fighting Untouchability)

امبیڈکر نے کہا تھا، 'چھوا چھوت غلامی سے بھی بدتر ہے۔' امبیڈکر کو بڑودہ کی شاہی ریاست نے تعلیم دی تھی، اس لیے وہ اس کی خدمت کرنے کے پابند تھے۔ انہیں گائیکواڑ مہاراجہ کا فوجی سکریٹری مقرر کیا گیا تھا، لیکن ذات پات کے امتیاز کی وجہ سے انہیں کچھ ہی عرصے میں یہ نوکری چھوڑنی پڑی۔ اس واقعے کو انہوں نے اپنی سوانح عمری *Waiting for a Visa* (ایک ویزا کا انتظار) میں بیان کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ذریعہ معاش تلاش کرنے کی کئی کوششیں کیں، جس کے لیے انہوں نے ایک محاسب، ایک نجی معلم اور سرمایہ کاری سے متعلق مشیر کے طور پر بھی کام کیا۔ لیکن یہ تمام کوششیں اس وقت ناکام ہوئیں جب ان کے مؤکلوں کو معلوم ہوا کہ وہ اچھوت ہیں۔ 1918 میں، وہ ممبئی کے سڈنہم کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس میں پروفیسر بن گئے۔ اگرچہ وہ طلباء کے ساتھ کامیاب رہے لیکن دوسرے پروفیسروں نے ان کی کئی مرتبہ توہین کی۔

امبیڈکر کو ہندوستان کے ایک سرکردہ دانشور کے طور پر، ساؤتھ برو کمیٹی (Southborough Committee) کے سامنے حقائق پیش کرنے کے لیے مدعو کیا گیا جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کا مسودہ تیار کر رہی تھی۔ اس سماعت کے دوران امبیڈکر نے دلتوں اور دیگر مذہبی برادریوں کے لیے علاحدہ حلقہ انتخاب اور ریزرویشن کی وکالت کی۔ 1920 میں بمبئی سے، انہوں نے مراٹھی ہفتہ وار 'موک نایک' (*Mooknayak*) شائع کرنا شروع کیا۔ یہ اشاعت جلد ہی قارئین میں مقبول ہوگئی اور امبیڈکر نے اسے قدامت پسند ہندو سیاست دانوں اور ذات پات کے امتیاز سے لڑنے میں ہندوستانی سیاسی برادری کی ہچکچاہٹ پر تنقید کرنے کے لیے استعمال کیا۔ دلت طبقے کی ایک کانفرنس کے دوران ان کی تقریر نے کولہاپور ریاست کے مقامی حکمران شاہو چہارم کو بہت متاثر کیا، جس کے امبیڈکر کے ساتھ کھانے کو لے کر قدامت پسند معاشرے میں ہلچل مچ گئی۔ بامبے ہائی کورٹ میں قانون کی پریکٹس کرتے ہوئے انہوں نے اچھوتوں کی تعلیم اور ترقی کے لیے کوششیں کیں۔ ان کی پہلی منظم کوشش مرکزی ادارہ 'بہشکرت ہتکارنی سبھا' ('Bahishkrit Hitkarini Sabha') کا قیام تھا، جس کا مقصد تعلیم اور سماجی واقتصادی اصلاحات کے ساتھ ساتھ ان 'بہشکرتوں' کی فلاح و بہبود کو فروغ دینا تھا، جنہیں پسماندہ طبقات کہا جاتا ہے۔ دلتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے انہوں نے پانچ میگزین نکالے جیسے موک نائک، بہشکرت بھارت، سمتا، پربدھ بھارت اور جنتا۔

1925 میں، انہیں بمبئی پریذیڈنسی کمیٹی میں تمام یورپی اراکین والے سائمن کمیشن کے ساتھ کام کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس کمیشن کے خلاف ہندوستان بھر میں مظاہرے ہوئے۔ جہاں اس کمیشن کی رپورٹ کو زیادہ تر ہندوستانیوں نے نظرانداز کیا، امبیڈکر نے الگ سے مستقبل کی آئینی اصلاحات کے لیے سفارشات لکھ کر بھیجیں۔ دوسری اینگلو-مراٹھا جنگ کے تحت 1 جنوری 1818 کو کورے گاؤں کی لڑائی کے دوران مارے گئے ہندوستانی مہار فوجیوں کے اعزاز میں امبیڈکر نے 1 جنوری 1927 کو 'کورے گاؤں یادگار فتح (جے ستمبھ) میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ یہاں مہار برادری سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کے نام سنگ مرمر کے کتبے پر کندہ کیے گئے تھے اور کورے گاؤں کو

دلتوں کی عزت نفس کی علامت قرار دیا گیا۔ 1927 تک، ڈاکٹر امبیڈکر نے چھوا چھوت کے خلاف ایک وسیع اور فعال تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ عوامی تحریکوں، ستیہ گرہ اور جلوسوں کے ذریعے انہوں نے سماج کے تمام طبقوں کے لیے پینے کے پانی کے عوامی وسائل کھلوانے کے ساتھ ساتھ ہندو مندروں میں اچھوتوں کے داخلے کے حق کے لیے بھی جدوجہد کی۔ انہوں نے مہد (Mahad) شہر کے چاودر تالاب سے اچھوت طبقے کو پانی نکالنے کا حق دلانے کے لیے ایک ستیہ گرہ کی قیادت بھی کی۔

1925 میں، انہیں بمبئی پریزیڈنسی کمیٹی میں تمام یورپی اراکین والے سائمن کمیشن کے ساتھ کام کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس کمیشن کے خلاف ہندوستان بھر میں مظاہرے ہوئے۔ جہاں اس کمیشن کی رپورٹ کو زیادہ تر ہندوستانیوں نے نظر انداز کیا، امبیڈکر نے الگ سے مستقبل کی آئینی اصلاحات کے لیے سفارشات لکھ کر بھیجیں۔ دوسری اینگلو-مراٹھا جنگ کے تحت 1 جنوری 1818 کو کورے گاؤں کی لڑائی کے دوران مارے گئے ہندوستانی مہار فوجیوں کے اعزاز میں امبیڈکر نے 1 جنوری 1927 کو 'کورے گاؤں یادگار فتح (جے ستمبھ) میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ یہاں مہار برادری سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کے نام سنگ مرمر کے کتبے پر کندہ کیے گئے تھے اور کورے گاؤں کو دلتوں کی عزت نفس کی علامت قرار دیا گیا۔ 1927 تک، ڈاکٹر امبیڈکر نے چھوا چھوت کے خلاف ایک وسیع اور فعال تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ عوامی تحریکوں، ستیہ گرہ اور جلوسوں کے ذریعے انہوں نے سماج کے تمام طبقوں کے لیے پینے کے پانی کے عوامی وسائل کھلوانے کے ساتھ ساتھ ہندو مندروں میں اچھوتوں کے داخلے کے حق کے لیے بھی جدوجہد کی۔ انہوں نے مہد (Mahad) شہر کے چاودر تالاب سے اچھوت طبقے کو پانی نکالنے کا حق دلانے کے لیے ایک ستیہ گرہ کی قیادت بھی کی۔ 1925 میں، انہیں بمبئی پریزیڈنسی کمیٹی میں تمام یورپی اراکین والے سائمن کمیشن کے ساتھ کام کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس کمیشن کے خلاف ہندوستان بھر میں مظاہرے ہوئے۔ جہاں اس کمیشن کی رپورٹ کو زیادہ تر ہندوستانیوں نے نظر انداز کیا، امبیڈکر نے الگ سے مستقبل کی آئینی اصلاحات کے لیے سفارشات لکھ کر بھیجیں۔ دوسری اینگلو-مراٹھا جنگ کے تحت 1 جنوری 1818 کو کورے گاؤں کی لڑائی کے دوران مارے گئے ہندوستانی مہار فوجیوں کے اعزاز میں امبیڈکر نے 1 جنوری 1927 کو 'کورے گاؤں یادگار فتح (جے ستمبھ) میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ یہاں مہار برادری سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کے نام سنگ مرمر کے کتبے پر کندہ کیے گئے تھے اور کورے گاؤں کو دلتوں کی عزت نفس کی علامت قرار دیا گیا۔ 1927 تک، ڈاکٹر امبیڈکر نے چھوا چھوت کے خلاف ایک وسیع اور فعال تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ عوامی تحریکوں، ستیہ گرہ اور جلوسوں کے ذریعے انہوں نے سماج کے تمام طبقوں کے لیے پینے کے پانی کے عوامی وسائل کھلوانے کے ساتھ ساتھ ہندو مندروں میں اچھوتوں کے داخلے کے حق کے لیے بھی جدوجہد کی۔ انہوں نے مہد (Mahad) شہر کے چاودر تالاب سے اچھوت طبقے کو پانی نکالنے کا حق دلانے کے لیے ایک ستیہ گرہ کی قیادت بھی کی۔

20.4.1 منوا سمرتی نذر آتش کرنا (Burning the *Manusmriti*)

1927 کے اواخر میں ہونے والی کانفرنس میں امبیڈکر نے ذات پات کی تفریق اور چھوا چھوت کو نظریاتی طور پر درست قرار دینے والے قدیم برہمنی متن 'منوسمرتی' کی عوامی طور پر مذمت کی، جس کے کئی اقتباس کھلے عام ذات پات کی تفریق اور ذات کے نظام کی حمایت

کرتے ہیں۔ انہوں رسمی طور پر اس قدیم متن کی کئی کاپیاں جلائیں۔ 25 دسمبر 1927 کو، انہوں نے ہزاروں پیروکاروں کی قیادت میں منو اسمرتی کی متعدد کاپیاں جلائیں۔ اس کی یاد میں، ہر سال 25 دسمبر کو امبیڈکر کے ماننے والوں اور ہندو دلتوں کے ذریعے اس دن کو 'منو سمرتی دہن دیوس' کے طور پر منایا جاتا ہے۔

20.4.2 کالارام مندر ستیہ گرہ (Kalaram Temple Satyagraha)

کالارام مندر ستیہ گرہ ایک تحریک تھی جو بھیم راؤ امبیڈکر نے 2 مارچ 1936 کو اچھوتوں کے مندروں میں داخلے کے لیے شروع کی تھی۔ یہ ستیہ گرہ ناسک کے کالارام مندر میں ہوا تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں ہندوؤں میں اونچی ذات کو پیدائشی طور پر مندر میں داخلے کا حق تھا لیکن ہندو دلتوں کو یہ حق حاصل نہیں تھا۔ اس ستیہ گرہ میں تقریباً 15 ہزار دلت لوگوں نے حصہ لیا، جن میں سے زیادہ تر کا تعلق مہار برادری سے تھا اور دیگر مانگ اور چمار تھے۔ اور اس میں خواتین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ یہ ستیہ گرہ 5 سال، 11 مہینے اور 7 دن تک چلا۔ اپنے ستیہ گرہ اور ناسک کے کالارام مندر میں داخلے کی جدوجہد کے دوران انہوں نے پوچھا، 'اگر خدا سب کا ہے تو پھر صرف چند لوگوں کو ہی اس کے مندر میں داخلے کی اجازت کیوں ہے؟' اس تحریک میں امبیڈکر کے ساتھ، دادا صاحب گائیکواڑ، سہستر ابدھے، دیوراؤ نائک، ڈی وی پردھان، بالا صاحب کھرے اور سوامی آنند تھے۔ تب ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے کہا تھا— 'ہندوؤں کو بھی غور کرنا چاہئے کہ کیا مندر میں داخلہ ہندو سماج میں دلتوں کی سماجی حیثیت کو بڑھانے کا حتمی مقصد ہے؟ یا یہ ان کے عروج کی طرف پہلا قدم ہے؟ اگر یہ پہلا قدم ہے تو حتمی مقصد کیا ہے؟ اگر مندر میں داخلہ ہی حتمی مقصد ہے، تو اعلیٰ طبقے کے لوگ کبھی بھی اس کی حمایت نہیں کریں گے۔ دلتوں کا آخری مقصد اقتدار میں حصہ لینا ہے۔' اس ستیہ گرہ میں حصہ لینے کے لیے پورے مہاراشٹر سے لوگ ناسک شہر آئے۔ امبیڈکر کی صدارت میں 2 مارچ 1930 کو ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں ستیہ گرہ کو انجام دینے کے بارے میں فیصلے کیے گئے۔ سب کو اطلاع دی گئی کہ ستیہ گرہ عدم تشدد کے ذریعے کیا جائے گا۔ اگلے دن 3 مارچ 1930 کو ستیہ گرہیوں کے چار دستے بنائے گئے جو مندر کے چار دروازوں پر تعینات ہو گئے۔ پولیس اور مندر کے پجاریوں نے ستیہ گرہیوں کے مطالبے کی مخالفت کرتے ہوئے مندر کے تمام دروازے بند رکھے۔ پولیس نے بھی پورے مندر کی گھیرابندی کر رکھی تھی تاکہ کوئی اچھوت مندر میں داخل نہ ہو سکے۔ شہر کی اونچی ذات کے ہندوؤں نے ان ستیہ گرہیوں پر حملہ کیا، پتھر برسائے اور لاٹھیوں سے مارا۔ اس میں امبیڈکر بھی زخمی ہوئے۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کے مقابلے تعداد میں کئی گنا زیادہ ہونے کے باوجود، دلتوں نے اونچی ذات پر حملہ نہیں کیا اور تشدد کا سہارا نہیں لیا کیونکہ 'ستیہ گرہ عدم تشدد کے ذریعے کرنا ہے۔' امبیڈکر کے اس حکم پر تمام دلت عمل پیرا تھے۔ یہ تقریباً 6 سال تک جاری رہا لیکن رام کے مندر کا دروازہ دلتوں کے لیے نہیں کھلا۔ اس کے بعد ہندو مذہب میں کوئی بدلاؤ نہ ہوتا دیکھ کر امبیڈکر نے ہندو مذہب ترک کرنے کا اعلان کیا۔

امبیڈکر نے اپنی کتاب *Who Were the Shudras? How They Came to be the Fourth Varna in the Indo-Aryan Society?* کے ذریعے ہندو ذات کے نظام کی درجہ بندی میں سب سے نچلی ذات شودروں کے وجود کی وضاحت کی۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ کس طرح 'اتی شودر' (اچھوت) شودروں سے الگ ہیں۔ 1948 میں *Who*

Were the Shudras? کے جواب میں لکھی گئی کتاب *The Untouchables: A Thesis on the Origin of Untouchability* میں امبیڈکر نے ہندو مذہب پر جم کر نشانہ سادھا۔ 'ہندو تہذیب .... جو انسانیت کو غلام بنانے اور دبانے کا ایک ظالمانہ آلہ ہے اور اس کا مناسب نام بدنامی ہوگا۔ اس تہذیب کے بارے میں اور کیا کہا جا سکتا ہے جس نے لوگوں کا ایک بہت بڑا طبقہ تیار کیا جو انسان سے کمتر سمجھا جاتا تھا اور جن کا محض لمس ہی آلودگی پھیلانے کے لیے کافی تھا۔' انہوں نے لکھا کہ ہندو سماج جیسی سماجی برائیاں مسلم سماج میں بھی ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی طرف سے ارزل (نچلا ترین) طبقات کے خلاف امتیازی سلوک پر بھی تنقید کی، جنہیں 'کمتر درجے' کا سمجھا جاتا تھا، نیز مسلم سماج میں خواتین کے پردے کی رسم پر بھی تنقید کی۔ ان کا کہنا تھا کہ پردہ ہندوؤں میں بھی دیکھا جاتا ہے لیکن اسے مذہبی منظوری صرف مسلمانوں نے دی ہے۔ انہوں نے مزید لکھا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے سماج کی اصلاح کرنے میں ناکام رہے ہیں جبکہ اس کے برعکس ترکی جیسے ممالک نے خود کو بہت بدل لیا ہے۔

20.5 مذہب کی تبدیلی کا اعلان (The Declaration of Change of Religion)

10-12 سال تک ہندو مذہب میں رہتے ہوئے، باباصاحب امبیڈکر نے ہندو مذہب اور ہندو سماج کی اصلاح، مساوات اور احترام کے حصول کے لیے تمام کوششیں کیں، لیکن اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے دل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے برعکس ان کی مذمت کی گئی اور ہندو مذہب کو تباہ کرنے والا بھی کہا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا تھا، 'ہم نے ہندو سماج میں برابری کی سطح کو حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی کوششیں اور ستیہ گرہ کیے، لیکن سب بے سود ثابت ہوا۔ ہندو سماج میں برابری کی کوئی جگہ نہیں ہے۔' ہندو سماج کہتا تھا کہ 'انسان مذہب کے لیے ہے' جبکہ امبیڈکر کا ماننا تھا کہ 'مذہب انسان کے لیے ہے۔' امبیڈکر نے کہا کہ کسی مذہب کا کوئی فائدہ نہیں جس میں انسانیت کی کوئی قدر نہ ہو۔ اس مذہب میں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں جو اپنے ہی مذہب کے ماننے والوں (اچھوتوں) کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا، انہیں نوکریوں کے حصول میں روکتا ہے، ہر گفتگو میں ان کی توہین کرتا ہے اور انہیں پانی تک نہیں پینے دیتا، ایسے مذہب میں رہنے کا کوئی مطلب نہیں۔ امبیڈکر نے ہندو مذہب کو ترک کرنے کا اعلان کسی بھی قسم کی دشمنی اور ہندو مذہب کی تباہی کے لیے نہیں کیا تھا، بلکہ انہوں نے یہ فیصلہ کچھ بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا تھا جو ہندو مذہب سے بالکل مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ 13 اکتوبر 1935 کو ناسک کے قریب 'ییولا' میں ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے، امبیڈکر نے اپنے مذہب کی تبدیلی کا اعلان کیا، 'اگرچہ میں ایک اچھوت ہندو پیدا ہوا ہوں، لیکن میں ہندو بن کر کبھی نہیں مروں گا۔'

انہوں نے اپنے پیروکاروں سے ہندو مت چھوڑ کر کوئی بھی مذہب اختیار کرنے کی اپیل کی۔ امبیڈکر ایک ایسے مذہب کا انتخاب کرنا چاہتے تھے جس کا مرکز انسانیت اور اخلاق ہو، جس میں آزادی، مساوات اور بھائی چارہ ہو۔ وہ کسی بھی حالت میں ایسے مذہب میں رہنا نہیں چاہتے تھے جس میں ذات پات کی تفریق اور چھوا چھوت کی بیماری ہو اور نہ ہی وہ کسی ایسے مذہب کا انتخاب کرنا چاہتے تھے جو توہم پرستی اور منافقت سے بھرا ہو۔ 21 مارچ 1936 کے ہریجن میں گاندھی نے لکھا، 'جب سے ڈاکٹر امبیڈکر نے مذہبی تبدیلی کی دھمکی کا بم ہندو سماج میں

پھینکا ہے، انہیں اپنے عزم سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔' گاندھی مزید ایک جگہ لکھتے ہیں، 'ہاں، ایسے وقت میں (اونچی ذات کے) مصلحین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دلوں کو ٹٹولیں۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ کیا وہ میرے یا میرے پڑوسیوں کے رویے سے ناخوش ہوکر تو ایسا نہیں کیا جارہا ہے۔ ۔۔۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد جو خود کو سناتنی کہتی ہے، کا رویہ ایسا ہے کہ اس سے ملک بھر میں ہریجنوں کو بے حد تکلیف اور چڑچڑاپن ہوتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے ہی ہندوؤں نے ہندو مذہب کیوں چھوڑا اور دوسروں نے کیوں نہیں چھوڑا۔ یہ تو ان کی قابل ستائش وفاداری یا ہندو مذہب کی یا برتری ہے کہ اسی مذہب کے نام پر اتنے ظلم و ستم کے باوجود لاکھوں ہریجن اس میں رہتے ہیں۔'

امبیڈکر نے اپنی مذہبی تبدیلی کے اعلان کے بعد 21 سالوں تک دنیا کے تمام بڑے مذاہب کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور آخر میں بدھ مت کا انتخاب کیا کیونکہ یہ تین اصولوں کی ایک مربوط شکل فراہم کرتا ہے جو کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ اسلام بھی برصغیر میں آکر اپنی ابتدائی سادہ شکل کھو چکا تھا اور اس میں بھی ذات پات کی تفریق اور بری رسومات پیدا ہو گئیں تھیں۔ بدھ مت 'پرگیا' (توہم پرستی اور مافوق الفطرت کی بجائے ذہانت کا استعمال)، 'کرونا' (محبت) اور 'سمتا' (مساوات) کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان انہی چیزوں کو پاکیزہ اور خوشگوار زندگی کے لیے چاہتا ہے۔ دیوتا اور روح معاشرے کو نہیں بچا سکتے۔ امبیڈکر کے مطابق، سچا مذہب وہ ہے جس کا مرکز انسان اور اخلاقیات ہو، جس کی بنیاد سائنس یا فکری عنصر ہو نہ کہ مذہب کا مرکز خدا، روح کی آزادی اور نجات ہو۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مذہب کا کام دنیا کی تشکیل نو کرنا ہے نہ کہ اس کی ابتدا اور انجام کو بیان کرنا۔ وہ ایک جمہوری سماجی نظام کے حق میں تھے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایسی صورت حال میں مذہب انسانی زندگی کا رہنما بن سکتا ہے۔ انہوں نے یہ سب چیزیں صرف بدھ مت میں پائی۔

20.5.1 بدھ مت میں تبدیلی مذہب (Conversion to Buddhism)

1950 کی دہائی میں، بھیم راؤ امبیڈکر بدھ مت کی طرف راغب ہوئے اور بدھ راہبوں اور علماء کی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے سری لنکا گئے۔ پونے کے قریب ایک نئی بدھ خانقاہ کو وقف کرتے ہوئے، ڈاکٹر امبیڈکر نے اعلان کیا کہ وہ بدھ مت پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں اور جیسے ہی یہ مکمل ہو جائے گی وہ رسمی طور پر بدھ مت اختیار کر لیں گے۔ 1954 میں امبیڈکر نے دو بار میانمار کا دورہ کیا، دوسری بار وہ تیسری 'ورلڈ بدھسٹ فیلو شپ کانفرنس' میں شرکت کے لیے رنگون گئے۔ 1955 میں انہوں نے 'بھارتیہ بدھسٹ مہاسبھا' (Buddhist Society of India) کی بنیاد رکھی، انہوں نے 1956 میں اپنا آخری مشہور مقالہ *The Buddha and His Dhamma* مکمل کیا۔ یہ ان کی وفات کے بعد 1957 میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے دیباچے میں امبیڈکر نے لکھا ہے۔ 'میں بھگوان بدھ اور ان کے اصل مذہب کی پناہ میں جارہا ہوں۔ میں مروجہ بدھ فرقوں سے غیر جانبدار ہوں۔ میں جس بدھ مت کو قبول کر رہا ہوں وہ نو بدھ مت یا 'نویان' ہے۔ 14 اکتوبر 1956 کو، ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے ناگپور شہر میں اپنے اور اپنے حامیوں کے لیے ایک رسمی عوامی تبدیلی مذہب کی تقریب کا اہتمام کیا۔ پہلے ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی اہلیہ سویتا اور کچھ ساتھیوں کے ساتھ بھکشو مہاستھویر چندر منی کے ذریعے روایتی طریقے سے 'تری رتن' اور 'پنچ شیل' کو اپنا کر بدھ مت قبول کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے 5,00,000 پیروکاروں کو تری رتن،

پنچ شیل اور 22 وعدے کراتے ہوئے نویان بدھ مت میں داخل کیا۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر جی اور ان کا خاندان سنت کبیر کے نظریے سے بہت متاثر ہوا اور اپنی زندگی کبیر کی تعلیمات کے مطابق گزارتے تھے۔ ہندومت کے طوق کو مکمل طور پر الگ کرنے کے لیے، امبیڈکر نے خود اپنے بدھ مت کے پیروکاروں کے لیے بائیس واجبات یا عزیمتیں رکھیں، جو بدھ مت کے فلسفے کا ہی نچوڑ تھا۔ ان واجبات میں ہندومت کی تثلیث میں عدم اعتماد، اوتار واد کا انکار، شرادھ پر روک، پنڈ دان کا ترک کرنا، بدھ کے اصولوں اور تعلیمات پر یقین، کسی بھی برہمنی تقریب میں عدم شرکت، انسان کی برابری پر یقین، مہاتما بدھ کے آٹھوں اصولوں پر عمل آوری، جانداروں کے ساتھ حسن سلوک، چوری نہ کرنا، جھوٹ نہ بولنا، شراب نہ پینا، عدم مساوات پر مبنی ہندو مذہب کو ترک کرنا اور بدھ مت کو اپنانا شامل تھا۔

نویان کو اپنا کر امبیڈکر اور ان کے حامیوں نے واضح طور پر ہندو مذہب اور ہندو فلسفے کی مذمت کی اور اسے چھوڑ دیا۔ اگلے دن 15 اکتوبر کو امبیڈکر نے دوبارہ اپنے 2 سے 3 لاکھ پیروکاروں کو بدھ مت میں شامل کیا۔ یہ وہ پیروکار تھے جو 14 اکتوبر کو تقریب میں نہیں پہنچ سکے تھے یا دیر سے پہنچے تھے۔ امبیڈکر نے ناگپور میں تقریباً 8 لاکھ لوگوں کو بدھ مت میں داخل کیا، اس لیے یہ سرزمین 'دیکشا بھومی' کے نام سے مشہور ہوئی۔ تیسرے دن، 16 اکتوبر کو امبیڈکر چندر پور گئے اور وہاں بھی انہوں نے تقریباً 3 لاکھ پیروکاروں کو بدھ مت میں داخل کیا۔ اس طرح صرف تین دن میں خود امبیڈکر نے 11 لاکھ سے زیادہ لوگوں کو بدھ مذہب میں داخل کر کے دنیا میں بدھ مت کے پیروکاروں کی تعداد میں 11 لاکھ کا اضافہ کیا اور ہندوستان میں بدھ مت کو زندہ کیا۔ اس واقعہ پر بہت سے لوگوں اور بودھ ممالک سے مبارکبادیں موصول ہوئیں۔ اس کے بعد وہ نیپال میں ہونے والی چوتھی عالمی بدھ کانفرنس میں شرکت کے لیے کاٹھمنڈو گئے۔ وہاں وہ کاٹھمنڈو شہر کی دلت بستیوں میں گئے تھے۔ نیپال کی امبیڈکر وادی تحریک کی قیادت دلت رہنما کرتے ہیں اور نیپال کے زیادہ تر دلت رہنماؤں کا ماننا ہے کہ صرف 'امبیڈکر کا فلسفہ' ہی ذات پات کے امتیاز کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ امبیڈکر نے اپنا آخری نسخہ 'بدھ اور کارل مارکس' 2 دسمبر 1956 کو مکمل کیا۔

20.6 پونا معاہدہ (The Poona Pact)

اب تک بھیم راؤ امبیڈکر ہمعصر دور کی سب سے بڑی اچھوت سیاسی شخصیت بن چکے تھے۔ انہوں نے ذات پات کے نظام کے خاتمے کے تئیں مبینہ بے حسی پر مرکزی دھارے کی سیاسی جماعتوں پر سخت تنقید کی۔ امبیڈکر نے انڈین نیشنل کانگریس اور اس کے رہنما مہاتما گاندھی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا اور ان پر الزام لگایا کہ وہ اچھوت برادری کو ایک قابل رحم چیز کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ امبیڈکر ذات پات کی تفریق مٹانے میں برطانوی حکمرانی کی ناکامیوں کی وجہ سے بھی غیر مطمئن تھے۔ انہوں نے اچھوت برادری کے لیے ایک الگ سیاسی شناخت کی وکالت کی جس میں کانگریس یا انگریزوں کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ پہلی گول میز کانفرنس کے دوران 8 اگست 1930 کو لندن میں ایک استحصال شدہ طبقے کی کانفرنس میں، امبیڈکر نے اپنا سیاسی نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا، جس کے مطابق استحصال شدہ طبقے کا تحفظ حکومت اور کانگریس دونوں سے آزاد ہونے میں مضمر ہے۔

> ہمیں اپنا راستہ خود بنانا ہے۔ . . . سیاسی طاقت مظلوموں کے مسائل حل نہیں کر سکتی، ان کی نجات معاشرے میں ان کا جائز مقام حاصل کرنے میں مضمر ہے۔ انہیں اپنے برے طرز زندگی کو بدلنا ہوگا... انہیں تعلیم یافتہ ہونا چاہیے... ایک بہت بڑی

ضرورت ہے کہ ان کے احساسِ کمتری کو ختم کر دیا جائے اور ان میں وہ الوہی عدم اطمینان پیدا کیا جائے جو تمام تر بلندیوں کا سرچشمہ ہے۔

امبیڈکر نے کانگریس اور گاندھی کے ذریعہ شروع کیے گئے نمک ستیہ گرہ پر تنقید کی۔ اچھوت طبقے میں ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور عوامی حمایت کی وجہ سے انہیں 1931 میں لندن میں منعقد ہونے والی دوسری گول میز کانفرنس میں بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ وہاں ان کی گاندھی کے ساتھ اچھوتوں کو علیحدہ انتخابی حلقے دینے کے معاملے پر تیکھی بحث ہوئی اور انگریزوں نے ڈاکٹر امبیڈکر کے خیالات سے اتفاق کیا۔ مذہب اور ذات پات کی بنیاد پر الگ حلقہ انتخاب دینے کے سخت مخالف گاندھی نے خدشہ ظاہر کیا کہ اچھوتوں کو علیحدہ انتخابی حلقے دینے سے ہندو سماج تقسیم ہو جائے گا۔ گاندھی کو لگتا تھا کہ اعلیٰ ذاتوں (سورن) کو اچھوت پن کو بھلانے اور ذہنیت تبدیل کرنے کے لیے چند سال کا وقت دیا جانا چاہیے تاکہ، لیکن یہ دلیل اس وقت غلط ثابت ہوئی جب پونا معاہدے کے کئی دہائیوں بعد بھی اعلیٰ ذات کے ہندو اچھوتوں پر پابندی لگاتے رہے۔

1932 میں جب انگریزوں نے امبیڈکر کے نظریات سے اتفاق کیا اور اچھوتوں کو علیحدہ انتخابی حلقے دینے کا اعلان کیا۔ فرقہ وارانہ اوارڈ ('The Communal Award') کا اعلان گول میز کانفرنس میں ہونے والی بات چیت کا نتیجہ تھا۔ اس معاہدے کے تحت امبیڈکر کے ذریعہ اٹھائے گئے سیاسی نمائندگی کے مطالبے کو قبول کرتے ہوئے، دلت طبقے کو علیحدہ حلقہ انتخاب میں دو ووٹوں کا حق دیا گیا۔ اس کے تحت دلت ایک ووٹ سے اپنا نمائندہ منتخب کر سکتے تھے اور دوسرے ووٹ سے عام زمرے کے نمائندے کو منتخب کرنے کی آزادی تھی۔ اس طرح دلتوں کا نمائندہ صرف دلتوں کے ووٹوں سے منتخب ہونا تھا۔ اس دفعہ کے ساتھ اب دلت نمائندے کے انتخاب میں عام طبقے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ لیکن دلت طبقہ اپنے دوسرے ووٹ کا استعمال کر کے عام طبقے کا نمائندہ منتخب کر کے اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔ ایسے میں دلتوں کے ذریعہ منتخب ہونے والا دلت امیدوار دلتوں کے مسائل کا بخوبی اظہار کر سکتا تھا لیکن غیر دلت امیدوار کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ان کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش بھی کرے۔

گاندھی اس وقت پونے کی یرودا جیل میں تھے۔ جیسے ہی کمیونل ایوارڈ کا اعلان ہوا، گاندھی نے سب سے پہلے وزیر اعظم کو خط لکھا جس میں اسے تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب انہیں لگا کہ ان کے مطالبے پر عمل نہیں ہو رہا تو انہوں نے مرن برت (موت تک روزہ) کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد امبیڈکر نے کہا کہ 'اچھا ہوتا اگر گاندھی یہ روزہ ملک کی آزادی کے لیے رکھتے لیکن انہوں نے یہ روزہ دلت لوگوں کے خلاف احتجاج میں رکھا ہے جو کہ انتہائی افسوسناک ہے۔ جب کہ ہندوستانی عیسائیوں، مسلمانوں اور سکھوں کو ملے اسی حق (علیحدہ حلقہ انتخاب) کے بارے میں گاندھی کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں آیا۔' انہوں نے یہ بھی کہا کہ گاندھی ایک لافانی شخص نہیں ہیں۔ کون جانے ایسے کتنے لوگ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور چل بسے۔ امبیڈکر نے کہا کہ وہ گاندھی کی جان بچانے کے لیے دلتوں کے مفادات کی قربانی نہیں دے سکتے۔ اب گاندھی کی صحت ان کے مرن برت کی وجہ سے مسلسل بگڑ رہی تھی۔ گاندھی کی جان کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا اور پورا ہندو

سماج امبیڈکر کے خلاف ہو گیا۔

ملک میں بڑھتے ہوئے دباؤ کو دیکھ کر امبیڈکر 24 ستمبر 1932 کو شام 5 بجے یرودا جیل پہنچے۔ یہاں گاندھی اور امبیڈکر کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جو بعد میں پونا معاہدہ (Poona Pact) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس معاہدے میں امبیڈکر نے فرقہ وارانہ ایوارڈ میں دلتوں کو دیے گئے علاحدہ حلقہ انتخاب کے حق کو چھوڑنے کا اعلان کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی فرقہ وارانہ ایوارڈ کے ذریعے حاصل ہونے والی 78 مخصوص نشستوں کے بجائے پونا معاہدہ میں مخصوص نشستوں کی تعداد بڑھا کر 148 کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اچھوت لوگوں کے لیے ہر صوبے میں تعلیمی گرانٹ میں مناسب رقم مقرر کرائی اور دلت طبقے کے لوگوں کی سرکاری ملازمتوں میں بلاامتیاز بھرتی کو یقینی بنایا۔ امبیڈکر اس معاہدے سے مطمئن نہیں تھے، انہوں نے گاندھی کے مرن برت کو گاندھی کی طرف سے اچھوتوں کو ان کے سیاسی حقوق سے محروم کرنے اور ان پر اپنے مطالبات سے دستبردار ہونے کا دباؤ ڈالنے کا ڈرامہ قرار دیا۔ 1942 میں امبیڈکر نے اس معاہدے کی مذمت کی اور پونا معاہدے کے حوالے سے اپنی ناراضگی کا اظہار اپنی کتاب *State of Minority* میں کیا۔

20.7 گاندھی کے ساتھ تعلقات اور نظریاتی اختلاف

(Relations, and Ideological Differences with Gandhi)

1920 کی دہائی میں، امبیڈکر بیرون ملک اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہندوستان واپس آئے اور سماجی میدان میں کام کرنا شروع کیا۔ اس وقت کانگریس پارٹی نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں تحریک آزادی شروع کر رکھی تھی۔ 14 اگست 1931 کو امبیڈکر اور گاندھی کی پہلی بار بمبئی کے منی بھون میں ملاقات ہوئی۔ اس وقت تک گاندھی نہیں جانتے تھے کہ امبیڈکر خود ایک مبینہ 'اچھوت' ہیں۔ وہ انہیں اپنی ہی طرح کا ایک سماجی مصلح، سورن یا برہمن رہنما سمجھتے تھے۔ گاندھی کو یہی بتایا گیا کہ امبیڈکر نے بیرون ملک تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی تھیں اور وہ پی ایچ ڈی ہیں۔ وہ دلتوں کی حالت سدھارنے کے لیے کوشاں ہیں اور ہمیشہ گاندھی اور کانگریس پر تنقید کرتے ہیں۔ پہلی گول میز کانفرنس میں امبیڈکر کے دلائل کے بارے میں جاننے کے بعد، گاندھی کو مکمل یقین ہو گیا کہ وہ مغربی تعلیم اور سوچ میں پوری طرح ڈوبے ہوئے جدیدیت پسند نوجوان ہیں، جو ہندوستانی سماج کو بھی یورپی نقطہ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

جب گاندھی کو قتل کیا گیا تو امبیڈکر پہلے شخص تھے جو موقع پر پہنچے اور عینی شاہدین کے مطابق وہ کافی دیر تک وہاں رہے۔ 1935 میں، جب امبیڈکر نے ہندو مذہب چھوڑنے اور اجتماعی تبدیلی کا اعلان کیا، تو جمنالال بجاج نے 4 مارچ 1936 کو گجرات کے ساولی گاؤں میں ایک پروگرام میں اس پر گاندھی کی رائے پوچھی۔ گاندھی نے کہا- 'اگر ڈاکٹر امبیڈکر کی جگہ میں ہوتا تو مجھے بھی اتنا ہی غصہ ہوتا۔ اس حالت میں رہ کر شاید میں ایک غیر متشدد انسان نہ بن پاتا۔ ڈاکٹر امبیڈکر جو کچھ بھی کرتے ہیں، ہمیں اسے عاجزی کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہریجنوں کی خدمت اسی میں ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ واقعی ہمیں جوتے مارتے ہیں، تو بھی ہمیں اسے برداشت کرنا ہوگا۔ لیکن ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کو منا کر انہیں قائل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ صحیح نہیں ہوگا۔ اگر وہ یا دوسرے ہریجن جو ہندو

مذہب کو نہیں مانتے ہیں، مذہب تبدیل کرتے ہیں، تو یہ بھی ہماری پاکیزگی کا سبب ہوگا۔ ہم اس طرح کے سلوک کے مستحق ہیں۔'

گاندھی امبیڈکر کے لیے 'ڈاکٹر' کا خطاب استعمال کرتے تھے اور امبیڈکر گاندھی کو 'مسٹر گاندھی' کہتے تھے۔ امبیڈکر نے 1930 اور 1940 کی دہائیوں میں گاندھی پر سخت تنقید کی۔ ان کا خیال تھا کہ صفائی کارکنوں کی ترقی کا گاندھیائی راستہ حقارت آمیز اور توہین آمیز تھا۔ گاندھی اچھوت کے داغ کو مٹا کر ہندو مذہب کو پاک کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف امبیڈکر نے خود ہندو مذہب کو ہی مسترد کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر دلتوں کو مساوی شہری کا درجہ حاصل کرنا ہے تو انہیں کوئی اور عقیدہ اپنانا ہوگا۔ امبیڈکر ناراض تھے کہ کانگریس نے دلتوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اس کے لیے سب سے زیادہ ذمہ دار گاندھی تھے، کیونکہ اپنے آخری ایام سے پہلے وہ ورن نظام اور ذات پات کے نظام کی مخالفت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، لیکن اپنے سناتنی ہندو ہونے پر مطمئن تھے۔ اگرچہ گاندھی اور امبیڈکر اپنی زندگی بھر سیاسی حریف رہے، لیکن دونوں نے توہین آمیز سماجی نظام کو کمزور کرنے میں ایک دوسرے کے معاون کا کردار ادا کیا۔ قانوناً چھوت کا خاتمہ ہو گیا ہے، لیکن ہندوستان کے کئی حصوں میں اب بھی دلتوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔

26 فروری 1955 کو امبیڈکر نے بی بی سی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں مہاتما گاندھی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ امبیڈکر نے کہا کہ وہ ہمیشہ گاندھی سے حریف کے طور پر ملتے تھے۔ اس لیے وہ گاندھی کو دوسروں سے بہتر جانتے تھے۔ امبیڈکر کے مطابق، 'گاندھی ہندوستان کی تاریخ میں ایک حادثہ تھے، وہ کبھی بھی ایک عہد ساز نہیں تھے۔ ...' انہوں نے گاندھی پر ہر وقت دوہرا کردار ادا کرنے کا الزام بھی لگایا۔ گاندھی نے دو اخبارات نکالے، پہلا ہریجن انگریزی اخبار جس میں گاندھی نے خود کو ذات پات کے نظام اور چھوا چھوت کا مخالف بتایا۔ دوسرے ایک اور گجراتی اخبار میں وہ زیادہ قدامت پسند شخص کے طور پر نظر آتے ہیں، جس میں وہ ذات پات کے نظام، ورناشرم دھرم یا تمام قدامت پسند اصولوں کے حامی تھے۔ امبیڈکر نے برابری پر زور دیا۔ چھوا چھوت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ مساوی مواقع اور وقار پر زور دیا اور دعویٰ کیا کہ گاندھی اس کے مخالف تھے۔ ان کے مطابق گاندھی چھوا چھوت کی بات صرف اچھوتوں کو کانگریس سے جوڑنے کے لیے کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اچھوت، سوراج کے ان کے تصور کی مخالفت نہ کریں۔ گاندھی ایک پر عزم مصلح نہیں تھے اور انہوں نے جیوتی راؤ پھولے یا امبیڈکر کی طرح ذات پات کے نظام کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ امبیڈکر اور ان کے حامیوں نے گاندھی کے دلتوں کو 'ہریجن' کہنے کی مخالفت کی اور دلتوں نے اسے گالی کے مترادف سمجھا۔ گاندھی کی طرف سے شروع کیے گئے 'ہریجن سیوک سنگھ' کو بھی دلتوں نے ناپسند کیا کیونکہ 'وہ ایک اعلیٰ ذات کی مدد سے دلتوں کی ترقی کے خیال کی عکاسی کرتا ہے، نہ کہ دلتوں کی زندگیوں پر ان کے اپنے اختیار کی۔

گاندھی اور امبیڈکر بہت سے مسائل پر ایک جیسے خیالات رکھتے تھے، جب کہ بہت سے مسائل پر ان کے خیالات بالکل مختلف یا مخالف تھے۔ دیہی ہندوستان، ذات پات کے نظام اور اچھوت کے مسائل پر دونوں کے خیالات ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ تاہم، دونوں نے ملک میں سماجی انصاف اور اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی اور دونوں نے ان مقاصد کے لیے مختلف راستے دکھائے۔ گاندھی کے مطابق اگر ہندو ذات کے نظام سے چھوا چھوت کو ختم کر دیا جائے تو پورا نظام سماج کے مفاد میں کام کر سکتا ہے۔ اس کے منطقی تصور کے لیے، گاندھی نے

گاؤں کو ایک مکمل معاشرہ قرار دیا اور اسے ترقی اور افزائش کے مرکز میں رکھا۔ گاندھی کے برعکس، امبیڈکر نے ذات پات کے نظام کو مکمل طور پر ختم کرنے کا خیال پیش کیا۔ امبیڈکر کے مطابق، جب تک سماج میں ذات پات کا نظام موجود ہے، چھوا چھوت سماج میں نئی شکلوں میں پروان چڑھتا رہے گا۔ گاندھی ستیہ گرہ میں یقین رکھتے تھے۔ امبیڈکر کے مطابق، اونچی ذات کے ہندوؤں کے دل ستیہ گرہ کے ذریعے نہیں بدلے جاسکتے کیونکہ وہ ذات پات کے نظام سے مادی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ گاندھی ریاست کو زیادہ اختیارات دینے کے خلاف تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ اختیارات معاشرے میں منحصر کیے جائیں اور اس کے لیے وہ گاؤں کو اقتدار کی مرکزی اکائی بنانے کے حق میں تھے۔ اس کے برعکس، امبیڈکر نے سماج کے بجائے آئین کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنانے کی وکالت کی۔

20.8 امبیڈکر کی سیاسی زندگی (Political Life of Ambedkar)

امبیڈکر کی سیاسی زندگی کا آغاز 1926 میں ہوا اور وہ 1956 تک میدان سیاست میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ دسمبر 1926 میں، بامبے کے گورنر نے انہیں بامبے قانون ساز کونسل کا رکن نامزد کیا۔ انہوں نے اپنے فرائض کو سنجیدگی سے لیا اور اکثر اقتصادی معاملات پر تقریریں کیں۔ وہ 1936 تک بمبئی قانون ساز کونسل کے رکن رہے۔ 13 اکتوبر 1935 کو امبیڈکر کو گورنمنٹ لاء کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا اور دو سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ انہوں نے دہلی یونیورسٹی کے رام جس کالج کے بانی شری رائے کیدار ناتھ کی موت کے بعد اس کالج کی گورننگ باڈی (مجلس انتظامی) کے صدر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ امبیڈکر اب بمبئی میں بس گئے۔ انہوں نے یہاں ایک بڑا تین منزلہ مکان 'راج گرہ' بنایا، جس میں ان کی ذاتی لائبریری میں 50,000 سے زیادہ کتابیں تھیں، جو کہ دنیا کی سب سے بڑی نجی لائبریری تھی۔ اسی سال 27 مئی 1935 کو ان کی اہلیہ رما بائی طویل علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ اپنی موت سے پہلے رما بائی تیرتھ یاترا کے لیے پندھارپور جانا چاہتی تھی لیکن امبیڈکر نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ امبیڈکر نے کہا کہ اس ہندو تیرتھ استھل پر جہاں انہیں اچھوت سمجھا جاتا ہے، جانے کا کوئی جواز نہیں۔ اس کے بجائے انہوں نے ان کے لیے ایک نیا پندھارپور بنانے کی بات کہی۔

1936 میں، امبیڈکر نے 'انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی' کی بنیاد رکھی، جس نے 1937 میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں 13 نشستیں حاصل کیں۔ امبیڈکر بامبے ودھان سبھا (مجلس قانون ساز) کے ایم ایل اے کے طور پر منتخب ہوئے۔ وہ 1942 تک ودھان سبھا کے رکن رہے اور اس دوران انہوں نے بامبے ودھان سبھا میں اپوزیشن لیڈر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ اسی سال، امبیڈکر نے 15 مئی 1936 کو اپنی کتاب *Annihilation of Caste* (ذات کے نظام کا خاتمہ) شائع کی، جو نیویارک میں ان کے لکھے گئے ایک تحقیقی مقالے پر مبنی تھی۔ اس کتاب میں امبیڈکر نے ہندو مذہبی رہنماؤں اور ذات پات کے نظام پر کڑی تنقید کی۔ انہوں نے اچھوت طبقے کے لوگوں کو گاندھی کے ذریعے وضع کردہ اصطلاح ہریجن پکارنے کے کانگریس کے فیصلے کی شدید مذمت کی۔ بعد میں 1955 میں بی بی سی (BBC) کو دیے انٹرویو میں انہوں نے گاندھی پر ان کے گجراتی زبان کے خطوط میں ذات کے نظام کی حمایت کرنے اور انگریزی زبان کے خطوط میں ذات پات کے نظام کی مخالفت کرنے کا الزام لگایا۔ آل انڈیا شیڈیولڈ کاسٹ فیڈریشن ('All-India Scheduled Caste Federation')

ایک سماجی و سیاسی تنظیم تھی جسے امبیڈکر نے 1942 میں دلت برادری کے حقوق کی مہم چلانے کے لیے قائم کیا تھا۔ سال 1942 سے 1946 کے دوران، امبیڈکر نے دفاعی مشاورتی کمیٹی اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں وزیر محنت کے طور پر خدمات انجام دیں۔

20.8.1 امبیڈکر اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی (Ambedkar and India's Freedom Struggle)

پاکستان کا مطالبہ کرنے والی مسلم لیگ کی لاہور قرارداد (1940) کے بعد امبیڈکر نے 400 صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس کا عنوان تھا *Thoughts on Pakistan* (پاکستان کے بارے میں نظریات)، جس میں پاکستان کے تصور کا اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ تجزیہ کیا گیا تھا۔ اس میں انہوں نے مسلم لیگ کی مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت 'پاکستان' کے مطالبے پر تنقید کی۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ دلیل بھی دی کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے لیے پاکستان تسلیم کرنا چاہیے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ مسلم اور غیر مسلم اکثریت والے حصوں کو الگ کرنے کے لیے بنگال اور پنجاب کی صوبائی سرحدوں کو از سر نو کھینچنا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو صوبائی سرحدوں کو دوبارہ بنانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور اگر انہیں اعتراض ہے تو وہ 'اپنے مطالبے کی نوعیت کو نہیں سمجھ پائے۔' دانشور وینکٹ دھولی پل نے کہا کہ ''تھاٹس آن پاکستان' نے ایک دہائی تک ہندوستانی سیاست کو روک دیا۔' انہوں نے مسلم لیگ اور ہندوستانی قومی کانگریس کے درمیان بات چیت کا ایسا راستہ طے کیا جو تقسیم ہند کے لیے راہ ہموار کر رہا تھا۔ اگرچہ وہ محمد علی جناح اور مسلم لیگ کی باعث تفریق فرقہ وارانہ سیاست کے سخت ناقد تھے، لیکن انہوں نے دلیل دی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ کر دینا چاہیے اور پاکستان بنایا جائے کیونکہ ایک ہی ملک کی قیادت کرنے سے نسلی قوم پرستی ملک کے اندر مزید تشدد کو بڑھاوا دے گی۔

انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ تقسیم کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کی تائید کے لیے سلطنت عثمانیہ کے خاتمے اور چیکوسلواکیہ کی تحلیل جیسے تاریخی واقعات کا حوالہ دیا۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا قیام پاکستان کی خاطر خواہ وجوہات موجود ہیں؟ اور تجویز پیش کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کو کم سخت اقدام سے بھی ختم کرنا ممکن ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ پاکستان اپنے وجود کا جواز پیش کرے۔ کینیڈا جیسے ممالک میں بھی فرقہ وارانہ مسائل ہمیشہ سے رہے ہیں لیکن آج بھی انگریز اور فرانسیسی ایک ساتھ رہتے ہیں تو کیا ہندو اور مسلمان بھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے؟ انہوں نے خبردار کیا کہ دو ملک بنانے کے حل پر عمل درآمد انتہائی مشکل ہوگا۔ بڑی آبادی کی منتقلی کے ساتھ سرحدی تنازع کا مسئلہ بھی پیدا ہوگا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد ہونے والے تشدد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ پیشین گوئی درست تھی۔

What Congress and Gandhi Have Done to the Untouchables? (کانگریس اور گاندھی نے اچھوتوں کے لیے کیا کیا؟)، اس کتاب کے ساتھ امبیڈکر نے گاندھی اور کانگریس دونوں پر منافقت کا الزام لگاتے ہوئے اپنے حملوں کو تیز کیا۔ امبیڈکر نے اپنی سیاسی جماعت کو 'آل انڈیا شیڈیولڈ کاسٹ فیڈریشن' میں تبدیل ہوتے دیکھا، حالانکہ اس پارٹی نے 1946 میں ہونے والے ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات میں خراب کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ بعد میں وہ بنگال سے، جہاں مسلم لیگ اقتدار میں تھی،

آئین ساز اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے۔امبیڈ کر نے 1952 کی پہلی ہندوستانی لوک سبھا کا انتخاب بامبے نارتھ سے لڑا، لیکن وہ اپنے سابق معاون اور کانگریس پارٹی کے امیدوار نارائن کاجولکر سے ہار گئے۔اس الیکشن میں امبیڈ کر کو 123,576 ووٹ ملے اور نارائن سدوبا کاجولکر کو 138,137 ووٹ ملے۔امبیڈ کر 1952 میں راجیہ سبھا کے رکن بنے۔انہوں نے بھنڈارا سے 1954 کے ضمنی انتخاب کے ذریعے دوبارہ لوک سبھا میں داخل ہونے کی کوشش کی، لیکن وہ تیسرے نمبر پر رہے۔1957 میں دوسرے عام انتخابات کے وقت تک امبیڈ کر کا انتقال ہو چکا تھا۔

امبیڈ کر دو بار ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایوان بالا راجیہ سبھا میں مہاراشٹر کی نمائندگی کرتے ہوئے پارلیمنٹ کے ممبر بنے۔راجیہ سبھا کے رکن کے طور پر ان کی پہلی میعاد 3 اپریل 1952 سے 2 اپریل 1956 تک تھی اور ان کی دوسری میعاد 3 اپریل 1956 سے 2 اپریل 1962 تک ہونی تھی لیکن مدت ختم ہونے سے قبل ہی 6 دسمبر 1956 کو ان کا انتقال ہو گیا۔30 ستمبر 1956 کو، امبیڈ کر نے 'شیڈیولڈ کاسٹ فیڈریشن' کو مسترد کرتے ہوئے 'ریپبلکن پارٹی آف انڈیا' (Republican Party of India) کے قیام کا اعلان کیا، لیکن پارٹی کے بننے سے پہلے ہی 6 دسمبر 1956 کو ان کا انتقال ہو گیا۔اس کے بعد ان کے پیروکاروں اور کارکنوں نے اس پارٹی کو بنانے کا منصوبہ بنایا۔پارٹی کے قیام کے لیے یکم اکتوبر 1957 کو ناگپور میں صدارتی اجلاس ہوا۔اس میٹنگ میں این شیوراج، یشونت امبیڈ کر، پی ٹی بورالے، اے جی پوار، دتا کٹی، ڈی اے روپ وتے موجود تھے۔3 اکتوبر 1957 کو ریپبلکن پارٹی آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا اور این شیوراج کو پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔

20.8.2 آئین سازی (Making of the Constitution of India)

گاندھی اور کانگریس کی سخت تنقید کے باوجود، امبیڈ کر ایک غیر معمولی دانشور اور ماہر قانون کے طور پر شہرت رکھتے تھے، جس کی وجہ سے جب 15 اگست 1947 کو ہندوستان کی آزادی کے بعد کانگریس کی قیادت میں نئی حکومت وجود میں آئی تو انہوں نے امبیڈ کر کو ملک کے پہلے وزیر قانون وانصاف کے طور پر کام کرنے کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔29 اگست 1947 کو امبیڈ کر کو آزاد ہندوستان کے لیے ایک نئے آئین کا مسودہ تیار کرنے کے لیے آئین کی مسودہ ساز کمیٹی (Drafting Committee) کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔امبیڈ کر ایک ذہین ماہر آئین تھے۔انہوں نے تقریباً 60 ممالک کے آئین کا مطالعہ کیا تھا۔امبیڈ کر کو 'آئین ہند کے باپ' کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔دستور ساز اسمبلی میں مسودہ ساز کمیٹی کے رکن ٹی ٹی کرشنا ماچاری نے کہا:

> اسپیکر صاحب، میں ایوان میں موجود ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے ڈاکٹر امبیڈ کر کو بہت توجہ سے سنا ہے۔میں اس آئین کے مسودے میں ان کے کام اور جوش و خروش سے واقف ہوں۔اسی کے ساتھ ہی میں محسوس کرتا ہوں کہ آئین کے مسودے کی تیاری کے لیے اس وقت جتنی توجہ کی ضرورت تھی وہ ڈرافٹنگ کمیٹی نے نہیں دی تھی۔ایوان شاید سات ارکان سے واقف ہے۔آپ کے ایک نامزد نے ایوان سے استعفیٰ دے دیا تھا اور اسے بدل دیا گیا تھا۔ایک مر گیا تھا اور اس کی جگہ کسی کو نہیں لیا گیا تھا۔ایک امریکہ میں تھا اور اس کا عہدہ نہیں بھرا گیا اور ایک دوسرا شخص ریاستی امور میں مصروف تھا اور ایک حد

تک صفر تھا۔ایک یا دو لوگ دہلی سے بہت دور تھے اور شاید صحت کی وجوہات نے انہیں شرکت کی اجازت نہیں دی۔ تو آخر کار وہی ہوا کہ اس آئین کو تیار کرنے کا سارا بوجھ ڈاکٹر امبیڈکر پر پڑا اور مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ان کے شکر گزار ہیں۔اس کام کو پورا کرنے کے بعد، مجھے یقین ہے کہ یہ بلاشبہ قابل ستائش ہے۔

ہندوستانی آئین کے محقق امریکی مورخ گرینولے آسٹن (Granville Austin) نے امبیڈکر کے تیار کردہ ہندوستانی آئین کا 'پہلی اور سب سے اہم سماجی دستاویز' کے طور پر ذکر کیا ہے۔ 'ہندوستان کی زیادہ تر آئینی دفعات یا تو براہ راست سماجی انقلاب کے مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے یا اس کے حصول کے لیے ضروری حالات قائم کرکے اس انقلاب کو بڑھاوا دینے کی کوشش میں بنائی گئی ہیں۔' امبیڈکر کے ذریعہ تیار کردہ آئین کا متن انفرادی شہریوں کے لیے وسیع پیمانے پر شہری آزادیوں کے لیے آئینی ضمانتیں اور تحفظات فراہم کرتا ہے جس میں مذہب کی آزادی، چھوت چھوت کا خاتمہ، اور ہر قسم کے امتیازی سلوک کی ممانعت شامل ہے۔امبیڈکر نے خواتین کے لیے وسیع تر معاشی اور سماجی حقوق کے لیے دلیلیں دیں اور درج فہرست ذاتوں (SC)، درج فہرست قبائل (ST) اور دیگر پسماندہ طبقات (OBCs) کے لیے سول سروسز، اسکولوں اور کالجوں میں ملازمتوں میں ریزرویشن کا نظام شروع کرنے کے لیے اسمبلی کی حمایت حاصل کی جو کہ مثبت کاروائی تھی۔ ہندوستانی پارلیمنٹ کے اراکین نے ان اقدامات کے ذریعے ہندوستان کے پسماندہ طبقوں کے لیے سماجی و اقتصادی تفاوت کو ختم کرنے اور مواقع کی کمی کو دور کرنے کی امید ظاہر کی۔ہندوستانی آئین کو دستور ساز اسمبلی نے 26 نومبر 1949 کو اپنایا۔اپنا کام مکمل کرنے کے بعد خطاب کرتے ہوئے امبیڈکر نے کہا:

> میں محسوس کرتا ہوں کہ آئین قابل عمل ہے، یہ لچکدار ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اتنا مضبوط بھی ہے کہ ملک کو امن اور جنگ کے وقت جوڑ کر رکھ سکے۔ درحقیقت میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر کبھی کچھ غلط ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوگی کہ ہمارا آئین خراب تھا بلکہ اس لیے ہوگا کہ اسے استعمال کرنے والا برا تھا۔

آئین ساز اسمبلی میں بحث کے دوران امبیڈکر نے ہندو کوڈ بل (The Hindu Code Bill) کو اپنانے کی سفارش کرتے ہوئے ہندوستانی معاشرے کی اصلاح کی خواہش کا اظہار کیا۔انہوں نے کہا:

> مجھے ذاتی طور پر سمجھ نہیں آتی کہ مذہب کو اتنا بڑا اور وسیع دائرہ اختیار کیوں دیا جائے کہ وہ ساری زندگی کا احاطہ کرے اور مقننہ کو اس علاقے میں تجاوزات سے روکے۔ آخر ہم اس آزادی کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ یہ آزادی ہمیں اپنے سماجی نظام کو بہتر کرنے کے لیے مل رہی ہے، جو کہ عدم مساوات، امتیازی سلوک اور دیگر چیزوں سے بھری ہوئی ہے جو ہمارے بنیادی حقوق سے متصادم ہیں۔

1951 میں جب امبیڈکر کے ہندو کوڈ بل کے مسودے کو پارلیمنٹ میں روک دیا گیا تو امبیڈکر نے کابینہ سے استعفیٰ دے دیا۔ہندو کوڈ بل کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ ہندوستانی خواتین کو بہت سے حقوق فراہم کرتا ہے۔اس مسودے میں وراثت، شادی اور معیشت کے قوانین میں صنفی مساوات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔اگرچہ وزیراعظم نہرو، کابینہ اور کچھ دوسرے کانگریسی لیڈروں نے اس کی حمایت کی، لیکن صدر راجندر

پرساداور ولبھ بھائی پٹیل سمیت ممبران پارلیمنٹ کی ایک بڑی تعداد اس کے خلاف تھی۔

20.9 امبیڈکر کی صحافت (Ambedkar's Journalism)

امبیڈکر ایک کامیاب صحافی اور موثر ایڈیٹر تھے۔ان کا خیال تھا کہ معاشرہ اخبارات کے ذریعے ترقی کرے گا۔وہ اخبار کو تحریک میں بہت اہم سمجھتے تھے۔انہوں نے استحصال شدہ اور دلت سماج میں بیداری لانے کے لیے کئی اخبارات اور پانچ رسالوں کو شائع اور ایڈٹ کیا۔اس سے ان کی دلت تحریک کو آگے بڑھانے میں کافی مدد ملی۔انہوں نے کہا کہ 'کسی بھی تحریک کو کامیاب کرنے کے لیے اخبار کی ضرورت ہوتی ہے، اگر تحریک کے پاس اخبار نہ ہو تو اس تحریک کی حالت اس پرندے کی سی ہے جس کے پر ٹوٹے ہوئے ہوں۔' ڈاکٹر امبیڈکر دلت صحافت کے ستون تھے کیونکہ وہی دلت صحافت کے پہلے ایڈیٹر، بانی اور پبلشر تھے۔ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنے تمام خطوط مراٹھی زبان میں شائع کیے کیونکہ ان کا میدان عمل مہاراشٹر کا علاقہ تھا اور وہاں کی مقبول زبان مراٹھی تھی۔اس وقت تک مہاراشٹر کے استحصال شدہ اور دلت لوگ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے، وہ صرف مراٹھی ہی سمجھ سکتے تھے۔کئی دہائیوں تک، انہوں نے پانچ مراٹھی میگزینوں کی تدوین کی، جن میں موکنائک (1920)، جنتا (1930)، بہشکرت بھارت (1927)، سمتا (1928) اور پربدھ بھارت (1956) شامل تھیں۔ان پانچ رسالوں میں امبیڈکر ملک کے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ادیب اور مفکر گنگادھر پانتاونے نے 1987 میں ہندوستان میں پہلی بار امبیڈکر کی صحافت پر پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھا۔اس میں پانتاونے امبیڈکر کے بارے میں لکھا ہے کہ 'یہ موک نائک'، 'بہشکرت بھارت' کے لوگوں کو 'پربدھ بھارت' میں لے آیا۔ باباصاحب ایک عظیم صحافی تھے۔'

موک نائک (*Mooknayak*)

31 جنوری 1920 کو، باباصاحب نے اچھوتوں پر ہونے والے مظالم کو بے نقاب کرنے کے لیے اپنا پہلا مراٹھی پندرہ روزہ اخبار 'موک نائک' شروع کیا۔امبیڈکر اور پنڈورام نندرام بھٹ کر اس کے ایڈیٹر تھے۔اس اخبار کے اوپری حصے پر سنت تکارام کے کلمات تھے۔ اس کے لیے کولہاپور کے چھترپتی شاہو مہاراج سے 25000 روپے کی مالی مدد بھی حاصل ہوئی۔ہر اعتبار سے موک نائک، خاموش دلتوں کی ہی آواز تھی، جس میں ان کے دکھوں کا اظہار کیا گیا تھا۔اس اخبار نے دلتوں میں ایک نیا شعور بیدار کیا اور انہیں اپنے حقوق کے لیے تحریک چلانے پر اکسایا۔امبیڈکر بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے گئے اور مالی مجبوریوں کی وجہ سے یہ اخبار 1923 میں بند کر دیا گیا، لیکن یہ شعور کی لہر پھیلانے کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

بہشکرت بھارت (*Bahishkrit Bharat*)

موک نائک کی بند ہونے کے بعد، تھوڑے ہی عرصے میں امبیڈکر نے 3 اپریل 1924 کو دوسرا مراٹھی ہفتہ وار 'بہشکرت بھارت' نکالا۔امبیڈکر خود اس کی تدوین کرتے تھے۔یہ اخبار بمبئی سے شائع ہوتا تھا۔اس کے ذریعے وہ اچھوتوں کے مسائل اور شکایات کو سامنے لاتے

At the house of C. Rajagopalachari, the last governor-general of India, 28 July 1948.

Holidaying in Mussoorie, during the last week of June 1949.

Handing over the draft of the Constitution of India to the chairman of the Constituent Assembly, Dr Rajendra Prasad, at the Central Hall of Parliament, 25 November 1949.

In Haridwar for a holiday, June 1949. Brahmachari (Prabhu Datt) is also in the picture.

(Source: Savita Ambedkar, *Babasaheb: My Life with Dr. Ambedkar*, Penguin Random House, New Delhi, 2022.)

تھے اور ساتھ ہی اپنے ناقدین کو جواب بھی دیتے تھے۔ اس مقالے کے ایک اداریہ میں انہوں نے لکھا کہ اگر بال گنگادھر تلک اچھوتوں میں پیدا ہوئے ہوتے تو وہ یہ نعرہ نہ لگاتے کہ 'سوراج میرا پیدائشی حق ہے' بلکہ وہ کہتے 'چھوا چھوت کا خاتمہ میرا پیدائشی حق ہے۔' اس اخبار نے بھی دلتوں کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس اخبار کے اوپری حصوں پر سنت گیانیشور کے اقوال تھے۔ اس پندرہ روزہ کے کل 34 شمارے شائع ہوئے۔ مالی مشکلات کی وجہ سے یہ نومبر 1929 میں بند ہو گیا۔

سمتا (*Samata*)

29 جون 1928 کو امبیڈکر نے اخبار 'سمتا' (مساوات) شروع کیا گیا۔ یہ اخبار، ڈاکٹر امبیڈکر کے ذریعہ سماجی اصلاح کے لیے قائم کردہ تنظیم 'سماج سمتا سنگھ' کا ترجمان تھا۔ امبیڈکر نے دیوراؤ وشنو نائک کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا تھا۔

جنتا (*Janata*)

سمتا اخبار کے بند ہونے کے بعد، امبیڈکر نے اسے 'جنتا' (عوام) کے نام سے دوبارہ شائع کیا۔ اس پندرہ روزہ کا پہلا شمارہ 24 فروری 1930 کو شائع ہوا۔ 31 اکتوبر 1930 کو یہ ہفتہ وار بن گیا۔ 1944 میں، اس میں امبیڈکر نے ایک مشہور مضمون لکھا جس کا عنوان تھا 'آمھی شاسن کرتی جمات بن نار' (ہم حکمران طبقہ بنیں گے)۔ اس اخبار کے ذریعے امبیڈکر نے دلتوں کے مسائل کو اٹھانے کا کام بحسن وخوبی انجام دیا۔ یہ اخبار فروری 1956 تک یعنی کل 26 سال تک جاری رہا۔

پربدھ بھارت (*Prabuddha Bharat*)

امبیڈکر نے پانچویں بار 4 فروری 1956 کو پربدھ بھارت کا آغاز کیا۔ انہوں نے 'جنتا' اخبار کا نام بدل کر 'پربدھ بھارت' (روشن خیال ہندوستان) رکھ دیا۔ اس اخبار کے صفحہ اول پر 'آل انڈیا دلت فیڈریشن' کا ترجمان چھپتا تھا۔ یہ پندرہ روزہ امبیڈکر کے انتقال کے بعد بند ہو گیا۔ 11 اپریل 2017 کو، مہاتما جیوتیا پھولے کے یوم پیدائش کے موقع پر، باباصاحب کے پوتے پرکاش امبیڈکر نے 'پربدھ بھارت' کو دوبارہ شروع کرنے کا اعلان کیا اور 10 مئی 2017 کو اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ ان اخبارات کے ذریعے امبیڈکر نے اپنے خیالات سے اچھوتوں کو بیدار کیا جس کی وجہ سے دلتوں کی سوچ اور زندگی میں تبدیلی آئی۔

20.10 علالت، دوسری شادی اور انتقال (Illness, Second Marriage, and Death)

امبیڈکر کی پہلی بیوی رمابائی کا انتقال 1935 میں طویل علالت کے بعد ہوا۔ 1940 کی دہائی کے آخر میں ہندوستانی آئین کے مسودے کو مکمل کرنے کے بعد، وہ نیند کی کمی کا شکار تھے، ان کی ٹانگوں میں نیوروپیتھک درد تھا اور وہ انسولین اور ہومیوپیتھک ادویات لے رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے ایک ایسے شریک حیات کی سفارش کی جو ان کے لیے بہتر کھانا پکا سکے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے طبی علم رکھتا ہو۔ وہ علاج کے لیے بمبئی گئے، اور وہاں ڈاکٹر شاردا کبیر سے ملاقات ہوئی، جن سے انہوں نے 15 اپریل 1948 کو دہلی میں اپنے گھر پر شادی کی۔

1948 سے امبیڈکر ذیابیطس (Diabetes) کے مرض میں مبتلا تھے۔ وہ جون سے اکتوبر 1954 تک بہت بیمار رہے، اس دوران وہ کمزور ہوتی بینائی کا شکار تھے۔ سیاسی مسائل سے پریشان، امبیڈکر کی صحت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور 1955 کے دوران کیے گئے مسلسل کام نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اپنے آخری نسخے، *Buddha and His Dhamma* کو مکمل کرنے کے تین دن بعد امبیڈکر 6 دسمبر 1956 کو دہلی میں اپنے گھر میں سوتے ہوئے انتقال کر گئے، تب ان کی عمر 64 سال 7 ماہ تھی۔ ان کے جسد خاکی کو دہلی سے خصوصی پرواز کے ذریعے ممبئی میں ان کے گھر راج گرہ لایا گیا۔ 7 دسمبر کو، ممبئی میں دادر چوپاٹی ساحل سمندر پر بودھ طرز میں ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں، جس میں ان کے لاکھوں حامیوں، کارکنوں اور مداحوں نے شرکت کی۔

Dr Ambedkar with Ramabai, his first wife, at Rajgraha, his residence in Mumbai. From left to right: Yeshwant (son), Dr Ambedkar, Ramabai (wife), Laxmibai (wife of his elder brother, Anand), Mukundrao (nephew) and Tobby (their dog).

Dr Ambedkar and Savita Ambedkar photographed on the day of their wedding, 15 April 1948.

(Source: Savita Ambedkar, *Babasaheb: My Life with Dr. Ambedkar*, Penguin Random House, New Delhi, 2022.)

ان کے جنازے کے وقت ان کے 10,00,000 سے زیادہ پیروکاروں نے بھدنت آنند کوسلیاین کے ذریعے ان کے جسد خاکی کو گواہ رکھ کر بدھ مت کی دیکشا لی، کیونکہ امبیڈکر نے 16 دسمبر 1956 کو ممبئی میں بدھ مت کی تبدیلی کا ایک پروگرام رکھا تھا۔ ان کی موت کے بعد ان کی دوسری بیوی سویتا امبیڈکر رہ گئیں، جو دلت بدھ تحریک میں امبیڈکر کے بعد بدھ مذہب اختیار کرنے والی پہلی شخصیت تھیں۔ بدھ مت کے پیروکار ڈاکٹر سویتا امبیڈکر جنہیں 'مائی' یا 'مائی صاحب' کے نام سے جانا جاتا ہے، کا 29 مئی 2003 کو 94 سال کی عمر میں مہرولی، نئی دہلی میں انتقال ہوا۔ امبیڈکر کے پوتے پرکاش امبیڈکر، بھاریپا بہوجن مہاسنگھ کی قیادت کرتے ہیں اور ہندوستانی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے رکن رہ چکے ہیں۔ دہلی میں 26 علی پور روڈ پر امبیڈکر کے گھر پر ایک یادگار قائم کی گئی ہے۔ امبیڈکر جینتی پر عام تعطیل ہوتی ہے۔

1990 میں، انہیں بعد از مرگ بھارت رتن سے نوازا گیا، جو بھارت کا سب سے بڑا شہری اعزاز ہے۔

Dr Ambedkar delivering the historic address 'The Buddha and Karl Marx' during the World Buddhist Conference in Kathmandu, Nepal, 20 November 1956. Seen here: Dr Ambedkar (at the mic), Maisaheb Ambedkar (behind him) and Mai's brother, Balu, to her left. Sitting: Bhante Chandramani and the King of Nepal, Mahamahendra Vikramdev.

Babasaheb's body laid out at 26 Alipore Road, New Delhi, 6 December 1956.

Yeshwant and Mai meeting after a long gap at the house of Mai's brother-in-law, Bhideskar, in Shivaji Park, through the efforts of Bawiskar (1970–71).

Protest against the effort to delete 'Riddles in Hinduism' from Volume 4 of *Babasaheb Ambedkar's Writings and Speeches*, due to be published by the then Government of Maharashtra. The picture is of 5 February 1988. Seen in the picture: Maisaheb Ambedkar, Prakash Ambedkar (to her left), Namdeo Dhasal, R.S. Gavai, Ramdas Athavale, Avinash Mahatekar, Arjun Dangale and others.

(Source: Savita Ambedkar, *Babasaheb: My Life with Dr. Ambedkar*, Penguin Random House, New Delhi, 2022.)

ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے کہا تھا کہ 'ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر ہندو سماج کے تمام جابرانہ طریقوں کے خلاف بغاوت کی علامت تھے۔' اقتصادیات میں ان کے کردار کی وجہ سے، ایک مشہور ہندوستانی ماہر اقتصادیات، نریندر جادھو نے کہا ہے کہ، 'امبیڈکر اب تک کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہندوستانی ماہر معاشیات تھے۔' 2007 میں دیے گئے ایک لیکچر میں معاشیات کے میدان میں

امبیڈکر کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے، اقتصادیات میں نوبل انعام جیتنے والے ماہر معاشیات امرتیہ سین نے کہا، 'امبیڈکر معاشیات میں میرے والد ہیں۔ وہ دلتوں اور استحصال شدہ لوگوں کے سچے اور جانے پہچانے عظیم ہیرو ہیں۔ انہیں آج تک جتنی عزت اور احترام ملا ہے وہ اس سے بڑھ کر کے مستحق ہیں۔ وہ ہندوستان میں انتہائی متنازعہ شخصیت ہیں۔ حالانکہ ان کی زندگی اور شخصیت میں کوئی قابل تنازعہ کچھ نہیں ہے۔ ان کی تنقید میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ حقیقت سے بالکل پرے ہے۔ معاشیات کے میدان میں ان کا تعاون بہت شاندار ہے۔' امریکی صدر براک اوباما نے 2010 میں ہندوستانی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے دلت رہنما ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر کو انسانی حقوق کے ایک عظیم اور قابل احترام علمبردار اور ہندوستان کے آئین کے مرکزی مصنف کے طور پر یاد کیا تھا۔

20.11 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر ایک عظیم ہندوستانی ماہر اقتصادیات، سیاست دان اور سماجی مصلح تھے۔ انہوں نے 'دلت بدھ تحریک' کو متاثر کیا اور اچھوتوں (دلتوں) سے سماجی بھید بھاؤ کے خلاف مہم چلائی۔ مزید برآں انہوں نے مزدوروں، کسانوں اور خواتین کے حقوق کے لیے بھی آواز بلند کی۔ وہ آزاد ہندوستان کے پہلے 'وزیر برائے قانون وانصاف' اور ہندوستانی آئین کے موسس اور جمہوریہ ہند کے معماروں میں سے ایک تھے۔ امبیڈکر بے پناہ صلاحیتوں کے حامل طالب علم تھے۔ انہوں نے کولمبیا یونیورسٹی اور لندن اسکول آف اکنامکس دونوں سے معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں اور قانون، معاشیات اور سیاسیات میں بھی تحقیقی کام انجام دیے۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے ابتدائی حصے میں وہ معاشیات کے پروفیسر رہے اور کچھ دن وکالت کی بھی مشق کی اور بعد کی زندگی کا زیادہ تر حصہ سیاسی سرگرمیوں میں گزارا۔ بعد ازاں امبیڈکر ہندوستان کی آزادی کی مہم اور اس سے متعلق مباحثوں میں شامل ہوگئے۔ قومی تحریک کے عروج کے دوران انہوں نے ہمیشہ ملک کی آزادی سے پہلے دلتوں اور پچھڑے طبقوں کو استحصال سے آزادی دلانے پر زور دیا۔ ان کے مطابق ایسی آزادی کا کوئی فائدہ نہیں جس میں مذہبی اور سماجی بندشوں سے چھٹکارہ نہ مل سکے۔ وہ چاہتے تھے کہ ذات پات کے نظام، اور اس سے منسلک تمام برائیوں کو قانونی طور پر ختم کر دیا جائے جس پر ابتدا میں کانگریسی قیادت تذبذب کا شکار رہی۔ دلتوں کو علاحدہ حلقہ انتخاب کے سلسلے میں مہاتما گاندھی سے ان کے شدید اختلافات ہوئے لیکن بعد میں انہوں نے مرکزی اور صوبائی اسمبلی میں مخصوص نشستوں پر دلتوں کو ریزرویشن ملنے پر علاحدہ حلقہ انتخاب کا مطالبہ ترک کر دیا۔ امبیڈکر نے متعدد کتابیں اور رسالے شائع کر کے دلتوں کے سیاسی حقوق اور سماجی آزادی کی وکالت کی۔ ان میں 'اینی ہلیشن آف کاسٹ'، اور موک نایک وغیرہ خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ دلتوں کے مندروں میں داخلے کے لیے بھی انہوں نے مہم چلائی، لیکن وہ اس سلسلے میں ناکام رہے۔ اس سے دلبرداشتہ ہو کر انہوں نے اپنے پیروکاروں کو ہندو مذہب چھوڑ کر کسی بھی مذہب کو اختیار کرنے کی اجازت دی۔ خود امبیڈکر نے 1951 میں بدھ مذہب اختیار کر لیا۔ آزادی کے بعد وہ ہندوستانی آئین کی مسودہ ساز کمیٹی کے چیرمین بنائے گئے۔ ان کی نگرانی میں بہت سی سماجی اصلاحات، آئین میں شامل کی گئیں اور کافی لگن، محنت اور وقت صرف کر کے ہمارا آئین تیار ہوا۔ امبیڈکر مہاراشٹر سے ہندوستانی پارلیامنٹ کے ایوان بالا یعنی راجیہ سبھا کے ممبر بھی رہے۔ 1990 میں، انہیں بعد از مرگ بھارت رتن سے نوازا گیا، جو ہندوستان کا سب سے بڑا شہری اعزاز ہے۔ ان کا یوم پیدائش 14 اپریل کو ہندوستان سمیت دنیا بھر میں امبیڈکر جینتی کے طور پر منایا جاتا ہے۔

20.12 کلیدی الفاظ (Keywords)

دلت بدھ تحریک	:	امبیڈکر کے ذریعے چلائی گئی ایک تحریک جس میں دلتوں نے ہندو مذہب کی پابندیوں سے تنگ آکر نویان بدھ مت میں پناہ لی۔
مہو(Mhow)شہر	:	ڈاکٹرامبیڈکر نگر، جس کا سابقہ نام مہو تھا،ہندوستان کے مدھیہ پردیش کے اندور ضلع میں واقع ایک شہر ہے۔ یہاں ڈاکٹر بھیم راؤامبیڈکر کی پیدائش ہوئی اور یہ ایک تاریخی چھاونی بھی ہے۔
دیورکھے برہمن	:	دیورکھے برہمن مہاراشٹری برہمنوں کی پانچ ذیلی ذاتوں میں سے ایک ہیں۔
تیرتھ یاترا	:	مذہبی مقامات کا سفر

20.13 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

20.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. آزاد ہندوستان کے پہلے 'وزیر برائے قانون وانصاف' تھے؟
2. امبیڈکر کہاں پیدا ہوئے؟
3. امبیڈکر کی والدہ کا نام کیا تھا؟
4. دیورکھے برہمن کون ہیں؟
5. امبیڈکر کو کس ریاست سے اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفہ ملا؟
6. کس سال امبیڈکر لندن گئے؟
7. 1927 میں امبیڈکر نے کس برہمنی متن کی عوامی طور پر مذمت کی؟
8. امبیڈکر کی پی ایچ ڈی کا موضوع کیا تھا؟
9. مہد شہر میں ستیہ گرہ کیوں کیا گیا؟
10. مرن برت رکھنے کا اعلان کس نے کیا؟

20.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. امبیڈکر کی تعلیم پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. منواسمرتی نذرآتش کرنے پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. کالارام مندر ستیہ گرہ پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. پونا معاہدہ پر ایک نوٹ لکھیے۔

5. امبیڈکر اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی پر ایک نوٹ لکھیے۔

20.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. امبیڈکر کی چھوا چھوت کے خلاف جدوجہد پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. امبیڈکر کے مذہب کی تبدیلی کا اعلان پر تفصیلی تبصرہ کیجیے۔
3. امبیڈکر کی سیاسی زندگی پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

20.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ambedkar, Savita, *Babasaheb*: *My Life with Dr. Ambedkar* (trans. Nadeem Khan), Penguin/Vintage, Gurugram, 2022.
2. Gopal, Ashok, *A Part Apart*: *The Life and Thought of B.R. Ambedkar*, Navayana, New Delhi, 2023.
3. Jaffrelot, Christophe, *Analysing and Fighting* Caste: Dr. *Ambedkar and Untouchability*, Permanent Black, Ranikhet, 2005.
4. Mani, Braj Ranjan, *De-brahmanising History*: *Dominance and Resistance in Indian Society*, Manohar, New Delhi, 2005.
5. Michael, S.M. ed., *Dalits in Modern India*: *Visions and Values*, Sage, New Delhi, 2007 (first pub. in 1999).
6. Omvedt, Gail, *Ambedkar*: *Towards an Enlightened India*, Penguin Books, New Delhi, 2008 (first pub. in 2004).
7. _________, *Dalit Visions*: *The Anti-Caste Movement and the Construction of an Indian Identity*, Orient Longman, New Delhi, 2006 (first pub. in 1995).
8. _________, *Dalits and the Democratic Revolution*: *Dr. Ambedkar and the Dalit Movement in Colonial India*, Sage, New Delhi, 1994.
9. Rathore, Aakash Singh, *Becoming Babasaheb*: *The Life and Times of Bhimrao Ramji Ambedkar, Birth to Mahad,* (*1891 – 1929*), Harper Collins, New Delhi, 2023.
10. Roy, Arundhati, *The Doctor and the Saint*: *The Ambedkar–Gandhi Debate: Caste, Race and* The Annihilation of Caste*,* Penguin, Gurgaon, 2019 (first pub. in 2014).
11. Syama Sundar, Unnamati ed., *No Laughing Matter*: *The Ambedkar Cartoons*, *1932–1956*, Navayana, New Delhi, 2020 (first pub. in 2019)
12. Teltumbde, Anand, *Mahad*: *The Making of the First Dalit Revolt*, Aakar, New Delhi, 2016.
13. Zelliot, Eleanor, *Dr. Babasaheb Ambedkar and the Untouchable Movement*, Bluemoon Books, New Delhi, 2004.
14. Zelliot, Eleanor, *Ambedkar's World*: *The Making of Babasaheb and the Dalit Movement*, Navayana, New Delhi, 2013 (first pub. in 2004).
15. Zelliot, Eleanor, *From Untouchable to Dalit*: *Essays on the Ambedkar Movement*, Manohar, New Delhi, 2005.

اکائی 21۔ قومی تحریک اور خواتین

(National Movement and Women)

اکائی کے اجزاء

21.0 تمہید

21.1 مقاصد

21.2 ہندوستانی قومی تحریک میں خواتین کی شمولیت

21.3 گاندھی سے پہلے قومی تحریک

21.4 خواتین اور گاندھی کی آمد

21.5 گاندھی اور خواتین

21.6 تحریکِ آزادی میں خواتین: کچھ تضادات

21.7 ہندوستانی قومی تحریک اور خواتین

21.8 ہندوستان چھوڑو تحریک اور خواتین

21.9 انقلاب پسند قوم پرست خواتین: شرکت کا مفہوم

21.10 آزاد ہند فوج اور رانی جھانسی رجیمنٹ

21.11 اکتسابی نتائج

21.12 کلیدی الفاظ

21.13 نمونہ امتحانی سوالات

21.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد

21.0 تمہید (Introduction)

خواتین کے مسئلہ کو نوآبادیاتی مباحثہ (Colonial Discourse) میں ایک خاص جگہ دی گئی تھی کیونکہ یہ انگریزوں کے لیے ہندوستان پر اپنے قبضے کو جائز ٹھرانے اور اپنی مغربی تہذیب کی اخلاقی برتری کو ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔اس ضمن میں ہندوستان میں ستی، صغرسنی، کثرت ازدواجی، بیواوں کی حالت، عورتوں کی ناخواندگی، پردہ اور حفظان صحت جیسے مسائل انگریزوں نے بحث کے موضوع بنائے تاکہ ہندوستانیوں کی تہذیبی کم تری کو ثابت کیا جائے۔ اس نوآبادیاتی تہذیبی تصادم کے نتیجے میں مقامی ہندوستانی دانشوروں نے بھی عورتوں کے مسائل پر اپنا ردعمل ظاہر کیا اور ہندوستانی معاشرے میں (بالخصوص خواتین کے حوالے سے) تبدیلی کی وکالت کی۔اس کے نتیجے میں انیسویں صدی میں مرد مصلحین نے عورتوں کے حقوق کے لیے مختلف اصلاحی تحریکیں شروع کیں۔ تاہم بعد میں خواتین نے بھی ان اصلاحی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد ہندوستان میں خواتین نے قومی تحریک میں حصہ لیا، تحریکِ آزادی کے لیے جدوجہد کی اور اپنے سیاسی حقوق کے لیے بھی آواز بلند کی۔ بیسویں صدی کے شروعات میں خواتین بڑی تعداد میں ہندوستان کی تحریک آزادی میں مردوں کے شانہ بشانہ حصہ لینے لگیں۔

21.1 مقاصد(Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ جان سکیں گے کہ

- خواتین نے ہندوستان کی آزادی میں کیا رول ادا کیا۔
- خواتین کی شرکت ہندوستان کی تحریک آزادی میں کیسے ممکن ہوئی۔
- ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں حصہ لیکر خواتین کے اپنے تجربات اور احساسات کیا تھے۔

21.2 ہندوستانی قومی تحریک میں عورتوں کی شمولیت

(Participation of Women in the Indian National Movement)

ہندوستان کی قومی تحریک میں خواتین کی شرکت کے موضوع پر تاریخ داں اس جواب کے لیے عموماً گاندھیائی تحریک یا دور پر زیادہ توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ گاندھی کے آنے سے قبل خواتین یا اُن کے مسائل کو قومی تحریک میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ حساس سماجی مسئلے جیسے ذات پات، عورتوں کی سماجی حالت اور ان سے جڑے ہوئے مسئلے، ابتدا میں انڈین نیشنل کانگریس میں زیر بحث نہیں لائے گئے تھے جو کہ اس سیاسی جماعت کی بڑی خامی تھی۔ اسی وجہ سے جوڈتھ براؤن نے گاندھی سے قبل ہندوستانی قومی تحریک کی نوعیت کو 'عوام مخالف طبقات کی نمائندگی کرنے والی تحریک' کے طور پر بیان کیا ہے۔ لہٰذا ہندوستانی معاشرے کی اصلاح کے لیے ذات پات اور خواتین کی ماتحتی جیسے حساس سماجی مسائل پر غور و فکر کرنے کا سہرا گاندھی کو جاتا ہے۔ نہ صرف انہوں نے ایسے اہم مسائل پر بات کی بلکہ کسانوں، مزدوروں اور دیگر عوامی طبقوں کو متحرک کیا اور انہیں قومی تحریک کے ساتھ فعال طور پر جوڑ دیا۔

21.3 گاندھی سے پہلے قومی تحریک (National Movement before Gandhi)

ہندوستان پر اپنی سامراجیت قائم کرنے میں برطانوی حکمرانوں کو مقامی لوگوں کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ حالانکہ اس کے باوجود بھی برطانوی دو سو سال تک ہندوستان پر حکومت کرنے میں کامیاب ہوئے۔ بغاوتوں کی شکل میں یہ مزاحمت زیادہ تر غیر منظم اور علاقائی اور سماجی شمولیت کے اعتبار سے محدود تھیں جس کی وجہ سے یہ برطانوی سامراجیت کا خاتمہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو پائی۔ ان بغاوتوں میں سب سے بڑی بغات 1857 کی تھی جس نے برطانوی سامراجیت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی بغاوت تھی جس میں ہندوستانی سماج کے تقریباً ہر طبقے نے حصہ لیا۔ خواہ وہ کسان ہو یا سپاہی، تالقدار ہو یا شاہی حکمراں، ہندو ہو یا مسلم، یا دونوں مذاہب سے وابستہ خواتین ہو۔ وی ڈی ساورکر نے اس بغاوت کو ''ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی'' قرار دیا ہے۔ تاہم اس کے علاقے کے مخصوص پھیلاؤ اور رہنماوں کے درمیان اتفاق کی عدم موجودگی کی وجہ سے، تھامس میٹکالف (Thomas R. Metcalf) نے اس بغاوت کی نوعیت کو ''قومی بغاوت سے کم اور فوجی بغاوت سے زیادہ'' قرار دیا ہے۔ اس بغاوت میں متعدد خواتین نے بھی حصہ لیا لیکن تاریخ دانوں کی تحقیق رانی لکشمی بائی اور بیگم حضرت محل تک ہی محدود رہی۔ متعدد آرکائیو ماخذات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ خواتین نے بھی اس بغاوت میں حصہ لیا تھا لیکن ان کے رول کی مکمل تحقیق یا چھان بین ابھی تک نہیں کی گئی ہیں جس کی اشد ضرورت ہے۔ حال ہی میں چارو گپتا اور دیگر تاریخ دانوں نے 1857 کی بغاوت میں دلت خواتین کی شرکت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

اگرچہ اس بغاوت کی اپنی خامیاں تھی اور اسے برطانوی ریاست نے پر تشدد طریقے سے کچل دیا تھا لیکن یہ ہندوستانی عوام میں قومی شعور پیدا کرنے میں کامیاب رہی۔ بغاوت کے فوراً بعد ہندوستان کی طرف سے سیاسی انجمنیں قائم کرنے کی مختلف کوششیں کی گئیں۔ لیکن اس ضمن میں صرف انڈین نیشنل کانگریس جو 1885 میں قائم کی گئی ایک قومی تنظیم بن پائی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے بانی ارکان مغربی تعلیم یافتہ طبقہ اور اعلیٰ ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طبقے نے ہندوستان میں برطانوی نوآبادیت کے معاشی اثرات کے نتیجے میں دولت کی نکاسی، غربت اور عدم صنعتکاری وغیرہ جیسے مسائل کو اُجاگر کیا۔ تاہم یہ طبقہ عوام کو متحرک کرنے میں ناکام رہا۔ یہ پارٹی اعتدال پسند اشراف اور انتہاپسندوں کے اندرونی اختلافات کی وجہ سے ہندوستانی معاشرے کے مختلف طبقات کی پوری حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہی۔

اس کے باوجود بھی 1889 میں دس خواتین نے انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ جلسے میں شرکت کی۔ جرال ڈائین فوربس (Geraldine Forbes) کی معلومات کے مطابق سورنا کماری گھوسل (Swarnakumari Ghosal) اور کدم بنی گانگولی (Kadambini Ganguly) جو پیشے سے ڈاکٹر تھیں' نے مندوبین کے طور پر 1890 کے کانگریس اجلاس میں شمولیت اختیار کی تھی۔ 1905 میں جب برطانوی حکومت نے بنگال کو تقسیم کرنے کا اعلان کر دیا تو مردوں کے ساتھ عورتوں نے بھی اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا اور سودیشی تحریک شروع کی۔ اسی دوران بنگال میں جوگنتر (*Jugantar*) نامی پارٹی قائم ہوئی جس کا مقصد تشدد کے ذریعے انگریزی سامراجیت کا خاتمہ کرنا تھا۔ اس کرانتی کاری گروہ نے مختلف طریقوں سے اپنے فرائض انجام دیے۔ انہوں نے کبھی

ہتھیار چھپائے، کبھی باغی مردوں کو پناہ دی، اور کبھی مردوں کو برطانیہ کے خلاف لڑنے کے لیے آمادہ کیا۔

21.4 خواتین اور گاندھی کی آمد (Women and the Advent of Gandhi)

گاندھی (1948–1869) کی آمد سے ہندوستان کی تحریک آزادی کو ایک نئی قوت ملی جس کی بنیاد عوام کی براہ راست شمولیت پر تھی۔ اس موضوع پر تاریخ دانوں میں کافی حد تک اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ گاندھی نے عام لوگوں (کسانوں، مزدوروں، نچلی ذاتوں، مسلمانوں اور خواتین طبقوں) کے لیے ہندوستانی قومی تحریک کے دروازے کھول دیئے۔ مزید انہوں نے مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہونے پر آمادہ کر کے ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دیا۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کیے کہ جن کی وجہ سے آزادیٔ ہند کی تحریک میں عورتوں کی شمولیت میں آسانی پیدا ہو گئی۔ 1915 میں گاندھی جب افریقہ سے وطن واپس لوٹے تو وہ پہلے ہی ہندوستان میں مقبول ہو گیے تھے۔ افریقہ سے واپسی کے فوراً بعد گاندھی نے بمبئی کی کچھ اصلاحی انجمنوں کے ارکان کے ساتھ ملاقات کی جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ اس ملاقات کے دوران گاندھی جی نے کہا کہ ہندوستان کو خواتین رہنماؤں جیسے سیتا اور دروپدی کی ضرورت ہے جو دل کی سچی، مظبوط اور صبر تحمل والی ہو۔ 1919 میں رولٹ قانون پاس ہونے کے خلاف گاندھی نے مزاحمتی طور پر ستیہ گرہ شروع کیا اور خواتین کو ستیہ گرہ میں شامل ہونے کی اپیل کی۔ 13 اپریل 1919 کے جلیاں والا باغ سانحہ کے فوراً بعد گاندھی جی نے اپنی تحریک کو واپس لیا مگر جرال ڈائین فوربس کے مطابق گاندھی نے عورتوں کو یہ ہدایت پہلے ہی دے دی تھی کہ وہ بیرونی اشیاء کا بائیکاٹ کریں، کیونکہ چرخہ کاتنے سے ہی عدم صنعت کاری اور غربت جیسے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ 1920 میں گاندھی کی وجہ سے خواتین کی ایک بڑی تعداد نے عدم تعاون تحریک میں شرکت کی۔ مشہور کانگریس رہنما سی۔ آر۔ داس کی بیوی بسنتی دیوی، بہن ارمیلا دیوی اور بھتیجی سُنیتا دیوی نے بھی اس تحریک میں شرکت کی۔ جب یہ خواتین گرفتار کی گئیں تو عوام کی ایک بڑی بھیڑ نے پولیس تھانے کا گھیراؤ کیا جس کے فوراً بعد ان کو رہا کر دیا گیا۔ اسی عدم تعاون تحریک کے دوران احمد آباد میں انڈین لیڈیز کانفرس (Indian Ladies' Conference) کے اجلاس میں خلافت تحریک کے رہنما مولانا شوکت علی اور محمد علی کی والدہ عبادی بانو بیگم نے تقریباً چھ ہزار خواتین کے ہجوم سے خطاب کیا اور ان کو کانگریس میں شامل ہونے کی درخواست کی۔ 32-1930 کی سول نافرمانی تحریک میں بھی خواتین کی ایک بڑی تعداد نے شمولیت اختیار کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابتداء میں گاندھی نے خواتین کی شرکت کو سول نافرمانی تحریک کے لیے مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ ان کو اس بات کا خدشہ تھا کہ عورتوں کو آگے کر کے برطانوی حکومت ہندوستانی مردوں کو بزدل ہونے کا طعنہ دے سکتے ہیں۔ مگر ڈانڈی مارچ کے دوران ایک اندازے کے مطابق تقریباً دس ہزار خواتین گاندھی کو سُننے کے لیے جمع ہوئیں۔

21.5 گاندھی اور خواتین (Gandhi and Women)

اگرچہ ہمارے پاس شواہد موجود ہیں کہ خواتین نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں ابتدا سے ہی حصّہ لیا تھا مگر گاندھی کے آنے سے پہلے ان خواتین کی تعداد بہت کم تھی۔ خواتین کو قومی تحریک کا حصہ بنانے کے لیے گاندھی نے ایک ایسا پروگرام وضع کیا جس سے ان کی

شمولیت یقینی ہو۔ گاندھی نے شعوری طور پر خواتین کی ذاتی زندگی کو قومی آزادی کی جدوجہد سے جوڑ دیا۔ ان کے لیے پروگرام اس طرح وضع کیا گیا کہ خواتین گھر میں رہ کر ہی قومی تحریک میں حصّہ لے سکیں۔ اس سوچ کے نتیجے میں خواتین کی ایک بڑی تعداد نے قومی تحریک میں شرکت کی جس کی مثال 1920 کی عدم تعاون تحریک، 1930 کے نمک ستیہ گرہ اور 1942 کی ہندوستان چھوڑو تحریک کے طور پر دی جاسکتی ہے جس میں خواتین نے مردوں کے شانہ بشانہ انگریزی حکومت کی مخالفت کی۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گاندھی نے کیوں اور کس طرح خواتین کو قومی تحریک میں شامل کروایا۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ گاندھی نے خواتین کو قومی تحریک میں کس قسم کا رول یا ذمہ داری دی تھی اور ان کی شرکت کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔

گاندھی نے سب سے پہلے خواتین کو چرخہ کاتنے کی تلقین کی۔ انہوں نے چرخہ کاتنے پر اتنا زور دیا کہ بعد میں چرخہ ایک قومی علامت کی نشانی بن گیا جس کی مثال ہندوستان کے قومی پرچم کے طور پر دی جاسکتی ہے۔ ہندوستان کی دستکاری، خاص طور پر کپڑے کی صنعت نوآبادیاتی اثرات کی وجہ سے زوال پذیر ہوئی جس سے لاکھوں مرد اور خواتین اپنے ذریعۂ معاش سے محروم ہوگئے۔ اس پس منظر میں کھادی کو خود انحصاری اور تخلیق نو کی علامت کے طور پر دیکھا جانے لگا اور ایسا مانا جاتا تھا کہ چرخہ بہت سے مسائل کا حل فراہم کرتا ہے۔ گاندھی نے ہر گھر میں چرخہ کاتنے اور کھادی کا کپڑا پہننے پر زور دیا اور دور دراز دیہاتی علاقوں میں قوم پرستی اور آزادی کی روح پھونکنے کے لیے چرخے کاتنے اور کھادی کے استعمال کو قومی خدمت کے جذبے سے تشبیہ دی۔ چرخہ کاتنے اور کھادی پہننے کے علاوہ گاندھی نے شراب اور غیر ملکی چیزوں کا بائیکاٹ کرنے کی ذمہ داری خواتین کو سونپ دی۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے خواتین کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ ان دُکانوں کے سامنے دھرنا دیں جو بیرونی چیزیں فروخت کر رہے ہو۔

گاندھی عدم تشدد (Non-violence) پالیسی پر یقین رکھتے تھے اور اسی ہتھیار کے ذریعے ہندوستان کو آزادی دلانا چاہتے تھے حالانکہ اس نظریہ کی وجہ سے بہت سارے قد آور رہنما ان کے مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی نے چوری چورہ سانحہ (فروری 1922) کے فوراً بعد عدم تعاون تحریک کو واپس لیا جس کی ان کے ہم عصر قائدین نے ان کی تقلید بھی کی۔ گاندھی کی قیادت میں شروع کی گئی تحریکوں میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ صرف عدم تشدد کے ذریعے ہی سیاسی مقاصد حاصل کیے جائیں اور جب بھی تشدد جیسے حالات پیدا ہوتے تھے تب گاندھی تحریک کو روک دیتے تھے۔ مدوکشور کے مطابق تحریک کو عدم تشدد کے راستے پر رکھنے کے لیے گاندھی نے عورتوں کی شرکت کو یقینی بنایا۔ گاندھی کی نظر میں قومی تحریک کی کامیابی کے لیے دستیاب بہترین آپشن (option) خواتین تھیں کیونکہ فطری طور پر خواتین غیر فعال اور غیر متشدد ہوا کرتی ہیں۔ اگر یہ رول مردوں کو سونپا جاتا تو اُن کی فعال فطرت کی وجہ سے تشدد کے امکانات زیادہ پیدا ہوتے۔ مزید یہ کہ گاندھی خواتین کی نفسیات سے قریبی واقفیت رکھتے تھے کیونکہ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ شراب سے عورتوں کی ازدواجی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ گاندھی نے خواتین کو جان بوجھ کر قومی تحریک میں اس طرح کے کام ان کے ذمہ رکھے جو ذاتی طور پر ان سے جُڑے ہوئے تھے تاکہ جذباتی طور پر ان کی شرکت کو یقینی بنایا جائے۔ جہاں تک ڈانڈی مارچ 1930 کا تعلق ہے، گاندھی نے نمک ستیہ گرہ شروع کرنے اور نمک بنانے والے نوآبادیاتی قوانین کی خلاف ورزی کے لیے خواتین کو شامل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ گاندھی کو پنڈت نہرو

سمیت کئی رہنماؤں نے نمک کے اس معمولی مسئلے کے لیے تحریک نہ چلانے کا مشورہ دیا تھا۔ تاہم گاندھی بہت دور اندیش رہنما تھے اور انہوں نے نمک کے مسئلہ کو اٹھایا جو خواتین کی گھریلوں زندگی کی اہم شئے تھی۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ گاندھی نے نمک کا مسئلہ اٹھا کر باورچی خانہ میں انقلاب برپا کیا۔

21.6 تحریکِ آزادی میں خواتین: کچھ تضادات

(Women in the Freedom Struggle: Some Contradictions)

گاندھی جی نے چرخہ کاتنے، کھادی کا استعمال کرنے، نئے ممبران کا اندراج کرنے، دھرنا دینے، اچھوت پن کا خاتمہ کرنے اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے خواتین کا انتخاب کیا اور ان کو اس قومی زمہ داری کے لیے اپنی تحریک میں ایک خاص جگہ دے دی۔ کانگریس میں زیادہ تر خواتین کی شمولیت اسی کام تک ہی محدود رہی۔ حالانکہ کچھ ممتاز خواتین نے اعلیٰ سطح پر کانگریس کے معاملات کو سنبھالا لیکن کانگریس کی سرگرمیوں میں یہ شمولیت صرف چند نمایاں خواتین جیسے سروجنی نائیڈو، کملادیوی اور ہنسامہتا تک ہی محدود رہی۔ گاندھی نے معاشی وسائل پر آزادانہ اختیار کو خواتین کی آزادی کے لیے ضروری نہیں سمجھا۔ کچھ حد تک گاندھی نے دیہی علاقوں کی خواتین کی بے روزگاری کے لیے کھادی کاتنے کی وکالت کی لیکن کھادی کا کپڑا زیادہ مہنگا اور صنعتی کپڑے کے مقابلے میں زیادہ پائیدار نہیں تھا جس سے عورتوں کی اقتصادی حالت میں کوئی زیادہ بہتری نہیں ہوئی۔ مگر بائیکاٹ کی صورت میں ہندوستانی بازاروں سے برطانوی کپڑے کے غائب ہونے کا مطلب عورتوں کی فتح نہیں تھی بلکہ ہندوستان کی ملکیت والی کپڑا صنعتوں کی جیت تھی۔ گاندھی کے تفویض کردہ اس تنگ اور معاون کردار کے نتیجے میں سرلا دیوی چودھرانی (1872–1945) نے کانگریس پر الزام لگایا ہے کہ یہ جماعت عورتوں کو برطانوی سامراجیت کے خلاف قانون توڑنے کے لیے استعمال کر رہی ہے نہ کہ قانون بنانے کے لیے ('Congress wanted them as law breakers only, but not law makers.')۔

21.7 ہندوستانی قومی تحریک اور خواتین (Women and the Indian National Movement)

مانینی چٹرجی (Manini Chatterjee) کی رائے میں ہندوستان کی تحریک آزادی میں 1930 کا سال خواتین کی شرکت کے اعتبار سے ایک اہم سنگ میل تھا۔ اس سال اور اس کے بعد آنے والے سالوں میں خواتین کی ایک بڑی تعداد نے آزادی کی لڑائی میں اپنی ہمت دکھائی۔ ایک طرف 1920 سے ہی خواتین نے گاندھی کا ساتھ دینا شروع کیا اور دوسری طرف خاص کر بنگال میں خواتین انقلاب پسند تحریکوں میں شامل ہوتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ کوئی یکایک تبدیلی نہیں تھی بلکہ بیسوی صدی کے ابتدا سے ہی عورتوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ بیسوی صدی کے اوائل میں ہی نسوانی انجمنیں قائم ہونے لگی۔ 1910 مین سرلا دیوی گھوسل نے 'بھارت ستری منڈل' کلکتہ میں قائم کی۔ 1917 میں "وومن انڈین ایسوسیشن" اینی بیسنت کی قیادت میں قائم ہوئی اور 1917 میں وہ کانگرس کے کلکتہ اجلاس کی صدر منتخب ہوئی۔ اس اجلاس میں سروجنی نائیڈو اور بی اماں (محمد علی اور شوکت علی کی والدہ) نے بھی شرکت کی۔ سال 1917 ہی

میں سروجنی نائیڈو کی قیادت میں خواتین کی ایک وفد نے مون ٹیگ اور چیمس فورڈ (Montague Chelmsford) سے خواتین کی اصلاح اور حقوق حاصل کرنے کے لیے برطانوی حکومت کے تعاون کی درخواست کی۔

گاندھی نے جب عدم تعاون کی تحریک 1920 میں چلائی تو پہلی بار مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والی خواتین نے اس تحریک میں شرکت کی۔اس تحریک کے دوران سروجنی نائیڈو نے مانیبن پٹیل (Maniben Patel) کے ساتھ "راشٹریہ ستری سبھا" قائم کی۔ سی۔آر۔داس نے 1921 میں ''ناری کرمامنڈل'' کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد خواتین کی تربیت کرنا تھا تاکہ وہ اپنے قومی فرائض کو انجام دے سکیں۔ کملا دیوی چٹوپادھیائے (Kamaladevi Chattopadhyaya) نے 1920 میں کانگرس کی رکنیت اختیار کی۔ 1925 میں سروجنی نائیڈو کانگریس کی صدر منتخب ہوئی۔1926 میں مار گریٹ کزنز(Margaret Cousins) نے The All-India Women's Conference کو قائم کیا۔

خواتین گاندھی جی کی تحریک کے علاوہ انقلاب پسند تحریک کے صفوں میں بھی شامل ہوئیں۔سب سے پہلے سرلا دیوی گھوسل نے انوشیلان اور جوگنتر (Anushilan, and Jugantar) کرانتی کاری تنظیموں کے ساتھ خفیہ طور پر منسلک رہی۔اسی طرح 1907 میں جرمنی میں Madam Bhikaji Cama نے "انڈین سوشلسٹ کانگرس" میں ہندوستانی کے قومی پرچم لہرایا۔وہ اس گروپ سے بھی منسلک تھی جس نے 1907 میں جنیوا میں "وندے ماترم" رسالے کی اشاعت کی۔یہ لوگ مسلسل جدوجہد کے ذریعے برطانوی سامراجیت کے خاتمہ کی وکالت کر رہے تھے۔اس بحث سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ 1930 سے پہلے ہی خواتین ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں مردوں کے شانہ بشانہ شامل ہو رہی تھیں۔مانینی چٹرجی کے مطابق 1930 کا سال خواتین کی شرکت کے اعتبار سے دو چیزوں کے لیے اہم تھا۔ایک تو اس سال خواتین کثیر تعداد میں آزادی کی تحریک بالخصوص گاندھی کے زیر اثر شروع کی گئی عوامی تحریک میں شریک ہوئیں۔حالانکہ 1930 سے پہلے بھی خواتین آزادی کی تحریک میں شامل ہوئی تھیں مگر ان کی تعداد کم ہونے کے علاوہ ان کا تعلق ایسے گھرانوں سے تھا جن کے مرد کانگرس سے جڑے تھے اور اسی وجہ سے وہ تحریک میں شامل ہوئیں۔ دوسرا اسی سال بنگال کے علاقے میں مسلح انقلاب پسندوں نے انگریزی سامراجیت کے خلاف اپنی مزاحمت میں تیزی لائی جس کی مثال 1930 کی "چٹاگونگ اسلحہ خانے پر حملے (Chittagong Armoury Raid) کے طور پر دی جاسکتی ہے۔اس پر تشدد تحریک میں بھی خواتین نے پہلی بار مساوی اعتبار سے مردوں کے ہمراہ برطانوی سامراجیت کے خلاف لڑائی میں شرکت کیں۔مانینی چٹرجی کا کہنا ہے کہ اگرچہ گاندھی نے عورتوں کو عوامی طور پر اپنی تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کی مگر عسکریت پسند تنظیموں نے خواتین کو برابری کی شرکت کا موقع دیا۔

21.8 ہندوستان چھوڑو تحریک اور خواتین (Women in the Quit India Movement)

1942 ہندوستان چھوڑو تحریک میں بھی خواتین نے اہم رول ادا کیا۔جب برطانوی حکومت کی طرف سے تقریباً سارے بڑے کانگریس رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا تو خواتین نے خفیہ طریقے سے تحریک کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا۔اُوشامہتہ نے خفیہ ریڈیو قائم کیا

جس کے ذریعے عوام کو تحریک کے بارے میں ہدایات دی جارہی تھیں۔اسی طرح کانگریس سوشلسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والی ارونا آصف علی نے لوگوں کو متحرک کرنے کے لیے کوششیں کی۔ سچیتا کرپلانی (Sucheta Kripalani) نے لوگوں کو عدم تشدد کے ذریعے آزادی حاصل کرنے کی تلقین کی۔

21.9 انقلاب پسند قوم پرست خواتین: شرکت کا مفہوم

(Revolutionary Nationalist Women: Meaning of their Participation)

جہاں تک ہندوستانی قومی تحریک میں خواتین کی شرکت کا تعلق ہے اس معاملے میں زیادہ تر تاریخ دانوں کی تحقیقی توجہ گاندھیائی دور پر رہی ہے۔اکثر تاریخ داں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ گاندھی کی کوششوں کی وجہ سے ہی ہندوستانی قومی تحریک میں خواتین اور سماج کے دیگر طبقوں کی شرکت ممکن ہو پائی۔ قوم پرست تاریخ نگاری میں وہ تحریکیں جو گاندھی کے نظریہ عدم تشدد پر یقین نہیں رکھتی تھی اور برطانوی حکومت کے خلاف براہ راست نہیں لڑتی تھی کم توجہ حاصل کر پائی۔ حالانکہ ہمارے پاس کثیر تعداد میں مثالیں موجود ہیں جس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ گاندھی کی تحریک کے علاوہ عورتوں نے نوآبادیاتی ہندوستان میں کچھ انقلابی اور پر تشدد تحریکوں میں بھی حصہ لیا۔اس کی بہترین مثال بنگال سے دی جاسکتی ہے جہاں خواتین نے 1930 کی دہائی میں انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ 1930 میں بنگال کے نامور کرانتی کاری سوریہ سین (1894–1934) کی قیادت میں 66 لوگوں پر مشتمل پلٹن نے چٹاگونگ اسلحہ خانے پر حملہ (Chittagong Armory Raid) کیا۔اس حملے میں ان کے ساتھ دو خواتین کلپنا دتہ (1913–45) اور پریتی لتا وڈیڈار (1911–32) بھی شامل تھی۔ حملے کے فوراً بعد کلپنا دتہ کچھ وقت کے لیے روپوش ہوئی لیکن آخرکار 1934 میں وہ گرفتار کی گئی اور ان کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔چٹاگاوں اسلحہ خانے پر حملے کے دو سال بعد پریتی لتا وڈیڈار نے چٹاگاوں کے یورپی کلب پر بم سے حملہ کیا جس میں ایک عمر رسیدہ انگریز خاتون جان بحق ہوئی۔خود پریتی لتا وڈیڈار بھی اس حملے میں زخمی ہوئی اور پکڑے جانے کے اندیشے کی وجہ سے پوٹاشیم سینائڈ کھاکے خودکشی کی۔

بینا داس (1911–32)، جو سبھاش چندر بوس کے مرشد (mentor) بینی مادھو داس (Beni Madhav Das) کی بیٹی تھی، نے کلکتہ یونیورسٹی کے کانووکیشن کی تقریب میں اپنی ڈپلوما کی سند لینے کے دوران بنگال کے گورنر سر سٹین لی جیکسن (Sir Stanley Jackson) پر گولی چلائی۔ سٹین لی جیکسن اس حملے میں بچ گئے اور بینا داس کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ چودہ سالہ سنیتی چودھری (Suniti Chowdhury) اور پندرہ سالہ شانتی گھوش (Shanti Ghosh) جو سبھاش چندر بوس کی شخصیت سے کافی متاثر تھی نے 1931 میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پر گولیاں چلائی۔عدالت میں سزا سنانے کے دوران انہوں نے جج سے پھانسی کی سزا مانگی تاکہ وہ ہندوستان کے لیے شہید ہو سکے مگر دونوں کو صرف عمر قید کی سزا ہوئی۔ان کا ماننا تھا کہ اسطبل میں گھوڑے کی زندگی سے موت بہتر ہے۔ان انقلابی تحریکوں میں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ رہیں۔تاہم گاندھیائی نظریات پر مبنی تحریکوں پر زیادہ زور دینے کی وجہ سے ایسی انقلابی تحریکوں کو قوم پرست مورخین کی طرف سے خاطر خواہ توجہ نہیں ملی۔اس ضمن میں مشہور تاریخ دان تانیکا سرکار (Tanika

(Sarkar) کا کہنا ہے کہ کسی بھی سیاسی تحریک میں خواتین کی شرکت کو ان کی آزادی کے ساتھ ہمیشہ نہیں دیکھنا چاہیے۔ بنگال کی مثال دیتے ہوئے وہ یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ پدرانہ معاشرے کا غلبہ ایسا تھا کہ اتنی قربانی دینے کے باوجود بھی پریتی لتا نے خودکشی کرنے سے پہلے ایک آخری عہد نامہ چھوڑا جس میں انہوں نے پر تشدد کارروائی میں اپنے ملوث ہونے کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

پریتی لتا لکھتی ہے کہ مجھے حیرانی اس بات پر ہوتی ہے کہ ہندوستان کو آزادی دلانے کی کوششوں میں بھی مردوں اور عورتوں میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر مرد آزادی کے لیے لڑھ سکتے ہیں تو خواتین کیوں نہیں؟۔ اس قومی فرض کو پورا کرنے سے عورتوں کو کیوں روکا جاتا ہے۔ اگر ستیہ گرہ میں عورتیں اپنے بھائیوں کے ہمراہ کھڑی رہ سکتی ہیں تو انقلابی تحریک میں وہ مردوں کے ساتھ کیوں نہیں لڑ سکتی ہیں۔ حال ہی میں مدھوریما سین (Madhurima Sen) نے اپنی تحقیق *Women In The War Of Freedom Unveiled Bengal 1919–1947: Glimpses from the Archival Records* میں آرکائوز کے دستاویزات کے ذریعے بہت سی ایسی خواتین کی شمولیت پر روشنی ڈالی جو 1930 کی بنگال انقلابی تحریک کا حصہ تھیں۔ یہ بات نہایت دلچسپ ہے کہ وہ انقلاب پسند خواتین جن کے بارے میں مدھوریما سین نے تفصیلات فراہم کیں، بہت سی ایسی غیر منقولہ مسلم خواتین بھی تھیں جنہیں استعمار مخالف انقلابی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کرنے پر نوآبادیاتی ریاست نے قید کیا تھا۔

21.10 آزاد ہند فوج اور رانی جھانسی رجیمنٹ

(Indian National Army and the Rani of Jhansi Regiment)

1943 میں گیارہ سال گزرنے کے بعد پریتی لتا واڈیدار کی خواہش پوری ہوئی جب پہلی بار عورتوں کو مردوں کے ساتھ آزاد ہند فوج میں شمولیت حاصل کرنے کا موقع دیا گیا۔ باقی سیاسی معاملات کی طرح خواتین کے معاملے میں بھی سبھاش چندر بوس کی سوچ گاندھی سے کافی مختلف تھی۔ گاندھی نے عورتوں کو اپنی تحریک میں شریک تو ضرور کیا مگر یہ شرکت پدری دائرے یا ان کے گھریلو رول تک ہی محدود رہی۔ اس کے برعکس سبھاش چندر بوس عورتوں کو مردوں کی طرح تعلیم دینے کی وکالت کرتے تھے تاکہ وہ بااختیار اور قابل ہو کے ہندوستان کی سیاست، تعلیم، کاروبار اور سماجی زندگی میں اپنی صلاحیتوں کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کر سکیں۔ سبھاش چندر بوس عورتوں کو ہندوستان کی جنگ آزادی میں برابری کی حصہ داری دینا چاہتے تھے۔ 1943 میں سنگاپور میں سبھاش چندر بوس کی آمد کے فوراً بعد انہوں نے تمام ہندوستانی لوگوں کو آزاد ہند فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کہا اور ساتھ ہی خواتین کے ایک ریجیمنٹ کو تشکیل دینے کا اعلان کیا جو جھانسی کی رانی کی طرح بہادر اور حریت پسند ہو۔ اسی خواتین رجیمنٹ کا نام بعد میں رانی جھانسی رجیمنٹ رکھا گیا۔ Veera Hildebrand کی تحقیق کے مطابق اس رجیمنٹ میں تقریباً پانچ سو کے آس پاس خواتین تھیں مگر دوسرے تاریخ دانوں کے مطابق اس کی تعداد ایک ہزار سے پندرہ سو کے قریب تھی۔ یہ تصویر Veera Hildebrand کی کتاب *Women at War: Subhash Chandra Bose and the Rani of Jhansi Regiment* سے لی گئی ہے۔

پریتی لتا وڈیڈار

(حوالہ: گوگل)

Source: Veera Hildebrand, *Women at War: Subhash Chandra Bose and the Rani of Jhansi Regiment.*

ہندوستانی قومی تحریک میں خواتین کی شرکت اور رول کے عنوان پر گاندھی اور ان کے زیر اثر قومی تحریک کو بہت سارے تاریخ دانوں نے کافی تحقیقی توجہ دی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ گاندھی نے ہندوستانی قومی تحریک کے دروازے عوام کے لیے کھول دیے، لیکن جہاں تک خواتین کا سوال ہے انہوں نے اپنی تحریک کی عدم تشدد نوعیت کو برقرار رکھنے کے لیے خواتین کی شرکت کو یقینی بنایا۔انہوں نے ہندوستانی سیاست میں خواتین کی فعال شرکت کی وجہ سے ہندوستانی عوام میں بالخصوص خواتین میں سیاسی شعور پیدا کیا۔اسی وجہ سے 1947 کے فوراً بعد ہندوستان میں مردوعورت دونوں کے لیے عالمی بالغ رائے دہی کے حق کو فراہم کیا گیا۔تاہم یہ بات بھی عیاں ہے کہ گاندھی نے خواتین کے لیے معاشی تعمیر نو کے پروگرام کی حمایت نہیں کی جو انھیں خود مختار بنانے کے لیے لازمی تھا۔ دوسرا نوآبادیاتی ہندوستان کے مختلف حصوں میں انقلابی تحریکوں کو مورخین کی توجہ حاصل ہوئی لیکن یہاں بھی قائدین کی شکل میں مردوں کو زیادہ توجہ دی گئی۔اس کے نتیجے میں خواتین یہاں قوم پرست تاریخ نویسی کے حاشیے پر رہیں۔جہاں تک مسلم اور دلت خواتین کا تعلق ہے ان کا ذکر بہت شاذ ہے۔

21.11 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی قومی تحریک میں خواتین مردوں کی طرح شامل ہوئیں مگر یہ سفر خواتین کے لیے آسان نہیں تھا۔پدری سوچ اور دیگر سماجی و مذہبی رسموں کی وجہ سے ان کے لیے یہ سفر بہت مشکل تھا۔ 1857 کی بغاوت سے ہی خواتین نے دھیرے دھیرے برطانوی سامراجیت کے خلاف مزاحمت دکھائی۔انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے فوراً بعد کچھ خواتین نے اس کے جلسوں میں شرکت کرنا شروع کردیا۔ہندوستان میں افریقہ سے گاندھی کی آمد کے بعد ہی خواتین کی ایک بڑی تعداد نے قومی تحریک میں حصہ لیا۔ 1930 کی دہائی میں گاندھی کی عدم تشدد تحریک کے علاوہ خواتین نے مردوں کے ہمراہ برطانوی سامراجیت کے خلاف ہتھیار اُٹھائے۔اس کے بعد میں آزاد ہند فوج میں رانی جھانسی رجیمنٹ نے برطانوی سرکار کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا۔

21.12 کلیدی الفاظ (Key Words)

سامراجیت : جب کوئی طاقت ور ملک کسی کمزور ملک پر قبضہ کرتا ہے تو اس عمل کو سامراجیت کہتے ہیں۔

سودیشی : دیسی چیزیں۔

Picketing : بیرونی اشیاء کی خرید و فروخت کے خلاف احتجاج کرنا۔

21.13 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

21.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. سروجنی نائیڈو کس سال میں انڈین نیشنل کانگریس کی صدر بنی؟
2. 1857 کی بغاوت میں شامل ہونے والی کسی خاتون رہنما کا نام بتائیں۔

3. ڈانڈی مارچ کس سال میں شروع ہوا؟
4. انڈین نیشنل کانگریس کب قائم ہوئی؟
5. انڈین نیشنل کانگریس کی پہلی خاتون صدر کا نام بتائیں۔
6. 'چٹاگاؤں اسلحہ خانے پر حملہ' کس سال میں کیا گیا؟
7. 'بھارت ستری منڈل' کس سال میں قائم ہوئی؟
8. 'وندے ماترم' رسالہ کس سال مں شروع ہوا؟
9. گورنر سر سٹینلی جیکسن (Sir Stanley Jackson) پر کس نے یونیورسٹی کنووکیشن کے دوران گولی چلائی؟
10. آزاد ہند فوج کی خواتین رجیمنٹ کا نام بتائیں۔

21.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. نوآبادیاتی ہندوستان میں خواتین کی مختلف انجمنوں پر روشنی ڈالیں۔
2. گاندھی نے خواتین کو کس طرح کی ذمہ داریاں سونپی؟
3. گاندھی سے پہلے ہندوستان کی قومی تحریک پر روشنی ڈالیں۔
4. بنگال کے حوالے سے عورتوں کی انقلابی تحریکوں میں شرکت کے عنوان پر روشنی ڈالیں۔
5. آزاد ہند فوج پر ایک نوٹ لکھیں۔

21.13.3 تفصیلی جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. گاندھی نے عورتوں کے لیے تحریک آزادی کے دروازے کیسے کھولیں؟
2. گاندھی نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں خواتین کو کیوں شریک کیا؟
3. انقلاب پسند پر تشدد تحریکوں میں خواتیں کی شرکت پر بحث کریں۔

21.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Basu, Aparna and Bharati Ray, *Women's Struggle: A History of the All-India Women's Conference, 1927–1990*, Manohar, New Delhi, 1990.
2. Chakravarty, Renu, *Communists in Indian Women's Movement*, People's Publishing House, New Delhi, 2011.
3. Chatterjee, Partha, *The Nation and its Fragments: Colonial and Post-colonial Histories*, Princeton University Press, Princeton, 1993.
4. Chatterjee, Manini, 'Turning Point in the Participation of Women in the Freedom Struggle', *Social Scientist*, Vol. 29, Nos. 7-8, July–August 2001, pp. 39–47.

5. Forbes, Geraldine, *Women in Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 1998.
6. Hildebrand, Veera, *Women at War: Subash Chandra Bose and the Rani of Jhansi Regiment*, HarperCollins, New Delhi, 2016.
7. Ray, Bharati ed., *From the Seams of History: Essays on Indian Women*, Oxford University Press, Delhi, 1995.
8. Sangari, Kumkum, and Sudesh Vaid ed., *Recasting Women: Essays in Colonial History*, Kali for Women, New Delhi, 1989.
9. Sarkar, Sumit, and Tanika Sarkar eds., *Women and Social Reform in India* (two volumes), Permanent Black, Ranikhet, 2007.
10. Thapar-Bjorkert, Suruchi, *Women in the Indian Nationalist Movement, 1930– 1942: Unseen Faces and Unheard Voices*, Sage Publications, New Delhi, 2005.

اکائی 22۔ ہندوستان اور دوسری عالمی جنگ

(India and the Second World War)

اکائی کے اجزا

22.0 تمہید
22.1 مقاصد
22.2 ہندوستانی قومی تحریک اور دوسری عالمی جنگ
22.2.1 دو پیش رفتیں
22.2.2 سہ رخی جنگ: برطانیہ، کانگریس اور مسلم لیگ
22.2.3 نظریۂ پاکستان
22.2.4 کانگریس کی ماورائے پارلیمانی مہم میں واپسی۔
22.2.5 اگست 1940 کی پیشکش
22.2.6 انفرادی ستیہ گرہ تحریک
22.2.7 کرپس مشن
22.2.8 ہندوستان چھوڑو تحریک
22.3 سبھاس چندر بوس اور آزاد ہند فوج
22.4 بنگال کا عظیم قحط
22.5 عالمی سیاسی منظر نامے میں تبدیلی
22.6 اکتسابی نتائج
22.7 کلیدی الفاظ
22.8 نمونہ امتحانی سوالات
22.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

22.0 تمہید (Introduction)

دوسری جنگ عظیم سے لے کر یوم آزادی تک یعنی 1939 سے 1947 تک ہندوستانی قومی تحریک دو مختلف طریقوں سے اہم ہے۔ ایک طرف، جنگ کے زمانے میں برطانوی حکومت نے ہندوستانی آئین کی ساخت، قانون سازی کے اقدامات اور آزادی سے متعلق مختلف وعدے پیش کر کے ہندوستانی قومی تحریک کے ساتھ مفاہمت کی پالیسی اپنائی تھی۔ یہ سب کچھ اس لیے پیش کیا گیا تاکہ دوسری جنگ عظیم میں قوم پرست رہنماؤں سے ہندوستانی حمایت حاصل کی جاسکے۔ دوسری طرف، ہندوستانیوں کی طرف سے آزادی کے حصول کی طرف رجحان میں نمایاں تبدیلی آئی۔ اس کی عکاسی ہندوستان چھوڑو تحریک میں ہوئی اور قوم پرستوں نے یہ واضح کر دیا کہ وہ کسی بھی قیمت پر آزادی حاصل کر کے ہی دم لیں گے۔

22.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ

- نظریۂ پاکستان کو سمجھ سکیں گے۔
- دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ، کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سہ رخی جدوجہد کے بارے میں جان سکیں گے۔
- اگست 1940 پیشکش اور کرپس مشن کی اہم خصوصیات بیان کر سکیں گے۔
- ہندوستان چھوڑو تحریک کی اہمیت کو جان سکیں گے۔
- سبھاش چندر بوس اور آزاد ہند فوج کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔

22.2 ہندوستانی قومی تحریک اور دوسری عالمی جنگ

(Indian National Movement and the Second World War)

دوسری عالمی جنگ ستمبر 1939 میں نازی جرمنی کے پولینڈ پر حملے کے ساتھ شروع ہوئی۔ یہ جرمنی کی توسیع کی طرف ایڈولف ہٹلر کا منصوبہ تھا۔ ہٹلر پہلے ہی مارچ 1938 میں آسٹریا اور مارچ 1939 میں چیکوسلواکیہ پر قبضہ کر چکا تھا۔ برطانیہ اور فرانس نے ہٹلر کو پر سکون کرنے کی پوری کوشش کی۔ جب ان کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئی، تب وہ پولینڈ کی مدد کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں سے مشورہ کیے بغیر یکطرفہ فیصلہ لے کر کے ہندوستان کو جنگ کا فریق قرار دیا۔ برطانوی حکومت نے اپنی سامراجی فتوحات کو طول دینے کے لیے انیسویں اور بیسویں صدی میں ہونے والی جنگوں میں ہندوستانی وسائل اور ہندوستانی عوام کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ تاہم، اس دوران ہندوستان کے لوگ سیاسی طور پر بیدار ہو چکے تھے اور مزید استحصال برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

جنگ کا اعلان ہوتے ہی کانگریس نے ایشیا، افریقہ اور یورپی ممالک کے خلاف جرمنی، اٹلی اور جاپان کی فاشسٹ جارحیت کی مذمت کی۔ اس نے جارحیت کے متاثرین کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار بھی کیا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستانی عوام کی آزادی کا جھوٹا دعویٰ کر کے ہندوستان کو دوسری عالمی جنگ میں گھسیٹنا چاہتی ہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے جنگ کے تئیں اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے ایک قرارداد پاس کی تھی، جس میں یہ بیان گیا تھا کہ "ہندوستان جمہوری آزادی کے لیے جنگ میں شریک نہیں ہو سکتا جب کہ اس سے اپنی آزادی سے محروم کیا گیا ہو۔" کانگریس نے ہندوستان میں ایک ہندوستانی حکومت کے قیام کا بھی مطالبہ کیا جو مرکزی قانون ساز اسمبلی کی طرف جواب دہ ہو۔ اس کے علاوہ، کانگریس نے اس وعدے کا بھی مطالبہ کیا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستان کو آزادی دے دی جائے۔ ان مطالبات پر بھی برطانوی حکومت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اکتوبر 1939 میں، صوبوں میں کانگریس کی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا کیونکہ اس وقت یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ برطانیہ جنگ میں اپنے سامراجی مقاصد کی پیروی کرنا چاہتا تھا۔ 1940 میں، حکومت نے کانگریس کی اسی طرح کی ایک اور پیشکش کو بھی مسترد کر دیا تھا۔

22.2.1 دو پیش رفتیں (Two Advancements)

دوسری جنگ عظیم کے آغاز سے پہلے اور اس کے بعد کے عرصے میں ہندوستان میں دو پیش رفتیں واضح ہو گئیں — پہلی۔ آزادی کی طرف اٹھائے گئے اقدامات؛ اور دوسری۔ کانگریس اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان بڑھتا ہوا عدم اعتماد۔ پہلی پیش رفت سے متعلق، جون اور اکتوبر 1938 کے درمیان برطانیہ کے دورے پر نہرو نے برطانوی لیبر پارٹی کے سرکردہ اراکین کے درمیان ہوئی اس نشست میں شمولیت کی، جس میں یہ بحث ہوئی کہ ہندوستان کو کس طرح آزادی دی جائے۔ غالباً اسی وقت بنگال میں ایک افواہ گردش کر رہی تھی کہ انگریز پانچ سال کے اندر اندر ہندوستان چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس طرح، دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے ساتھ ہی یہ خیال مضبوط ہونے لگا کہ جنگ کے فوراً بعد ہندوستان کو آزادی دی جائے گی۔ مزید برآں، اس وقت برطانوی حکومت کے اختتام پر ہندوستان کو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تقسیم کرنے کا خیال بھی زور پکڑ رہا تھا۔ اگرچہ یہ دونوں پیش رفتیں قریب اور ناگزیر نظر آ رہی تھیں لیکن برطانوی اور ہندوستانی قیادت ان کو قبول کرنے کی صورت میں نہیں تھی۔ اس کے علاوہ، مستقبل قریب میں اکثر برطانوی قدامت پسندوں نے ہندوستان کی آزادی کو بلا جھجک مسترد کر دیا۔ دوسری طرف کانگریس قیادت نے جناح یا مسلم لیگ کو ایک عوامی پہچان دینے سے انکار کرتے ہوئے خود کو ہندوستانی عوام کا واحد حقیقی نمائندے کے طور پر پیش کرنے کی ضد جاری رکھی۔

22.2.2 سہ رخی جنگ: برطانیہ، کانگریس اور مسلم لیگ

(Triangle War: Britain, Congress and Muslim League)

دوسری جنگ عظیم کے دوران ہندوستان ایک سیاسی میدان جنگ بن چکا تھا، جہاں برطانیہ، انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ایک سہ رخی جنگ شروع ہوئی تھی۔ برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل چاہتے تھے کہ تمام آئینی تبدیلیوں کو مابعد جنگ کے دور تک موخر کیا جائے تاکہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا امکان موجود اور قائم رہے۔ اس طرح چرچل مرکزی حکومت کو برطانوی کنٹرول میں رکھ

کر، ہندو ہندوستان، مسلم ہندوستان اور مقامی حکمرانوں کے ہندوستان پر مشتمل پورے برصغیر کو ایک ساتھ تھام کر چلانے کی امید کر رہے تھے۔ دوسری طرف کانگرس کا مقصد یہ تھا کہ متحد ہندوستان کو یک دم مکمل آزادی دلائی جائے۔ اگرچہ یہ مقصد واضح تھا لیکن اس کے حصول کی حکمت عملی مبہم تھی۔ کانگریس قیادت تین بنیادوں پر منقسم تھی۔ ایک طرف تہذیب کے مستقبل کے لیے جواہر لال نہرو برطانیہ کی فاشسٹ مخالف جنگ کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے۔ دوسری طرف گاندھی برطانیہ سے ہمدردی رکھتے ہوئے اصولی طور پر ہندوستان کے کسی بھی پر تشدد تنازعے میں ملوث ہونے کے مخالف تھے۔ اس کے علاوہ، اس وقت متعدد سیاسی حقیقت پسند بھی موجود تھے جنھوں نے جنگ کو ایک موقع کے طور پر دیکھا جس میں وہ تشدد کا سہارا لے کر آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مزید برآں، جناح اور مسلم لیگ کی بھی ایک الگ صورتحال تھی۔ مسلم لیگ نے نہ صرف کانگریس کے مقابلے میں ہندوستانی آبادی کے بہت کم تناسب کی نمائندگی کی، بلکہ تنظیمی طور پر بھی جناح کی تمام کوششوں کے باوجود لیگ بہت کم موثر ثابت ہوئی۔ اس نے دو حکمت عملیوں کے ذریعے ان خامیوں پر قابو پالیا جنھیں اس نے بڑی مظبوطی کے ساتھ اپنایا۔ ایک تو انگریزوں کے ساتھ اتحاد کا احساس تھا؛ اور دوسرا ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک یا ایک سے زیادہ آزاد ریاستوں کا قیام تھا، جس کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ ہندوستانی مسلمان اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں۔

22.2.3 نظریۂ پاکستان (Theory of Pakistan)

یہ جناح ہی تھے جنھوں نے ابتدائی طور پر معروف شاعر اقبال اور طالب علم رحمت علی کے تجویز کردہ مبہم، رومانوی خیال کو نظریاتی بنیاد دے کر ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ریاست کا دعویٰ کیا۔ جناح کا دعویٰ تھا کہ ہندوستانی مسلمان اقلیت میں نہیں ہیں، بلکہ ایک الگ قوم ہے۔ اس طرح، مسلمان اپنی ریاست میں خود حکمرانی (self-government) قائم کرنے کے حقدار ہیں—اس خیال کو جناح نے پہلی بار 19 جنوری 1940 کو لندن کے معروف میگزین *Time and Tide* میں عوامی طور پر بیان کیا۔ ایک مضمون 'The Constitutional Maladies of India' میں جناح نے استدلال کیا کہ ہندوستان کے آئینی مسائل کی بنیادی حقیقت یہ تھی کہ برطانوی طرز جمہوریت مختلف الانواع ہندوستانی ثقافت کے لیے مناسب نہیں تھی۔ برطانوی انکوائری کمیشن کے رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے، جناح نے کہا کہ ہندوستان میں کئی نسلیں آباد ہیں، جو روایت اور طرز زندگی کے لحاظ سے اتنے ہی الگ تھے جیسے یورپ کی قومیں ہیں"۔ سب سے بڑھ کر، جناح نے اس بات پر زور دیا کہ ہندو اور مسلمان حقیقت میں دو قومیں ہیں جو دو الگ الگ تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں"۔ اسی مضمون میں جناح نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ہندوستانی آئین کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ دو قوموں کے وجود کو مد نظر رکھا جائے۔ اس نئے آئین کی تشکیل کے لیے جناح نے اعلان کیا کہ ہندوستانی مسلمان برطانوی حکومت، کانگریس یا کسی اور کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ان خیالات کی تصدیق 24 مارچ 1940 میں مسلم لیگ کے لاہور اجلاس میں ہوئی۔ اس تحریک کو فوری طور پر کانگریس کے حامی پریس نے 'Pakistan Motion' کا نام دیا، حالانکہ اس قرارداد میں کہیں لفظ 'پاکستان' کا ذکر نہیں آیا ہے۔ اس میں یہ واضح دعویٰ بھی شامل تھا کہ "جن علاقوں میں مسلمان عددی طور پر اکثریت میں ہیں (جیسا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں ہیں)، ان کو آزاد ریاستوں کے طور پر قبول کیا جانا چاہیے، اور انہیں اندرونی آزادی اور خود مختاری بھی عطا کی جائے۔"

22.2.4 کانگریس کی ماورائے پارلیمانی مہم میں واپسی

(Congress Returns to Extra-Parliamentary Campaign)

اس بات کو پہلے ہی بیان کیا گیا ہے کہ وائسرائے لارڈ لن لتھگو نے سرکردہ سیاست دانوں سے مشورہ کیے بغیر ہندوستان کو عالمی جنگ میں دھکیل دیا۔ کانگریس نے وائسرائے سے باضابطہ طور پر ان بنیادی اصولوں کو بیان کرنے کے لیے کہا جن کی بنیاد پر یورپ میں جنگ لڑی جا رہی تھی، یعنی کیا جنگ کا مقصد صرف یورپی اقوام کی آزادی کا دفاع کرنا ہے، یا پھر قومی آزادی کے حصول کا اطلاق بھی ہے۔ 17 اکتوبر 1939 کو لارڈ لن لتھگو نے برطانوی حکومت کے عین مطابق ہدایات کی بنیاد پر کانگریس کو ایک سرے انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ برطانوی حکومت کا مقصد ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دینا تھا۔ لیکن، انہوں نے اس کے لیے کسی بھی وقت کا کوئی اشارہ نہیں دیا۔ کانگریس کا موقف تھا کہ لن لتھگو کے اعلان نے ایک بار پھر برطانوی حکومت کے 1917 کے بعد سے کیے گئے وعدوں سے آگے نہ بڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس لیے، کانگریس قیادت نے اپنے اراکین کو نومبر 1939 کے آخر تک صوبائی حکومتوں سے دستبردار ہونے کا حکم دیا۔ کانگریس کا یہ فیصلہ شاید جذباتی سطح پر ایک قابل فہم ردعمل تھا۔ ان کے زیر انتظام زیادہ تر صوبوں میں کام کرنے کے لیے کانگریس حکومتوں کے لیے بڑھتی ہوئی مشکل میں اس کا ممکنہ سیاسی جواز بھی تھا۔ پارٹی کے اندر حکومت بنانے والوں اور اپنی پارٹی کی حکمرانی کی مؤثر مخالفت کرنے والوں کے درمیان تلخ اور کھلی تقسیم بڑھ رہی تھی۔

تاہم، کانگریس کے فیصلے کی وجوہات کچھ بھی ہوں، اس کی وجہ سے مسلم لیگ کے لیے میدان صاف ہو گیا، جس نے جنگ کے دوران گورنروں کی حمایت سے ان صوبوں میں اقتدار سنبھالا جن میں پہلے کانگریس کی حکومت تھی۔ اگر یہ انگریزوں کے خلاف ہمہ جہت لڑائی کی سمت میں پہلا قدم ہوتا تو کانگریس کے فیصلے کی کچھ سیاسی فہم ضرور ہوتی۔ لیکن کانگریس کی قیادت منقسم تھی اور اگلے ہر قدم پر تذبذب کا شکار تھی، کیونکہ اس کے اندرونی تنازعات نے فیصلہ کن سیاسی کارروائی کی صلاحیت کو مفلوج کر دیا تھا۔ برطانوی کنزرویٹو (Conservative) حکومت کے خاتمے اور مئی 1940 میں ونسٹن چرچل کی قیادت میں مخلوط حکومت نے کانگریس کے رہنماؤں میں آزادی کی امید جگائی۔ لیکن چرچل ہمیشہ ہندوستان کے لیے کسی بھی اہم سیاسی رعایت کے خلاف تھا، اور جلد یہ واضح ہو گیا کہ ان کی حکومت اپنے پیش رو کی پالیسی سے کوئی خاص دستبرداری کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

22.2.5 اگست پیشکش (August Offer, 1940)

8 اگست 1940 کو ناظم السلطنت (Viceroy) نے کانگریس کے سیاسی مستقبل کے حوالے سے ایک بیان دیا اور کانگریس صدر کو مذاکرات کے لیے مدعو کیا۔ اس بیان کو اگست کی پیشکش کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس پیشکش نے مخصوص ذمہ داریوں کے ساتھ ہندوستانیوں کو اپنا آئین وضع کرنے کی ترکیب کو قبول کیا۔ جنگ کے بعد آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کی رائے بھی پیش کی گئی۔ عارضی اقدام کے طور پر، جنگ کے دوران وائسرائے ہندستانیوں کی ایک مخصوص تعداد کو اپنی ایگزیکٹو کونسل میں شامل کرنے اور جنگی مشاورتی کونسل قائم کرنے کے لیے مدعو کرے گا۔ آئین پر نظر ثانی کرتے وقت اقلیتوں کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ برطانوی حکومت نے تمام جماعتوں

اور برادریوں کے مکمل تعاون کی توقع کی۔ کانگریس نے اگست کی پیشکش کو غیر تسلی بخش اور نقصان دہ قرار دیا، اور اسے مسترد کر دیا۔ ان کے مطابق، اگست پیشکش کا مطلب برطانوی پارلیمنٹ سے ہندوستانی مقننہ کو ذمہ داریاں منتقل کیے بغیر ایگزیکٹو کونسل میں محض چند ہندوستانیوں کا اضافہ کرنا تھا۔ تاہم انگریز اس کے نفاذ میں بہت آگے بڑھ گئے۔ اس کے مطابق، جولائی 1941 میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو 7 سے بڑھا کر 12 اراکین کر دیا گیا، جن میں سے چار برطانوی اور آٹھ ہندوستانی ہونگے۔ لیکن کانگریس یا مسلم لیگ کا کوئی بھی رکن اس نئے کونسل میں شامل نہیں ہوا۔

22.2.6 انفرادی ستیہ گرہ تحریک (Individual Satyagraha Movement)

کانگریس کی قیادت نے تعطل سے نکلنے کی کوشش میں گاندھی کو سول نافرمانی تحریک چلانے کا حکم دیا۔ تاہم، گاندھی، دیگر کانگریسی رہنماؤں کی طرح، اس بات کے قائل تھے کہ اس وقت ایک عوامی مہم ممکنہ طور پر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لیے، 17 اکتوبر 1940 کو انہوں نے انفرادی سول نافرمانی کی مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ گاندھی کی ہدایات کے مطابق، گاندھی کے ذریعے منتخب کردہ کانگریس کے انفرادی ارکان اظہار رائے پر پابندی، جنگ کی مذمت اور سزائے قید کی خلاف ورزی کریں گے۔ آچاریہ ونوبا بھاوے نے وردھا کے قریب پونار (Paunar) میں جنگ کے خلاف تقریر کے ساتھ انفرادی ستیہ گرہ کی شروعات کی۔ اس ستیہ گرہ کو ایک محدود سطح پر قائم کیا گیا تھا تاکہ ہندوستان میں بڑے پیمانے پر بغاوت کے ذریعے برطانیہ کی جنگی کوششوں کی تذلیل نہ کیا جائے۔ گاندھی نے واضح کیا تھا کہ اکثر ہندوستانی جنگ میں دلچسپی نہیں رکھتے ہیں، اور ان کے نزدیک نازی ازم اور ہندوستان پر برطانیہ کی دوہری حاکمیت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ لوگوں نے علامتی طور پر فرداً فرداً قانون توڑا اور گرفتار کیے گئے۔ 1941 کے پہلے چھ مہینوں میں کانگریس کے تقریباً بیس ہزار ارکان کو قید کیا گیا تھا۔ لیکن سال کے آخر تک یہ انفرادی سول نافرمانی تحریک اختتام کو پہنچ چکی تھی۔

22.2.7 کرپس مشن (Cripps Mission)

1941 میں، عالمی سیاسی منظر نامے میں دو اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ایک طرف نازی جرمنی نے مغرب میں پولینڈ، بیلجیم، ہالینڈ، ناروے اور مشرقی یورپ کے بیشتر حصوں پر قبضے کے بعد 22 جون 1941 کو سوویت یونین پر حملہ کیا؛ تو دوسری طرف 7 دسمبر 1941 کو جاپان نے امریکی بحری بیڑے پرل بندرگاہ (Pearl Harbour) پر اچانک حملہ کیا، اور جرمنی اور اٹلی کی طرف سے جنگ میں شمولیت اختیار کی۔ جاپان نے تیزی سے فلپائن، انڈوچینا، انڈونیشیا، ملایا اور برما کو شکست دی۔ مارچ 1942 میں، رنگون پر جاپانی قبضے نے جنگ کو ہندوستان کے قریب پہنچا دیا۔ جب شمال مشرق میں ہندوستان کی دہلیز پر جاپان کی مسلح افواج کھڑی ہو گئی، اور یورپ اور افریقہ میں ہٹلر کی فوجیں برتری حاصل کر رہی تھیں، اس وقت امریکہ کے صدر فرینکلن ڈی روزویلٹ، چین کے صدر چیانگ کائی شیک اور برطانیہ کی لیبر پارٹی کے رہنماؤں نے وزیر اعظم ونسٹن چرچل پر دباؤ ڈالا کہ جنگ کو قابو میں لانے کے لیے وہ ہندوستانی رہنماؤں سے بات چیت کرے۔ اس پس منظر میں، ہندوستان کے تعاون کو حاصل کرنے کے لیے برطانوی حکومت نے ہندوستان میں ایک مشن بھیجا جسے کرپس مشن کے نام سے جانا جاتا ہے۔

برطانوی جنگی کابینہ کے ایک رکن اسٹافورڈ کرپس مارچ 1942 میں نئی آئینی تجاویز کے ساتھ ہندوستان پہنچے تاکہ ہندوستانیوں کو مطمئن کیا جاسکے اور جنگی کوششوں میں ان کا تعاون حاصل کیا جاسکے۔ کرپس پلان نے مختلف تجاویز پیش کیں۔ اس میں ہندوستانیوں کے لیے ڈومینین اسٹیٹس (Dominion Status) کا وعدہ کیا گیا تھا، اور اس مقصد کے لیے ایک آئین ساز اسمبلی تشکیل دی جائے گی جو برطانوی ہندوستان کے ساتھ ساتھ مقامی ریاستوں کی بھی نمائندگی کرے گی۔ اس نے برطانوی ہندوستان اور ہندوستانی ریاستوں کے لیے ایک وفاق کا تصور پیش کیا۔ جو صوبہ آئین کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا، اسے الگ سے ڈومینین کا درجہ اختیار کرنے کی اجازت دی گئی۔ برطانوی حکومت دفاعی اور فوجی کاروائیوں پر کنٹرول برقرار رکھے گی؛ اور نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کے لیے بھی انتظامات فراہم کیے جائیں گے۔ فقط مسلم لیگ نے کرپس اسکیم کا خیر مقدم کیا، جب کہ دیگر سیاسی جماعتوں جیسے کانگریس، اکالی تحریک، ہندو مہاسبھا، نیشنل لبرل فیڈریشن اور ہندوستانی عیسائیوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ کانگریس کو مستقبل کے وعدوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس نے فوری طور پر مکمل اختیارات کے ساتھ ایک ذمہ دار حکومت کے قیام پر اصرار کیا۔ گاندھی نے کہا تھا کہ کرپس کی طرف سے لائی گئی اسکیم ایک تباہ شدہ بنک کی مابعد مدت کی چیک کے مانند ہے۔ برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کو موثر اقتدار کی فوری منتقلی کے مطالبے کو ماننے سے انکار کردیا۔ ہندوستانی قوم پرست مستقبل کے لیے محض ایک وعدے سے مطمئن نہیں تھے جبکہ وائسرائے نے حال میں ہی اپنے مطلق العنان اختیارات کو برقرار رکھا۔ کرپس مشن کی ناکامی نے کانگریس کو یہ اشارہ دیا کہ انگریز ہندوستانیوں کے ساتھ ایماندارانہ بات چیت، حقیقی آئینی پیش رفت اور ہندوستانیوں کے اپنے مستقبل کا تعین کرنے کے حق کو قبول کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ کانگریس اصولی طور پر فاشسٹ طاقتوں کے خلاف جنگی کوششوں میں رکاوٹ ڈالنے سے گریزاں تھی، لیکن 1942 کے موسم گرما کے آغاز تک گاندھی کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستانیوں کے حقوق کے لیے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرنا لازمی ہے۔

22.2.8 ہندوستان چھوڑو تحریک (Quit India Movement)

کرپس مشن کی ناکامی، دوسری جنگ عظیم میں جاپان کی کامیابی، برما اور ملائیشیا سے آنے والے ہندوستانیوں کے ساتھ برا برتاؤ، اور ضروری اور کارآمد اشیاء کی عدم دستیابی کی وجہ سے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف وسیع پیمانے پر عدم اطمینان پنپ رہا تھا۔ 19 اپریل 1942 کو جنگ کے دوران ضروری اشیاء کی عدم دستیابی کی بنیاد پر گاندھی نے انگریزوں کو ہندوستان سے فوری طور پر نکلنے کی تجویز کی۔ کانگریس نے بھی اب انگریزوں سے آزادئ ہند کے مطالبے کو تسلیم کرنے کے لیے فعال اقدامات اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ 14 جولائی 1942 کو کانگریس نے وردھا میں ہندوستان چھوڑو قرارداد پاس کی، جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں برطانوی راج کو فوری طور پر ختم ہونا چاہیے۔ 7-8 اگست 1942 کو بمبئی میں منعقد ہوئی کل ہند کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں اس قرارداد کو منظوری دی گئی۔ 8 اگست 1942 کی رات کو گاندھی نے کانگریس کے مندوبین سے خطاب کرتے ہوئے ہندوستان کی مکمل آزادی پر زور دیا۔ گاندھی نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا: 'یہ ایک مختصر منتر ہے، جو میں آپ کو دیتا ہوں۔ آپ اسے اپنے دلوں پر نقش کرلیں، اور اپنی ہر سانس میں اس کا اظہار کریں۔ منتر یہ ہے: ''کرو یا مرو'' ـــ ہم یا تو ہندوستان کو آزاد کریں گے یا اس کوشش میں اپنی جان قربان کریں گے۔'

لیکن اس سے پہلے کہ کانگریس اپنی عدم تشدد کی تحریک شروع کر پاتی، حکومت نے 9 اگست 1942 کی صبح کو گاندھی سمیت تمام اہم کانگریس رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ کانگریس اور دیگر صوبائی اداروں پر پابندی لگادی گئی اور دفاتر کو پولیس کے ماتحت کر دیا گیا۔ قوم پرست رہنماؤں کی گرفتاری سے لوگوں میں غم و غصہ کی لہر وجود میں آگئی۔ ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک کی آواز پورے ملک میں گونج اٹھی۔ کئی جگہوں پر بے ساختہ مظاہرے ہوئے اور لوگوں نے غیر ملکی حکمرانی کو ختم کرنے کے لیے تشدد کا سہارا لیا۔ حکومت نے تحریک کو دبانے کے لیے پولیس اور فوج کو استعمال کیا۔ ہندوستان چھوڑو تحریک یا اگست انقلاب ہندوستانی قومی تحریک کی تاریخ میں ایک اہم باب ہے۔ گاندھی کی گرفتاری کے بعد پورا ہندوستان بغاوت کی لپیٹ میں آ گیا۔ ابتدا میں تحریک آزادی عدم تشدد پر مبنی تھی، لیکن یہ انگریزوں کی جابرانہ پالیسی تھی جس نے لوگوں کو تشدد پر اکسایا۔ عدم تشدد کے گاندھیائی نظریے کو پس منظر میں دھکیل دیا گیا اور لوگوں نے جدوجہد کے اپنے طریقے وضع کر لیے۔ اس تحریک میں سرکاری عمارتوں، پولیس تھانوں، ڈاکخانوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر حملے؛ ٹیلی گراف اور ٹیلی فون سروس کی تباہی؛ پلوں کی مسماری؛ سڑکوں پر ٹریفک میں خلل ڈالنا؛ اور مزدوروں کا ہڑتال، وغیرہ جیسی سرگرمیاں شامل تھیں۔ متحدہ صوبوں اور بہار نے اس تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ طلباء نے بڑے پیمانے پر اس تحریک میں شرکت اور قیادت کی، اور اسے دیہی علاقوں تک پہنچایا۔

پورے ہندوستان کے ضلعی قصبوں اور دیہاتوں میں مظاہرے تیزی سے پھیل گئے۔ ان مظاہروں کے دوران پولیس تھانوں، عدالتوں، ڈاکخانوں اور دیگر سرکاری عمارتوں پر حملے کیے گئے۔ ریلوے پٹریوں کو بلاک کر دیا گیا، اور گاؤں والوں نے مختلف مقامات پر ستیہ گرہ کا مظاہرہ کیا۔ طلباء نے ہندوستان بھر کے اسکولوں اور کالجوں میں ہڑتال کیا، احتجاج کیے، اور غیر قانونی قوم پرست ادبی مطالعات پر زور دیا۔ بمبئی، احمد آباد، پونا، احمد نگر اور جمشید پور کے صنعت کار ہفتوں تک اس تحریک سے دور رہے۔ برطانوی حکومت نے اس تحریک کو دبانے کے لیے سخت رویہ اختیار کیا۔ پانچ ماہ سے بھی کم عرصے میں سیکڑوں افراد ہلاک کیے گئے، اور 70,000 سے بھی زائد کو گرفتار کیا گیا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو بغیر مقدمہ چلائے طویل مدت کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا۔ حکومت کی بے رحمی اور دوسری جنگ عظیم کے باوجود، جدوجہد آزادی جاری رہی۔ جابرانہ اقدامات کے ذریعے ہی برطانوی حکومت اپنا اقتدار بحال کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اگرچہ ہندوستان چھوڑو تحریک قلیل المدتی تھی، لیکن اس نے ملک میں قوم پرستی کا ایک گہرا احساس پیدا کیا۔ اس کے علاوہ، اس نے لوگوں کی جدوجہد اور قربانی کی عظیم صلاحیت کو بھی ظاہر کیا۔ اس نے برطانوی حکومت کے خلاف ہندوستان کے سامراجیت مخالف رویے کو از سر نو زندہ کیا۔ یہ تحریک انگریزوں کے لیے ایک انتباہ تھی کہ وہ ہندوستان پر اب زیادہ دیر تک تسلط نہیں رکھ سکتے۔ الغرض، یہ برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستان کی جدوجہد میں ایک سنگ میل حیثیت رکھتی ہے۔

اس تحریک نے ہندوستان میں بائیں بازو کے گروہوں اور جماعتوں کو کافی حد تک کمزور کیا۔ سوشلسٹوں اور سبھاش چندر بوس کے پیروکاروں نے کمیونسٹوں پر 'غداری' کا الزام لگایا، کیونکہ کمیونسٹوں نے سوویت یونین سمیت اتحادیوں (Allied Powers) کی حمایت کی، اور ہندوستان چھوڑو تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ اس کے برعکس، کمیونسٹوں نے سوشلسٹوں اور سبھاش چندر بوس پر محوری طاقتوں کی مدد سے ہندوستان کے لیے آزادی حاصل کرنے کا الزام لگایا۔ اس کے علاوہ، اس تحریک کو شاہی ریاستوں میں بھی بہت کم حمایت حاصل

تھی۔ 1944 کے اوائل تک، ہندوستان زیادہ تر پرامن تھا، جب کہ کانگریس کی پوری قیادت ابھی تک جیل میں تھی۔ چونکہ اس تحریک نے بہت سے قوم پرستوں کو متاثر یا افسردہ کیا تھا، لیکن جناح اور مسلم لیگ نے گاندھی اور کانگریس پارٹی پر تنقید کرتے ہوئے سیاسی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔

22.3 سبھاش چندر بوس اور آزاد ہند فوج (Subhas Chandra Bose and the Indian National Army)

1942 میں ہندوستان چھوڑو تحریک کو دبانے کے بعد سے 1945 میں دوسری جنگ عظیم کے خاتمے تک ہندوستانی قومی تحریک تذبذب کا شکار رہی۔ قوم پرست رہنما جیلوں میں تھے اور تحریک آزادی میں سیاسی قیادت کا فقدان محسوس کیا جاتا تھا۔ 1943 میں بنگال کا عظیم قحط وقوع پذیر ہوا، جس کے نتیجے میں تیس لاکھ سے زیادہ لوگ بھوک کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ برطانوی حکومت نے قحط زدہ لوگوں سے بے پرواہی اور بے تعلقی کا مظاہرہ کیا۔ اس وقت، سبھاش چندر بوس کی سرگرمیوں کی شکل میں قومی تحریک کو ایک نیا مظہر حاصل ہوا۔ مارچ 1941 میں، مدد حاصل کرنے کے لیے سبھاس چندر بوس ہندوستان سے سوویت یونین فرار ہو گئے۔ چونکہ سوویت یونین، اتحادی طاقتوں (Allied Powers) میں شامل ہو چکا تھا، اس لیے وہ جاپان چلے گئے۔ انہوں نے سنگاپور میں آزاد ہند فوج (انڈین نیشنل آرمی) کی تشکیل کی تاکہ ہندوستان کی آزادی کے لیے فوجی کاروائی عمل میں لائی جا سکے۔ ایک معروف انقلابی راش بہاری بوس نے ان کی مدد کی۔ سبھاش چندر بوس کے آنے سے پہلے، برطانوی ہندوستانی فوج میں ایک کیپٹن جنرل موہن سنگھ نے آزاد ہند فوج (آئی۔ این۔ آے) کو منظم کیا۔ ہندوستانی اور جنوب مشرقی ایشیا کے باشندے آزاد ہند فوج میں شامل ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ ملایا، سنگاپور اور برما میں جاپانی فوج کے ہاتھوں پکڑے گئے ہندوستانی بھی آزاد ہند فوج میں شامل ہو گئے۔ فوجیوں نے سبھاش چندر بوس کو 'نیتاجی' کا خطاب دے دیا۔ فوجیوں کے اندر قومی جذبات ابھارنے کے لیے سبھاش چندر بوس نے ''جئے ہند'' کا نعرہ دیا۔ برما سے ہندوستان کی طرف بڑھتے وقت آزاد ہند فوج جاپانی فوج میں شامل ہو گئی۔ قومی آزادی کے احساس اور جذبے کے تحت آزاد ہند فوج نے ہندوستان کو آزاد کرنے کے لیے سبھاش چندر بوس کی قیادت قبول کی۔ 1945 میں جنگ کے اختتام پر جاپان کی شکست کے ساتھ آزاد ہند فوج کا بھی خاتمہ ہوا۔ سبھاس چندر بوس ٹوکیو جاتے ہوئے ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ فاشسٹ طاقتوں کے ساتھ مل کر ہندوستان کو برطانوی راج سے آزاد کرانے کے طریقے کو بیشتر قوم پرستوں نے تنقید کا نشانہ بنایا۔ تاہم، آزاد ہند فوج نے بڑے منظم انداز میں ہندوستانی عوام اور ہندوستانی فوج کے اندر حب الوطنی کی ایک متاثر کن مثال قائم کی۔

نومبر 1945 میں انڈین نیشنل آرمی کے تین افسران شاہ نواز، گوریدال سنگھ ڈھلون اور پریم سہگل پر دہلی کے لال قلعہ میں مقدمہ چلایا گیا۔ ان پر برطانوی سلطنت کے خلاف سازش کرنے کے 'جرم' کا الزام لگایا گیا تھا۔ قوم کے رہنماؤں میں سے بیرسٹروں نے ان کا دفاع کیا۔ لیکن انہیں عمر بھر کے لیے نقل و حمل کی سزا سنائی گئی۔ اس کی وجہ سے پورے ملک میں بڑے پیمانے پر انتشار پیدا ہوا، اور مسلح افواج بھی متاثر ہوئیں۔ رائل انڈین نیوی کے ہزاروں عملوں نے بغاوت کی اور اپنے جہازوں پر برطانوی سلطنت کے یونین جیک پرچم کو ہٹا کر قومی پرچم لہرا دیا۔ ملک بھر میں مظاہرے، احتجاج اور ہڑتالیں ہوئیں۔

22.4 بنگال کا عظیم قحط (The Great Famine of Bengal, 1943)

1943 کا عظیم قحط ایسا قحط تھا جو دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی ہندوستان کے بنگال صوبے میں وقوع پذیر ہوا۔ 1943 اور 1944 میں قحط کے اختتام پر فاقہ کشی اور فاقہ کشی سے متعلق بیماریوں کی وجہ سے تقریباً تیس لاکھ اموات ہوئیں۔ مزید برآں، عظیم بنگال قحط ایک انسان ساختہ آفت تھی۔ اس تباہ کن قحط کا آغاز 1942 میں ہوا اور مارچ 1943 تک جاری رہا۔ عظیم بنگال قحط کی ایک اہم وجہ جنگ کے دوران مشرقی ہندوستان میں (بنگال اور آسام میں) بڑی تعداد میں فوجیوں کی آمد تھی۔ ان کے اخراجات کی وجہ سے متعدد اشیا اور اشیائے خوردونوش کی مانگ میں زبردست اضافہ ہوا، جس کے نتیجے میں قیمتوں میں بھی اضافہ ہوا۔ اگرچہ شہری لوگوں نے بلاشبہ بڑھتی ہوئی طلب اور جنگ سے متعلق اخراجات کی وجہ سے پیدا ہونے والے معاشی حالات سے فائدہ اٹھایا، وہیں زرعی غیر ہنرمند مزدور اور یومیہ اجرت والا محنت کش طبقہ نقصان اور جمود کا شکار رہا۔ بذات خود، اس قحط نے دھیرے دھیرے اشیائے خوردونوش کی قیمتوں کو بنگالی عوام کی قوت خرید سے باہر کر دیا۔

اپریل 1942 میں برما کے سقوط کے بعد بنگالی عوام کی صورت حال بنگال کے گورنر سر جان ہربرٹ کی طرف سے مسلط کی گئی 'انکار کی پالیسی' (Denial Policy) سے مزید خراب ہو گئی۔ انکار کی پالیسی میں مقررہ قیمتوں پر خریداری یا ساحلی اضلاع میں دستیاب اضافی چاول کی ضبطی شامل تھی۔ اس پالیسی کے دو مقاصد تھے۔ پہلا یہ کہ کسی بھی حملہ آور جاپانی فوج کو خوراک فراہم کرنے سے انکار کرنا؛ اور دوسرا ہندوستان اور برما کے سرحد پر لڑنے والے اتحادی فوجیوں (The Allied Forces) کو غذا کی سپلائی کرنا۔ ان اقدام کی وجہ سے غذائی اجناس کی دستیابی میں کمی واقع ہوئی۔ اس کے بعد خوراک کی دستیابی اس وقت مزید خراب ہو گئی تھی جب بنگال میں اکثر کشتیوں کو ضبط یا تباہ کر دیا گیا جس سے ماہی گیروں کی آمدنی پر برا اثر پڑھ گیا، کیونکہ بنگال میں چاول کے بعد مچھلی دوسری اہم ترین غذا تھی۔ مزید برآں، کشتیوں سے متعلق انکار کی پالیسی نے ڈیلٹا جزائر میں شالی کی کاشت کو ناممکن بنا دیا۔

انکار کی پالیسی کے منفی اثرات نے جنگ سے متعلق اضافی پیش رفتوں کا ایک سلسلہ پیدا کیا۔ ایک پیش رفت یہ تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے آخری تین سالوں میں بنگال میں تعینات برطانوی مسلح افواج کے لیے قابل کاشت کھیتوں کے وسیع علاقے کو ہوائی اڈے میں تبدیل کیا گیا۔ نتیجہ یہ سامنے آگیا کہ 1,50,000 سے 1,80,000 کے درمیان لوگ راتوں رات بغیر کسی معاوضے کے گھروں سے محروم ہو گئے۔ اس قحط اور تباہی کا الزام بنگال کی حکومت اور بعض افراط رواں ہندوستانی گروہوں پر لگایا جا سکتا ہے۔ درحقیقت جب جاپان کے ساتھ جنگ شروع ہو چکی تھی تو فضل الحق کی سربراہی میں بنگالی حکومت نے خوراک کے ذخائر جمع کرنے کے بجائے لوگوں پر زور دیا کہ وہ دو ماہ کا اناج اپنے گھروں میں محفوظ رکھیں۔ نتیجتاً لوگوں نے گھروں کے اندر اناج کے ذخایر بھرنے شروع کیے۔ جنگ کی شدّت اور پھیلاؤ کی وجہ سے پیدا ہونے والی گھبراہٹ نے بیوپاریوں اور سوداگروں کو کلکتہ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ مندرجہ بالا تمام عوامل کے نتیجے میں خوراک کی قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہوا۔

حالات کو مزید خراب کرنے کے لیے 16 اور 17 اکتوبر 1942 کو، دو ساحلی اضلاع (مدناپور اور 24 پرگنہ) ایک تباہ کن طوفان کی زد میں آ گئے، جس نے مال، جان اور خوراک کے ذخائر کو بڑے پیمانے پر نقصان پہنچایا۔ اس وجہ کی بنا پر بھی خوراک کی قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا اور دھیرے دھیرے اس نے بنگال کے دیہی علاقوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ 22 دسمبر 1942 کو بنگال حکومت نے اناج کے اپنے ذخایر جمع کرنے کے لیے خریداری کی مہم شروع کی۔ یہ مہم ناکام رہی، کیونکہ حکومت کی طرف سے مقرر کردہ قیمتوں پر کوئی اناج دستیاب نہیں تھا۔ چنانچہ فضل الحق کی حکومت نے بے سہارا افراد کو امداد اور خوراک مہیا کرنے کی کوشش کی لیکن محکموں کی عدم ہم آہنگی اور نااہلی کی وجہ سے یہ کوشش بھی ناکام ثابت ہوئی۔ مارچ 1943 تک، بڑے پیمانے پر ذخیرہ اندوزی اور ہندوستان کے دوسرے حصوں سے غیر متناسب سپلائی کی وجہ سے بنگالی بازاروں میں غذائی اجناس کی کمی قائم رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافے نے لوگوں کو خریدنے کی صلاحیتوں سے محروم کر دیا۔ اس کی وجہ سے ایک نیا مرحلہ شروع ہوا جس میں بھوک کی وجہ سے ہزاروں اموات ہوئیں۔ اس مایوس کن صورتحال میں، گورنر نے فضل الحق کی حکومت کو برطرف کر دیا، اور اس کی جگہ مسلم لیگ کے زیر اثر خواجہ نظام الدین کی سربراہی میں ایک مخلوط حکومت (Coalition Government) قائم ہو گئی۔ لیکن، بدقسمتی سے نظام الدین کی حکومت اپنے پیشرو سے بھی زیادہ ناکارہ اور یقینی طور پر زیادہ ظالم ثابت ہوئی۔

جون-جولائی 1943 میں، نئی حکومت نے غذائی اجناس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ایک جدوجہد شروع کی۔ اس جدوجہد کا مقصد ذخیرہ اندوز کیے گئے خوراک کو مارکیٹ میں لانا تھا۔ چونکہ پورے صوبے میں یہ جدوجہد ایک ہی وقت نہیں چلائی گئی تھی، اس لیے کھانے پینے کے بڑے ذخیروں کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل کیا جاتا تھا۔ لیکن، بداطوار اور بدعنوان ریاستی افسران نے اس جدوجہد کو ناکام ثابت کیا۔ چونکہ موسم خزاں میں فصل وافر مقدار میں آنے کی امید تھی، نظام الدین حکومت نے اگست 1943 میں شالی اور چاول کے لیے زیادہ سے زیادہ قانونی قیمت دوبارہ نافذ کر دی، اور اناج کے اپنے ذخیرے تیار کرنے کی کوشش کی۔ جب حکومتی کارکن نئی فصل خریدنے کے لیے دیہی علاقوں میں پہنچ گئے، اس وقت فصل کا بڑا حصہ نجی تاجروں نے خرید لیا تھا۔ اس بنا پر پہلے کی طرح ذخیرہ اندوزی دوبارہ عمل میں لائی گئی۔ وائسرائے لارڈ لن لتھگو کی مدت کار کے اختتام تک (1 اکتوبر 1943)، برطانوی حکومتِ ہند کے رویے سے بنگال تباہی اور بربادی کا شکار ہو گیا۔ اس خیال کو قبول کیا گیا کہ بنگال ایک بڑے قحط کی لپیٹ میں ہے، لیکن برطانوی حکومت اس موقف پر قائم رہی کہ بحران سے نمٹنے کی ذمہ داری خصوصی طور پر صوبائی حکومت پر عائد تھی۔ نظام الدین حکومت نے آزاد تجارت اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں اناج کی آزادانہ نقل و حرکت کی درخواست کی۔ حکومت ہند نے مئی 1943 میں مشرقی علاقے میں آزاد تجارت قبول کر لیا۔ جب بنگال کی مانگ کی وجہ سے دیگر مشرقی علاقوں میں خوراک کی قیمتوں میں اضافہ ہوا، تو برطانوی حکومت ہند نے جلد بازی میں جولائی 1943 میں آزاد تجارت کو روک دیا۔

برطانوی حکومت ہند کا رویہ اس وقت بدل گیا جب اکتوبر 1943 میں لارڈ لن لتھگو کی جگہ لارڈ ویول نائب السلطنت مقرر کیے گئے۔ لارڈ ویول نے فوج کا سہارا لیتے ہوئے امدادی کارروائیوں کو تیز کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی انہوں نے برطانوی کابینہ کے ذریعے

ہندوستان میں خوراک کی درآمدات کی حوصلہ شکنی اور خوراک کی برآمدات کی حوصلہ افزائی کروائی۔ مزید برآں، ستمبر سے دسمبر 1943 تک، انہوں نے نہ صرف پڑوسی صوبوں سے، بلکہ دیگر صوبوں جیسے، سندھ، مرکزی صوبوں اور پنجاب سے اناج کی بڑھتی ہوئی آمد کو ممکن بنایا۔ اس موقع پر، نظام الدین حکومت نے ایک بار پھر اپنی نااہلی کا مظاہرہ کیا، کیونکہ وہ ذخیرہ کرنے کی مناسب سہولیات فراہم کرنے سے قاصر تھی۔ نتیجے کے طور پر، دستیاب خوراک کو کھلے میں سڑنے کی اجازت دی گئی اور اسے جلدی سے ان مقامات پر نہیں بھیجا گیا جہاں اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

1943 کے آخری مہینوں اور 1944 کے ابتدائی مہینوں میں موسم خزاں کی فصل کی کٹائی کے ساتھ ہی خوراک کی فراوانی سے حالات سازگار ہونے لگے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ 1944 کے آغاز میں ہی عظیم بنگال قحط تکنیکی طور پر ختم ہو چکا تھا، کیونکہ غذائی اجناس کی فراوانی کی وجہ سے قیمتیں ایک بار پھر باقاعدہ ہو گئیں۔ لیکن نومبر 1943 سے لے کر 1944 کے بیشتر مہینوں میں، جنگ اور قحط کے بعد، طاعون نے حملہ کیا جس کے نتیجے میں متعدد اموات واقع ہوئیں۔ اس کے نتیجے میں، چیچک، ہیضہ اور ملیریا نے ایک خوفناک منظر پیدا کر دیا۔ دسمبر 1943 میں اموات کی شرح اپنے عروج پر پہنچ گئی، اور 1944 کے دوران اموات کی تعداد میں آہستہ آہستہ کمی آنے لگی۔ ایک بار پھر، موت کی بلند شرح سے نمٹنے میں بنگال حکومت نے اپنی غیر منظم انتظامیہ اور نااہلی کا مظاہرہ کیا۔

22.5 عالمی سیاسی منظر نامے میں تبدیلی (Change in the International Political Arena)

دوسری عالمی جنگ نے دنیا کی پوری تصویر بدل کر رکھ دی۔ پرانے سامراجی ممالک برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور دیگر جنگ کی وجہ سے کمزور ہو گئے۔ یہ ممالک اب اتنے طاقتور نہیں تھے کہ قوم پرست تحریکوں کا مقابلہ کر سکیں۔ جنگ کے بعد امریکہ اور سوویت یونین دو مضبوط طاقتوں کی شکل میں سامنے آ گئے۔ جن ممالک پر جرمنی کا قبضہ تھا، وہ ہٹلر کی شکست کے بعد سوشلسٹ افکار سے متاثر ہو گئے۔ ان ممالک نے سامراجیت اور سامراج ممالک کی مخالفت کی۔ اس طرح، دوسری عالمی جنگ ایک ایسی جنگ تھی جس نے فاشزم کو تباہ کر دیا، اور سامراجیت پر شدید ضربیں لگائیں۔

22.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ہندوستان کی قومی تحریک ایک معروف اور شاندار جدوجہد تھی۔ اس جدوجہد کے ذریعے ہندوستان کے لوگوں نے دنیا کی سب سے طاقتور سلطنت کو چیلنج کیا اور آزادی حاصل کی۔ اس تحریک نے مختلف مذہبی، علاقائی اور لسانی گروہوں سے تعلق رکھنے والے لاکھوں افراد (مرد اور خواتین) کو اکٹھا کیا۔ یہ ایک ایسی جدوجہد تھی، جس نے ہندوستان کے تمام لوگوں کو اس طرح متحد کر دیا کہ اس سے پہلے کسی چیز نے انہیں متحد نہیں کیا تھا۔ مختلف مذاہب، ذاتوں اور عقیدوں کے لوگوں کے اتحاد نے لوگوں کو دوبارہ زندہ ہونے کا ثمر عطا کیا۔ برطانوی سامراجیت کی تدابیر سے بھڑکانے والی فرقہ وارانہ طاقتوں پر قابو پا لیا گیا، اور اس کے بعد ہی ہندوستانی عوام نے غیر ملکی جوئے کو اتار کر پھینک دیا۔ یہ اتحاد اس جدوجہد کی کامیابی کی بہترین امید تھی۔ ایم۔ کے۔ گاندھی، جواہر لعل نہرو، سردار پٹیل اور مولانا آزاد جیسے عظیم رہنماؤں کی

قابل تعریف قیادت میں یہ اتحاد قائم ہوا۔ وحشیانہ جبر کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی ہمت، اور تقسیم کرنے والی طاقتوں کے سامنے یکجہتی کا مظاہرہ ہمارے وطن کا سب سے قیمتی ورثہ ہے۔ آزادی کے ساتھ ہی ہندوستانی عوام کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، اور ایک نئے اور خوشحال ہندوستان کی تعمیر پر غور کیا گیا۔ خوشحال ہندوستان کی تعمیر نو کی شروعات "ہر آنکھ سے ہر آنسو پونچھا جائے گا" کے نعرے سے کی گئی۔

22.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

انفرادی ستیہ گرہ	:	اگست پیشکش کے ردِ عمل میں، یہ ہندوستانیوں کے مطالبات کو پورا کرنے میں برطانوی حکومت کی نااہلی کے خلاف احتجاج تھا۔ نیز، ہندوستانی یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ان کی جنگ میں شرکت رضاکارانہ نہیں ہے۔
ہندوستان چھوڑو تحریک	:	ہندوستان چھوڑو تحریک ایک ایسی تحریک تھی جو کل ہند کانگریس کمیٹی کے بمبئی اجلاس میں گاندھی نے 8 اگست 1942 کو دوسری جنگ عظیم کے دوران شروع کی تھی، جس میں ہندوستان میں برطانوی راج کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔
آزاد ہند فوج	:	آزاد ہند فوج کی بنیاد موہن سنگھ نے یکم ستمبر 1942 کو جنوب مشرقی ایشیا میں رکھی تھی۔ اس کا مقصد ہندوستان کو برطانوی راج سے آزادی دلانا تھا۔
ذخیرہ اندوزی	:	ذخیرہ اندوزی سے مراد غذائی اجناس جمع یا اکٹھا کرنا ہے۔ خوراک کی ذخیرہ اندوزی اکثر خوراک کے گلنے کا باعث بنتی ہے جس سے آخر کار قحط کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔
طاعون	:	طاعون ایک متعدی بیماری ہے جو جانوروں اور انسانوں کو متاثر کرتی ہے۔ یہ Yersinia pestis جراثیم کی وجہ سے ہوتا ہے۔

22.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

22.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. دوسری عالمی جنگ کس سال شروع ہوئی؟
2. ایڈولف ہٹلر کا تعلق کس ملک سے تھا؟
3. ونسٹن چرچل کس ملک کے وزیر اعظم تھے؟
4. 'The Constitutional Maladies of India' کس کی تصنیف ہے؟
5. تحریک پاکستان کس سال منظور ہوئی؟
6. ہندوستان کا وائسرائے کون تھا جس نے اگست 1940 کی پیشکش کی؟
7. انفرادی ستیہ گرہ تحریک کس سال شروع ہوئی؟

8. ''کرو یا مرو'' کا نعرہ کس نے دیا؟

9. آزاد ہند فوج (انڈین نیشنل آرمی) کی بنیاد کس نے رکھی؟

10. ''جے ہند'' کا نعرہ کس نے دیا؟

22.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. اگست 1940 کی پیشکش کی اہم خصوصیات کا جائزہ لیں۔
2. انفرادی ستیہ گرہ تحریک کی اہمیت کو واضح کریں۔
3. کرپس مشن پر ایک نوٹ لکھیں۔
4. نظریہ پاکستان کی ابتداء کی وضاحت کیجیے۔
5. 1943 کے عظیم بنگال قحط کے پھیلنے کی وجوہات کا جائزہ لیں۔

22.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوستان چھوڑو تحریک کی اہمیت کی وضاحت کیجیے۔
2. ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں انڈین نیشنل آرمی کے کردار پر روشنی ڈالیں۔
3. '1943 کا عظیم بنگال قحط ایک انسان ساختہ تباہی تھی۔' بحث کیجیے۔

22.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bhargava, M.L., *History of Modern India*, Reliance Publishing House, Delhi, 2002.
2. Bose, Sugata and Ayesha Jalal, *Modern South Asia*: *History, Culture, Political Economy*, Oxford University Press, New Delhi, 2004.
3. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin Books, Delhi, 1989.
4. Chaurasia, R.S., *History of Modern India, 1707 A.D. upto 2000 A.D.*, Atlantic Publishers, Delhi, 2011.
5. Desai, A.R., *Social Background of Indian Nationalism*, Popular Prakashan Ltd., Delhi, 2011.
6. Grover. B.L. and S. Grover, *A New Look at Modern Indian History*, S. Chand & Co. Ltd., New Delhi, 2006.
7. Khan, Yasmin, *The Raj at War*: *A People's History of India's Second World War*, Penguin, Gurgaon, 2015.
8. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal*: *A New History of British India*, HarperCollins, Noida, 2021.
9. Sarkar, Sumit, *Modern India, 1885–1947*, MacMillan, Delhi, 2006.
10. Sharma, L.P., *History of Modern India*, Konark Publishers Pvt. Ltd, Delhi, 1989.

اکائی 23۔ تقسیم ہند

(Partition of India)

اکائی کے اجزا

23.0 تمہید

23.1 مقاصد

23.2 ہندوستانی سیاست میں علاحدگی پسند رجحانات

23.3 مسلم لیگ کا عروج اور ارتقا

23.3.1 مسلم لیگ کے قیام کے اسباب

23.3.2 آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام

23.4 تحریک پاکستان

23.4.1 پس منظر

23.4.2 تحریک کا آغاز

23.4.3 تحریک کا ارتقا

23.5 1945 کے بعد کے واقعات: تقسیم اور آزادی

23.5.1 سی۔آر۔فارمولا

23.5.2 گاندھی-جناح مذاکرات

23.5.3 دیسائی-لیاقت معاہدہ

23.5.4 ویول پلان اور شملہ کانفرنس

23.5.5 کیبنٹ مشن پلان

23.5.6 یوم راست کاروائی

23.5.7 دستور ساز اسمبلی

23.5.8 ماؤنٹ بیٹن پلان اور حصول آزادی

23.6 اکتسابی نتائج

23.7 کلیدی الفاظ

23.8 نمونہ امتحانی سوالات

23.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

23.0 تمہید (Introduction)

اپریل 1945 میں یوروپ میں دوسری عالمی جنگ کے بعد ہندوستانی قومی تحریک ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوئی۔ قومی رہنماؤں کی جیلوں سے رہائی کے بعد اُن لوگوں میں جنھوں نے مزاحمت کے ایک اور مرحلے غالباً جدوجہد آزادی کے آخری مرحلہ کی جانب دیکھنا شروع کر دیا تھا، ایک نیا جذبہ پیدا ہوا۔ اسی کے ساتھ حسبِ ذیل اسباب کی بنا پر قومی تحریک کے سلسلہ میں برطانیہ کے رویے میں بھی تبدیلی آئی۔ دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں عالمی سیاسی منظر نامہ میں طاقت کا توازن تبدیل ہوا۔ برطانیہ کی جگہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین بڑی طاقتوں کے طور پر اُبھرے۔ یہ دونوں طاقتیں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے تئیں ہمدرد تھیں۔ جنگ نے برطانیہ کی معاشی اور فوجی طاقت کو نقصان پہنچایا تھا۔ برطانیہ میں سیاسی صورتِ حال بھی تبدیل ہوگئی تھی۔ کنزرویٹو پارٹی کو جو ہندوستان کے مطالبہ آزادی کی مخالفت کرتی تھی، انتخابات میں زبردست شکست ہوئی تھی۔ جنگ کے دوران رہنے والے وزیر اعظم ونسٹن چرچل، جنھوں نے 'برطانوی سامراج' کو ختم کرنے سے انکار کر دیا تھا، وزیر اعظم نہیں رہے تھے۔ کلیمینٹ اٹلی کی زیر قیادت لیبر پارٹی برسر اقتدار آگئی تھی۔ یہ پارٹی ہندستان پر برطانوی حکومت کو جاری رکھنے کے خلاف تھے۔ آئی این اے (آزاد ہند فوج) کی سرگرمیوں کی وجہ سے انگریزوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ قومی تحریک کو کچلنے کے لیے حکومت انتظامیہ اور مسلح فورسیز سے متعلق ہندستانیوں پر مزید انحصار نہیں کر سکتی تھی۔ جنگ کے بعد ہندوستانیوں کا جو پر اعتماد اور پختہ رویہ سامنے آیا تھا اس سے انگریزوں سے سمجھ لیا تھا کہ ہندوستانی غیر ملکی حکومت کی ذلت کو اب مزید برداشت نہیں کریں گے۔ جنگ کے بعد سارے ملک میں بڑے پیمانے پر محنت کشوں میں بے چینی تھی۔ ہر صنعت میں ہڑتالیں ہونے کا خطرہ تھا۔ کسانوں میں بھی بے چینی بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی اور یہ زیادہ پر تشدد ہو گئی تھی۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلباء ہڑتالیں، مظاہرے اور جلوس منتظم کرانے میں پیش پیش تھے۔ اب برطانیہ نے ہندوستان کو آزادی دینے کا فیصلہ کیا، لیکن ساتھ ہی اپنی سابقہ پالیسیوں سے ملک میں اختلافات کے بیج بھی بو دیے جو آزادی کے وقت تک تناور درخت بن چکے تھے۔ 19 ویں صدی کی آخری دہائیوں میں ہندوستانی سیاست میں فرقہ پرستی کا ظہور ہوا۔ دو بڑے مذہبی گروہوں -ہندوؤں اور مسلمانوں کے کچھ ماہرین تعلیم اور سماجی مصلحین نے مذہب کی بنیاد پر منظم ہونا شروع کیا اور اپنی اپنی فرقوں کے مفادات کو فروغ دینے کے لیے کام کرنے کا دعویٰ کیا۔ اس وقت فرقہ واریت میں جو نئی پیش رفت ہوئی جسے

'دو قومی نظریہ' کہا جاتا تھا۔ اس نظریہ کے مطابق ہندوستان دو الگ الگ قوموں پر مشتمل تھا یعنی مذہب کی بنیاد پر منقسم تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، دونوں فرقوں کے درمیان اختلافات شدت اختیار کر گئے اور فرقہ وارانہ فساد کی بنیاد پڑی جس کے نتیجے میں ہندوستان کے لوگوں کے لیے المناک نتائج بر آمد ہوئے اور ملک کی تقسیم ناگزیر ہو گئی۔

23.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- برطانوی ہندوستان میں علاحدگی پسندانہ رجحانات سے واقف ہو سکیں گے۔
- فرقہ وارانہ سیاست اور تقسیم کے وقت رہنماؤں کی سیاسی اولوالعزمیوں کو سمجھ سکیں گے۔
- مسلم لیگ اور اس کی سرگرمیوں کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ہندو فرقہ وارانہ تنظیموں سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہندوستان کی تقسیم اور آزادی کی جانب پیش رفت سے واقف ہو سکیں گے۔
- نئے ہندوستان کی تعمیر کا مشاہدہ کر سکیں گے۔

23.2 ہندوستانی سیاست میں علاحدگی پسند رجحانات (Separatist Trends in Indian Politics)

ہندستانی قومی سیاست میں علاحدگی پسند رجحانات کا بنیادی سبب ہندو اکثریت سے مسلم اقلیت کو تکلیف تھی کیونکہ صنعت و تجارت، سرکاری نوکریوں، تعلیم اور پیشوں پر اکثریت کا غلبہ تھا۔ عام طور پر ملک کی معاشی پسماندگی نے بھی علاحدگی پسند رجحانات کو اُبھارنے میں کردار ادا کیا۔ نتیجتاً ملک مخالف سے زیادہ ہندو مخالف سرگرمیاں ہونے لگیں۔ مسلمانوں کے ایک طبقہ میں علاحدگی پسندیدہ رجحان 1906 میں اُس وقت اپنے عروج پر پہنچ گیا جب آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی۔ لیگ نے بنگال کو تقسیم کیے جانے کی حمایت کی اور مسلمانوں کو خصوصی تحفظات دینے کا مطالبہ کیا۔ بعد ازاں اس کا علاحدہ ووٹنگ کرانے کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔ اگرچہ ہندو فرقہ پرستوں کی کوئی منظم پارٹی مسلم لیگ کے ساتھ تشکیل نہیں دی گئی تھی۔ لیکن فرقہ وارانہ نظریات میں اُبھار آیا تھا۔ متعدد ہندو مصنفین اور سیاسی کارکنان نے ہندو قوم پرستی کی بات شروع کر دی تھی اور انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کو غیر ملکی قرار دیا تھا۔

1915 میں ہندو فرقہ پرستی نے منظم شکل تب اختیار کی جب مدن موہن مالویہ نے ہندو مہاسبھا قائم کی۔ 1925 میں ہندو فرقہ پرستی کا ایک اور منظم اظہار راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے قیام کی شکل میں ہوا۔ دونوں فرقوں، ہندو اور مسلمانوں نے خود پر مرکوز ایک تنگ ذہنیت کو مادی بہبود اور سماجی و سیاسی حیثیت سے متعلق معاملات میں فروغ دیا۔ انگریزوں نے اس کا فائدہ اُٹھایا۔ ملک میں متحد قومی جذبہ کے فروغ کو روکنے کے لیے انگریزوں نے لوگوں کو مذہبی خطوط پر تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ بنگال کی تقسیم (1905) اور 1909 کی اصلاحات کے ذریعہ فرقہ وارانہ بنیاد پر انتخاب، انگریزوں کی Divide and Rule (بانٹو اور راج کرو) پالیسی کی واضح

مثالیں ہیں۔ فرقہ وارانہ گروہ، کانگریس کے خلاف ہاتھ ملانے میں بھی نہیں ہچکچائے۔ دراصل کسی بھی فرقہ پرست گروہ یا پارٹی نے غیر ملکی حکومت کے خلاف کسی بھی جدوجہد میں حصہ نہیں لیا۔ ان علاحدگی پسند رجحانات کا ہندوستانی معاشرہ اور جدوجہد آزادی پر منفی اثر پڑا۔ علاحدگی پسند گروہوں نے فرقہ وارانہ جذبات اُبھارے اور قوم پرست طاقتوں کو کمزور کیا۔ اُنہوں نے حصول آزادی میں بھی چند برسوں کے لیے تاخیر کر دی۔ مسلمانوں کے لیے الگ ملک کا مطالبہ اور بالآخر تقسیم ہند کا سبب بھی وہی تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علاحدگی پسند رجحانات کا نتیجہ فرقہ وارانہ فسادات کے سماجی مسئلہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ فسادات آزاد ہندوستان کی ایک مستقل علامت بن گئے۔

23.3 مسلم لیگ کا عروج اور ارتقا (Rise and Growth of the Muslim League)

23.3.1 مسلم لیگ کے قیام کے اسباب (Reasons for the Formation of the Muslim League)

تقسیم کرو اور حکومت کرو کی برطانوی پالیسی: انگریزوں نے مغل حکمرانوں کا تختہ الٹ کر ہندوستان پر اپنی مکمل حکمرانی قائم کی۔ چونکہ مغل تخت، ہندوستان میں عام مسلمانوں کے لیے ایک علامتی اہمیت اور جذباتی قدر و منزلت کا حامل تھا، اسے مسلم شناخت پر حملہ کے طور پر دیکھا گیا۔ اس کے نتیجے میں، مسلمان برطانوی حکومت کے سخت ناقد بن گئے اور 1857 کی بغاوت میں بھرپور طریقے سے حصہ لیا۔ جواب میں انگریزوں نے بغاوت کو کچلنے کے بعد مسلمانوں پر ظلم کیا۔ تاہم، 1870 کے بعد ان کے رویے میں ایک عظیم تبدیلی آئی کیونکہ انہیں احساس ہو چلا تھا کہ قوم پرستی کی بڑھتی ہوئی لہر کو روکنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کو تقسیم کرنا ضروری ہے۔ اس کے نتیجے میں، نوآبادیاتی حکومت نے مسلمانوں کے تئیں خوشامد کی پالیسی اپنائی اور انہیں اپنی سیاسی انجمنیں بنانے کی ترغیب دی۔ ہندوستان پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے برطانوی حکومت نے 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی اپنی بدنام زمانہ پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ 1871 میں حکومت نے ایک قرارداد منظور کی جس کے تحت پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں میں مسلمانوں کے لیے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور مسلم تعلیمی اداروں کے لیے سرکاری امداد میں اضافہ کیا۔ مسلمان حکمرانوں کو لٹیروں اور ہندو حکمرانوں کو اپنی مسلم رعایا کے ساتھ ظالم کے طور پر پیش کیا گیا۔ بنگال کی تقسیم کو بھی مسلمانوں کے مفاد میں ایک اقدام کے طور پر ظاہر کیا گیا۔ پریس، پوسٹرز، لٹریچر وغیرہ کے ذریعے ذات پات اور مذہب کی کمیوں کو جان بوجھ کر بڑھایا گیا اور فرقہ پرست رہنماؤں کو اپنی فرقوں کے مستند نمائندوں کے طور پر قبول کیا گیا۔

ہندی اردو تنازعہ: سب سے طویل عرصے تک، اردو، اتر پردیش، پھر متحدہ صوبوں میں سرکاری زبان رہی۔ عدالت میں تمام درخواستیں اردو میں لکھنی پڑتی تھیں۔ اس سے ہندوؤں میں کافی ناراضگی پیدا ہوئی کیونکہ ان کے ذریعہ بولی جانے والی زبان دیوناگری رسم الخط کی ہندی یا ہندوستانی تھی۔ ہندوؤں کے مسلسل احتجاج کے نتیجے میں، برطانوی حکومت نے 1900 میں ایک حکم جاری کیا کہ تمام درخواستیں دیوناگری رسم الخط میں ہندی میں جمع کی جائیں۔ عدالتی سمن اور تمام سرکاری اعلانات کے لیے ہندی اور اردو دونوں کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ سے اتر پردیش میں راسخ العقیدہ حکمران طبقے کے مسلمانوں میں عدم تحفظ پیدا ہوا۔ چونکہ ان علاقوں کے مسلمان نسبتاً سیاسی طور پر منظم تھے، اس لیے ان میں فرقہ وارانہ جوش نے مسلم لیگ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

کانگریس لیڈروں کا مذہبی/احیاء پسندانہ رجحان: بال گنگادھر تلک اور لالہ لاجپت رائے جیسے بنیاد پرست کانگریسی رہنما اپنی سیاسی گفتگو میں مذہبی اصطلاحات اور علامتوں کا استعمال کرنے سے باز نہیں آئے۔ در حقیقت کئی بار انہوں نے ہندو مت کے روایتی تصورات سے تحریک حاصل کی۔ تلک نے اپنی طرف سے گنیش چتر تھی اور شیواجی جینتی کے عوامی تہواروں کو منانا شروع کیا تاکہ ہندوستانیوں میں ان کی قدیم ثقافت کے لیے فخر پیدا کیا جا سکے۔ یہ بھی بڑے پیمانے پر عوام کو متحرک کرنے کے لیے کیا گیا۔ اگرچہ یہ فرقہ وارانہ ایجنڈے کے ساتھ نہیں کیا گیا تھا، لیکن اس نے بالآخر مسلمانوں کو کانگریس کی سیاست سے دور کر دیا۔

مسلم فرقہ کی نسبتاً پسماندگی: مسلمانوں میں فرقہ وارانہ اور علیحدگی پسندانہ سوچ کا رجحان اس وجہ سے بڑھا کہ ان کی تعلیم، تجارت اور صنعت میں اس وقت کی نسبتاً پسماندگی تھی۔ اعلیٰ طبقے کے مسلم زمینداروں اور اشرافیہ کی انگریزوں کے خلاف دشمنی کی وجہ سے مسلمان زیادہ تر جدید مغربی تعلیم سے دور رہے۔ مسلمان کسی بھی منظم صنعت کی ترقی میں بہت زیادہ ملوث نہیں تھے اور سرکاری خدمات میں داخل ہونے کے لیے مغربی تعلیم سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے۔ نتیجے کے طور پر، وہ لبرل ازم سے متاثر نہیں ہوئے جیسا کہ اس وقت کے ہندوؤں نے کیا تھا۔

بنگال کی تقسیم اور کانگریس کا رویہ: 1905 میں برطانوی حکومت کی طرف سے بنگال کی تقسیم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کو بہت زیادہ بگاڑ دیا۔ تقسیم نے مسلمانوں کے لیے بہت سے سیاسی فوائد کو یقینی بنایا لیکن ہندوؤں نے بنگال کی تقسیم کے خلاف مخالفانہ اور پر تشدد انداز میں رد عمل ظاہر کیا۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ہندو مسلمانوں کو ان کا جائز حصہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ مسلمانوں کو بہت مایوسی ہوئی جب انہوں نے دیکھا کہ کانگریس غیر جانبداری کے اپنے تمام دعووں کے باوجود ہندو انتہا پسندوں کی کھل کر حمایت کر رہی ہے۔ یہ مسلم لیگ کے قیام کا سب سے بڑا سبب تھا۔

برطانیہ میں حکومت کی تبدیلی: برطانیہ میں 1905 کے انتخابات میں لبرل پارٹی دوبارہ اقتدار میں آ گئی۔ پارٹی نے ہندوستان کے لیے سیاسی اصلاحات کا پروگرام دیا۔ مسلم قائدین نے صورتحال پر تبادلہ خیال کیا اور مسلمانوں کے مطالبات کو حکومت کے ساتھ اٹھانے کے لیے مشترکہ مقصد بنانے کا فیصلہ کیا۔

23.3.2 آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام (Foundation of the All-India Muslim League)

شملہ وفد: برصغیر کے تمام حصوں سے لیے گئے پینتیس اعلیٰ درجے کے مسلم رہنماؤں نے یکم اکتوبر 1906 کو اس وقت کے وائسرائے لارڈ منٹو سے شملہ میں ملاقات کی۔ ان کے ذریعے پیش کردہ اہم مطالبات کچھ اس طرح تھے؛ علاحدہ انتخابی حلقوں کا حق مسلمانوں کو دیا جائے۔ مسلمانوں کو مرکزی مقننہ میں مزید تین نشستیں دی جائیں۔ مسلمانوں کو سول سروسز میں کوٹہ دیا جائے۔ مسلمانوں کو یونیورسٹیوں کی سینیٹ اور سنڈیکیٹس میں نمائندگی دی جائے۔ مسلمانوں کو مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے امداد دی جائے۔ وائسرائے نے مسلمانوں کے مطالبات سے ہمدردی کا اظہار کیا اور انہیں برطانوی حکومت کے سامنے اٹھانے کا وعدہ کیا۔ وائسرائے کے جواب سے مسلم لیڈروں کو بہت حوصلہ ملا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد: آل انڈیا محمڈن ایجو کیشنل کانفرنس ایک تنظیم تھی جس کی بنیاد سر سید احمد خان نے 1886 میں علی گڑھ میں رکھی تھی جس کا مقصد ہندوستان میں مسلم فرقہ میں جدید اور آزاد خیال تعلیم کو فروغ دینا تھا۔اس کا20واں سالانہ اجلاس دسمبر 1906 میں نواب وقارالملک کی صدارت میں ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔اس میں نواب سلیم اللہ خان، مولانا ظفر علی خان، حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی وغیرہ جیسے مسلم رہنماوں نے شرکت کی۔نواب سلیم اللہ خان نے مسلمانوں کے مفادات کا خیال رکھنے کے لیے سینٹرل محمڈن ایسوسی ایشن کے قیام کا خیال پیش کیا۔آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی قرارداد نواب سلیم اللہ خان نے پیش کی جس کی مندرجہ بالا مسلم رہنماؤں نے تائید کی۔اسی مناسبت سے 30 دسمبر 1906 کو آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔سر آغا خان کو پہلا صدر بنایا گیا۔مسلم لیگ کا قیام انگریزوں کی 'تقسیم کرواور حکومت کرو' کی حکمت عملی کا پہلا ثمر سمجھا جاتا ہے۔

مسلم لیگ کے اغراض ومقاصد یہ تھے:

- مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ اور تحفظ اوران کے مطالبات کو برطانوی حکومت تک پہنچانا۔
- برطانوی حکومت کے لیے مسلمانوں میں احترام اور نیک نیتی کا جذبہ پیدا کرنا۔
- ہندوستان کی مختلف برادریوں کے درمیان بھائی چارہ کو فروغ دینا۔

لیکن، لیگ کا بنیادی مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ اور آگے بڑھنااور حکومت کو ان کی ضروریات کی نمائندگی کرنا تھا۔1906 سے 1910 تک پارٹی کا مرکزی دفتر علی گڑھ میں رہا۔اس نے 1908 میں اپنی لندن برانچ قائم کی۔1910 میں اس کا ہیڈ کوارٹر لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد اس کی سیاسی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔مولاناوں (محمد علی اور شوکت علی)، فضل الحق، مظہر الحق،اور فضلی حسین کی قیادت میں، 1912 تک اس میں نہ صرف بہت سے نوجوان مسلمان شامل ہوئے بلکہ کانگریس کے کچھ مسلم ارکان بھی شامل ہوئے جنہوں نے،تاہم،اپنی جماعت کو برقرار رکھا۔مؤخر الذکر کی رکنیت. 1906 میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہونے والے محمد علی جناح سات سال بعد 1912 میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔

دسمبر 1906 میں ہی مسلم لیگ نواب وقار الملک نے ڈھاکہ میں تشکیل دی اور اُنہوں نے ہی اس کے پہلے اجلاس کی صدارت بھی کی۔1906 تا 1910 اس پارٹی کا مرکزی دفتر علی گڑھ میں رہا۔اس کے ہیڈ کوارٹر کی لکھنو منتقلی کے بعد اس کی سیاسی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا فضل الحق، مظہر الحق اور فضلِ حسین کی رہنمائی میں 1912 تک نہ صرف متعدد مسلم نوجوان بلکہ کانگریس کے کچھ مسلم ممبران بھی جنہوں نے موخرالذکر میں اپنی ممبری بھی برقرار رکھی،اس میں شامل ہوئے۔خلافت تحریک(1920-24) کے دوران یہ پارٹی بس برائے نام ہی موجود تھی اور اپنے اجلاس وہاں منعقد کرتی تھی جناب خلافت کانفرنسیں ہوتی تھی۔ہندوستان کے آئینی مسائل حل کرنے کے لیے 1928 میں ایک آل پارٹی کانفرنس پہلے دہلی اور بعد میں پونہ میں منعقد ہوئی۔اس کے لیے ایک سب کمیٹی موتی لال نہرو کی زیر قیادت قائم کی گئی جس کے رُکن علی امام، تیج بہادر سپرداور سبھاش چندر بوس تھے۔اگست 1928 میں اس سب کمیٹی نے

ایک رپورٹ جو 'نہرو رپورٹ' کے نام سے مشہور ہوئی، پیش کی گئی جس میں ہندوستان کے لیے 'حکومتِ خود اختیاری' کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ علاحدہ الیکشن کو نامنظور کر دیا گیا تھا اور بنگال و پنجاب کے مسلمانوں کے لیے سیٹوں کے ریزرویشن کو بھی مسترد کر دیا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں مسلمانوں کے کسی بھی مطالبے کو منظور نہیں کیا گیا تھا۔ نہرو رپورٹ سے غیر مطمئن مسلم لیگ نے جناح کو اس منصوبہ کا فاکہ تیار کرنے کی ذمہ داری دی، جو مستقبل کے کسی بھی آئین کی بنیاد ہو اور جس میں ایک خود مختار ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ پر زور دیا گیا ہو۔ جناح 14 نکات کے ساتھ آگے آئے۔ یہ نکات مسلمانوں کے تمام مفادات کا احاطہ کرتے تھے اور یہ ان کے اہم مطالبات بن گئے۔ انہوں نے آئندہ دو دہائیوں یعنی 1947 میں قیام پاکستان تک مسلمانوں کی فکر کو بہت زیادہ متاثر کیا۔

1930 میں ڈاکٹر محمد اقبال نے الہ آباد اجلاس کے اپنے تاریخی خطاب میں ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا۔ 1936 میں جناح نے صوبائی اسمبلیوں اور مرکزی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات لڑنے کے لیے ایک پارلیمانی بورڈ نامزد کیا۔ 1937 کے جنرل الیکشن میں لیگ نے ابتدائی حدود کے بواجود سیت اچھی کارکردگی نہیں دکھلائی۔ یہ استثنیا بنگال لیگ ملسم اکثریت کے حامل صوبوں میں خالی ہاتھ رہی۔ لکھنؤ اجلاس (1937) میں لیگ کے دو قومی نظریے کی توثیق ہوئی لیکن اس کے لاہور اجلاس (1940) میں ملک کی تقسیم کا مطالبہ کرنے والی تجویز پاس کی گئی۔ ہندوستانی قوم پرست پریس نے لاہور تجویز کو پاکستان تجویز قرار دیا حالانکہ اجلاس میں جو تقریر یہ بن کی تیس اُن میں یا تجویز کے متن میں اسی لفظ کا ذکر نہیں تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران لیگ حقیقتاً مضبوط ہد کی۔ 1946 میں عام اسمبلی انتخابات میں اس نے بہت اچھی کارکردگی دکھائی اور مرکز و صوبوں دونوں میں اس نے تقریباً تمام مسلم سیٹوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

23.3.1 تحریک پاکستان (The Pakistan Movement)

بیسویں صدی کی چوتھائی دہائی میں وہ طاقتیں زیادہ واضح ہو گئی تھیں، جنہیں آزاد ہندوستان کی آخری شکل بنانی تھی۔ لیگ نے اپنی اصلاح کرنا شروع کر دیا تھا اور 1940 تک وہ سیاسی منظر نامہ پر ایک قابل ذکر طاقت بن کر ابھر چکی تھی اور ایک ایسی فورس جس نے مسلمانوں کے لیے قومی علاقے کا مطالبہ کیا تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ایسی نظیریں پانا شاید ممکن ہے، جن میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ فرقہ کے علاحدہ شناخت اور مفادات جن پر سرسید احمد خان نے زور دیا تھا، منٹو گیس مارلے اصلاحات اور ایک دہائی بعد مونٹنگ۔ چیمس فورڈ اسکیم میں دفن ہیں۔ وہ آج کی ضرورت کے لیے کافی ہیں۔ تاہم بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے نصف اول میں یہ کافی نہیں نظر آتے۔ 1921 میں لیگ کے اجلاس کے صدر مولانا حسرت موہانی نے صلاح دی تھی کہ برطانوی ہندوستان میں ہندو اکثریت والے سات صوبوں کے مقابلہ میں مسلم اکثریت کے حامل چار صوبوں کو استعمال کیا جائے۔ اگرچہ یہ نظریہ ایک علاحدہ علاقے کے خیال کی جانب بڑھا تھا لیکن اس سے یہ خیال اپنی آخری شکل تک نہیں پہنچا تھا کیونکہ مسلمان ابھی تک ایک متحد ہندوستان میں رہنا چاہتے تھے۔ یہ رویہ بتدریج جاری و ساری رہا اور 1928 میں آغا خان نے آزاد ریاستوں کے لیے رضاکارانہ وفاق میں متحد مقتدر اعلیٰ علاقوں کے لیے اپنی وکالت میں اسے مضبوطی کے ساتھ پیش کیا تھا۔ یہ صورت حال اس وقت تک رہی جب تک 1930 میں ''دو قومی نظریہ'' کے موثر ترجمان محمد اقبال نے عوام کے درمیان اپنی بات نہیں رکھی تھی۔ محمد اقبال 1930 میں مسلم لیگ کے صدر تھے اور شاید ہندوستان کے مقبول ترین

اور موثر ترین مسلم شاعر تھے۔اپنے خطاب میں اقبال نے زور دے کر کہا تھا کہ اسلام کے مذہبی آئیڈیل معاشرتی نظام سے مربوط ہیں۔ایک کو مسترد کرنے کے معنی ہیں، دوسرے کو بھی مسترد کرنا۔ہندوستان میں جہاں ہر گروہ، ہر مذہب اور ہر فرقہ دوسرے کے وجود سے حسد رکھتا ہو، وہاں مستقبل کے ہندوستان کا مقصد ان اقدار کو متحد کرنا یا ملانا نہیں بلکہ ان میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہونا چاہئے۔انہوں نے اس سے ایک برس قبل دہلی میں منعقدہ کل پارٹی مسلم کانفرنس کی اس تجویز کو بھی تسلیم کیا تھا کہ مستقبل کے آزاد ہندوستان کو ایک وفاقی ماڈل پر مبنی ہونا چاہئے، جس میں صوبوں کو خود مختاری اور بچے ہوئے اختیارات حاصل ہوں۔ لیکن یہ نظریات ان کے اپنے ہی رہے اور انہیں نہ تو لیگ کی تجویز میں رسمی طور پر شامل کیا گیا اور نہ ہی وہ کچھ وقت کے لیے مسلم دانشوروں میں بھی مقبول ہوئے۔چوتھی دہائی کے وسط تک اقبال کی پوزیشن بڑھ گئی تھی۔تب تک وہ مسلمانوں کو ایک قوم اور ایک الگ سیاسی یونٹ ماننے لگے تھے اور جناح کو اپنے نقطہ نظر کے قریب لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نے نہ صرف مسلمانوں کو علاحدہ نشستیں دینے کا ایک مضبوط آرڈیننس بلکہ سندھ، نارتھ ویسٹ فرنیٹئر پراونس (این ڈبلیو ایف پی) پنجاب میں تواتر سے موجود اکثریتوں کو نئے مکمل صوبوں کی شکل دی اور 48.6 فیصد سیٹیں بنگال میں دیں۔1933 میں کیمبرج کے ایک طالب علم رحمت علی نے ایک پمفلیٹ شائع کیا جس میں اس نے ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک علاحدہ مسلم ریاست کی وکالت کی اور جسے اس نے پاکستان کا نام دیا جس کے معنی تھے ''پاک لوگوں کی سرزمین'' اور یہ لفظ پنجاب، افغانیہ (یعنی این ڈبلیو ایف پی) 'کشمیر'، 'سندھ' اور 'بلوچستان' کے فائنل حصے کے اولین حروف کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ یہ علاقہ محدود تھا اور اس میں بنگال کو جہاں مسلمان مرکوز تھے شامل نہیں کیا گیا تھا۔اس طرح الگ ملک پاکستان کے تصور نے معینہ شکل اختیار کر لی اور اسے عام وخاص کے لیے پیش کیا گیا لیکن 1935-36 میں اسے کم حمایت ملی اور یہ مقبولیت کوئی اہم مسئلے نہیں بنا تھا۔مگر پانچ سال کے اندر ہی منظر تبدیل ہو گیا۔

1934 کے بعد لیگ کی قسمت اس وقت بدل گئی جب یوپی کے سیاستداں لیاقت علی خان نے جناح کو جو انگلینڈ میں قیام پذیر تھے ہندوستان واپس آنے اور تنظیم کی ذمہ داری لینے کی ترغیب دی۔انہوں نے ایسا ہی کیا اور مارچ 1934 میں وہ مستقل صدر منتخب ہوئے اور جلد ہی وہ اپنی موجودگی کا احساس کرانے لگے۔ اگرچہ اس مرحلہ میں وہ کانگریس کے ساتھ تعاون کرنا اور مساوات کی بنیاد پر اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے خواہاں تھے مگر 1937 کے انتخابات نے اس تصویر کو کچھ بدل دیا۔لیگ میں نئی جان ڈالنے اور مسلمانوں کو زیادہ موثر بنانے کے اپنے عام پروگرام کے ایک حصے کے طور پر جناح نے محسوس کیا کہ خاص طور پر مسلمانوں کی پارٹی کو قانون سازی میں رول ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ممبئی میں لیگ کے 1936 کے اجلاس میں ان خیال کو قبول کیا گیا اور انتخابات لڑنے کا فیصلہ لیا گیا۔ایک مرکزی پارلیمانی بورڈ قائم کیا گیا اور جناح کو انتخابات کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔

لیگ نے انتخابات اور 1935 کے ایکٹ سے پیدا شدہ صورت حال سے جو نتائج اخذ کیے وہ دور رس تھے۔اقلیتی صوبوں میں ایسا نظر آیا کہ ان کی قسمت میں کبھی بھی حکومت تشکیل دینا نہیں ہے اور غیر مسلم ہندوستان پر زبردست گرفت کے ساتھ کانگریس ہمیشہ حاوی رہے

گی۔ اکثریتی صوبوں میں سیٹوں پر زور ان کے لیے نقصان دہ رہا اور کل اکثریت کے تحت انہیں صرف بنگال اور پنجاب دیے۔ بہر حال 1937 سے یہ ظاہر ہوا کہ ان صوبوں میں ان کی گرفت کمزور تھی۔ یہ واضح تھا کہ لیگ مسلم اکثریت والے صوبوں پر اپنی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے ترجیحی طور پر غیر مسلم لیڈروں کو اپنے غول میں لانا چاہتی ہے۔ علاوہ ازیں اس آئینی اسکیم کی مخالفت کرنی تھی جس نے اسے سیاسی طور پر غیر موثر بنادیا۔ آخری سہارے کے طور پر یہ خود اپنی شبیہ کو تبدیل کرنے کی تیاری کرتی اور ہندوستانی سیاست میں اپنے آپ کو آئندہ صرف ایک علاحدہ اقلیت نہیں بلکہ ایک الگ قوم مانے گی۔ نظریے میں اس تبدیلی کو ایک اہم سبب انتخابات کا نتیجہ انتخابی مہم کے دوران کانگریس اور لیگ ایک دوسرے کے مخالف نہیں رہے اور کم از کم یوپی میں ان کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کا شریفانہ معاہدہ نظر آتا تھا۔ لیکن کانگریس نے کچھ کامیابی کے بعد اپنی حکومت بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنی وزارتوں میں ان مسلمانوں کو بھی شامل کیا جنھوں نے کانگریس کے نظریات کو تسلیم کیا اور یہ مانا کہ انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں کانگریس ہی واحد تنظیم تھی۔ اس نے مسلم لیگ کے ممبران کو کیبنٹ میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ اس فیصلہ نے لیگ کو الگ تھلگ کر دیا اور شاید یہ اس کے نظریہ کے لیے ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔

1947 میں لیگ نے لکھنؤ میں 1936 کے پروگرام کو جاری رکھنے کا فیصلہ لیا۔ جناح نے تنظیم کو مضبوط بنانے اور دانشوروں سے زیادہ عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے دوبارہ زور دیا۔ تین ماہ کے اندر ہی 170 شاخیں قائم کی گئیں اور یہ دعویٰ کیا گیا کہ صرف یوپی میں ہی ایک لاکھ نئے ممبر بنائے گئے۔ ملاؤں اور مولویوں نے دیہی اور شہری عوام میں لیگ کے نظریہ کو پھیلایا جبکہ کسی حد تک کامیابی کے ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی کہ صوبائی قانون ساز اداروں میں غیر لیگی مسلم سیاستداں کو ساتھ لایا جائے۔ کانگریس مخالف پروپیگنڈہ مہم بھی شروع کی گئی۔ مسلمانوں کو سمجھایا گیا کہ وہ کانگریس راج میں انصاف اور اچھے کاموں کی توقع نہ کریں۔ کانگریس کے خراب انتظامیہ کے بارے میں بھی شکایتیں کی گئیں۔ جب 2 اور 3، دسمبر 1939 کو کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیے تو جناح نے اس کو 'یوم نجات' قرار دیا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کا تصور بھی زور پکڑنے لگا۔ 1938 میں سندھ صوبائی مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ اپنے پروپیگنڈہ میں 'قوم' اصطلاح کا استعمال کیا، جبکہ اسی سال لیگ کے سالانہ اجلاس نے جناح کو حکومت کی متبادل شکلوں کو جانچنے کا اختیار دیا۔ 1939 میں لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے مختلف اسکیموں کو پرکھنے کے لیے ایک سب کمیٹی تشکیل دی۔ بالآخر 1940 میں لیگ کے لاہور اجلاس میں ایک تجویز جو 'پاکستان قرارداد' کے نام جانی جاتی ہے، منظور کی گئی۔ بہ الفاظ دیگر لیگ نے یہ فیصلہ کیا اور ہندوستان کو مذہبی طور پر تقسیم کیا جانا اور علاحدہ ملک بنایا جانا چاہئے۔ کانگریس نے اس نظریے کی مخالفت کی اور یہ پوزیشن لی کہ ایک سیکولر اور متحد تنظیم ہونے کی وجہ سے وہ ملک کے تمام طبقوں اور گروہوں کی نمائندگی کرتی ہے اور یہ کہ ہندوستان ایک ملک ہے اور آزاد ہندوستان ایک سیکولر اور متحد ملک رہنا چاہئے۔ دونوں رویے ناقابل مفاہمت تھے اور اس مسئلہ کو حل کرنے میں مزید سات سال لگنے تھے۔ 1940 میں مطالبہ پاکستان ایک شیخ چلی کا خواب اور ایک غیر حقیقی مقصد لگتا تھا۔ مسلم دانشوروں، رہنماؤں اور متوسط طبقے یا عوام میں بھی اسے سنجیدگی سے قبول نہیں کیا گیا تھا۔ بعض مصنفین نے اس مطالبہ کا ایک سنجیدہ مقصد قرار نہیں دیا بلکہ اسے سودے بازی کا ایک حربہ کہا جسے لیگ مستقبل کے آئینی معاہدہ سے زیادہ سے زیادہ رعایتیں حاصل کرنے کے لیے استعمال کر سکتی تھی۔ اگر ایسا تھا تو 1940 کے بعد بھی پاکستان ناگزیر نہیں تھا اور ایسا لگتا ہے کہ جناح بعد میں بھی بعض مراحل پر پاکستان سے

کم کسی بات کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ تھے۔

1945 کے بعد کے واقعات: تقسیم ملک اور آزادی
(The Post-1945 Developments: Partition and Independence)

23.3.2 سی آر فارمولہ (The C.R. Formula,1944)

سی راج گوپال آچاریہ نے ہندوستان کے حصول آزادی کے لیے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے 1944 میں ایک فارمولہ تیار کیا جسے سی آر فارمولہ کہا جاتا ہے اور جس کی خاص باتیں تھیں: عبوری دور میں انٹرم حکومت کی تشکیل کے لیے مسلم لیگ کو کانگریس کے ساتھ تعاون۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد ہندوستان کے شمال مغرب اور مشرق میں مسلم اکثریت کے حامل اضلاع کی حدود کے تعین کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ ان اضلاع کے عوام رائے شماری کے ذریعہ ہندوستان سے علاحدگی کے مسئلے پر فیصلہ کریں گے۔ علاحدگی کی صورت میں دفاع، کامرس، مواصلات اور دیگر ضروری شعبوں کی مشترکہ طور پر نگرانی کے لیے دونوں حکومتوں کے درمیان معاہدہ ہوگا۔

23.3.3 گاندھی جناح مذاکرات (Gandhi–Jinnah Talks, 1944)

سی آر فارمولہ کی روشنی میں انگریزوں کے جانے کے، جو ناگزیر لگتا تھا، بعد ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں غور کرنے کے لیے گاندھی نے جناح سے ملاقات کی تجویز رکھی۔ 9، ستمبر 1944 کو بمبئی میں مذاکرات شروع ہوئے اور 27، ستمبر تک جاری رہے۔ جناح نے ان کے خاتمے اور کسی معاہدہ پر پہنچنے میں ناکامی کا اعلان کیا۔ گاندھی کا کہنا تھا کہ چونکہ سی آر فارمولہ مسلم لیگ کے مطالبہ کو تسلیم کرتا ہے اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ لیگ اپنی لاہور تجویز کو جوان کے خیال میں دو قومی نظریے پر مبنی تھی ترک کرے۔ لیکن دو قومی نظریہ لیگ کی باضابطہ پالیسی بن چکا تھا لہٰذا جناح نے بحث کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی کو یہ بات تسلیم کرنی چاہئے اور ماننا چاہئے کہ ہندو اور مسلمان دو خود مختار قومیں ہیں۔ گاندھی چاہتے تھے کہ لیگ انگریزوں کے خلاف کانگریس کی جدوجہد میں فوری طور پر اس کی حمایت کرے۔ صرف انگریزوں کے جانے کے بعد ہی تقسیم پر غور کیا جائے۔ لیکن جناح انگریزوں کے جانے سے پہلے ہی تقسیم کو یقینی بنانا چاہتے تھے۔ اس طرح گاندھی اور جناح کے درمیان مذاکرات بغیر کسی مزید مفاہمت کے ناکام ہوگئے۔

23.3.4 دیسائی-لیاقت معاہدہ (Desai–Liaqat Pact, 1945)

گاندھی-جناح مذاکرات کی ناکامی کے بعد گاندھی سمجھ گئے کہ انگریز ہندوستان کو تب تک آزادی نہیں دیں گے جب تک کانگریس اور مسلم لیگ کے مستقبل اور عبوری حکومت کی تشکیل کے بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچتیں۔ لہٰذا گاندھی نے کانگریسی لیڈر بھولا بھائی جیون جی دیسائی سے تاکید کی کہ وہ مسلم لیگ کے لیڈروں کو منانے اور 1942-45 کی سیاسی پیچیدگی سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے کے لیے ایک اور کوشش کریں۔ جنوری 1945 میں بھولا بھائی دیسائی مسلم لیگ کے لیاقت علی خان سے ملے اور انہیں مرکز میں عبوری حکومت کی تشکیل

کے لیے تجاویز پیش کیں۔ان تجاویز پر رد عمل ظاہر کرتے ہوئے لیاقت علی نے معاہدہ کا اختصار شائع کیا۔اس کے مطابق کانگریس اور لیگ مرکز میں حسب ذیل خطوط پر عبوری حکومت قائم کریں گی۔کانگریس اور لیگ دونوں مساوی تعداد میں مرکزی عاملہ میں لوگوں کو نامزد کریں گی اور اقلیتوں بالخصوص درج فہرست ذاتوں اور سکھوں کو نمائندگی دی جائے گی۔دیسائی-لیاقت معاہدہ کے طور پر مشہور اس معاہدہ کو کانگریس یا لیگ نے رسمی طور پر کبھی منظور نہیں کیا۔

23.3.5 ویویل منصوبہ اور شملہ کانفرنس (Wavell Plan, and the Shimla Conference – 1945)

سی آر فار مولہ پر مبنی گاندھی-جناح مذاکرات کی ناکامی کے بعد اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ واویل نے آئینی تعطل کو ختم کرنے کے لیے ایک منصوبہ پیش کیا۔1945 میں اس پر غور کرنے کے لیے انہوں نے شملہ میں تمام ہندوستانی سیاسی پارٹیوں اور گروہوں کے رہنماؤں کی کانفرنس کی۔انہوں نے ایک منصوبہ پیش کیا جس کے تحت کمانڈران چیف کے کے استثنیٰ سے ایگزیکیٹو کونسل پوری طرح ہندوستانیوں کو سونپی جانی تھی اور کونسل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی دی جائے گی۔یہ ہندوستان کے لیے نیا آئین تیار کیے جانے تک کے لیے ایک عبوری انتظام تھا لیکن کانفرنس اور منصوبہ جناح کی زیر قیادت مسلم لیگ کے غیر منطقی رویے کی وجہ سے ناکام ہوئے۔وہ چاہتے تھے کہ ایگزیکیٹو کونسل کے مسلم ممبران صرف مسلم لیگ منتخب کرے تاہم یہ بات کانگریس کے لیے ناقابل قبول تھی۔

23.4 کیبنٹ مشن منصوبہ (The Cabinet Mission Plan, 1946)

انگلینڈ میں 1945 کے عام انتخابات میں چرچل کی زیر قیادت کنزرویٹو پارٹی کو سی آر اٹلی جو نئے وزیر اعظم تھے، کی قیادت والی لیبر پارٹی نے شکست سے دوچار کرایا۔لارڈ واویل کو لندن طلب بھی کیا اور انہیں مطلع کیا گیا کہ برطانیہ ہندوستان کو چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ بعد ازاں اسی سال (1945-46) میں ہندوستان کی صوبائی اسمبلیوں اور مرکز میں قانون ساز اسمبلی کے انتخابات کرائے گئے۔ان عام انتخابات میں کانگریس نے مرکزی قانون ساز اسمبلی میں 57 سیٹوں پر کامیابی حاصل کی۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے محفوظ 30 نشستوں پر قبضہ کیا۔صوبوں میں کانگریس کی اگرچہ 1937 میں 714 سیٹیں تھیں لیکن 1946 میں اس نے 923 نشستیں حاصل کیں۔ لیگ نے بھی بہتر کارکردگی دکھائی۔1937 میں یہ مسلمانوں کے 492 کے کوٹہ میں سے صرف اپنے 109 نمائندے کو ہی کامیابی سے ہمکنار کرا پائی تھی لیکن 1946 میں اس نے 425 سیٹوں پر کامیابی حاصل کی اور اس کا فیصد 86 تک پہنچ گیا تھا۔

24 مارچ 1946 کو کابینہ وزرا کا ایک خصوصی مشن جس میں لارڈ پیتھک لارینس، سر اسٹیورڈ کرپس اور اے وی الگیزنڈر شامل تھے۔ہندوستان آیا تھا کہ ہندوستان کی ممکنہ حد تک جلد سے جلد آزادی حاصل ہو سکے۔اس مشن نے ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی ہندوستان کے نمائندوں کے ساتھ غور وخوض کرنے میں تقریباً پانچ ہفتے لگائے۔آخر میں 5 مئی کو شملہ میں صوبوں کی گروہ بندی، وفاقی یونین کے کردار اور آئین ساز مشینری کے قیام پر غور کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کی تھی۔ لیکن جب کانگریس اور لیگ کے اختلافات ناقابل مفاہمت ہو گئے تو کانفرنس کو ختم کر دیا گیا۔16 مئی 1946 کو کیبنٹ مشن نے اپنا ایک بیان شائع کیا جس میں انہوں نے اپنی سفارشات پیش

کی تھیں جو کیبنٹ مشن منصوبہ کے طور پر جانی جاتی ہیں۔اس کی درج ذیل اہم دفعات تھیں:

- برطانوی ہندوستان اور شاہی ریاستوں پر مشتمل ہندیونین میں امور یعنی خارجہ امور، دفاع اور مواصلات کو دیکھے گی۔
- اس کے عاملہ بھی ہوگی اور مجلس قانون ساز بھی۔
- یونین کے امور کے علاوہ دیگر تمام امور اور بقیہ اختیارات برطانوی ہندوستان کے موجودہ دو معنی ہوں گے۔
- شاہی ریاستوں کے پاس وہ تمام امور ہوں گے جو یونین کے پاس نہیں ہیں۔
- صوبے اپنے گروہ (حتمی وفاقی) تشکیل دینے کے لیے خود مختار ہوں گے۔
- یونین کے آئین اور گروہوں کو یہ دفعہ دیکھنی ہوگی کہ کچھ ابتدائی مرحلوں کے بعد کوئی صوبہ اپنی قانون ساز اسمبلی میں ووٹوں کی اکثریت کے ساتھ آئین کی شرائط ضوابط پر نظر ثانی کرنے کے لیے کہہ سکتا ہے۔
- ہر صوبہ کو اس کی آبادی کے تناسب سے کل سیٹوں کی تعداد الاٹ کر کے حال ہی میں منتخبہ صوبائی قانون سازوں کی بنیاد پر آئین ساز اسمبلی کی تشکیل۔واحد قابل تبادلہ ووٹ کے ساتھ تناسبی نمائندگی کے طریقے سے انتخابات کرائے جانے تھے۔
- آئین سازی کے عمل کے دوران ملک کا انتظام چلانے کے لیے ایک عبوری حکومت جسے تمام اہم سیاسی پارٹیوں کی حمایت حاصل تھی قائم کی جانی چاہئے۔

مجوزہ آئین ساز اسمبلی 292 برطانوی ہندوستان کے اور 93 ہندوستانی ریاستوں کے ممبران پر مشتمل ہوتی۔ برطانوی ہندوستان کے ممبران کو 210 جنرل (وہ سب جو مسلمان یا سکھ نہیں تھے) 78 مسلم اور 4 سکھ سیٹوں میں تسلیم کیا گیا تھا۔ابتدائی میٹنگ میں اسمبلی کو نہ صرف ایک چیئرمین اور دیگر عہدیداروں کو بلکہ ایک مشاورتی کمیٹی کو بھی منتخب کرنا تھا۔ بعدازاں اسے اپنے آپ کو تین حصوں میں تقسیم کرنا تھا جو گروہ A,B,C کے صوبوں پر مشتمل ہوتے۔ گروہ A میں جو صوبے رکھے گئے وہ تھے مدراس، ممبئی، یونائیٹڈ پرونسیز اور بہار۔ وسطی صوبے اور اڑیسہ، گروہ B پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ پر مشتمل تھا جبکہ گروہ سی میں بنگال اور آسام کو رکھا گیا تھا۔ علاوہ ازیں یہ انتظام بھی کیا گیا تھا کہ کسی گروہ سے کسی صوبہ کی علاحدگی کا کوئی بھی فیصلہ نئے آئین کے تحت پہلے عام انتخابات کے بعد صوبائی قانون ساز یہ لے سکتی ہے۔ لیکن کانگریس اور لیگ دونوں ہی کیبنٹ مشن کی تجاویز پر اپنے ردعمل کا اظہار کرنے میں تذبذب میں مبتلا تھے۔ مجوزہ عبوری حکومت میں عہدوں کو بھرنے کے مسئلہ پر زیادہ نااتفاقی تھی۔ اس طرح کیبنٹ مشن دو اہم سیاسی پارٹیوں کے درمیان مفاہمت کرانے کی کوششوں میں مشتعل ہو گیا۔ بالآخر 29 جون کو وہ انگلینڈ کے لیے روانہ ہو گیا۔ کانگریس انتخابات لڑنے اور آئین ساز اسمبلی میں حصہ لینے کے لیے تو رضامند ہو گئی لیکن عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ مسلم لیگ نے منصوبہ کو منظور کر لیا اور اسے توقع تھی کہ وائسرائے عبوری حکومت قائم کرنے کے لیے لیگ کو مدعو کریں گے، لیکن وائسرائے نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن منصوبے کی اپنی منظوری کو واپس لے لیا۔ 12 اگست 1946 کو واویل نے کانگریس کو عبوری حکومت تشکیل دینے کے لیے مدعو کیا۔

23.5.6 یوم راست کاروائی (The Direct-Action Day)

اس سے قبل مسلم لیگ نے 30 جولائی 1946 کو یہ فیصلہ کیا وہ 16 اگست کو سارے ملک میں "یوم راست کارروائی" کے طور پر منائے گی۔ اس کشیدہ صورت حال میں کانگریس کا عبوری حکومت بنانے کے لیے مدعو کرنے کے وائسرائے کے فیصلے نے جلتی آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ اس لیے 16 اگست کو لیگ نے ملک میں عوامی مظاہرے اور ہڑتالیں کرائیں جن کے نتیجے میں سارے شہر میں فساد اور جھڑپیں ہوئیں۔ دوسری جانب کانگریس نے اپنے پہلے پہلے فیصلے کو پلٹ دیا اور وہ عبوری حکومت تشکیل دینے کے لیے تیار ہو گئی۔ شروع میں لیگ نے عبوری حکومت میں حصہ نہیں لیا لیکن بعد میں وہ حکومت میں شامل ہو گئی۔ تاہم لیگ نے آئین کا خاکہ تیار کرنے والی آئین ساز اسمبلی میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ اس نے پاکستان پر زور دینا جاری رکھا اور برطانوی حکومت سے آئین ساز اسمبلی کو تحلیل کرنے کے لیے کہا۔

23.5.7 آئین ساز اسمبلی (The Constituent Assembly, 1946–1950)

جون 1946 میں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ کل 292 نشستیں برطانوی ہندوستان کو دی گئیں۔ 4 سیٹیں خالی رہیں کیونکہ سکھوں نے اسمبلی میں شمولیت سے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح کانگریس نے کل 201، مسلم لیگ نے 73 اور 8 آزاد اور 6 دیگر پارٹیوں کے ممبران نے جیتیں۔ اسمبلی کی پہلی میٹنگ 9 دسمبر کو کونسل چیمبر کی لائبریری میں منعقد ہوئی۔ جس میں 205 ممبران نے شرکت کی۔ مسلم لیگ نے اسمبلی کا بائیکاٹ کیا اور علاحدہ ملک پاکستان کے لیے اپنے مطالبہ پر زور دیا۔ نوابوں اور راجاؤں نے بھی اسمبلی کا بائیکاٹ کیا۔ دریں اثنا ریاستوں کے عوام نے متحدہ ہندوستان میں ریاستوں کے الحاق کے لیے اپنی تحریک برقرار رکھی۔

23.5.8 ماؤنٹ بیٹن منصوبہ اور حصول آزادی

(Mountbatten Plan and the Declaration of Independence, 1947)

1947 کے اوائل میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا اور برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ جون 1948 سے قبل ہی ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں اقتدار سونپ دے گی۔ جون 1947 میں ماؤنٹ بیٹن نے ایک منصوبہ پیش کیا جو ہندوستان کو دو آزاد ملکوں ہندیونین اور پاکستان میں تقسیم کرنے سے متعلق تھا اور جون تھرڈ پلان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہندوستانی ریاستوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود ہی کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے ایک بل بہت عجلت یعنی 12 دنوں (4 جولائی تا 16) میں پیش کیا گیا اور 18 جولائی کو شاہی منظوری ملنے کے بعد یہ ایکٹ بن گیا جو انڈین انڈپینڈنٹس ایکٹ کے طور پر مشہور ہوا۔ اس ایکٹ کے ذریعے دو قومی نظریہ کے قیام کے لیے 15 اگست 1947 کی تاریخ طے کی گئی۔ تقسیم مکمل ہوئی اور دو مملکتوں ہندوستان اور پاکستان کو اقتدار منتقل کر دیا گیا۔ پاکستان مغربی پنجاب، مشرقی بنگال، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ (این ڈبلیو ایف پی) پر مشتمل تھا۔ 15 اگست 1947 کو ہندوستان آزاد ہو گیا۔ مگر بدقسمتی سے آزادی کے لیے ہندوستانی عوام کی شاندار جدوجہد کی فتح حصول آزادی سے قبل اور بعد میں ہونے والے خوفناک واقعات سے داغدار ہو گئی۔ لاکھوں لوگوں نے اپنے گھر کھو دیے اور ہزاروں افراد مارے گئے۔ دونوں فرقوں سے متعلق لوگوں نے فرقہ وارانہ یکجہتی کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

23.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

دوسری عالمی جنگ کے بعد ہندوستانی قومی تحریک کے فروغ کے دوران فرقہ وارانہ رجحانات اپنے خوفناک سر ابھار رہے تھے، جن کے المناک نتائج ہندوستانیوں کے لیے برآمد ہوئے اور جن کی وجہ سے ملک تقسیم ہوا۔ فرقہ پرست پارٹیوں نے مذہب کی بنیاد پر اپنی سرگرمیاں شروع کیں اور یہ دعوے بھی کیے کہ وہ اپنے اپنے فرقوں کے مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے کام کر رہی ہیں۔ انگریز حکومت نے مسلم لیگ کی اس بات کے لیے حوصلہ افزائی کی کہ وہ ایک علاحدہ ملک کے لیے اپنی مانگ پر زور دے۔ اگرچہ گاندھی سے ممتاز رہنما مذہب پر مبنی تقسیم کے فارمولے کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن مذہبی گروہوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات نے پاکستان کی تشکیل میں تعجیل کی۔ برطانوی کیبنٹ مشن نے 1946 میں آزادی اور تقسیم کی جو تجویز پیش کی تھی اسے کانگریس نے منظور کر لیا۔ برطانوی پارلیمنٹ نے مشہور انڈین انڈیپنڈنٹس ایکٹ 1947 پاس کیا جس نے برطانوی ہندوستان کو ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کر دیا۔ ہندوستان نے 15، اگست 1947 کو اپنی آزادی حاصل کر لی۔ تقسیم ہند برطانوی ہندوستان کی عدم نوآبادیت کا نتیجہ تھی، جو تقریباً دو صدیوں سے نوآبادیاتی حکومت کے تحت رہا تھا۔ جیسے جیسے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد نے زور پکڑا، یہ سوال ایک اہم مسئلہ بن گیا کہ مختلف مذہبی فرقوں کے مطالبات کو کیسے پورا کیا جائے۔ محمد علی جناح کی قیادت میں آل انڈیا مسلم لیگ نے ایک علیحدہ مسلم قوم کی وکالت کی، جو بالآخر تحریک پاکستان میں تبدیل ہو گئی، تاکہ ہندو اکثریتی ہندوستان میں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔ ہندوستان کے آخری برطانوی وائسرائے لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم کا منصوبہ پیش کیا جسے ماؤنٹ بیٹن پلان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس منصوبے میں مذہبی خطوط پر ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا گیا، جس میں 15 اگست 1947 کو دو آزاد ریاستیں، ہندوستان اور پاکستان وجود میں آئیں۔

23.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

مسلم لیگ	کیبنٹ مشن منصوبہ	ویویل منصوبہ اور شملہ کانفرنس
سی آر فارمولہ	یوم راست کاروائی	آئین ساز اسمبلی

23.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

23.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. فرقہ واریت سے آپ کی کیا مراد ہے؟
2. شملہ کانفرنس کی کیا اہمیت ہے؟
3. سی۔آر۔ فارمولے کے اہم نکات کو شمار کریں۔
4. ڈیسائی لیاقت معاہدے سے آپ کی کیا مراد ہے؟

5. ویول پلان پر ایک نوٹ لکھیں۔
6. ڈائریکٹ ایکشن ڈے کی وضاحت کریں۔
7. گاندھی-جناح مذاکرات پر ایک نوٹ لکھیں۔
8. آئین ساز اسمبلی پر ایک نوٹ لکھیں۔
9. کیبنٹ مشن پلان کی اہم دفعات کی وضاحت کریں۔
10. محمد علی جناح پر ایک نوٹ لکھیں۔

23.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تقسیم کرو اور حکومت کرو کی برطانوی پالیسی کو آپ کیا سمجھتے ہیں؟
2. مسلم لیگ کی تشکیل کے عوامل کا جائزہ لیں۔
3. 1947 میں تقسیم ہند کا سبب بننے والے عوامل کی وضاحت کریں۔
4. ماؤنٹ بیٹن پلان کی اہم خصوصیات کیا تھیں؟
5. ہندوستانی آزادی ایکٹ کی وضاحت کریں۔

23.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. تحریک پاکستان کے مختلف مراحل پر تفصیلی گفتگو کریں۔
2. ''کچھ مورخین تقسیم کو فرقہ وارانہ سیاست کی انتہا کے طور پر دیکھتے ہیں''۔ بیان کا جائزہ لیں۔
3. آزاد ہندوستان میں قوم سازی کے لیے حکومت کی طرف سے اٹھائے گئے اقدامات کی وضاحت کریں۔

23.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Godbole, Madhav, *The Holocaust of Indian Partition: An Inquest*, Rupa Publications, Delhi, 2006.
2. Hasan, Mushirul (ed.), *India's Partition*: *Process*, *Strategy and Mobilization*, Oxford University Press, Delhi, 1993.
3. Ikram, S.M., *Indian Muslims and Partition of India*, Atlantic Publishers, New Delhi, 1992.
4. Islam, Shamsul, *Muslims against Partition*: *Revisiting the Legacy of Allah Bakhsh and Other Patriotic Muslims*, Pharos, New Delhi, 2015.
5. Kaur, Ravinder, *Since 1947*: *Partition Narratives among Punjabi Migrants of Delhi*, Oxford University Press, New Delhi, 2007.
6. Kidwai, Hashim M., *The Life and Times of a Nationalist Muslim*, Universal Book House, Aligarh, 2015.
7. Khan, Yasmin, *The Great Partition: The Making of India and Pakistan*, Yale University Press,

Connecticut, 2017.
8. Lapierre, Dominique, and Larry Collins, *Freedom at Midnight*, Vikas Publishing House, Delhi, 2011.
9. Mahajan, Sucheta, *Independence and Partition*: *The Erosion of Colonial Power in India*, Sage, New Delhi, 2000.
10. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal*: *A New History of British India*, HarperCollins, Noida, 2021.
11. Roy, Haimanti, *The Partition of India*, Oxford University Press, New Delhi, 2018.
12. Seervai, H.M., *Partition of India*: *Legend and Reality*, Emmenem Publications, Bombay, 1989.
13. Singh, Anita Inder, *The Partition of India*, National Book Trust, Delhi, 2020.
14. Talbot, Phillips, *An American Witness to India's Partition*, Sage, New Delhi, 2007.
15. Zamindar, Wazira Fazila-Yacoobali, *The Long Partition and the Making of Modern South Asia*: *Refugees*, *Boundaries*, *Histories*, Penguin, New Delhi, 2008.

اکائی 24۔انڈین انڈپنڈنس ایکٹ

(Indian Independence Act)

اکائی کے اجزا

24.0 تمہید

24.1 مقاصد

24.2 1947کا انڈین انڈپنڈنس ایکٹ

24.2.1 ایکٹ کی اہم دفعات

24.2.2 ایکٹ کی نمایاں خصوصیات

24.2.3 ایکٹ کے نتائج

24.2.4 ایکٹ کی تنسیخ

24.2.5 ایکٹ کے مابعد نتائج

24.2.6 ہندوستان پر آئینی ترقی کے اثرات

24.3 اکتسابی نتائج

24.4 کلیدی الفاظ

24.5 نمونہ امتحانی سوالات

24.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

24.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

24.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

24.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

24.0 تمہید (Introduction)

برطانوی وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی نے 20 فروری 1947 کو اعلان کیا کہ ہندوستان میں برطانوی راج 30 جون 1948 تک ختم ہو جائے گا جس کے بعد اقتدار ہندوستانیوں کو منتقل ہو جائے گا۔ یہ اعلان مسلم لیگ کی طرف سے ملک کی تقسیم کا مطالبہ کرنے والے احتجاج کے بعد کیا گیا۔ تقسیم کا منصوبہ 3 جون 1947 کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پیش کیا جسے تین جون کا منصوبہ یا ماؤنٹ بیٹن پلان (Third June Plan or, the Mountbatten Plan) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس منصوبے کو انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ نے قبول کر لیا۔ 1947 کے انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ کو نافذ کر کے اس منصوبے کو فوری طور پر عمل میں لایا گیا۔

24.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ کے مختلف پہلوؤں کو سمجھ سکیں گے۔
- انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ کی اہم دفعات کے بارے میں جان سکیں گے۔
- انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ کی نمایاں خصوصیات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ کے نتائج کے بارے میں جان سکیں گے۔

24.2 1947 کا انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ (The Indian Independence Act, 1947)

برطانوی حکومت 14 اگست 1947 تک نافذ رہی۔ 15 اگست 1947 کو اور اس سے لے کر 1947 کے انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ کے ذریعہ مرکز اور ہندوستان کے زیر تسلط صوبوں میں مکمل اور ذمہ دار حکومت قائم ہوئی۔ مرکزی حکومت میں گورنر جنرل اور صوبائی حکومت میں گورنر خالصتاً رسمی اور علامتی سربراہ بن کر رہ گئے۔ ہندوستان کی آزادی کے قانون کا مسودہ (Bill)، 4 جولائی 1947 کو برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا اور 5 جولائی 1947 کو پارلیمنٹ نے اسے منظوری دے دی۔ 18 جولائی 1947 کو اسے شاہی توثیق بھی مل گئی۔ اس قانون نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے تین جون کے منصوبے کو نافذ کیا جس میں دو اجزاء شامل تھے۔ اول، برطانوی ہندوستان کو دو ملکوں میں تقسیم کیا جائے گا اور دوسرا، اس کے بعد نئی تشکیل شدہ حکومت کو قانونی درجہ دیا جائے گا۔

24.2.1 قانون کی اہم دفعات (Important Provisions of the Act)

قانون کی چند اہم دفعات اس طرح ہیں:

- برطانوی ہند کی دو نئے خود مختار ملکوں یعنی ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم جس کا اطلاق 15 اگست 1947 سے ہوگا۔
- بنگال اور پنجاب کے دو صوبوں کو نئے قائم ہونے والے ملکوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

- دونوں ممالک (ہندوستان اور پاکستان) میں گورنر جنرل کے دفاتر قائم کیے جائیں گے جو قانون کے نفاذ میں سہولت فراہم کریں گے۔
- قانون سازی کا اختیار مکمل طور پر دو نئے ملکوں کی نئی تشکیل شدہ آئین ساز اسمبلیوں کے ہاتھ میں دیا جائے گا۔
- 15 اگست 1947 سے شاہی ریاستوں پر برطانوی اختیار ختم ہو جائے گا اور شاہی ریاستوں کو دو نئی حکومتوں میں سے کسی ایک میں شامل ہونے یا آزاد رہنے کا اختیار ہو گا۔
- برطانوی حکومت کی طرف سے 'شہنشاہ ہند' کے لقب کے استعمال کا خاتمہ ہو جائے گا۔
- مسلح افواج کو دو نئے ملکوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا۔

ان اہم ترین دفعات کے علاوہ، اس قانون میں کئی اور دفعات بھی تھیں، جو کہ دیگر نمایاں رکاوٹوں سے نمٹنے کے لیے بنائی گئی تھیں، جس میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سابقہ مشترکہ املاک کی تقسیم بھی شامل تھی۔

24.2.2 قانون کی نمایاں خصوصیات (Salient Features of the Act)

- **دو نئے ممالک کا ظہور:** اس قانون کی تشکیل کے بعد دو نئے ممالک، ہندوستان اور پاکستان وجود میں آئے۔
- **آزادی کی تاریخ کا تعین:** برطانوی ہند کی تقسیم کے لیے 15 اگست 1947 کی تاریخ مقرر کی گئی۔
- علاقے:

ہندوستان: مقررہ دن سے فوراً پہلے وہ تمام علاقے جو براہ راست برطانوی حکومت کے ماتحت تھے، ہندوستانی سرزمین تسلیم کیے گئے۔ ان میں شاہی ریاستیں اور پاکستانی علاقے شامل نہیں تھے۔

پاکستان: شمال مغربی سرحدی صوبے، مغربی پنجاب، سندھ، مشرقی بنگال، بہاولپور، خیرپور، آسام میں سلہٹ ڈویژن، صوبہ بلوچستان اور اس کی آٹھ دیگر شاہی ریاستیں آزاد مملکت پاکستان کا حصہ بنیں۔

بنگال: صوبہ بنگال کا وجود ختم ہو گیا اور اس سے دو نئے صوبے مشرقی بنگال اور مغربی بنگال وجود میں آئے۔ مشرقی بنگال میں جانے والے اضلاع میں نواکھلی اور ٹپراہ، چٹاگانگ پہاڑی علاقے، چٹاگانگ کے اضلاع، فرید پور، میمن سنگھ، کستیا اور مہرپور تحصیلیں، بوگرا، دیناج پور، اورنگ پور اور نواب گنج تحصیل وغیرہ شامل تھے، جب کہ مغربی بنگال ہندوستان کا حصہ بن گیا۔

پنجاب: پنجاب سے نکل کر دو نئے صوبے مغربی پنجاب اور مشرقی پنجاب وجود میں آئے۔ تحصیل سیالکوٹ اور شکر گڑھ، شیخوپورہ، گوجرانوالہ، لاہور، اٹک کے اضلاع، جہلم، شاہ پور، راولپنڈی، ڈیرہ غازی خان کے اضلاع، جھنگ، منٹگمری، ملتان، لائل پور، اور مظفر گڑھ وغیرہ مغربی پنجاب میں شامل تھے، جبکہ مشرقی پنجاب ہندوستان کا حصہ بن گیا۔ نئے صوبوں کی حدود کا تعین سر سیرل ریڈکلف کی سربراہی میں ایک کمیٹی

نے کیا۔

- **ہندوستان اور پاکستان کا آئین:** گورنمنٹ آف انڈیا قانون 1935 دونوں ممالک پر اس وقت تک لاگو رہے گا جب تک کہ دونوں ممالک کے لیے نئے آئین عمل میں نہیں آ جائے گا۔
- **ہندوستان اور پاکستان کے گورنر جنرل:** دونوں میں سے ہر ایک ملک کے لیے، تاج برطانیہ کی طرف سے ایک الگ گورنر جنرل کا تقرر ضروری تھا جس کو کہ نئے ملک میں سے کسی ایک کی مجلس قانون ساز (اسمبلی) کے قوانین کے تابع رہنا تھا۔ گورنر جنرل کی بنیادی ذمہ داری علاقوں، حقوق، فرائض، اختیارات، واجبات، اثاثوں وغیرہ کی تقسیم کی صدارت کرنی تھی۔ گورنر جنرل کو 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا قانون کو اپنانے اور اس میں ترمیم کرنے کا بھی اختیار دیا گیا تھا۔
- قانون نے ہندوستان کی مسلح افواج کے مستقبل کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں برطانوی افواج کے حوالے سے اٹھائے جانے والے اقدامات کے لیے بھی رہنمایانہ خطوط فراہم کیے تھے۔
- قانون نے دونوں نئے ممالک کے لیے قانون ساز ادارے بھی بنائے۔ اس میں یہ بھی کہا گیا کہ 15 اگست 1947 کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے کسی بھی معاملات پر انگریزوں کا کوئی کنٹرول نہیں ہوگا۔
- قانون نے یقین دہانی کرائی کہ وہ سرکاری ملازمین جو 15 اگست 1947 سے پہلے تعینات کیے گئے تھے، اسی مراعات کے ساتھ اپنی خدمات جاری رکھیں گے۔

24.2.3 قانون کے نتائج (The Consequences of the Act)

1947 کے انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کے ذریعہ ہندوستان کو کوئی نیا آئین نہیں فراہم کرایا گیا تھا۔ یہ صرف ایک 'مجاز بنانے کا قانون' (enabling act) تھا یعنی ایک ایسا قانون جسے ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں کو اپنا آئین بنانے اور منتقلی کے انتہائی مشکل دور میں سہولیات فراہم کرنے کے قابل بنانا تھا۔' دونوں ممالک ہر لحاظ سے آزاد اور برابر تھے۔ ہر ملک کے گورنر جنرل کا تقرر برطانوی بادشاہ کے ذریعے کیا جانا تھا۔ ہر ایک ملک میں ایک مکمل طاقتور مقننہ (Legislature) قائم کی گئی۔ دونوں ممالک کی مقننہ کے ذریعے منظور شدہ کسی بھی قانون کی برطانوی حکمراں کے نمائندے کے طور پر گورنر جنرل نے توثیق کرنی تھی۔

ویسٹ منسٹر کے قانون (Statute of Westminster, 1931) کا سیکشن 4 کہتا ہے:

> برطانیہ کی پارلیمنٹ کا کوئی بھی قانون جو اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد منظور ہوا ہے اس کا اطلاق، کسی بھی ملک پر اس ملک کے قانون کے طور پر نہیں کیا جائے گا اور نہ اسے اطلاق شدہ سمجھا جائے گا۔ جب تک کہ اس قانون میں یہ واضح طور پر اعلان نہ کیا جائے کہ اس ملک نے حکومت برطانیہ سے اس قانون کے نفاذ کی درخواست کی ہے اور رضامندی دی ہے۔

ہندوستانی آزادی کے قانون کے تحت، برطانیہ کی پارلیمنٹ کا کوئی قانون ،نئے ملک میں سے صرف اس صورت میں نافذ ہو سکتا ہے جب کہ اسے متعلقہ ملک کی مقننہ کے قانون کے ذریعے نافذ کیا گیا ہو۔انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کے سیکشن 6 کے ذیلی سیکشن 4 نے نئے ممالک کی مقننہ کو اس سے زیادہ طاقت دی جو 1932 کے ویسٹ منسٹر قانون کے سیکشن 4 میں فراہم کی گئی تھی۔ قانون کے سیکشن 6 کے ذیلی اجزاء (2)،(4)اور (5) نے برطانوی پارلیمنٹ کی ماتحتی یا اس پر انحصار کے ہر ممکنہ عنصر کو ہٹا دیا۔

15 اگست 1947 سے برطانوی حکومت پر 'برطانوی ہندوستان کے نظم و نسق' کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔کچھ وقت کے لیے ہندوستان کا بنیادی آئین، قانون حکومت ہند 1935 کو ہونا تھا۔تاہم یہ چھوٹ بھی دی گئی کہ گورنر جنرل اور گورنر اپنی صوابدید یا انفرادی فیصلے کا استعمال نہیں کریں گے۔ہندوستان پر غیر ملکی تسلط کے خاتمے کی علامت کے طور پر سکریٹری آف اسٹیٹ کے اختیار اور خدمات کو معطل کر دیا گیا تھا۔ برطانوی افواج کو جو ہندوستان پر برطانوی تسلط کا ایک اور آلہ تھا، ہندوستان سے نکالا جانا تھا۔نئے آئین کی تشکیل تک گورنر جنرل کو 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا قانون میں ترمیم کرنے یا اسے اپنانے کا اختیار دیا گیا۔ قانون نے ہندوستان پر برطانوی تسلط کا خاتمہ کر دیا اور ہندوستانی ریاستوں پر تاج برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ کو بھی ختم کر دیا۔اپنی پسند کے مطابق قوانین کو ویٹو کرنے یا محفوظ رکھنے کے تاج برطانیہ کے حق کو بھی ترک کر دیا گیا۔اقلیتوں کے لیے تحفظات فراہم کرنے کی دفعہ کو بھی ختم کر دیا گیا۔ قانون کے سیکشن 9 نے گورنر جنرل کو دفعات کی دفعات کو نافذ کرنے کا اختیار دیا۔ قانون آزادی ہند، ہندوستان کی آئینی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ہے۔26 نومبر 1949 کو دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ اپنایا گیا نیا ہندوستانی آئین، مرکز اور ہندوستانی وفاق میں شامل ریاستوں دونوں میں پارلیمانی نظام حکومت کے قیام کی بات کرتا ہے۔اس کے مطابق گورنر جنرل کی جگہ مجازی طور پر ہندوستان کے صدر نے لے لی اور وہ ہندوستان کے آئینی سربراہ بن گئے ہیں۔ریاستوں میں گورنر کو آئینی سربراہ کے طور پر کام کرنا تھا۔

انڈین انڈپنڈنس ایکٹ نے ہندوستان کی آئینی حیثیت کو تبدیل کر دیا۔1947 تک ،آئینی نظریہ کے مطاق حکومت ہند،تاج برطانیہ کی حکمرانی کے تحت ایک ماتحت رسمی حکومت تھی۔ انڈین انڈپنڈنس ایکٹ 1947 نے اعلان کیا کہ 15 اگست 1947 سے ہندوستانی ریاستوں پر تاج برطانیہ کی بالادستی ختم ہو گئی اور قبائلی علاقوں کے ساتھ معاہداتی تعلقات بھی اسی تاریخ سے ختم ہو گئے۔ قانون کے سیکشن 7(1)(a) میں کہا گیا ہے کہ 'برطانوی ہند میں شامل علاقوں کی حکومت کے حوالے سے برطانیہ میں تاج برطانیہ کی حکومت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔'ہندوستان کے نظم و نسق کے سلسلے میں برطانوی حکومت اور پارلیمنٹ کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔1947 تک ،تاج برطانیہ اختیارات کا حتمی ماخذ رہا۔ ہندوستان طویل عرصے سے تاج برطانیہ کی ذمے داری تھا۔اس قانون کے تحت، ہندوستان نے تاج برطانیہ سے وفاق یا اس کی اکائیوں کے لیے کوئی منظوری یا اختیار حاصل کرنا بند کر دیا۔ گورنر جنرل کو آئینی طور پر ریاست کا سربراہ بنایا گیا، لیکن قانون برائے آزادی ہند کے تحت کی گئی تبدیلیوں کے مطابق،1919 کے قانون کے تحت بنائی گئی گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل، یا 1935 کے قانون کے تحت مقرر کردہ گورنر جنرل کے 'مشیر' اب نہیں رہے۔ گورنر جنرل یا صوبائی گورنر کو مرکزی یا صوبائی مقننہ کا اعتماد رکھنے والی مجلس وزراء جیسا بھی معاملہ ہو، کے مشورے پر کام کرنا تھا۔

گورنر جنرل یا گورنر کو 'اپنی صوابدید' یا 'اپنے انفرادی فیصلے' سے کام کرنے سے روک دیا گیا۔ قانون حکومت ہند 1935 کے تحت گورنر جنرل کے اختیارات، یا اس کے نمائندوں کے طور پر گورنرس کو کچھ کام انجام دینے کے لیے مطلوبہ اختیارات، اس قانون سے متاثر ہوئے۔ گورنر جنرل اور گورنر کو اعلانات، احکامات اور منظوری کے اختیار کے حوالے سے قانون سازی کے غیر معمولی اختیارات سے محروم کر دیا گیا۔ تاج برطانیہ نے اپنا ویٹو کا حق کھو دیا اور گورنر جنرل نے کسی بھی بل کو تاج برطانیہ کی منظوری کے لیے محفوظ کرنا بند کر دیا۔ ہندوستان کی مرکزی مقننہ جو کہ قانون ساز اسمبلی (Legislative Assembly) اور ریاستی مجلس (Council of State) پر مشتمل تھی، 14 اگست 1947 کو ختم ہو گئی۔ مقررہ دن سے لے کر دستور ساز اسمبلی کے نیا آئین بنانے اور اس کے تحت وہاں ایک نئی مقننہ تشکیل دیے جانے تک، قانون ساز اسمبلی کو، آزادی ہند قانون 1947 کے سیکشن 8(2) پر وویژن (e) کے تحت ملک کی مرکزی مقننہ کے طور پر کام کرنا تھا۔ اس طرح ملک کی آئین ساز اسمبلی کا کام دوہرا تھا، ایک آئین سازی اور دوسرا قانون سازی۔ مذکورہ قانون یہ بھی کہتا ہے کہ:

1. برطانوی ہند اور ریاستوں دونوں پر مشتمل ایک ہندوستانی وفاق (Union of India) ہونا چاہیے، جو درج ذیل موضوعات سنبھالے: خارجی امور، دفاع اور مواصلات، اور اس کے پاس مندرجہ بالا موضوعات کے لیے درکار مالیات کو بڑھانے کے لیے ضروری اختیارات ہونے چاہیے۔
2. وفاق کے پاس ایک عاملہ اور ایک مقننہ ہونا چاہئے جو برطانوی ہندوستان اور ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ مقننہ میں کسی بڑے فرقہ وارانہ مسئلے کو اٹھانے والے کسی بھی سوال کے فیصلے کے لیے حاضر نمائندوں کی اکثریت اور دونوں بڑے فرقوں میں سے ہر ایک کی ووٹنگ کے ساتھ ساتھ موجود اور ووٹ دینے والے تمام اراکین کی اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے۔
3. مرکزی مضامین کے علاوہ تمام مضامین اور بقایا اختیارات صوبوں کے پاس ہونے چاہئیں۔
4. صوبجات، مرکز کو حوالے کیے گئے مضامین اور اختیارات کے علاوہ تمام مضامین اور اختیارات اپنے پاس رکھے گا۔
5. صوبوں کو عاملہ اور مقننہ کے ساتھ گروپ بنانے کے لیے آزاد ہونا چاہیے، اور ہر گروپ مشترک صوبائی قوانین کا تعین کر سکتا ہے۔
6. اس کے بعد وفاق کے آئین میں ایسی شق ہونی چاہیے جس کے تحت کوئی بھی صوبہ، اپنی قانون ساز اسمبلی کے اکثریتی ووٹ سے، دس سال کی ابتدائی مدت اور دس سالہ وقفوں کے بعد آئین کی شرائط پر نظر ثانی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

اس کا ارادہ ایک دستور ساز اسمبلی کی تحریک دلانا تھا جس کے ذریعے ایک آئین ہندوستانی خود تیار کر سکیں۔ آئین ساز اسمبلی کا انتخاب صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کو کرنا تھا جس میں بالغ حق رائے دہی کو مسترد کر دیا گیا کیونکہ اس سے نئے آئین کی تشکیل میں تاخیر ہو سکتی تھی۔ ہر صوبے کو اس کی آبادی کے تناسب سے تقریباً دس لاکھ پر ایک کے تناسب سے نشستیں تفویض کی گئیں۔ نشستوں کی صوبائی تقسیم، ہر صوبے میں اہم جماعتوں کے درمیان ان کی آبادی کے تناسب سے کی گئی تھی۔ ہر فرقے کو تفویض کیے گئے نمائندوں کا انتخاب ایک صوبے میں، اس صوبے کی مقننہ میں موجود اس فرقے کے اراکین نے کرنا تھا۔ ان مقاصد کے لیے تین اہم گروہ، مسلم، سکھ اور 'جنرل' نشان زد کیے گئے تھے۔ جنرل طبقہ میں وہ تمام لوگ شامل تھے جو نہ مسلمان تھے اور نہ سکھ۔ صوبوں کو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر صوبائی قانون ساز اسمبلی کے

ذریعے منتخب کیے جانے والے نمائندوں کی تعداد بحیثیت کل یا جماعت کے لحاظ سے مندرجہ ذیل میں اسکیم میں طے کی گئی تھی ہے:

سیکشن (A)

صوبہ	جنرل	مسلم	کل
مدراس	45	4	49
بامبے	19	2	21
متحدہ صوبجات	47	8	55
بہار	31	5	36
مرکزی صوبجات	16	1	17
اڑیسہ	9	0	9
کل	**167**	**20**	**187**

سیکشن (B)

صوبہ	جنرل	مسلم	سکھ	کل
پنجاب	8	16	4	28
شمال مغربی سرحدی صوبہ	0	3	0	3
سندھ	1	3	0	4
کل	**9**	**22**	**4**	**35**

سیکشن (C)

صوبہ	جنرل	مسلم	کل
بنگال	27	33	60
آسام	7	3	10
کل	**34**	**36**	**70**

صدر کمشنری والے صوبوں کی نمائندگی کرنے کے لیے، سیکشن A میں مرکزی قانون ساز اسمبلی میں دہلی کی نمائندگی کرنے والا رکن، مرکزی قانون ساز اسمبلی میں اجمیر، مارواڑہ کی نمائندگی کرنے والا رکن، اور کورگ مقننہ کے ذریعے منتخب ہونے والا نمائندہ شامل کیا جانا تھا۔ سیکشن B میں برطانوی بلوچستان کا نمائندہ شامل کیا گیا۔ ہندوستانی ریاستوں کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد 93 مقرر کی گئی تھی۔ مجموعی طور پر دستور ساز اسمبلی میں 389 ارکان ہونا تھے۔ ریاستوں کے نمائندوں کے انتخاب کا طریقہ مشاورت سے طے کیا گیا۔ جیسے ہی نئے آئینی انتظامات نافذ ہو جائیں گے، کسی بھی صوبے کے لیے کھلا ہو گا کہ وہ کسی بھی ایسے گروپ میں سے نکلنے کا انتخاب کر سکے جس میں اسے رکھا گیا

ہے۔ ایسا فیصلہ صوبے کی مقننہ کے ذریعے نئے آئین کے تحت پہلے عام انتخابات کے بعد کیا جائے گا۔

برطانوی پارلیمنٹ سے انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کی منظوری کے ساتھ ہی، محمد علی جناح 7 اگست 1947 کو کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔ 11 اگست 1947 کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے انہیں صدر منتخب کیا۔ تین دن بعد 14 اگست کو انہوں نے پاکستان کے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھایا۔ 14 اور 15 اگست 1947 کی درمیانی رات کو ہندوستان اور پاکستان وجود میں آئے۔ اس کے بعد ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن (Lord Mountbatten) کو ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر کیا جب کہ جواہر لال نہرو کی سربراہی میں نئی کابینہ نے 15 اگست 1947 کی صبح حلف اٹھایا۔

24.2.4 قانون کی تنسیخ (Repeal of the Act)

حکومت کو بااختیار بنانا: 1947 کے انڈین انڈپنڈنس ایکٹ نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کو اختیار دیا کہ وہ برطانوی پارلیمنٹ کے کسی بھی قانون کو منسوخ کریں جو ان پر لاگو ہوتا ہے۔ یہ ایک اہم شق تھی جس نے نو تشکیل شدہ حکومت کو اپنی خود مختاری پر زور دینے اور اپنے قوانین بنانے کی اجازت دی۔

آئین کے ذریعے قانون کی منسوخی: ہندوستان اور پاکستان نے اپنے اپنے آئین کو اپنا کر انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کو منسوخ کرنے کے لیے اپنی طاقت کا استعمال کیا۔ ایک بار جب یہ نئے آئین نافذ ہو گئے تو انہوں نے قانون برائے آزادی ہند کی جگہ لے لی اور اپنے اپنے ملک میں سرزمین کا اعلیٰ ترین قانون بن گئے۔

ہندوستانی آئین کا سیکشن 395: ہندوستان میں، ہندوستان کا آئین 26 جنوری 1950 کو اپنایا گیا تھا۔ ہندوستانی آئین کے سیکشن 395 نے خاص طور پر 1947 کے انڈین انڈپنڈنس ایکٹ اور اس کے نفاذ کے وقت نافذ دیگر تمام قوانین کو منسوخ کر دیا۔ اس نے ہندوستانی آئین کو ملک کے لیے نئے حکومتی دستاویز کے طور پر قائم کیا۔

ہندوستانی جمہوریہ بن گیا: ہندوستانی آئین کو اپنانے کے بعد، ہندوستان کا ماتحت کردار ختم ہو گیا اور وہ ایک خود مختار جمہوریہ بن گیا جس کا سربراہ اس کا صدر مملکت تھا۔ ماتحت کی حیثیت، جس کی تعریف انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کے تحت کی گئی تھی، کو ختم کر دیا گیا۔

پاکستان کے آئین کا سیکشن 221: پاکستان میں، آئین 1956 میں اپنایا گیا تھا۔ 1956 کے پاکستان کے آئین کا سیکشن 221 پچھلے قوانین کی تنسیخ سے متعلق تھا۔ اس دفعہ نے مؤثر طریقے سے انڈین انڈپنڈنس ایکٹ اور برطانوی پارلیمنٹ کے بنائے گئے کسی بھی دوسرے قوانین کو منسوخ کر دیا جو پاکستان پر لاگو ہوتے تھے۔

برطانوی پارلیمنٹ کے دائرہ اختیار کا خاتمہ: یہ حقیقت کہ برطانوی پارلیمنٹ نے 1947 کے انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کو باضابطہ طور پر منسوخ نہیں کیا ہے، آزادی کے قانونی مضمرات کا نتیجہ ہے۔ ایک بار جب ہندوستان اور پاکستان آزاد ممالک بن گئے، انہوں نے مکمل خود مختاری

سنبھال لی اور ان پر برطانوی پارلیمنٹ کا دائرہ اختیار ختم ہو گیا۔ ان کے اپنے آئین کے ذریعے قانون کی منسوخی نے برطانوی پارلیمنٹ سے قانونی تعلقات منقطع کر دیے۔

خود مختاری کا دعویٰ: انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کو اپنے آئین کے ذریعے منسوخ کرنا ہندوستان اور پاکستان کی خود مختاری کا واضح دعویٰ تھا۔ اس نے برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی اور قوانین سے ان کی مکمل آزادی کی نشاندہی کی، جس نے انہیں خود مختار قوموں کے طور پر حکمرانی کا جواز بخشا۔

خلاصہ یہ کہ 1947 کے انڈین انڈپنڈنس ایکٹ نے اقتدار کی منتقلی اور ہندوستان اور پاکستان کو آزاد ممالک کے طور پر تخلیق کرنے کا قانونی ڈھانچہ فراہم کیا۔ تاہم، ایک بار جب ان ممالک نے اپنے آئین کو اپنا لیا، تو انہوں نے قانون کو منسوخ کرنے کے لیے اپنی طاقت کا استعمال کیا اور اپنی خود مختاری اور آزادی کو علیحدہ اور خود مختار قوموں کے طور پر قائم کیا۔ ان کے متعلقہ آئین کے ذریعے قانون کی منسوخی نے برطانوی نوآبادیاتی اثر ورسوخ کے خاتمے اور ہندوستان اور پاکستان کے لیے خود حکمرانی اور ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

24.2.5 انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کے نتائج (Act and its Aftermath)

تشدد اور بڑے پیمانے پر ہجرت: برطانوی ہندوستان کی ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کے نتیجے میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان بڑے پیمانے پر تشدد اور فرقہ وارانہ جھڑپیں ہوئیں۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے، اور مسلمانوں کی پاکستان اور ہندوؤں اور سکھوں کی ہندوستان میں بڑے پیمانے پر ہجرت ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے تشدد سے بچنے اور اپنے نئے ممالک میں حفاظت تلاش کرنے کے لیے اپنے گھر اور جائیدادیں چھوڑ دیں۔

قبل از وقت دستبرداری کی چنوتیاں: جس تیز رفتاری سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی قیادت میں تقسیم عمل میں لائی گئی اس نے کئی چنوتیوں اور مسائل کو جنم دیا۔ تقسیم کے مسائل کو حل کرنے کے لیے عبوری ادارہ جاتی ڈھانچے کی کمی، حد بندی کمیشن ایوارڈ کے اعلان میں تاخیر اور پاکستان میں گورنر جنرل کے عہدے پر ماؤنٹ بیٹن اور جناح کے درمیان مفادات کے تصادم نے مشکلات میں اضافہ کیا۔

حد بندی کمیشن ایوارڈ میں تاخیر: سر سیرل ریڈ کلف (Sir Cyril Radcliffe) کی سربراہی میں حد بندی کمیشن ہندوستان اور پاکستان کے درمیان نئی سرحدیں بنانے کا ذمہ دار تھا۔ تاہم، ایوارڈ کے اعلان میں تاخیر نے غیر یقینی صورتحال اور علاقائی کنٹرول پر تنازعات کو جنم دیا، جس سے سرحدی علاقوں میں کشیدگی اور تشدد میں اضافہ ہوا۔

ریاستوں کا انضمام: انڈین انڈپنڈنس ایکٹ نے ریاستوں کو ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہونے یا آزاد رہنے کا اختیار دیا۔ تاہم، اس نے چنوتیاں پیدا کیں کیونکہ کچھ شاہی ریاستوں نے انضمام کے خلاف مزاحمت کی، جس کے نتیجے میں ہندوستانی حکومت کی جانب سے ہندوستانی وفاق میں ان کے الحاق کو یقینی بنانے کے لیے فوجی کارروائیاں کی گئیں۔

کانگریس کی تقسیم پر رضامندی: انڈین نیشنل کانگریس نے موجودہ حالات کی وجہ سے ہچکچاتے ہوئے تقسیم کو قبول کیا۔ 'راست کارروائی' اور

فرقہ وارانہ تشدد کے پھیلاؤ نے مزید خونریزی سے بچنے کے لیے اقتدار کی فوری منتقلی کو ضروری بنا دیا۔ عبوری حکومت کے خاتمے نے بھی پاکستان کا تصور ناگزیر کر دیا۔ مزید برآں، تقسیم کو قبول کرنے سے شاہی ریاستوں کے آزادی حاصل کرنے کے امکان کو مسترد کر دیا گیا، جو ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا باعث بن سکتا تھا۔

24.2.6 ہندوستان کی آئینی ترقی پر اثر (Impact on the Constitutional Development of India)

برطانوی راج کا خاتمہ: اس قانون نے ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی حکومت کے خاتمے کی نشاندہی کی اور برصغیر ہند و پاک کو آزادی دی۔ اس نے خود مختاری اور برطانوی تسلط سے آزادی کے لیے ہندوستانی رہنماؤں کے دیرینہ مطالبہ کو پورا کیا۔

ہندوستان کی تقسیم: اس قانون کے نتیجے میں برطانوی ہندوستان کو دو الگ الگ مملکتوں، ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کیا گیا۔ تقسیم کے نتیجے میں آبادی کی نمایاں نقل و حرکت اور فرقہ وارانہ تشدد ہوا، جس کے نتیجے میں جانوں کا المناک نقصان ہوا اور لاکھوں افراد بے گھر ہوئے۔

خود مختار تسلط کا قیام: قانون نے ہندوستان اور پاکستان کو ان کی اپنی آئین ساز اسمبلیوں کے ساتھ دو خود مختار قوموں کے طور پر قائم کیا۔ اس طرح اس نے انہیں اپنے متعلقہ آئین بنانے اور خود حکومت کرنے کا اختیار دیا۔

برطانوی شاہی حکومت کی دستبرداری: اس قانون کے نتیجے میں برطانیہ شاہی حکومت نے ہندوستان میں شہنشاہ کے لقب اور انکے ساتھ جڑے تمام ناتوں کو ترک کر دیا، جو برصغیر ہند و پاک پر برطانوی سامراجی کنٹرول کے خاتمے کی علامت ہے۔

اقتدار کی منتقلی: اس قانون نے تمام اختیارات جو پہلے برطانوی حکومت کے ذریعے استعمال کیے گئے تھے ہندوستان اور پاکستان کے نو تشکیل شدہ تسلط کو منتقل کر دیے۔ برطانوی حکام نے 15 اگست 1947 کو ہندوستان چھوڑ دیا۔

حد بندی کمیشن: یہ قانون ریڈکلف کی سربراہی میں حد بندی کمیشن کے نام سے مقرر ہوا، تاکہ ہندوستان اور پاکستان، خاص طور پر پنجاب اور بنگال میں سرحدوں کی حد بندی کی جا سکے۔ جس کی وجہ سے ان صوبوں کی تقسیم مذہبی بنیادوں پر ہوئی۔

سیکرٹری آف اسٹیٹ کا خاتمہ: اس قانون نے سیکرٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان کے دفتر کو ختم کر دیا، جو ہندوستانی معاملات پر براہ راست برطانوی تسلط کے خاتمے کی علامت ہے۔

ریاستوں کا انتخاب: قانون نے ریاستوں کو ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرنے یا آزاد رہنے کا اختیار دیا۔ 560 سے زیادہ ریاستوں نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا انتخاب کیا۔

فرقہ وارانہ کشیدگی: جہاں قانون نے آزادی کی راہ ہموار کی، وہیں اس نے تقسیم کے دوران ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد کو جنم دیا، جس کے نتیجے میں دونوں ممالک کی تاریخ میں المناک باب کا آغاز ہوا۔

مجموعی طور پر، 1947 کے انڈین انڈپنڈنس ایکٹ خود مختاری اور آزادی کی طرف ہندوستان کے سفر میں ایک تاریخی سنگ میل لگایا، جہاں اس نے آزادی فراہم کی، وہیں اس نے تقسیم کی چنوتیوں اور برطانوی حکمرانی کی میراث سے ہٹ کر نئی قوموں کی تعمیر کی ضرورت کو بھی سامنے رکھا۔ اس قانون نے برصغیر ہند و پاک کی تقدیر کو تشکیل دیا اور آزادی کے فوراً بعد کے دور میں اس کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی ترقی کا راستہ طے کیا۔

24.3 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

انڈین انڈپنڈنس ایکٹ 3 جون 1947 کے ماؤنٹ بیٹن پلان پر مبنی تھا اور اسے 5 جولائی 1947 کو برطانوی پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا۔ اسے 18 جولائی 1947 کو شاہی منظوری ملی۔ اس قانون نے دو نئے ممالک ہندوستان اور پاکستان پیدا کیے۔ اس نے دونوں نئے ممالک کی عبوری مقننہ بھی بنائی اور ان کی دستور ساز اسمبلیوں کے لیے ایسے انتظامات کیے جو آئین تشکیل دے سکیں۔ یہ قانون، ہندوستان کو نئے دور کی دہلیز پر لے آیا جہاں اسے کسی کی سرپرستی کے بغیر اپنی ذمہ داریاں بانٹنی تھیں۔ لارڈ کلیمنٹ ایٹلی نے برطانیہ کے مجلس عوام یا ہاؤس آف کامنز (House of Commons) میں کہا کہ، 'یہ (قانون) واقعات کے ایک طویل دورانیے کا اختتامی نقطہ ہے۔' انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کے نتیجے میں تشدد، بڑے پیمانے پر نقل مکانی اور تقسیم سے متعلق چنوتیاں پیدا ہوئیں۔ برطانوی راج کی جلد بازی سے دستبرداری اور شاہی ریاستوں کے انضمام کی پیچیدگیوں نے مشکلات میں اضافہ کیا۔ اس قانون اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تقسیم نے خطے پر گہرے اثرات مرتب کیے، جس کے دیرپا نتائج ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ اور تعلقات پر مرتب ہوئے۔ اس قانون نے ہندوستان اور پاکستان کو مکمل خود مختاری دی اور نو تشکیل شدہ ریاستیں اب برطانیہ کے زیر تسلط نہیں رہیں۔ تاہم، تقسیم کی جلد بازی اور بے ترتیب نوعیت کے ساتھ ساتھ عبوری ڈھانچے کی کمی نے متعدد چیلنجز اور پیچیدگیاں پیدا کیں۔ حد بندی کمیشن ایوارڈ کے اعلان میں تاخیر نے علاقائی حدود پر غیر یقینی صورتحال اور تنازعات کو مزید بڑھا دیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سے تقسیم کو قبول کرنا مزید خونریزی اور افراتفری کو روکنے کے لیے ایک عملی فیصلہ تھا۔ تاہم، اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ ایک متحد ہندوستان کا خواب چکنا چور ہو گیا اور تقسیم کے نتیجے میں لاتعداد انسانی مصائب اور بیشمار جانوں کا بھی زیاں ہوا۔ مجموعی طور پر، جہاں 1947 کے انڈین انڈپنڈنس ایکٹ نے آزادی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا، وہیں اس نے تشدد اور بے گھر ہونے کی دیرپا میراث بھی چھوڑی۔ یہ قانون ایک اہم تاریخی واقعہ ہے جس نے خطے کی تقدیر کو تشکیل دیا، اس کا اثر اب بھی ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات اور تقسیم سے متاثر ہونے والے لاکھوں لوگوں کی زندگیوں میں محسوس ہوتا ہے۔

24.4 کلیدی الفاظ (Keywords)

مقننہ	گورنر جنرل	آئین ساز اسمبلی
تسلط	آئین	برطانوی تاج برطانیہ
وزراء کی کونسل	خود مختاری	

24.5 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

24.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کس سال منظور ہوا؟
2. ماؤنٹ بیٹن پلان ہندوستان کے کس وائسرائے نے پیش کیا تھا؟
3. کس تاریخ کو برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستانی آزادی کا بل منظور کیا؟
4. ہندوستانی آزادی بل کو شاہی منظوری کب ملی؟
5. کس تاریخ کو ہندوستان نے آزادی حاصل کی؟
6. انڈین انڈپنڈنس ایکٹ میں صوبوں کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا؟
7. انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کے نتیجے میں کون سے دو ممالک ابھرے؟
8. ہندوستان اور پاکستان کے نئے صوبوں کی حدود کا تعین کس نے کیا؟
9. نئے ہندوستانی آئین کو دستور ساز اسمبلی نے کب اپنایا؟
10. آزاد ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل کون تھا؟

24.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کے نتائج کیا تھے؟ بتائیے۔
2. انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کی اہم خصوصیات کی وضاحت کیجیے۔
3. انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کی آئینی اہمیت کیا ہے؟ واضح کیجیے۔
4. ہندوستان کی آئینی ترقی پر انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کا کیا اثر ہوا؟ نوٹ لکھیے۔
5. انڈین انڈپنڈنس ایکٹ نے بنگال اور پنجاب کے بارے میں کیا کہا؟ روشنی ڈالیے۔

24.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کی دفعات کیا ہیں؟ تفصیلی طور پر بتائیے۔
2. انڈین انڈپنڈنس ایکٹ کو منسوخ کرنے کے طریقہ کار پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. انڈین انڈپنڈنس ایکٹ میں صوبوں کی گروہ بندی کس طرح کی گئی؟ تفصیلی وضاحت کیجیے۔

24.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Bhargava, M.L., *History of Modern India*, Reliance Publishing House, Delhi, 2002.
3. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin Books, Delhi, 1989.
4. Desai, A.R., *Social Background of Indian Nationalism*, Popular Prakashan Ltd., Delhi, 2011.
5. Grover. B.L. and S. Grover, *A New Look at Modern Indian History*, S. Chand & Co. Ltd., New Delhi, 2006.
6. Matthews, Roderick, *Peace, Poverty and Betrayal*: *A New History of British India*, HarperCollins, Noida, 2021.
7. Sarkar, Sumit, *Modern India, 1885–1947*, MacMillan, Delhi, 2006.
8. Sharma, L.P., *History of Modern India*, Konark Publishers Pvt. Ltd, Delhi, 1989.

نمونہ پرچہ امتحان

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم

Bachelor of Arts بیچلرآف آرٹس

Subject Code: BAHS601DSTT

Paper: Modern India: National Movement

پرچہ: جدید ہندوستان: قومی تحریک

6th Semester Examination ، چھٹا سمسٹر امتحان

Time : 3 hours وقت : ۳ گھنٹے — Marks : 70 نشانات : ۷۰

ہدایات

یہ پرچہ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (1 0 x 1 =10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں 8 سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو (200) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی 3 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً پانچ سو (500) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30Marks)

حصہ اول

سوال : 1

i. مشہور کتاب *Emergence of Indian Nationalism* کے مصنف ہیں؟

ii. اسلحہ ایکٹ (Arms Act) کب پاس ہوا؟

iii. 'انڈیا ٹوڈے' (*India Today*) کس کی تحریر ہے؟

iv. کانگریس کا پہلا اجلاس کہاں منعقد ہوا؟

v. *Poverty and Un-British Rule in India* کس نے لکھی؟

vi. ڈان سوسائٹی (Dawn Society) کی بنیاد کس نے رکھی؟

vii. کتاب 'گیتا رہسیہ' کس انتہا پسند رہنما نے لکھی؟

viii. 1906 میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کس نے کی؟

ix. تین معروف اعتدال پسند رہنماؤں کے اسمائے گرامی تحریر کیجئے؟

x. *The Arctic Home in the Vedas* کس کی تصنیف ہے؟

حصہ دوم

2. ہندوستان میں قوم پرستی کی ارتقاء پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
3. سیفٹی والو نظریہ کے حق میں دوسری دلیل کے بارے میں بتائیے۔
4. سودیشی تحریک کی اہمیت کی وضاحت کیجیے۔
5. انجمن اسلامی پر ایک مختصر نوٹ تحریر کریں۔
6. ہندوستانی جدوجہد آزادی میں انتہا پسندوں کے کردار پر روشنی ڈالیے۔
7. ہندوستانی تاریخ میں لکھنؤ معاہدہ کی اہمیت پر نوٹ لکھیے۔
8. ہندو مہاسبھا کے مقاصد پر نوٹ لکھیے۔
9. سامراجی کشمکش پر ایک نوٹ لکھیے۔

حصہ سوم

10. کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہوم رول تحریک نے گاندھی کی عوامی تحریک کے لیے بنیاد فراہم کی تھی؟ بحث کریں۔
11. جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی کی سیاسی تحریک کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
12. عدم تعاون کی تحریک کے تین مختلف مراحل پر روشنی ڈالیے۔
13. کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ خلافت تحریک ناکام ثابت ہوئی، کیونکہ یہ ادارۂ خلافت کی بحالی میں ناکام رہی؟ بحث کیجیے۔
14. وہ کون سے فوری عوامل تھے جن کی وجہ سے ہندوستان چھوڑو تحریک شروع ہوئی؟ تفصیلی جائزہ لیجیے۔